بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اشرف التوضیح کی چوتھی جلد ایک طویل وقفے کے بعد قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔اس غیر معمولی تاخیر کی وجہ یہ ہوئی کہ تیسری جلد کی طرح اس جلد میں بھی بنیاد اس ناکارہ کی درسی تقریروں کو بنایا گیا ہے۔ان دروس کو کیسٹوں سے کاغذ پر منتقل کرانے کا کام بھی جناب مولانا مفتی سجاد احمد صاحب فاضل جامعہ امدادیہ واستاذِ حدیث جامعہ دار القرآن فیصل آباد نے اپنے ذمے لیا اور بڑی محنت سے اسے نبھایا۔ابتدائی مسودے کی فائلوں کے بارے میں ایک عرصے تک دلچسپ سی غلط فہمی ایسی رہی جس کی وجہ سے میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ فائلیں کہیں گم ہو گئی ہیں۔اس طرح کا کام از سرِ نو کروانے کا حوصلہ بھی مشکل ہو رہا تھا۔کئی سال اسی غلط فہمی میں گذرنے کے بعد الحمد للہ یہ فائلیں مل گئیں اور برادرِ عزیز مولوی محمد شاہد سلمہ نے اس کی کمپوزنگ کی۔ اس کمپوز شدہ مسودے پر اس ناکارہ نے نظرِ ثانی اور اضافات کئے۔اس طرح سے یہ مواد قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہوا۔

اس جلد میں تقریباً وہی منہج اور طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے جو تیسری جلد میں اختیار کیا گیا تھا۔کیسٹ سے نقل شدہ دروس میں نظرِ ثانی کے دوران کافی تبدیلیاں اور اضافات بھی کئے گئے ہیں۔زبانی گفتگو میں عموماً جو تکرار وغیرہ ہوتا ہے اسے ایک حد تک ختم کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے پھر بھی گفتگو اور تحریر کا فرق بالکلیہ ختم کرنا مشکل ہوتا ہے۔اس لئے امید ہے کہ اس جلد کو بھی ایک درسی تقریر کے طور پر ہی لیا جائے گا اور زبان و بیان کا سقم جہاں کہیں کسی ذوقِ لطیف پر گراں گذرے اس سے در گذر کیا جائے گا۔جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حوالہ جات بھی دے دیئے گئے ہیں۔بہت معروف چیزوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔پھر بھی بہت ممکن ہے کہ بعض

مقامات پر ضرورت کے باوجو حوالہ جات رہ گئے ہوں۔ ان ظاہری اور تکنیکی چیزوں کے علاوہ خود نفسِ مواد میں تسامحات اور غلطیوں کا ہونا ایک ناکارہ طالب علم کے کام میں ناممکن نہیں۔ اس لئے اللہ تعالی جزائے خیر دیں ان حضرات کو جو اگر کوئی غلطی محسوس کریں تو اس سے مطلع فرمائیں۔

اس جلد اور آنے والی جلدوں میں احادیثِ مبارکہ کا وہ حصہ زیرِ بحث آیا ہے جو عام طور پر ہمارے درسی حلقوں میں زیادہ توجہ حاصل نہیں کر پاتا۔ ایک ناکارہ طالب علم کیا اور اس کے دروس کی کیا حیثیت۔ تاہم ان دروس کے ذریعے حدیث کے طالب علم میں اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ مشہور فقہی اور اختلافی مسائل کے علاوہ حدیث نبوی ﷺ کی ایک وسیع دنیا موجود ہے اور اس کا ہماری روز مرہ کی جیتی جاگتی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے اور اس طرح اس طالب علم میں حدیث کے وسیع تر تناظر میں مطالعے کا ذوق پیدا ہو جائے تو ایک بڑا مقصد حاصل ہے۔ دینی مدارس کے اساتذہ و طلبہ کے علاوہ عام پڑھے لکھے قاری کے لئے بھی امید ہے یہ مواد حدیث فہمی کے سلسلے میں مفید ثابت ہو گا۔

اس موقع پر ان تمام حضرات کا شکر ادا کرنا فرض ہے جن کا کسی بھی طرح کا تعاون اس جلد کی تیاری میں شامل رہا۔ خصوصاً مفتی سجاد احمد صاحب جن کی ہمت و کاوش اگر نہ ہوتی تو یہ پیش کش ممکن نہ ہوتی۔ اسی طرح مفتی اکرام اللہ شاہ صاحب اور مفتی زاہد حسین صاحب جنہوں نے پروف ریڈنگ میں معاونت کی۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس کاوش کی نافعیت و قبولیت اور باقی ماندہ کام کی تکمیل کے لئے دعا سے محروم نہ فرمائیں۔

محمد زاہد

۱۰/۶/۱۴۳۴ھ

zahidimdadia@yahoo.com

مولف کے مزید افادات کے لیے وزٹ کیجیے: https://www.facebook.com/ilmohikmatt/
https://archive.org/details/@zulal_foundation
https://www.youtube.com/channel/UCKdxN20VhJJ3FyTk3BWRbzg

فہرست مضامین

کتاب الطب والرقی

کتاب الطب والرقی

عنوان میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں، ''الطب'' اور ''الرقی''۔ طب کے عربی زبان میں کئی معانی آتے ہیں ان میں سے ایک معنی ہے کسی بھی کام میں ماہر ہونا، لیکن بعد میں زیادہ تر اس کا اطلاق علاج معالجے میں مہارت پر ہونے لگا اور طبیب اسے کہا جانے لگا جو علاج معالجے کے کام میں مہارت رکھتا ہو۔ اسی طرح ''طب'' کبھی جادو کو بھی کہہ دیتے ہیں؛ چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تو اس کے بارے میں بخاری کی بعض روایتوں میں آتا ہے انہ ''مطبوب'' یعنی ایک فرشتے نے دوسرے سے کہا کہ آپ مطبوب یعنی مسحور ہیں۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ جادو پر ''طب'' کا اطلاق تفاؤلاً ہوتا ہے یعنی اس امید پر اسے ''طب'' کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کا علاج ہو جائے گا، ورنہ زیادہ تر طب کا اطلاق عام علاج معالجہ پر ہوتا ہے، جیسے سانپ کے ڈسے ہوئے کو عربی میں سلیم کہتے ہیں، حالانکہ سلیم کے اصل معنی ہیں سلامتی والا، سانپ کے ڈسے ہوئے کو سلیم اس امید پر کہہ دیا جاتا ہے کہ اسے سلامتی مل جائے گی۔

موطا کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات طب اور طبیب کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے دو آدمیوں سے پوچھا کہ تم میں سے زیادہ طبیب کون ہے؟ (أیکما أطب)، تو ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ کیا طب میں بھی کوئی خیر ہے یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا دوائی بھی اسی ذات نے پیدا کی ہے جس نے بیماریاں پیدا کی ہیں[1]۔

''رُقی'' یہ جمع ہے رُقیۃ کی، رقیہ کے اصل معنی دم اور منتر یعنی مخصوص الفاظ وغیرہ پڑھ کر علاج کرنے کے

1۔ موطا امام مالک، کتاب الجامع: باب تعالج المریض

آتے ہیں[1]۔

یہاں عنوان میں دو لفظ استعمال کئے ہیں "الطب" اور "الرقی"، ان دو لفظوں کو لا کر اصل میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علاج کی دو صورتیں ہوتی ہیں اور یہاں پر دونوں کے متعلق حدیثیں لائیں گے ۔ایک ہوتاہے علاج ظاہری اسباب کے ذریعے یعنی ان اسباب کے ذریعے جن کاادراک عام آدمی بھی کر سکتاہے اور دوسرا علاج ہوتاہے باطنی اسباب کے ذریعے جس میں دم کرنا، تعویذ گلے میں لٹکانا وغیرہ داخل ہیں، تواس باب میں دونوں قسم کے علاج کے بارے میں احادیث لانا مقصود ہیں۔

علاج معالجہ کے بارے میں کچھ اصولی باتیں

اس باب کی احادیث کو شروع کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتاہے کہ علاج معالجہ اور علاج معالجہ کی احادیث کے بارے میں کچھ اصولی باتیں ذہن میں رکھ لی جائیں۔

ا۔ ہر بیماری کا علاج موجود ہے:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ علاج معالجے کا شریعت میں کیا حکم ہے، یعنی اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تواس باب کی پہلی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایاہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بیماری بھی پیدا فرمائی ہے اس کے لئے دوا اور شفا ضرور پیدا فرمائی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بیماری لاعلاج نہیں ہے ہر بیماری کا علاج ضرور

[1]۔ رقی یرقِی (باب ضرب یضرب)، حافظ ابنِ حجر نے رقیہ کے معنے مطلقا تعویذ کے لکھے ہیں (فتح الباری، کتاب الطب: باب الرقی بالقرآن والمعوذات)۔

موجود ہے البتہ اس پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آج تک کئی بیماریاں ایسی ہیں جن کو ساری دنیا کے اطبا اور معالج لاعلاج قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ان کا کوئی علاج نہیں ہے جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ لاعلاج بیماری کوئی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کا علاج پیدا فرمایا ہے۔ تو اصل میں یہاں دو باتیں ہیں ایک ہے کسی بیماری کا علاج موجود ہونا اور دوسرا ہے اس علاج کا دریافت ہو جانا اور ہمیں اس کا علم ہونا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہیں فرمارہے کہ ہر بیماری کا علاج ہر ایک کو معلوم ضرور ہے، بلکہ آپ یہ فرمارہے ہیں کہ ہر بیماری کا علاج موجود ضرور ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے البتہ یہ ہو سکتا ہے کسی بیماری کا علاج موجود ہونے کے باوجود انسان کے علم میں یہ بات نہ آئی ہو کہ فلاں بیماری کا یہ علاج ہے۔ یہ ضمانت تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی ہے کہ ہر بیماری کا علاج موجود ضرور ہے لیکن اس علاج کا علم حاصل کرنا یہ انسان کی محنت اور کوشش پر منحصر ہے، جتنی محنت کرے گا، تجربات کرے گا، جاننے کی کوشش کرے گا، اتنا ہی انسان کا علم وسیع ہوگا اور زیادہ سے زیادہ بیماریوں کا علاج اسے معلوم ہو جائے گا۔ تو جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں بیماری لاعلاج ہے تو اس معنی میں تو یہ بات درست ہے کہ اس کا علاج انسان ابھی تک دریافت نہیں کر سکا اور سائنس دانوں کے علم میں نہیں آسکا لیکن اس معنی میں کسی بیماری کو لاعلاج کہنا درست نہیں ہے کہ اس کا علاج سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ موجود یقیناً ہے لیکن اسے معلوم کرنا انسان کا کام ہے۔ لہٰذا یہ بات اپنی جگہ پر اٹل حقیقت ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادی کہ ہر بیماری کا علاج موجود ضرور ہے اور کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج موجود نہ ہو۔

یہ حدیث میڈیکل سائنس میں تحقیق کا جذبہ پیدا کرتی ہے:

اور یہ ایک ایسی بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماگئے ہیں جس سے بڑھ کر تحقیق کے لئے انسان کو جوش اور جذبہ مہیا کرنے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی؛ اس لئے کہ آدمی جب کسی چیز پر محنت کرتا ہے تو کسی نہ کسی درجے میں یہ ضرور سوچتا ہے کہ میری اس محنت میں کامیابی کے امکانات بھی ہیں یا نہیں، فضول محنت کرنے سے انسان گریز کرتا ہے، تو ایک آدمی علاج معالجے کے موضوع اور میڈیکل سائنس پر تجربے کر رہا اور جدید چیزیں دریافت

کرنے کی کوشش کر رہا ہے ، ہو سکتا ہے اس کے ذہن میں یہ بات آئے کہ پتا نہیں میری کوشش کامیاب ہو گی یا نہیں۔ کوئی کینسر کا علاج دریافت کر رہا ہے ، کوئی ایڈز کا علاج دریافت کر رہا ہے ، کوئی کسی اور بیماری کا علاج دریافت کر رہا ہے ، ہر ایک کے ذہن میں یہ خدشہ موجود ہو کہ معلوم نہیں یہ علاج ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں ، دریافت تو تب ہو جب موجود ہو ، اگر علاج کے وجود ہی کے بارے میں شبہ ہو گا تو دریافت کی کوشش کی کامیابی بھی اس کی نظر میں مشکوک ہو گی ۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جس کے پیشِ نظر ہو گا اور جس کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر ایمان ہو گا اس کا یہ یقین ہو گا کہ جس بیماری کا علاج میں دریافت کرنے کے لئے نکلا ہوں اس کا علاج ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہے اس کے ذہن میں یہ نہیں آئے گا کہ ہو سکتا ہے کہ اس کا علاج ہے ہی نہیں تو میں خوامخواہ لگا رہوں۔ جب اتنا پتا چل جائے کہ یہ چیز موجود ضرور ہے تو آدمی زیادہ جذبے کے ساتھ اس کی تلاش کرتا ہے۔

توبہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح فرمادی کہ کوئی بیماری لاعلاج نہیں ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کچھ بیماریاں ایسی تھیں جن کو لاعلاج سمجھا جاتا تھا اب ان کا علاج موجود ہے۔ ٹی بی کی بیماری کسی زمانے میں لاعلاج سمجھی جاتی تھی لیکن آج اس کا بآسانی علاج ہو جاتا ہے۔ کینسر کی ساری قسمیں کسی زمانے میں لاعلاج سمجھی جاتی تھیں لیکن آج بہت سی اقسام کا علاج ہو جاتا ہے اور جن کا علاج نہیں ہے ان کا بھی آئندہ دریافت ہو سکتا ہے۔ تو اس سے پتا چلا کہ انسان جس بیماری کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ اس علاج نہیں تو یہ اصل میں انسان کے محدود علم پر مبنی ہوتا ہے اور یہ بات حقیقت کی عکاسی نہیں کرتی ، اس لئے کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا ۔ انسان جتنی بھی تحقیقات کر لے اور علم کے جس مرتبے پر بھی پہنچ جائے اس کا علم اللہ تبارک وتعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تھوڑا ہی ہے رہے گا ، جو اسے معلوم نہیں وہ ہمیشہ زیادہ رہے گا بنسبت اس کے جو اسے معلوم ہے۔

۲۔ علاج کرانے کا شرعی حکم:

یہ جو حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر بیماری کا علاج پیدا فرمایا ہے اسی کے ساتھ بعض روایتوں میں یہ لفظ بھی ہیں "فتداوَوا یاعباداللہ" کہ اللہ کے بندوں دوا استعمال کیا کرو، علاج کیا اور کروایا کرو، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دوا استعمال کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے تو اس کے لئے پہلے یہ ذہن میں رکھیں کہ اسباب تین طرح کے ہوتے ہیں۔

اسبابِ قطعیہ:

پہلی قسم ہے اسباب قطعیہ، یعنی وہ اسباب جن پر مسبب کا مرتب ہونا یقینی ہوتا ہے، الا یہ کہ اللہ جل جلالہ اپنی قدرت سے اس کو روک دیں، گلے میں چھری چلائیں گے تو گلا کٹ جائے گا یہ عام عادت کے اعتبار سے یقینی ہے، البتہ کبھی کبھار اس کے برعکس ہو جائے کہ اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری چلائی جائے لیکن گلا نہ کٹے تو الگ بات ہے تو یقینی ہونے سے مراد عادت عامۃ کے اعتبار سے یقینی ہونا ہے۔

اسبابِ ظنیہ:

دوسری قسم کے اسباب اسبابِ ظنیہ ہیں، یعنی جن کا ثمرہ عام طور پر مرتب تو ہو جاتا ہے لیکن ان کے مرتب ہونے کا یقین نہیں ہوتا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا ثمرہ اس پر مرتب نہ ہو، اکثر دوائیاں اور اکثر علاج معالجے اسی قسم میں داخل ہیں، سر درد کی گولی کھانے سے عموماً سر درد ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن ایسا بھی ہوتا رہتا ہے کہ گولی کھالی لیکن سر درد ٹھیک نہیں ہوا تو درد کو ٹھیک کرنے کے لئے گولی کھانا اسبابِ ظنیہ میں سے ہے۔

اسبابِ وہمیہ:

تیسری قسم ہے اسبابِ وہمیہ ، یعنی وہ اسباب جن پر ثمرہ مرتب ہونا ظنِّ غالب کے درجے میں بھی نہیں ہوتا ک، بھی کبھار ہو سکتا کہ ثمرہ مرتب ہو گیا ہو لیکن عام طور پر کوئی پتا نہیں ہوتا کہ ثمرہ مرتب ہو گا یا نہیں ،اکثر جھاڑ پھونک اور منتر تعویذات وغیرہ قسم کے جو معالجات ہوتے ہیں اسی قسم میں داخل ہوتے ہیں اور اسی طرح عام اناڑی لوگوں کے ٹوٹکے بھی اسی قسم میں داخل ہوتے ہیں۔

تو اسباب کی تین قسمیں ہیں اسبابِ قطعیہ ،اسبابِ ظنیہ ،اسبابِ وہمیہ۔علاج معالجہ بھی اسباب میں ہی داخل ہے اس لئے اسباب کا حکم معلوم ہو جائے گا تو علاج معالجہ کا حکم بھی معلوم ہو جائے گا۔

اسبابِ قطعیہ کا حکم:

اسبابِ قطعیہ کا حکم یہ ہے کہ جان بچانے کے لئے انہیں استعمال کرنا واجب ہے، یعنی جس شخص کو پتا ہو کہ اس سبب کو استعمال کریں گے تو جان بچ جائے گی اور اگر نہیں استعمال کریں گے تو جان چلی جائے گی اس شخص کے لئے اس سبب کا استعمال واجب ہے؛ مثال کے طور پر ایک آدمی کو بھوک لگی ہے اب یہ بات قطعی ہے کہ یہ اگر کچھ کھائے گا تو جان بچ جائے گی اور اگر کئی دن ایسے گزر گئے کہ کچھ نہیں کھایا تو جان چلی جائے گی۔پیاس لگی ہوئی ہے اس کے بجھانے کے لئے پانی پینا ایک سبب ہے اور یہ سبب قطعی ہے لہٰذا جس آدمی کو بھوک لگی اور اس نے کئی دن تک کچھ نہیں کھایا اور مر گیا یا پیاس لگی اور اس نے کئی دن تک کچھ نہیں پیا اور وہ مر گیا تو وہ گناہ گار ہو گا؛ کیونکہ کھانا پینا اسبابِ قطعیہ میں سے ہیں اور سببِ قطعی کو استعمال کرنا واجب تھا اور اس نے اس واجب کو ترک کیا ہے اس لئے یہ گناہ گار ہو گا۔

اسبابِ ظنیہ کا حکم:

دوسری قسم کے اسباب یعنی اسبابِ ظنیہ کا حکم یہ ہے کہ ان کا استعمال کرنا واجب تو نہیں ہے لہٰذا ان اسباب کو اگر کوئی استعمال نہیں کرتا تو گناہ گار نہیں ہو گا لیکن عام حالات میں بہتر یہی ہے کہ ان اسباب کو استعمال کیا جائے،

انبیاءِ کرام علیہم السلام کی سنت اور ان کی تعلیم یہی ہے، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا علاج کیا اور کروایا ہے اور اپنی امت کو بھی اس کی تعلیم فرمائی، فرمایا کہ ہر بیماری کا علاج ہے اس لئے دوائی استعمال کیا کرو اور علاج کیا اور کروایا کرو۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کا توکل میں خاص غلبۂ حال ایسا ہو کہ وہ اسبابِ ظنیہ بھی استعمال نہ کریں[1] لیکن عام حالات میں حکم یہی ہے کہ اسبابِ ظنیہ کا استعمال جائز بلکہ بہتر ہے۔ یہ توکل کے منافی نہیں ہے اس لئے کہ توکل درحقیقت ترکِ اسباب کا نام نہیں ہے، بلکہ توکل نام ہے اسباب پر نظر نہ رکھنے کا، توکل یہ نہیں کہ آدمی اسباب استعمال ہی نہ کرے بلکہ توکل یہ ہے کہ اسباب استعمال کرتے ہوئے بھی اس کا یہ عقیدہ ہو کہ مؤثرِ حقیقی اور فاعلِ حقیقی یہ اسباب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس سبب میں تاثیر پیدا کر دیں گے اگر نہیں چاہیں گے تو تاثیر پیدا نہیں کریں گے، استعمال تو اسباب کو کرتا ہے لیکن نظر اس کی محض اسباب پر نہیں بلکہ نظر اس کی اللہ تعالیٰ پر ہے۔ یہ توکل کی حقیقت ہے۔ اس لئے اسبابِ ظنیہ کو استعمال کرنا بھی توکل کے منافی نہیں۔

اسباب اختیار کرنے میں اعتدال کی ضرورت:

ہاں البتہ توکل کا اتنا تقاضا ضرور ہے کہ ان اسباب کے استعمال میں اعتدال ہو، اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق اسباب استعمال کر کے باقی معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ بیمار ہو گیا بعض اوقات بیماری ایسی

1۔ مخصوص حالت کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک خاتون تھیں جنہیں مرگی وغیرہ کے دورے پڑتے تھے، انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا کہ اگر چاہو تو تمہارے لئے شفا کی دعا کر دوں اور اگر چاہو تو تم صبر کر لو اور اللہ تعالی اس کے بدلے میں تمہیں جنت عطا فرمائیں، اس خاتون نے دوسرے آپشن کو ترجیح دی، البتہ یہ عرض کیا کہ دورے کے دوران میرا جسم کھل جاتا ہے، دعا فرما دیجئے کہ دورے کے دوران اللہ تعالی اس بے پردگی سے محفوظ رکھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرما دی (صحیح البخاری، کتاب المرضی: فضل من یصرع من الریح)

ہوتی ہے جو بہت مہنگے علاج معالجہ کا تقاضا کر رہی ہوتی ہے اور آدمی کے اندر مالی استطاعت اتنی نہیں ہوتی تو ایسی صورت میں بالکل علاج چھوڑ کر بیٹھ جائے یہ بھی مناسب نہیں ہے بلکہ جتنا اپنی ہمت اور وسعت میں ہے اتنا علاج کرا لے اور باقی معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو معمولی دوائیوں کے اندر برکت ڈال سکتے ہیں، یہ کوئی ضروری نہیں کہ آدمی ہر بیماری میں قیمتی سے قیمتی ہی علاج کروائے بس یہ ہے کہ اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق علاج کرواؤ، اگر تو اسباب پر نظر ہے وہ تو سوچے گا جو واقعتاً اس مرض کا علاج ہے میرے پاس اس کی حیثیت نہیں اس لئے کیا فائدہ جس کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ کہے گا کہ میں نے تو اللہ کا حکم سمجھ کر اسباب کو اختیار کرنا ہے اس لئے مہنگے علاج کی حیثیت نہیں ہے تو جتنی ہے اتنا کر لو جو اللہ تعالیٰ قیمتی علاج کے اندر تاثیر پیدا کر سکتے ہیں وہ معمولی چیز کے اندر بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

اسبابِ وہمیہ کا حکم:

تیسری قسم کے اسباب یعنی اسبابِ وہمیہ کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ خلافِ شریعت نہ ہوں تو ان کا استعمال جائز تو ہے لیکن توکل کے اعلیٰ درجہ کے منافی ہے، یعنی جس نے ان اسباب کو اختیار کیا اس کے بارے میں یہ بھی نہیں کہیں گے کہ اس نے ناجائز کام کیا، یہ بھی نہیں کہیں گے کہ اس نے توکل چھوڑ دیا بلکہ توکل کا واجب درجہ تو اس کو حاصل ہے البتہ کمالِ توکل اس کو حاصل نہیں رہا۔ کون سی چیز اسبابِ وہمیہ میں سے اور کون سی اسبابِ ظنیہ میں سے یہ وقت ،حالات اور زمانے کے بدلنے سے بدل سکتا ہے؛ ایک چیز ایک زمانے میں ہو سکتا ہے کہ اسبابِ وھمیہ میں سے ہو دوسرے زمانے میں اسبابِ ظنیہ میں سے ہو جائے، تجربات زیادہ ہو گئے، اس کا طریقہ لوگوں کو آ گیا تو جس کی تاثیر پہلے وہمی تھی اب ظنی ہو گئی۔

اسبابِ وہمیہ کی چند مثالیں:

عربوں کے ہاں چونکہ باقاعدہ طب عمومی طور پر مروّج نہیں تھی، زیادہ تر انحصار توہمات یا سیانوں اور سیانیوں کی باتوں پر ہوتا تھا اس لئے ان میں اسبابِ وہمیہ کا رواج کافی زیادہ تھا، عربوں میں زمانۂ جاہلیت سے جو اسبابِ وہمیہ مروّج چلے آرہے تھے ان میں سے بعض کا خاص طور سے حدیثوں میں ذکر آتا ہے؛ مثلاً انہیں میں سے ایک ''استر قاء'' ہے، یعنی دم اور جھاڑ پھونک۔ عربوں کے ہاں مختلف قسم کے دم چلتے تھے ان میں سے کئی تو شرکیہ مضامین پر مشتمل ہوتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اگرچہ قرآن وحدیث کے الفاظ پر مشتمل نہیں تھے لیکن ان کا مضمون ناجائز بھی نہیں تھا ان کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے مسئلہ ان شاءاللہ آجائے گا۔ لیکن یہ دم اسبابِ وہمیہ میں سے تھے اسبابِ ظنیہ میں سے نہیں تھے، فائدہ ہو بھی جاتا تھا لیکن بکثرت ایسا بھی ہوتا تھا کہ فائدہ نہیں ہوتا تھا، اگر فائدہ ہوا بھی ہے تو یہ واضح نہیں تھا کہ اسی چیز سے ہوا ہے یا کسی اور چیز سے، ویسے بھی بعض بیماریاں اپنی میعاد پوری کر کے خود ہی ختم ہو جاتی ہیں، عربوں میں مروّج جھاڑ پھونک زیادہ تر اسی نوعیت کی تھی۔

دوسرا ایسا وہمی طریقہ علاج ''کیّ'' تھا، اس کی تفصیل ان شاءاللہ اس باب کی تیسری حدیث میں آجائے گی، یہاں اجمالاً سمجھ لیں کہ ''کیّ'' کے معنی ہوتے ہیں کہ لوہا یا کوئی اور دھات گرم کر کے جسم پر لگایا جاتا تھا، یہ بھی ایک مخصوص علاج تھا، اس زمانے میں اس علاج کے ماہرین نہیں ہوتے تھے بس یوں ہی اناڑی قسم کے لوگ اپنے طور پر لگے رہتے تھے، اس لئے اس وقت کے حالات کے اعتبار سے یہ اسبابِ وہمیہ میں سے تھا، تو ان دو طریقۂ علاج کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''من استرقی او اکتوی فقد برئ من التوکل '' کہ جس نے دم کیا یا کروایا یا کیّ کے ذریعے سے علاج کیا وہ توکل سے بری اور خالی ہے، توکل سے خالی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ توکل کا کمال اسے حاصل نہیں رہا۔ یہی بات ایک اور حدیث سے زیادہ واضح طور پر معلوم ہو رہی ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ستر ہزار آدمی ایسے ہوں گے جو بغیر حساب وکتاب کے جنت میں داخل ہوں گے

اور یہ ستر ہزار تو وہ ہیں جو بذاتِ خود اس اعزاز کے مستحق ہوئے ہوں گے، ان کے طفیل اوران کی سفارش سے اور بھی بہت سے لوگ اس اعزاز میں داخل ہوجائیں گے اوران کی تعداد کتنی ہوگی اس پر بحث ان شاءاللہ وہاں کریں گے جہاں باب التوکل والصبر میں یہ حدیث آئے گی۔ جن ستر ہزار کو اصلاً یہ اعزاز ملے گا اوران کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''هم الذين لايكتوون ولايسترقون ولايتطيرون وعلى ربهم يتوكلون'' کہ ان کا بنیادی وصف یہ ہے کہ یہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور توکل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ 'کی' اور عملیات کے ذریعے علاج نہیں کرواتے اور بری فال نہیں لیتے — اچھی اور بری فال کا حکم اگلے باب میں آرہا ہے-اور دم اور منتر یا کیّ جیسے اسبابِ وہمیہ توکل کے منافی ہیں اور یہ بھی پتا چلا کہ ضروری توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل کا ایک خاص اور اونچا اور اعلیٰ درجہ ہے جس سے آدمی ان ستر ہزار معزز لوگوں میں داخل ہوجاتا اس کے منافی ہے؛ اس لئے ہم نے کہا کہ اسبابِ وہمیہ کا استعمال توکلِ واجب کے تو منافی نہیں ہے لیکن کمالِ توکل کے منافی ضرور ہے۔

ان امور کے کمالِ توکل کے منافی ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی انہی کاموں کا ہوکر رہ جاتا ہے، یہ بات تجربے اور مشاہدے سے بھی ثابت ہے اور حدیث میں بھی آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- جیسا کہ اگلی فصل میں آرہا ہے من تعلق شيئاوُكّل إليه کہ جو آدمی تعویذ گنڈے کے پیچھے پڑ جائے تو اس کو اسی کے سپرد کردیا جاتا ہے، مطلب یہ کہ اسی کام کا ہوکر رہ جاتا ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسبابِ قطعیہ اور اسبابِ ظنیہ کا نتیجہ تھوڑا سا واضح ہوتا ہے یا تو آدمی کو مقصد حاصل ہوجاتا ہے اور یا آدمی مایوس ہوجاتا ہے کہ اس کا نتیجہ نہیں ہے۔ لیکن اسبابِ وہمیہ کا نتیجہ کوئی واضح نہیں ہوتا اس لئے آدمی اس میں لا الی ہٰؤلاء ولا الی ہٰؤلاء کا مصداق رہتا ہے نہ تو جلدی ثمرہ مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی مایوس ہوتا ہے، اس لئے کبھی ایک جگہ سے تعویذ لینے چلا گیا اور کبھی دوسرے باباجی کے پاس چلا گیا اور کبھی تیسرے پیر صاحب کے پاس۔ یہی حال ٹوٹکوں والوں کا ہوتا ہے کہ فلاں کنویں پر ایک باباجی رہتے ہیں اور وہ صرف ایک پُڑیا دیتے ہیں اور آدمی بالکل ٹھیک ہوجاتا ہے تو ان سے پڑیا لی اور پھر دوسرے کا کسی نے پتا بتادیا اس کے ہاں چل دیئے، پھر چوتھے کا پتا چلا تو اس کے ہاں چل دیئے، جو آدمی ان چیزوں میں ایک دفعہ

لگ گیا وہ اس طرح کے نسخوں اور چٹکلوں میں ساری عمر رہتا ہے تو کمال توکل کے منافی ہونے کی ایک نحوست یہ ہوتی ہے کہ آدمی انہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

تو یہ ہے علاج معالجہ کا حکم کہ علاج معالجہ میں جو اسباب قطعیت کا درجہ رکھتے ہیں انہیں استعمال کرنا تو واجب ہے اور جب واجب ہے تو ظاہر ہے کہ توکل کے منافی نہیں اور جو ظنی درجہ رکھتے ہیں سنت طریقہ یہی ہے کہ ان اسباب کو بھی استعمال کیا جائے لیکن نظر اللہ تعالیٰ پر رکھی جائے یہ بھی توکل کے منافی نہیں اور اسباب وہمیہ اگر شرعی حدود کے اندر ہوں تو اگرچہ جائز ہیں لیکن کمالِ توکل کے منافی ضرور ہیں۔

احادیث سے ثابت دم وغیرہ کی حیثیت:

یہیں پر ایک بات اور ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ جو ہم نے کہا کہ 'کیّ' اور 'رقیہ' اسبابِ وہمیہ میں سے ہیں یہ بات علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ کسی خاص شخص کے لئے یا خاص حالات میں ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی اسبابِ ظنیہ میں سے ہو جائے، مثلاً خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیّ والے طریقۂ علاج کو استعمال فرمایا لیکن بظاہر یہ ہے کہ آپ کو کسی طرح سے ظنّ غالب ہو گیا ہو گا یا وحی کے ذریعے یقین ہو گیا ہو گا کہ کم از کم اس موقع پر فائدہ ہو گا یہاں یہ اسبابِ وہمیہ میں سے نہیں رہا بلکہ کم از کم اسبابِ ظنیہ میں سے بن گیا۔

یہی معاملہ رقی کا ہے یعنی تعویذ گنڈوں کا کہ اس میں وہ دم وغیرہ جو احادیث سے ثابت ہیں اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ اس میں داخل ہیں یا نہیں جہاں آپ نے ان ستر ہزار کے بارے میں فرمایا کہ وہ دم نہیں کرتے اور نہ ہی کرواتے ہیں تو بعض نے یہ کہا کہ اس میں ہر قسم کے دم داخل ہیں حدیث میں آئے ہوں یا لوگوں کے تجربات سے ثابت ہوں وہ کسی قسم کا دم وغیرہ کرتے ہیں نہ کرواتے ہیں۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ رُقی اور دم وغیرہ جو احادیث سے ثابت ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، اس لئے کہ جب یہ حدیث سے ثابت ہیں تو وہ اسبابِ وہمیہ میں سے نہیں رہے بلکہ کم

از کم ظنی ضرور ہیں اور قطعی کی بجائے ظنی اس لئے کہا کہ اکثر اخبار آحاد سے ثابت ہیں اور رُقی کو جو منافی توکل کہا تھا وہ اس لئے کہا گیا تھا کہ ان کی تاثیر وہمی ہے ظنی نہیں ہے جب ان کی تاثیر ظنی ہوگئی تو اب منافیٔ توکل نہیں رہے ۔ بالخصوص وہ رُقی جن کی صرف حضورِ اقدس ﷺ نے رخصت ہی نہیں دی بلکہ از خود سکھائے ہیں ان پر عمل میں تو اتباعِ سنت کا پہلو بھی ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حدیث میں ان ستر ہزار اہلِ توکل کی صفت میں چونکہ لا یکتوون اور لا یسترقون کے لفظ آئے ہیں اس لئے اس میں رقیہ اور کیّ کے ذریعے علاج کرانے کی نفی ہے، کسی کا علاج کرنے کی نہیں، مزید تفصیل ان شاءاللہ باب التوکل میں آجائے گی۔

۳۔ علاج معالجہ کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کے ارشادات وحی پر مبنی یا تجربے پر؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح کے علاج معالجے ثابت ہیں، ایک جسمانی اور دوسرے باطنی یعنی بعض رقی اور دم وغیرہ۔ دم تعویذات وغیرہ کا حکم تو آگے چل کر آئے گا البتہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری علاج کے سلسلے میں جن چیزوں کا ذکر فرمایا کہ فلاں فلاں چیز میں شفا ہے، یا فلاں فلاں بیماری کا علاج ہے تو اس کے بارے میں یہ بات جاننے کی ضرورت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات وحی پر مبنی ہیں یا تجربے پر۔ تو بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہ تجربے پر مبنی ہیں عربوں کے ہاں کوئی باقاعدہ طب تو مروّج نہیں تھی، طبیب اکادکا ہوتے تھے، زیادہ تر ان کا انحصار سیانوں کے تجربات پر ہوتا تھا، جب کوئی بیمار ہوتا تھا تو کسی ''سیانے بابے'' یا ''سیانی مائی'' کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، وہ کوئی چٹکلا بتادیتے تھے تو اس کے مطابق علاج کی کوشش کی جاتی تھی تو اس طرح کے تجربات کی بنیاد پر علاج ہوتا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا وہ درحقیقت یا تو عربوں کے تجربات پر مبنی ہے یا آپ کے اپنے ذاتی تجربات پر مبنی ہے وحی پر مبنی نہیں ہے اس لئے اس کا واقعہ کے مطابق ہونا کوئی ضروری نہیں ہے یہ ایک نقطۂ نظر ہے، معروف مؤرخ اور مفکر ابن خلدون کا نقطۂ نظر بھی یہی

ہے[1]۔ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ علی الاطلاق یہ کہنا کہ آپ نے طب کے بارے میں جو باتیں بھی فرمائی ہیں وہ ساری کی ساری تجربے پر ہی مبنی ہیں درست نہیں ہے، ان میں سے کچھ باتیں ضرور ایسی ہیں بلکہ ان میں کافی تعداد ایسی ہے جو وحی پر مبنی ہیں، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض باتیں اُس دور کے تجربات یا تصورات کے بالکل خلاف بھی ارشاد فرمائی ہیں، مثلاً الکمأۃ یعنی کھمبی کے بارے میں عربوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ زمین کی چیچک ہے اوراسے کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بالکل برعکس فرمایا کہ الكمأة من المن وماؤها شفاءٌ للعين[2]۔ کہ یہ کھمبی ''من'' میں سے ہے یعنی ''من وسلویٰ'' میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے تو بظاہر یہی ہے کہ یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی بنیاد پر فرمائی، اسی طرح اس

---

1 – چنانچہ ابنِ خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں: وللبادية من أهل العمران طبّ يَبْنُونه في غالب الأمر على تجربة قاصره على بعض الأشخاص، ويتداولونه متوارثاً عن مشايخ الحي وعجائزه، وربما يصح منه البعض، إلا أنه ليس على قانون طبيعي، ولا عن موافقة المزاج. وكان عند العرب من هذا الطب كثير، وكان فيهم أطباء معروفون: كالحارث بن كلدة وغيره. والطب المنقول في الشرعيات من هذا القبيل، وليس من الوحي في شيء وإنما هوأمر كان عادياً للعرب. ووقع في ذكر أحوال النبي صلىالله عليه وسلم من نوع ذكرأحواله التي هي عادة وجبلة، لا من جهة أن ذلك مشروع على ذلك النحو من العمل. فإنه صلى الله عليه وسلم إنما بعث ليعلّمنا الشرائع، ولم يبعث لتعريف الطب ولا غيره من العاديات. وقد وقع له في شأن تلقيح النخل ما وقع، فقال: " أنتم أعلم بأموردنياكم" . فلا ينبغي أن يحمل شيء من الذي وقع من الطب الذي وقع في الأحاديث الصحيحة المنقولة على أنه مشروع، فليس هناك ما يدل عليه ، اللهم إلا إن استعمل على جهة التبرك وصدق العقد الإيماني ، فيكون له أثر عظيم في النفع. وليس ذلك من الطب المزاجي وإنما هو من آثار الكلمة الإيمانية، كما وقع في مداواة المبطون بالعسل ونحوه. والله الهادي إلى الصواب لا رب سواه.

2۔ صحیح بخاری، کتاب الطب: باب المن شفاء للعین، نیز یہ حدیث اشرف التوضیح جلد ثالث کتاب الأطعمۃ میں بھی گذر چکی ہے۔

زمانے میں معروف یہ تھا کہ اگر کسی کو بخار ہو جائے تو اسے پانی سے بچاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں یہ فرمایا کہ بخار کا علاج پانی ہے اس باب میں بھی اس طرح کی حدیثیں آجائیں گی، آج طبّی تجربات سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے لیکن اُس وقت کم از کم یہ بات اُس دور کے تجربات کے منافی تھی اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ بیمار کو ویسے ہی پانی سے بچایا جانا چاہئے کوئی بھی بیمار ہو، اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس کو دنیا سے اس طرح بچاتے ہیں جیسا کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنے بیمار کو پانی سے بچاتا ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ اُس دور میں سمجھا یہ جاتا تھا کہ پانی بیمار کے لئے اچھا نہیں ہوتا ، لیکن حضور اقدس ﷺ نے اس کے بالکل برعکس تعلیم دی تو اس طرح کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہے بغیر چارہ کار نہیں ہے کہ یہ آپ نے وحی کی بنیاد پر فرمائی ہیں۔ اس لئے صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ طب کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ان میں سے بعض تجربات پر بھی مبنی ہو سکتی ہیں لیکن کافی ایسی بھی ہیں جو وحی پر مبنی ہیں۔ البتہ وحی پر مبنی ہونے کے باوجود یہ تبلیغِ رسالت کا باقاعدہ حصہ ہیں یا نہیں اس پر آگے شاہ ولی اللہ کے حوالے سے بات آرہی ہے۔

۴۔ طب نبوی کے بارے میں نقطۂ اعتدال:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے بارے میں کئی باتیں ارشاد فرمائیں، بہت سی چیزوں کے فوائد بیان فرمائے، کئی چیزوں کے نقصانات بیان فرمائے اس موضوع پر ہر دور میں علما اور اطبا نے کام کیا ہے، قدیم علما نے بھی اور اس دور میں بھی۔ بلکہ طبِّ نبوی ایک مستقل موضوع بن چکا ہے جس پر قدیم وجدید علما اور اطبا کی بہت سی کتابیں بھی وجود میں آچکی ہیں۔ ان میں خاص طور پر یہاں قابل ذکر ہے ابن القیمؒ کی زاد المعاد جو اگرچہ طبِّ نبوی کے موضوع پر نہیں ہے، لیکن اس میں طب نبوی پر تفصیلی کلام ضرور ہے۔ اس کتاب کے کتاب الطب میں انہوں نے باقاعدہ حروفِ تہجی کی ترتیب سے ان چیزوں کو ذکر فرمایا ہے جن کا احادیث میں ذکر آتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی کئی حضرات نے اس موضوع پر لکھا ہے۔ جو لوگ قرآن وحدیث کا سائنسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں اور اس حوالے سے

قرآن وحدیث کا اعجاز بیان کررہے ہیں ان میں کافی کام طب سے متعلق بھی ہے، اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ کئی طبّی حقائق ایسے ہیں جن تک میڈیکل سائنس کی رسائی اب کہیں جا کر ہوئی ہے جبکہ قرآن یا حدیث میں وہ حقائق چودہ صدیاں پہلے بیان کردیئے گئے تھے، ایسے بے شمار لوگوں اور اداروں میں رابطہ عالمِ اسلامی ذیلی تنظیم هيئة الإعجاز العلمي في القرآن والسنة کے کام کا حوالہ خاص طور پر دیا جاسکتا ہے۔

البتہ طبِ نبوی ﷺ کے سلسلے میں بعض اوقات کچھ افراط اور تفریط ہوجاتا ہے۔ایک تفریط تو وہ ہے جو میں نے پہلے بعض حضرات سے نقل کی کہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے متعلق جو بھی فرمایا اس کی حیثیت محض سیانوں کے تجربات کی ہے تو یہ طب نبوی کی حیثیت اپنے اصل مرتبے سے کم کرنے والی بات ہے، لیکن دوسری طرف بعض اوقات اس میں غلو اور افراط بھی ہوجاتا ہے جس چیز کا حدیث میں ذکر آگیا اب ہر جگہ اسی کو استعمال کررہے ہیں موقعہ محل دیکھے بغیر۔اس لئے یہاں چند باتیں ذہن میں رکھ لینی چاہئیں:

(۱)

پہلی بات تو یہ ہے کہ حضوراقدس ﷺ نے بعض چیزوں کو علی الاطلاق شفاقرار دیا ہے وہاں ہمیں مان لینا چاہئے کہ اس میں شفا ہے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر بیماری سے شفا اس میں ہو، کیونکہ بعض اوقات حکم اکثر اور اغلب پر لگادیا جاتا ہے، امورِ سے متعلق نصوص میں بھی لفظ عام ہونے کے باوجود کسی قرینے وغیرہ سے تخصیص اہلِ علم کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔یہاں ہم بطور مثال کے شہد کا ذکر کرسکتے ہیں۔شہد کے بارے میں قرآن مجید میں یہ آتا ہے فيه شفاء للناس[1] کہ اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے، لیکن صراحتاً یہ نہیں کہا گیا کہ ہر بیماری کے لئے

---

[1]- النحل:۶۹

شفا ہے ، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ اس میں ہر بیماری سے شفا ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک بہت بڑی شفا ہے بہت ساری بیماریوں میں شفا ہے۔ تو کئی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی لفظوں یہ فرمایا کہ اس میں شفا ہے لیکن یہ تصریح نہیں کہ ہر بیماری کا علاج اس میں ہے تو وہاں اپنی طرف سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس میں ہر بیماری کا علاج ہے، نص میں جتنی بات ہے اس کو اسی تک محدود رکھنا چاہئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک چیز کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ علاج ہے یا فلاں بیماری کا علاج ہے تو اس علاج کا پورا اثر ظاہر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو صحیح طریقے سے صحیح مقدار میں صحیح وقت میں استعمال کیا جائے، بعض اوقات طریقۂ استعمال سے تاثیر بدل جاتی ہے۔ ایک ہی چیز کے استعمال کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں ، کبھی اس کو کوٹ کر استعمال کیا جاتا ہے کبھی سالم ، کبھی پکا کر استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی پکائے بغیر ، کبھی اکیلے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی اور چیز ملا کر ، کبھی خارجی استعمال کیا جاتا ہے کبھی داخلی یعنی کبھی اس کو کھایا جاتا ہے کبھی ناک کے راستے اندر ڈالا جاتا تھا جس کو سعوط کہتے تھے، کبھی کسی چیز کو صرف سونگھا جاتا تھا، کبھی کسی چیز کو صرف جسم پر ملا جاتا تھا ، کبھی کسی چیز کی جسم پر ٹکور کی جاتی تھی۔ تو استعمال کے طریقے بیسیوں ہو سکتے ہیں ۔ حضور اقدس ﷺ نے یہ تو فرما دیا کہ فلاں چیز فلاں بیماری کا یا ہر بیماری کا علاج ہے لیکن کون سی بیماری میں طریقۂ استعمال کیا ہے اس کے متعلق بہت سی چیزوں کی تفصیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی اس کی تفصیل کو آپ ﷺ انسانی تجربے پر چھوڑ دیا۔ اب آدھی بات تو حدیث کی ہے کہ یہ چیز فلاں بیماری کا علاج ہے لیکن اس کو جس طریقے سے جس مقدار میں استعمال کیا وہ بات حدیث کی نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی اپنی ہے ۔ اب ہو سکتا ہے کہ وہ چیز اس نے استعمال کر لی لیکن طریقے اور استعمال میں غلطی کی وجہ سے فائدہ نہ ہو یا الٹا نقصان ہو جائے، تو اب غلطی حدیث کی نہیں ہو گی بلکہ غلطی اس کی اپنی ہو گی؛ اس لئے حدیث میں جس چیز کا ذکر آگیا اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کسی طبیب کے مشورے سے کرنا چاہئے اور ماہر طبیب کے مشورے سے استعمال کرنے کے بعد بھی فائدہ نہ ہوا یا الٹا نقصان ہو گیا تو اسے اس

طبیب کی رائے کی غلطی سمجھنا چاہیئے حدیث کی نہیں۔

اسی طریقے سے ایک چیز علاج ہے لیکن مزاج مزاج سے فرق پڑ جاتا ہے، ایک مزاج کے لوگوں کے لئے توہو سکتا ہے کہ وہ مفید ہو لیکن دوسرے مزاج کے لوگوں کے لئے وہ مفید نہ ہو، خود طبِّ قدیم اور طبِّ جدید کے اندر بھی اس کی بیسیوں بلکہ سینکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں کہ ایک دوائی جو مخصوص قسم کے لوگوں کے لئے تو کسی بیماری میں مفید ہے لیکن وہی دوائی دوسرے قسم کے لوگوں کو دی جائے تو نقصان ہو جاتا ہے، بعض لوگ خاص دوائیوں سے حساسیت کا شکار ہوتے ہیں ان کو اگر وہ دوائی دی جائے تو نقصان بھی ہو سکتا ہے، طبِّ جدید کے اندر جراثیم کش (antibiotics) دوائیاں بے شمار چل رہی ہیں، وہ سب کی سب اپنی اپنی جگہ انفیکشن کا علاج ہیں، لیکن ہر دوائی ہر کسی کے موافق نہیں ہوتی بلکہ کسی کے کوئی موافق ہوتی ہے کسی کے کوئی۔ انٹی الرجک دوائیاں بے شمار چل رہی ہیں، ہر ایک کے بارے میں یہ بات بذاتِ خود درست ہے کہ وہ الرجی کا علاج ہے، لیکن ہر انٹی الرجک ہر حالت میں ہر کسی کے موافق نہیں ہوتی، بلکہ کسی کے کوئی موافق ہوتی ہے کسی کے کوئی۔ تو حضور اقدس ﷺ جب یہ فرماتے ہیں کہ فلاں چیز فلاں بیماری کا علاج ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہر مزاج کے لوگوں کے لئے ہو بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ شارحینِ حدیث نے بعض مواقع پر فرمایا ہے کہ یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے مزاج کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے فرمائی ہے لہٰذا یہ بات ضروری نہیں کہ دوسرے علاقوں کے لوگوں کے لئے بھی اس بیماری میں وہ چیز مفید ہو۔ آپ ﷺ کے اس فرمانے کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اکثر مزاجوں کے لئے یہ اس بیماری میں مفید ہے لیکن استثنائی حالات بہر حال ہو سکتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو اس مفید دوائی سے حساسیت کا شکار ہوں یا کسی اور وجہ سے ان کے موافق نہ ہو۔ اس لئے بھی طبِّ نبوی میں جس چیز کا تذکرہ آگیا اس کو بھی سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیئے اس لئے کہ اس میں یہ تو ہے کہ یہ فلاں بیماری کا علاج ہے لیکن تمہارا جو مزاج ہے اس مزاج میں بھی اس کا یہی اثر ہے اس کی حدیث میں تصریح نہیں ہے اس لئے اگر نقصان اٹھاؤ گے تو تمہاری ذمہ داری ہو گی حدیث کی نہیں اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے تاثیر کا فرق پڑ جاتا ہے یہ تین چیزیں اب تک ذکر کی گئی ہیں مقدار، طریقہ استعمال اور مزاج۔

اس کے علاوہ موسم وغیرہ بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے تاثیر بدل جاتی ہے توان چیزوں کو دیکھنا سوچنا اور سمجھنا یہ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے اس میں کوتاہی کی ذمہ داری حدیث یا طب نبوی ﷺ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسی باب میں حدیثیں آرہی ہیں جن میں نبی کریم ﷺ نے حجامت (پچھنے لگانے-خاص انداز سے خون نکالنے) کو شفاقرار دیا ہے، یہ بھی آرہا ہے کہ ایک دفعہ حضور اقدس ﷺ نے زہر کی وجہ سے سر کے تالو پر پچھنے لگوائے، حدیث کے راوی معمر کہتے ہیں کہ میں نے بھی کسی اور بیماری میں تالو پر پچھنے لگوالئے، اس کا اثر یہ ہوا کہ میری یادداشت ختم ہوگئی، یہاں تک کہ سورۂ فاتحہ بھی مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہی۔ اب معمر کے اس تجربے کا یہ مطلب نہیں کہ حجامت میں شفاقرار دینے والی بات غلط ہوگئی، بلکہ یہ ان کے اپنے عمل کی غلطی ہے۔

احادیثِ طب تبلیغِ رسالت کا حصہ ہیں یا نہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طبّ کے سلسلے میں جو باتیں ارشاد فرمائیں ہیں ان کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور دوسرے متعدد علمانے ایک وضاحت یہ بھی فرمائی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طب کے سلسلے میں فرمائی ہوئی جو باتیں وحی پر مبنی ہیں ان کا صحیح ہونا ضروری ہے پھر بھی یہ باتیں تبلیغِ رسالت کی قبیل سے نہیں ہیں[1] یعنی ان باتوں میں سے نہیں ہیں جن کے پہنچانے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا لہٰذا یہ باتیں شریعت

---

[1] - چنانچہ شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغۃ المبحث السابع مبحث استنباط الشرائع من حدیث النبی ﷺ (۱۲۸/۱) میں فرماتے ہیں:
وثانيها ماليس من تبليغ الرسالة ، وفيه قوله ﷺ : ((إنما أنا بشر ، إذا أمرتكم بشيء من دينكم فخذوا به ، وإذا أمرتكم بشيء من رأيي فإنما أنا بشر)) .... ومنه الطب ، ومنه قوله ﷺ : ((عليكم بالأدهم الأقرح)) ومستنده التجربة الخ.

کا باقاعدہ حصہ نہیں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی دو طرح کی نازل ہوتی تھی ایک وحی وہ ہوتی تھی جو شریعت کا حصہ ہوتی تھی اس کو یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ یہ باتیں تبلیغِ رسالت کا حصہ ہیں جیسا کہ احکامِ شریعت وغیرہ، اور دوسری وحی ایسی ہوتی تھی جس کا پہچانا ضروری نہیں تھا اور وہ شریعت کا باقاعدہ حصہ نہیں ہوتی تھی مثلاً وحی کے ذریعے آپ کو پتہ چل گیا کہ فلاں شخص منافق ہے یا وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ فلاں کام ایسے ہوا ایسے نہیں ہوا وحی کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چل گیا کہ فلاں شخص ایسا کرے گا یا فلاں شخص نے ایسا کیا ہے یہ باتیں مبنی تو وحی پر ہیں لیکن تبلیغِ رسالت کے قبیل سے نہیں ہیں تو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ طب کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ بھی تبلیغِ رسالت کے قبیل میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ ان کاموں کی طرح ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عادت کے کئے ہیں بطور عبادت کے نہیں۔

کتاب الطب والرقی

الفصل الأول

ہر بیماری کی دوا موجود ہے

(۱) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : « مَا أَنْزَلَ اللهُ دَاءً إِلّا أَنْزَلَ لَهُ دَوَاءً » . رواه البخاري

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بیماری نہیں اتاری مگر اس کے لئے شفا ضرور اتاری ہے۔

ماانزل اللہ داءً: یہاں انزل کا لفظ استعمال فرمایا ہے، انزال کے اصل معنی تو ہوتے ہیں اتارنا، لیکن یہاں اس سے مراد غالباً پیدا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بیماری بھی پیدا فرمائی ہے اس کی شفا بھی ضرور پیدا فرمائی ہے، یہ ایسا ہے جیسا کہ قرآنِ مجید میں لوہے کے بارے میں آتا ہے **وانزلنا الحدید فیہ باس شدید** ہم نے لوہے کو اتارا، اتارنے سے مراد ہے اسے پیدا کیا اسی طرح یہاں انزل کے معنی ہیں پیدا کرنا۔

یہاں اسلوب اگرچہ بظاہر خبر کا ہے کہ ہر بیماری کی دوا اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، لیکن اصل مقصود انشاء یعنی اللہ کی پیدا کردہ دوا کو استعمال کرنے کی ترغیب دینا ہے، چنانچہ متعدد روایات میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی آتا ہے "لہذا اے اللہ کے بندو دوا استعمال کیا کرو"، حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں اس طرح کی کافی روایات جمع کر دی ہیں

، جن میں سے بعض اگلی فصل میں مشکوۃ کے اندر بھی آرہی ہیں۔

یہاں لفظ حضور ﷺ نے ''دواء'' کا استعمال نہیں فرمایا بلکہ ''شفاء'' فرمایا ہے، ویسے بعض روایتوں میں دواء کا لفظ بھی آتا ہے جیسا کہ اگلی روایت میں آرہا ہے ''لکل داء دواءٌ'' کہ ہر بیماری کے لئے دوا ہے لیکن یہاں لفظ شفا ہے، شفا کا لفظ دوا کی بنسبت عام ہے؛ اس لئے کہ دوا کا اطلاق ظاہری علاج پر ہوتا ہے اور شفا کا اطلاق ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علاج پر ہوتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ہر بیماری کو ٹھیک کرنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے کبھی بیماری ٹھیک ہوتی ہے دوا وغیرہ کے ذریعے اور کبھی بیماری ٹھیک ہوتی جھاڑ پھونک وغیرہ کے ذریعے یا غیر مرئی سبب سے۔

ہر بیماری کے لئے دوا کے مؤثر ہونے کی شرط اللہ کا حکم ہے

(۲) وعن جابر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: « لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ؛ فَإِذَا أُصِيْبَ دَوَاءٌ الدَّاءَ بَرَأَ بِإِذْنِ اللهِ ». رواه مسلم.

حضرت جابر رضي الله عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بیماری کے لئے دوا ہے لہٰذا جب کوئی دوائی کسی بیماری کو پالیتی ہے تو اللہ کے حکم سے آدمی تندرست ہو جاتا ہے۔

دوائی بیماری کو پالے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بیماری کے لئے جو دوا اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اس کے لئے وہی دوا استعمال کی جائے تو مریض صحت یاب ہو جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس بیماری کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوا تو کچھ اور پیدا کی ہوتی ہے لیکن انسان اپنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے استعمال کوئی اور دوائی کر رہا ہوتا ہے تو ایسی صورت میں صحت یاب ہونے کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ آخر میں ''باذن اللہ'' کی قید بھی لگادی کہ جس بیماری کے لئے جو دوائی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے اگر اس بیماری میں اسی دوائی کو استعمال کیا گیا تو صحت یاب ہونا یقینی تو ہے لیکن وہ صحت یابی محض اس دوائی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اصل میں اللہ کے حکم کی وجہ سے ہے، مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور وہ

دوائی محض ایک ذریعہ اور سبب ہے۔ باِذن اللہ کی قید ان صورتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بھی لگائی جہاں بیماری کی شدت کی وجہ سے صحت یابی ناممکن سی نظر آتی ہو، اس لئے کہ قرآن وسنت میں ایسی چیزوں کے لئے باذن اللہ کا لفظ بھی بولا جاتا ہے جو ظاہری اسباب کے لحاظ سے عجیب وغریب ہو۔ اس حدیث کے بارے میں کچھ بات کتاب الطب کے تمہیدی امور کے شروع میں بھی ہو چکی ہے۔

تین شفا والی چیزیں

(۳) وعن ابن عباس قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : « الشِّفَاءُ فِيْ ثَلَاثٍ : فِيْ شَرْطَةِ مِحْجَمٍ أَوْ شَرْبَةِ عَسَلٍ أَوْ كَيَّةٍ بِنَارٍ ، وَأَنَا أَنْهَى أُمَّتِيْ عَنِ الْكَيِّ » . رواه البخاري

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شفا تین چیزوں میں ہے: پچھنے لگانے والے کے سینگی لگانے میں، یا شہد پینے میں، یا آگ کے ساتھ داغ دینے میں اور میں اپنی امت کو داغ دینے سے منع کرتا ہوں۔

اس حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفا تین چیزوں میں ہے یہ مطلب نہیں کہ شفا تین چیزوں میں منحصر ہے بلکہ مطلب یہ ہے ان تین چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص شفا رکھی ہے۔

خون نکال کر علاج

پہلی چیز تو ہے ''حجامت'' حجامت کا اردو میں ترجمہ کیا جاتا ہے پچھنے لگانا۔ یہ اصل میں ایک خاص طریقۂ علاج ہوتا تھا جس میں جسم کے بعض حصوں سے بعض مخصوص طریقوں کے ساتھ خون نکالا جاتا تھا۔ عموماً دو طریقے اس کے

ہوتے تھے ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ سینگی ہوتی تھی خاص قسم کی یعنی سینگ سا ہوتا تھا جو اندر سے خالی ہوتا تھا گویا پائپ نما یا گلاس یا کپ قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی جسم کے کسی حصے پر کوئی تھوڑا ساز خم کر کے وہاں پر اس کو رکھا جاتا تھا اور دوسری طرف سے زور لگا کر سانس کھینچی جاتی تھی جس سے خاص مقدار میں جسم کا خون اس سینگی کے اندر آجاتا تھا، اسی لئے بعض روایتوں میں شرطة کی بجائے مصة کے لفظ آئے ہیں، اور دوسرا طریقہ ہوتا تھا بعض حشرات الارض کے ذریعے مثلاً جونک وغیرہ کے ذریعے خون نکالا جاتا تھا یہ جونکیں وغیرہ جسم کے بعض حصوں میں لگادی جاتی تھیں اور یہ جسم کا خون چوس لیتی تھی پھر انہیں اتار لیا جاتا تھا جو بھی طریقہ ہو اصل میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جسم کے بعض حصوں کا خون نکالا جاتا تھا، حجامت ہی سے ملتا جلتا ایک طریقہ فَصد ہے، بظاہر دونوں میں فرق یہ ہے کہ حجامت میں وہ خون نکالنا مقصود ہوتا تھا جو رگوں میں نہیں ہے اور فَصد میں رگوں کا خون نکالنا مقصود ہوتا تھا[1]۔

بعض معاصر عرب علمانے خون نکال کر علاج کی چار قسمیں بیان کی ہیں

1. الحجامۃ الرطبۃ (bloodletting)، یہ وہی سینگی لگانے کا معروف طریقہ ہے، جس میں جسم کے متعلقہ حصے پر پہلے ہلکا ساز خم کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کے اوپر خون جذب کرنے والی کوئی چیز لگائی جاتی ہے۔
2. الحجامۃ الجافۃ (cupping)، اس میں جسم کے متعلقہ حصے پر زخم وغیرہ نہیں کیا جاتا، بلکہ ویسے ہی کپ، گلاس یا سینگی وغیرہ لگا کر ہوا کھینچنے کے ذریعے اس جگہ کے خون کو حرکت دی جاتی ہے، گویا اس طریقے میں خون نکالا نہیں جاتا۔
3. جونک (العلق) وغیرہ کے ذریعے خون نکالنا یعنی زخم کئے بغیر کسی چیز سے خون چوسنا۔

[1]- ملاحظہ ہو: المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (دکتور جواد علی)، الفصل التاسع والعشرون بعد المائۃ

4. فصد، جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا۔ ان میں سے آخری دو طریقوں میں نسبتاً زیادہ خون نکلتا ہے، پہلے طریقے میں کم اور دوسرے طریقے میں بالکل نہیں، احادیث مبارکہ میں حجامۃ کا زیادہ تر اطلاق پہلے دو طریقوں خصوصاً پہلے طریقے پر کیا گیا ہے، اسی لئے حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ حجامۃ بدن کے اوپر والے حصے کا تنقیہ زیادہ کرتی ہے، جبکہ فصد گہرائی کا تنقیہ کرتی ہے[1]

حجامت کا ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ عام طور پر حجامت اس جگہ پر کی جاتی ہے جہاں خون کا بہاؤ ذرا کم یا کمزور ہوتا ہے، اس کی وجہ سے جسم کے ان حصوں کو تازہ خون نہ ملنے کی وجہ سے خون فاسد ہو جاتا ہے، جبکہ حجامت کی وجہ سے یا تو خون بہہ کر یا اس کی حرکت کی وجہ سے جسم کے ان حصوں کو تازہ خون مل جاتا ہے، عربوں کے علاوہ دیگر کئی قدیم تہذیبوں میں بھی اس طرح کے طریقہ ہائے علاج مروّج تھے، مثلاً قدیم چینی طریقہ ہائے علاج میں اس کا تذکرہ ملتا ہے اور آج کل بھی چینیوں کے ہاں اس طرح کے تجربات بکثرت ہو رہے ہیں۔ مغربی دنیا میں بھی جہاں جہاں متبادل طرقِ علاج (alternative medicine) پر کام ہو رہا ہے وہاں حجامت پر تحقیقات ہو رہی ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے حجامت کے ساتھ علاج کی بھی بڑی تاکید فرمائی ہے آگے ایک حدیث آرہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں معراج پر گیا اور فرشتوں کی ایک جماعت پر سے گذرا تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اپنی امت کو ترغیب دینا حجامت کی یعنی اس طریقۂ علاج کے اختیار کرنے کی۔

اس حدیث میں یہ فرمایا گیا کہ تین چیزوں کے اندر شفا ہے، ان تین میں سے ایک یہ بھی ہے تو پتا چلا کہ یہ بھی

---

[1] – قال الموفق البغدادي : الحجامة تنقي سطح البدن أكثر من الفصد ، والفصد لأعماق البدن (فتح الباري ، كتاب الطب : باب الحجامة من الداء).

شفا کا ایک ذریعہ ہے البتہ بعض حضرات محدثین نے یہ فرمایا ہے کہ یہ شفا ہر علاقے اور ہر مزاج کے لوگوں کے لئے نہیں ہے[1] بلکہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کے عربوں کے مزاج کے اعتبار سے فرمائی ہے ان کے لئے یہ طریقہ علاج بالکل مفید تھا لیکن ہر علاقے، ہر مزاج اور ہر عمر کے لوگوں کے لئے اس کا مفید ہونا ضروری نہیں ہے۔ بات در حقیقت وہی ہے جو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی بھی طریقۂ علاج سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت سی شرطوں کو مدّ نظر رکھنا پڑتا ہے اور وہ شرطیں ہر ہر مزاج اور ہر علاقے اور ہر زمانے کے لوگوں کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ الگ تفصیل سے بیان نہیں فرمائی بلکہ اس کو ہر دور کے اطبا پر چھوڑ دیا ہے اس لئے طبِّ نبوی سے استفادہ کرنے کے لئے اپنے دور کے ماہر اطبا سے رائے لینا بھی ضروری ہے اس لئے صحیح تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقۂ علاج عربوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس کی افادیت عام ہے البتہ اس کے فائدے کے لئے کئی اور شرطیں ہو سکتی ہیں، جو اس دور کے عربوں میں زیادہ پائی جاتی ہوں گی، مثلاً بعض اطبا نے لکھا ہے کہ یہ طریقۂ علاج جوانی میں مفید ہوتا ہے بچپن اور بڑھاپے میں مفید نہیں ہوتا، محمد بن سیرین سے بھی حافظ ابن حجر نے سندِ صحیح کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ چالیس سال کی عمر کے بعد پچھنے نہیں لگوانے چاہئیں[2]، اسی طریقے سے بعض ڈاکٹروں سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ دوسرے مریضوں کو جو خون دیا جاتا ہے یہ بھی بعض لوگوں کے لئے مفید ہوتا ہے لیکن اس کے لئے شرط ہے کہ مخصوص بلڈ پریشر مخصوص عمر ہو۔ تو یہ شرطیں اپنی جگہ ہیں ان شرطوں کے ساتھ اور ماہر طبیب کی رائے کے

---

١ – قال الحافظ في الفتح (كتاب الطب : باب الحجامة من الداء) : قال أهل المعرفة : الخطاب بذلك لأهل الحجاز ومن كان في معناهم من أهل البلاد الحارة ، لأن دماءهم رقيقة وتميل إلى ظاهر الأبدان لجذب الحرارة الخارجة لها إلى سطح البدن ، ويؤخذ من هذا أن الخطاب أيضا لغير الشيوخ لقلة الحرارة في أبدانهم . وقد أخرج الطبري بسند صحيح عن ابن سيرين قال : إذا بلغ الرجل أربعين سنة لم يحتجم.

2- البتہ یہ بات بھی عمومی معلوم ہوتی ہے کلّی نہیں، ورنہ خود حضور اقدس ﷺ کا چالیس سال کی عمر کے بعد بھی پچھنے لگوانا ثابت ہے۔

ساتھ یہ طریقۂ علاج سب کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

شہد سے علاج

دوسری چیز اس حدیث میں ذکر فرمائی شہد پینا، شہد کے اندر شفا ہونے کی خود قرآن مجید کے اندر تصریح موجود ہے فیہ شفاء للناس [النحل:٦٩] اس میں یہ تو نہیں آیا کہ ہر بیماری کے لئے شفا ہے لیکن بظاہر یہی ہے کہ شفاءٌ میں جو تنوین ہے یہ تعظیم کے لئے ہے یعنی اس میں ایک بڑی شفا ہے اور بہت ساری بیماریوں کا علاج اس کے اندر موجود ہے۔ باقی اس کے فوائد کی تفصیل طب کی کتابوں میں خصوصاً طبّ نبوی ﷺ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں دیکھی جاسکتی ہے، بعض بیماریوں میں شہد کے مفید ہونے کا تذکرہ اسی باب کی بعض حدیثوں میں آگے آرہا ہے۔

کیّۃ بنار (گرمائش کے ذریعے علاج)

تیسری چیز ہے کیّۃ بنار آگ کے ساتھ داغ دینا، بعض روایتوں میں لفظ آتا ہے 'لذعۃ بنار' آگ کے ذریعے گرمائش پہنچانا۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک مطلب تو وہی جو کیّ کے متعلق عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ لوہا وغیرہ گرم کرکے جسم کے بیمار حصوں پر لگایا جاتا تھا۔ یہ بھی علاج کا ایک طریقہ تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے مادۂ فاسدہ زائل ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے انسانوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا اور جانوروں کا بھی۔ بعضوں نے لذعۃ بنار کا معنی بیان کیا ہے تکمید جس کا اردو میں ہم ترجمہ کر سکتے ہیں ٹکور کرنا، یعنی پانی یا کوئی اور چیز گرم کرکے جسم کے کسی حصے پر لگانا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں کہ بعض حدیثوں میں کیّ کے معروف معنی یعنی داغ دینا مراد ہیں اور بعض میں تکمید یعنی ٹکور کرنا مراد ہے اور دونوں کی افادیت اپنی اپنی جگہ مسلّمہ ہے۔

کیّ کے بارے میں احادیث میں تعارض اور ان میں حل:

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیّ کے اندر یعنی داغ دینے میں شفا تو ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنی امت کو اس سے منع کرتا ہوں اور بھی کئی حدیثیں ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیّ سے منع فرمایا ہے بعض حدیثوں میں اسے توکل کے بھی خلاف قرار دیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو یہ کام کرے وہ توکل سے بری ہے۔ دوسری طرف بعض موقعوں پر خود نبی اکرم ﷺ سے اس طریقۂ علاج کو استعمال کرنا ثابت ہے مثلاً آگے آرہا ہے کہ حضرت ابی ابن کعبؓ کی اکحل رگ پر تیر لگ گیا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے داغ دیا، یہی بات حضرت سعد بن معاذؓ کے بارے میں بھی آتی ہے کہ ان کی بھی اکحل رگ میں تیر لگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے دست مبارک سے اسے داغ دیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیّ کیا بھی ہے اور اس سے منع بھی فرمایا، بظاہر دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں تو ان دونوں طرح کی حدیثوں میں محدیثن نے مختلف انداز سے تطبیق دی ہے مثلاً:

(۱) بعض حضرات نے یہ کہا کہ اصل میں کیّ کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے ایک تو ہوتا ہے حفظِ ماتقدم کے طور پر کہ بیماری ابھی آئی نہیں آنے کا ابھی خطرہ ہے اس سے پہلے ہی بچاؤ کے لئے داغ دیا جائے۔ دوسرا ہے بیماری آجانے کے بعد علاج کے طور پر داغ دینا۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منع فرمایا وہ پہلی صورت کے بارے میں ہے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دیا وہ دوسری صورت کے اندر داخل ہے لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، حاصل یہ کہ کوئی بیماری آچکی ہو اس کا علاج 'کی' میں ہو تو اسے اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن بیماری کے محض خدشے کے پیشِ نظر یہ طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ چنانچہ امام طحاوی اور ابن قتیبہ وغیرہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے، چنانچہ امام طحاویؒ نے لکھا ہے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ تھا کہ بیماری آئے بغیر ہی اس ذریعے سے علاج کیا کرتے تھے اور یہ سمجھتے کہ

اس سے قضاوقدر کے فیصلے ٹل جاتے ہیں[1]،اسی طرح ابن قتیبہ نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے خراسان میں ایک ترکی طبیب دیکھا،لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے،وہ مختلف بیماریوں کے کیّ کرنے کا دعوی کرتا تھا،اس کے علاوہ بارش اتارنے ، بادل پیدا کرنے اور ہوائیں چلانے جیسی شعبدہ بازیوں کا دعوی بھی کرتا تھا،سادہ لوح لوگ اسے مانتے تھے،لیکن ہم نے اسے آزما کر دیکھا تو اس کے دعووں کی کوئی حقیقت نہ تھی[2]۔

(۲) بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ اصل میں جو نہی ہے یہ تشریعی نہیں بلکہ ارشادی ہے،فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ اس طریقے کے اندر شفا ہے لیکن اس میں تکلیف بھی ہوتی ہے تو بغیر ضرورت کے مریض کو تکلیف میں ڈالنا اچھا نہیں ہے جہاں اور علاج ممکن ہو وہاں اور علاج کیا جائے مریض کو خوامخواہ تکلیف میں نہ ڈالا جائے،البتہ جہاں کوئی اور علاج نہ ہو وہاں ظاہر ہے یہی کرنا پڑے گا،اس صورت میں مریض کو تکلیف میں ڈالنا خود مریض کے اپنے فائدے میں ہے۔

(۳) تیسری تطبیق بعض علما نے یہ دی ہے کہ اصل میں کیّ کے اندر شفا تو ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمادیا لیکن عربوں میں اس کے ماہر بہت کم ہوتے تھے، زیادہ تر بدّو لوگ اپنے اٹکل پچو طریقے سے یہ طریقۂ علاج استعمال کرتے رہتے تھے۔ کون سی بیماری میں یہ علاج ہے اور کون سی بیماری میں نہیں ہے اور پھر کسی بیماری میں کہاں داغ دینا ہے کہاں نہیں دینا اس کا بھی انہیں پورے طور پر پتا نہیں ہوتا تھا۔ فن دان ہونے کی بجائے زیادہ تر اناڑی ہوتے تھے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمایا بلکہ اوپر ذکر کردہ ابن قتیبہؒ کے ترکی طبیب والے واقعے سے

---

١ – شرح مشكل الآثار ٣٢١/٤ كتاب الكراهة : باب الكي هل هو مكروه أم لا؟

٢ – تاويل مختلف الحديث ص: ٤٦٣ .

معلوم ہوتا ہے عجمیوں کے ہاں بھی یہ کام عموماً شعبدہ باز اور کمزور اعتقاد والے لوگوں کی سادگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے لوگ یہ کام کیا کرتے تھے۔ اور جہاں حضور اقدس ﷺ نے اس طریقے کو استعمال فرمایا ہے اس کو ظاہر ہے کہ اناڑی پن پر محمول نہیں کر سکتے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا تجربے سے ظن غالب ہو گیا تھا کہ یہاں پر یہ طریقۂ علاج مفید ثابت ہو گا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے اس بات کا یقین ہو گیا تھا اس لئے آپ نے اس کو استعمال فرمایا۔ حاصل یہ کہ جو نہی ہے وہ وہاں ہے جہاں اناڑی پن کے طور پر ایسا کیا جائے اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمایا تو وہاں فرمایا جہاں اس کی افادیت قطعی یا ظنی تھی لہٰذا دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، یہ تین تطبیقیں دی گئی ہیں۔

تینوں تطبیقیں اپنی جگہ پر درست ہیں تینوں باتوں کو ملانے سے حاصل یہ نکلتا ہے کہ جس علاج میں مریض کو تکلیف ہو رہی ہو اگر اس کا متبادل علاج موجود ہو تو اس سے بچنا اولیٰ ہے اس لئے کہ بلاوجہ مریض کو تکلیف میں ڈالنا اچھا نہیں ہے یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ آگے آرہا ہے کہ گلے کے بعض امراض میں گلے کو دبا کر علاج کیا جاتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ یہ تو کسی روایت میں نظر سے نہیں گزرا کہ آپ نے یہ فرمایا ہو کہ یہ علاج نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ اس سے بچے کو تکلیف ہوتی ہے اور اس کا متبادل علاج آپ نے تجویز فرمایا۔ اسی طرح آگے اسی باب کی حدیث نمبر ۲۶ میں آرہا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے دوائے خبیث سے منع فرمایا، دوائے خبیث کی متعدد تشریحوں میں سے ایک تشریح یہ بھی ذکر کی جائے گی کہ اس سے مراد ناگوار علاج ہے۔ تو ایک تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ جس علاج میں مریض کو تکلیف ہو وہاں اگر متبادل علاج موجود ہو تو تکلیف دہ علاج سے بچنا اولیٰ ہے خوامخواہ مریض کو تکلیف میں نہیں ڈالنا چاہئے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر ایسا علاج کروانا پڑ جائے تو کسی ماہر سے کروانا چاہئے کسی اناڑی سے پُر خطر علاج نہیں کروانا چاہئے۔ دو قسم کے علاج ہوتے ہیں ایک تو ہوتا ہے دوائی کے ذریعے علاج اور ایک ہوتا ہے جسم میں کوئی تصرف کر کے علاج۔ اناڑی سے پہلی قسم کا علاج بھی نہیں کروانا چاہئے۔ لیکن اس علاج میں خطرہ نسبتاً کم

ہوتا تھا اس لئے کہ عام لوگوں میں جو ادویہ مروج ہوتی تھیں وہ زیادہ تر غذا کے قبیل سے ہوتی تھی کہ ان کا اگر فائدہ نہ ہو تو نقصان بھی نہیں ہوتا تھا لیکن جسم میں تصرف کر کے جو علاج کیا جاتا ہے جیسا آپریشن اس میں اگر آدمی اناڑی کے ہاتھ چڑھ جائے تو زیادہ نقصان کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے اس میں خاص طور پر یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ اول تو بلا ضرورت ایسا علاج نہ کروایا جائے اور جہاں ضرورت ہو وہاں کسی ماہر سے کروایا جائے غیر ماہر سے نہ کروایا جائے۔ آج کل بواسیر اور اس قسم کی کئی بیماریوں کے لئے آپریشن کرنے والے جگہ جگہ اپنے کھوکھے کھول کر بیٹھے ہوتے ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اناڑی لوگوں سے بچنا چاہئے۔

کیّ کی جدید شکلیں:

آج کل کیّ کی جگہ پر اور کئی طریقے آ گئے ہیں، فزیو تھراپی کے بہت سے طریقوں کو کیّ میں داخل کیا جا سکتا ہے، مثلاً بعض جگہ پر جسم کو گرمائش پہنچا کر علاج کیا جاتا ہے اور بعض مواقع پر بجلی کے کرنٹ جسم میں سے گزار کر علاج کیا جاتا ہے چونکہ یہ ایک باقاعدہ فن بن چکا ہے اور اس میں خطرے کے امکانات کم ہوتے ہیں اس لئے جہاں واقعتاً ضرورت ہو اور ماہر طبیب بتائے تو اس کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

عربوں کے ہاں یہ بات مشہور تھی کہ آخر الدواء الکیّ کہ کیّ آخری علاج ہے تو ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع بھی اس اس لئے فرمایا ہو کہ اس کے بعد کوئی اور علاج کارگر نہیں ہوگا اس لئے آخری علاج تک اسی وقت پہنچنا چاہئے جب کہ باقی علاجوں سے مایوسی ہو جائے۔

آنحضرت ﷺ کا حضرت ابیؓ کو داغ دینا

(٤) وَعَنْ جَابِرٍ رضي الله عنه قَالَ : رُمِيَ أُبَيٌّ يَوْمَ الْأَحْزَابِ عَلَى أَكْحَلِهِ، فَكَوَاهُ رَسُوْلُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ . رواه مسلم .

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر حضرت ابی بن کعبؓ کی اکحل رگ میں ایک تیر لگا اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں داغ دیا۔

آنحضرت ﷺ کا حضرت سعد کو داغ دینا

(٥) وَعَنْهُ قَالَ : رُمِيَ سَعْدُ بْنُ مُعَاذٍ فِيْ أَكْحَلِهِ ، فَحَسَمَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ بِمِشْقَصٍ ، ثُمَّ وَرِمَتْ ، فَحَسَمَهُ الثَّانِيَةَ . رواه مسلم.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کی اکحل رگ میں تیر لگا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں تیر کے اگلے حصے سے اسے داغ دیا، پھر اس میں ورم آگیا تو آپ نے اسے دوبارہ داغ دیا۔

اس حدیث میں مِشْقَص کا لفظ نیا ہے۔ مشقص کہتے ہیں تیر کے اگلے حصے کو۔ تیر کے بنیادی طور پر تین اجزا ہوتے تھے، پہلا تو حصہ ہوتا تھا کہ درمیان میں ایک لمبی سی لکڑی ہوتی تھی اس کو عربی زبان میں 'قدح' کہتے ہیں، اور اس لمبی لکڑی کے آگے عام طور پر نوک دار لوہا لگا ہوتا تھا اور اپنے نشانے پر اصل میں وہی جا کر لگتا تھا، یہ جو آگے نوک دار لوہا لگا ہوتا ہے اس کو مِشْقَص یا نَصْل کہتے ہیں، اور اس کے بالکل پچھلی جانب یعنی دوسری جانب پر لگے ہوتے تھے، تاکہ تیر کو جب پھینکا جائے تو اس کا توازن برقرار رہے اور وہ زیادہ دور تک جا سکے، تیر کے پروں کو عربی میں ریش کہتے ہیں، انہیں قُذَذ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ نصل یعنی تیر کے پھالے اور تیر کے پروں کو درمیان والی لکڑی میں ٹھوکنے کے لئے بعض اوقات درمیان میں کپڑے کا ایک ٹکڑا سا لگا دیا جاتا تھا، جیسے چار پائی کے بعض اجزا ٹھونکنے کے لئے ہوتا ہے تاکہ ایک چیز دوسری میں اچھی طرح پھنس جائے۔ اس کپڑے کو 'رُصاف' کہتے ہیں۔

(٦) وَعَنْهُ قَالَ : بَعثَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِلى أُبيِّ بْنِ كَعْبٍ

طَبِيْباً فَقَطَعَ مِنْهُ عِرْقاً ثُمَّ كَوَاهُ عَلَيْه . رواه مسلم .

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ کی طرف ایک طبیب کو بھیجا، اس نے ان کی ایک رگ کاٹی اور اس پر داغ دیا۔

حدیث نمبر: ۴ میں یہ گذرا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ کو داغ خود حضور اقدس ﷺ نے دیا، لیکن یہاں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک طبیب کو یہ ذمہ داری سونپی، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاج کروایا تو ایک طبیب کے ذریعے ہی گیا تھا، لیکن چونکہ آنحضرت ﷺ کے حکم اور ارشاد سے ہوا تھا، اس لئے مجازاً آپ کی طرف نسبت کر دی گئی، اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس حدیث کے مرکزی روای اعمش ہیں۔ اعمش سے روایت کرنے کئی حضرات ہیں، ان میں ایک ابو معاویہ بھی، جو کہ باقی بعض راویوں مثلاً سفیان اور شعبہ وغیرہ کی جلالتِ شان کے مقابلے میں کم درجہ رکھتے ہیں، لیکن اعمش کی حدیثیں محفوظ کرنے میں ابو معاویہ زیادہ معروف سمجھے گئے ہیں، اور ابو معاویہ کی تقریباً تمام روایتوں میں یہی بات ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت ابیؓ بن کعبؓ کو داغ دینے کے لئے طبیب بھیجا، تقریباً یہی بات ابو معاویہ کے علاوہ بھی اعمش کے متعدد شاگرد نقل کر رہے ہیں۔ البتہ حضرت سعد بن معاذؓ کے بارے میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے داغ دیا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

کالے دانے میں ہر بیماری سے شفا ہے

(۷) وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضي الله عنه أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ :« فِيْ الْحَبَّةِ السَّوْدَاءِ شِفَاءُ مِنْ كُلِّ دَاءٍ إِلاَّ السَّام » . قال ابن شهاب : السام : الموت ، والحبة السوداء : الشونيز . متفق عليه .

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کالے
دانے میں ہر بیماری سے شفا ہے سوائے موت کے۔ ابن شہاب زہری کہتے ہیں سام کا معنی موت ہے
اور کالے دانے سے مراد شونیز ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے الحبۃ السوداء کی افادیت بیان فرمائی ہے اور افادیت یہ بیان فرمائی کہ اس میں موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہے۔ ''الحبۃ السوداء'' کا لفظی ترجمہ کالا دانا ہے اس سے مراد کیا ہے بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''کالا زیرا'' لیکن معروف معنی اس کا ہے 'کلونجی' جس کو فارسی میں شونیز کہا جاتا ہے یہ چھوٹے چھوٹے کالے دانے ہوتے ہیں جس کی آسان پہچان یہ ہے کہ اچار کے اندر بکثرت ڈالے جاتے ہیں اور آج کل کلونجی کے نام سے ہی مشہور ہیں، آپ کسی بھی دواخانہ میں جائیں اور کہیں کہ کلونجی چاہئے تو وہ آپ کو دے دے گا۔ اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہے۔ ظاہر ہے موت کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا کسی شاعر نے کہا ہے وأعیا داءُ الموت کلَّ طبیب کہ موت کی بیماری ایسی ہے جس نے ہر طبیب کو عاجز کر دیا ہے یہ ایسی بیماری ہے جو بڑے سے بڑے طبیب کے قابو میں نہیں آئی اس کے علاوہ ہر بیماری کا علاج اس کالے دانے میں موجود ہے۔ ہر بیماری سے کیا مراد ہے آیا یہ حدیث اپنے عموم پر ہے اور دنیا جہاں کی ہر ہر بیماری اس میں داخل ہے یا مخصوص قسم کی بیماریاں مراد ہیں؟ تو بعض شارحینِ حدیث نے یہ کہا ہے کہ ہر ایسی بیماری مراد ہے جو رطوبت اور بلغم کی وجہ سے پیدا ہو اس لئے کہ کلونجی کے اندر تاثیر ہے بلغم کو دور کرنے کی۔ اور یہ اپنے مزاج کے اعتبار سے گرم اور خشک ہے لہٰذا ہر بیماری جو رطوبت سے یا ٹھنڈک سے پیدا ہو گی اس کا علاج کلونجی سے کیا جا سکتا ہے، ان حضرات کے نزدیک مطلقاً ہر بیماری یہاں پر مراد نہیں ہے لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث اپنے عموم پر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنا فرمایا ہے ''الا السام'' کہہ کر سوائے موت کے، اور استثنا عام طور پر وہیں کیا جاتا ہے جہاں ماقبل کی عبارت میں عموم ہو استثنا ماقبل میں عموم پر بھی دلالت کرتا ہے جیسے ﴿ والعصر٭ ان الانسان لفی خسر٭ الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات ﴾ یہاں پر الا الذین اٰمنوا وعملو الصالحات کے استثنا سے

استدلال کیا گیا ہے اس بات پر کہ انسان سے مراد سارے انسان ہیں۔اسی طرح یہاں پر بھی الاالسام کا استثنا کیا گیا ہے اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے اس بات پر کہ پہلے جو فرمایا کہ ہر بیماری کا علاج ہے اس سے مراد مطلقاً ہر بیماری ہے مخصوص قسم کی بیماریوں کے ساتھ یہ حدیث خاص نہیں ہے۔ کلونجی کے جو فوائد اطبا نے لکھے ہیں اور آج نئے سے نئے جو فوائد دریافت ہو رہے ہیں ان کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ بات کوئی اتنی بعید بھی نہیں لگتی اس لئے کہ قدیم اطبا نے بھی اس کے بے شمار فوائد لکھے ہیں اور جدید تحقیقات سے بھی اس کے بہت سے فوائد سامنے آرہے ہیں، مثلاً یہی کہ یہ رطوبات کو ختم کرتی ہے، بلغم کا ازالہ کرتی ہے، اور یہ تنقیہ کا کام دیتی ہے یعنی جسم سے فاسد مادے کو خارج کرتی اور پیٹ کو صاف کرتی ہے، دافعِ تعفن اور جراثیم کش ہے اس لئے اس کو آنٹی بائیٹک کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے مُدرّ بول ہے یعنی پیشاب لاتی ہے۔ بہت ساری بیماریوں کا علاج یہ ہوتا ہے کہ پیشاب کثرت سے لایا جائے۔اس طرح اور بھی بے شمار فوائد اس کے اطبا نے لکھے ہیں ان کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ بات کوئی بعید بھی نہیں لگتی کہ اس حدیث کو اپنے عموم پر محمول کیا جائے۔

البتہ اس پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ بیماریاں تو متضاد ہوتی ہیں، بعض بیماریاں گرمی کی وجہ سے ہوتی ہیں، بعض سردی کی وجہ سے۔ ایک ہی چیز متضاد بیماریوں کا علاج کیسے کر سکتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ کوئی بعید بات نہیں ہے کہ حق تعالیٰ ایک ہی چیز میں متضاد چیزوں کو دور کرنے کی صلاحیت رکھ دیں۔البتہ یہ بات ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ کلونجی ہر بیماری کا علاج ہے لیکن کون سی بیماری میں اس کو کس مقدار میں استعمال کرنا ہے اور کیسے استعمال کرنا ہے اور کس مزاج کے لوگوں کو اس کو استعمال کرنا چاہئے کس کو استعمال نہیں کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ ایسے بہت سارے سوالات جن کا جواب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا بلکہ اس کا جواب خود انسانوں کے تجربات پر چھوڑ دیا گیا ہے تو ان تجربات میں کہیں غلطی لگ سکتی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بظاہر اپنی جگہ پر عام معلوم ہوتا ہے کہ ہر بیماری کا علاج اس کے اندر ہے۔

کلونجی استعمال کرنے کا ایک طریقہ:

کون سی بیماری میں کلونجی کو کیسے استعمال کرنا ہے، طبّ نبوی پر لکھی گئی کتابوں میں اس پر تفصیل سے لکھا گیا ہے وہاں دیکھا جاسکتا ہے، البتہ ایک بات حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ سابق شیخ الحدیث وناظم جامعہ دارالعلوم کراچی کی یاد آگئی، اسے عرض کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ ایک دفعہ یہاں تشریف لائے تو بڑے صحت منداور ہشاش بشاش لگ رہے تھے اس سے پہلے کافی بیمار رہ چکے تھے تو ہم نے عرض کیا کہ حضرت اس وقت تو طبیعت بہت اچھی لگ رہی ہے۔ تو فرمایا کہ میں نے کلونجی استعمال کی ہے اس کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ تو ہم نے پوچھا کہ استعمال کا طریقہ؟ فرمایا کہ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو سعودی عرب میں کسی ماہرِ امراضِ قلب نے بتایا وہ یہ کہ کچھ کلونجی لے کر اس کو کوٹ کر شہد میں ملا لیا جائے اور اس کو روزانہ تھوڑا سا استعمال کیا جائے لیکن اس کی مقدار مجھے یاد نہیں رہی کہ کتنی مقدار بتائی تھی۔ دوسرا طریقہ حضرت نے فرمایا کہ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا تھا کہ روزانہ رات کو سوتے وقت کلونجی کی ایک ذرا سی چٹکی لے کر منہ میں ڈال لیں اور اوپر سے تھوڑا سا پانی لیں۔ یہ طریقہ استعمال میں پہلے سے بھی آسان ہے اور حضرت نے فرمایا کہ اس دوسرے طریقے کے مطابق میں نے اسے استعمال کیا اور کچھ عرصہ بعد ایسے لگا جیسا کہ پیٹ کے اندر پہلے ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی اور ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر آگئی ہے۔

شہد کے ذریعے اسہال کا علاج

(٨) وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ الخُدرِيِّ رضي الله عنه قَالَ : جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ : أَخِيْ اسْتَطْلَقَ بَطَنُهُ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((اسْقِهِ عَسَلاً)) ، فَسَقَاهُ ، ثُمَّ جَاءَ فَقَالَ : سَقَيْتُهُ فَلَمْ يَزِدْهُ إِلاَّ

اسْتِطْلَاقاً ، فَقَالَ لَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. ثُمَّ جَاءَ الرَّابِعَةَ ، فَقَالَ : ((اسْقِهِ عَسَلاً)) . فَقَالَ : لَقَدْ سَقَيْتُهُ فَلَمْ يَزِدْهُ إِلاّ اسْتَطْلَاقاً ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((صَدَقَ اللهُ وَكَذَبَ بَطْنُ أَخِيْكَ)) . فَسَقَاهُ فَبَرَأَ . متفق عليه .

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ میرے بھائی کا پیٹ چل رہا ہے (یعنی اسے بکثرت دست آرہے ہیں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی کو شہد پلایا، پھر دوبارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آکر عرض کیا کہ میں نے اسے شہد پلایا ہے لیکن شہد نے اس کے پیٹ چلنے میں ہی اضافہ کیا ہے (یعنی شہد سے اور زیادہ دست آنے لگ گئے ہیں) تو تین مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہی بات فرمائی کہ اسے شہد پلاؤ، پھر وہ چوتھی مرتبہ آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ اسے شہد پلاؤ تو اس نے عرض کیا کہ میں نے اسے شہد پلایا ہے لیکن شہد نے اس کے پیٹ چلنے ہی میں اضافہ کیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بات سچی ہے اور تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، چنانچہ اس نے جاکر شہد پلایا تو وہ تن درست ہو گیا۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ ایک آدمی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ میرے بھائی کو اسہال کی تکلیف ہے تو آپ نے اس کے لئے شہد تجویز فرمایا اس نے شہد پلایا لیکن شہد پلانے سے اسہال اور بڑھ گئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کیا کہ اسے تو اور اسہال آنے لگ گئے ہیں تو آپ نے دوسری مرتبہ پھر وہی بات ارشاد فرمائی کہ شہد پلاؤ تو اس سے تعمیل حکم میں پھر جاکر شہد پلایا اور پھر آکر شکایت کی کہ افاقہ نہیں ہوا بلکہ زیادہ دست آنے لگ گئے ہیں، تیسری مرتبہ پھر ایسے ہوا، چوتھی مرتبہ میں جب آکر اس نے کہا کہ تین دفعہ میں شہد پلا چکا ہوں لیکن تینوں مرتبہ بیماری میں فرق پڑنے کی بجائے اضافہ ہو رہا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر شہد پلاؤ، اس نے کہا یا رسول اللہ شہد کیسے پلاؤں اس کو تو فائدہ نہیں ہو رہا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی بات سچی ہے اور تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔

"اللہ کی بات سچی ہے" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ شہد کے اندر شفا ہے تو وہ بات غلط نہیں ہو سکتی تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کی بات سچی ہے یعنی اللہ کے رسول کی بات سچی ہے اس لئے کہ شہد کو بطور علاج کے عام حکیم یا ڈاکٹر نے یہاں تجویز نہیں کیا بلکہ اللہ کے رسول نے تجویز کیا ہے اور اللہ کے رسول کا کہا ہوا در حقیقت اللہ کا کہا ہوا ہے اس لئے فرمایا کہ اللہ کی بات سچی ہے۔ اس مفہوم کے مطابق حدیث کے اس جملے سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور طب کے جو باتیں فرمائی ہیں وہ ساری کی ساری محض اپنے ذاتی تجربے پر مبنی نہیں تھیں بلکہ ان میں بہت ساری باتیں وحی پر بھی مبنی تھیں۔

آپ نے فرمایا کہ تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں تمہارے بھائی کو فائدہ ہو رہا ہے لیکن وہ فائدہ فوری طور پر ظاہر نہیں ہو رہا صحت مند ہونے کا عمل تو شروع ہو گیا ہے لیکن وہ نظر نہیں آرہا تمہارے بھائی کے پیٹ کی حرکت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ فائدہ نہیں ہو رہا حالانکہ حقیقت میں فائدہ ہو رہا ہے تو اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجازاً یوں تعبیر فرمایا کہ تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔

یہاں بعض لوگوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ شہد کی خاصیت تو یہ ہے کہ یہ مُسہِل ہوتا ہے یعنی اسہال لاتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اسہال کے علاج میں کیسے تجویز فرما دیا لیکن یہ اعتراض احمقانہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید اطبا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسہال اصل میں بیماری نہیں بلکہ اکثر و بیشتر حالات میں بیماری کی ایک علامت ہوتی ہے اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں کسی کو اسہال کسی وجہ سے آتے ہیں کسی کو کسی وجہ سے کو کسی وجہ سے۔ مثلاً بہت سی صورتوں میں اسہال آتے ہیں معدے میں یا انتڑیوں میں خاص قسم کے تعفن کی وجہ سے یا یوں کہئے کہ خاص قسم کے جراثیم آجانے کی وجہ سے۔ اس لئے اسہال کے علاج میں یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے کہ اس تعفن یا انفیکشن کو زائل کیا جائے یعنی ان جراثیم کو نکالا یا مارا جائے۔ اگر اسہال انفیکشن کی وجہ سے ہیں تو اسے ختم کئے بغیر اسہال

کا علاج مشکل ہے۔ اگر علاج کیا بھی اور قابض قسم کی دوائی دے دی تو وقتی طور پر تو ہو سکتا ہے کہ دست رک جائیں لیکن دیرپا علاج نہیں ہوگا، بلکہ بیماری اندر ہی رہ جائے گی۔

شہد کے اندر یہ تاثیر قدیم اطبا نے بھی لکھی ہے اور جدید تحقیقات سے بھی ثابت ہو گئی ہے کہ یہ جراثیم کش ہوتا ہے بلکہ جراثیم کش ہونے کے ساتھ ساتھ جراثیم پیدا بھی نہیں ہونے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری کھانے کی چیزیں وقت گزرنے سے خراب ہو جاتی ہیں لیکن شہد کبھی خراب نہیں ہوتا بلکہ بعض آثارِ قدیمہ سے پتا چلتا ہے کہ شہد صدیوں تک بھی محفوظ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اطبا جو معجون تیار کرتے تھے اور اسے دیر تک برقرار رکھنا ہوتا تھا وہ شہد کے اندر بناتے تھے، اس لئے کہ شہد کے اندر بنا ہوا معجون جلدی خراب نہیں ہوتا بلکہ جتنی دیر بھی پڑا رہے اس کی افادیت برقرار رہتی ہے۔ اس سے پتا چلا کہ شہد کے اندر یہ تاثیر ہے کہ یہ جراثیم کو مارتا بھی ہے اور اپنے قریب جراثیم کو نہیں آنے دیتا تو اس لئے یہ جراثیم کش صلاحیت رکھتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسہال کے اس مریض کو شہد اس لئے تجویز فرمایا کہ معدے کے اندر جو جراثیم ہیں وہ نکل جائیں یا مر جائیں، یعنی انفیکشن ختم ہو جائے۔ اس کے علاوہ قدیم اطبا کے اصول کے اعتبار سے دیکھیں تو بعض اوقات اسہال کے علاج کے لئے ضرورت ہوتی ہے پیٹ کے تنقیہ کی یعنی پیٹ کے اندر پہلے سے جو مواد موجود ہے اس کو نکالا جائے پھر علاج کیا جائے اور شہد کے اندر بھی پیٹ کو صاف کرنے کی صلاحیت مسلّمہ ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے اس کی وجہ یہی تھی اصل میں علاج کا فائدہ شروع ہو چکا تھا کہ پیٹ صاف ہونا شروع ہو چکا تھا اور جراثیم بھی ختم ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن دیکھنے میں یہ لگ رہا تھا کہ فائدہ نہیں ہو رہا لیکن جب پیٹ کی اچھے طریقے سے صفائی ہو گئی اور بیماری کا سبب زائل ہو گیا تو خود بخود پیٹ چلنا بند ہو گیا۔

اس کے علاوہ اسہال کے علاج میں ایک اور چیز بڑی اہم ہے، وہ یہ ہے کہ اسہال کی وجہ سے جسم سے پانی اور نمکیات بکثرت خارج ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ضعف شدید ہو جاتا ہے اور جان تک جانے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے آج کل پانی اور نمکیات کی کمی کے تدارک کے لئے بہت سارے مرکبات ڈاکٹروں میں مروج ہیں لیکن جو طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا یہ پانی اور نمکیات کی کمی کو دور کرنے کا ایک آسان اور قدرتی طریقہ ہے اس لئے کہ بعض اطبا نے لکھا ہے کہ یہ جو شہد تجویز کیا ہے یہ پانی میں ڈال کر تجویز کیا ہوگا اس لئے کہ اسہال یا اکثر پیٹ کی بیماریوں میں شہد پانی کے اندر ڈال کر دیا جاتا ہے خاص طور پر گرم پانی کے اندر۔ تو اس سے پانی کی کمی بھی دور ہو جاتی ہے اور نمکیات اور گلوکوز کی کمی بھی۔ اس لئے کہ شہد کے اندر نمکیات بھی ہوتے ہیں اور گلوکوز بھی۔ تو یہ علاج بھی تھا اور اسہال کی وجہ سے پیدا ہونے والی کمیوں کا تدارک بھی تھا اس لئے کچھ دیر تک اگر اسہال چلتے بھی رہے تو کسی بڑے نقصان کا خطرہ نہیں۔

یہ تو اطبا کی تحقیقات ہیں یہ نہ بھی ہوں پھر بھی یہ بات ہمارے لئے یقینی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علاج اس کے لئے تجویز فرمایا یہی اس کے لئے بہترین علاج تھا کیونکہ آپ ﷺ نے یہ بات وحی کی بنیاد پر بیان فرمائی تھی۔

یہاں پہلے تین دفعہ فائدہ نہیں ہوا اور چوتھی مرتبہ ہو گیا اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر بھی ذکر ہوئی کہ حقیقت میں پہلی خوراک ہی سے فائدہ شروع ہو گیا تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا، اس کے بعض حضرات نے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ اس نے پہلے تین مرتبہ اتنے زیادہ یقین کے ساتھ شہد نہیں دیا تھا اور چوتھی دفعہ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زور دے کر فرمایا کہ صدق اللہ وکذب بطن اخیك جس سے پتا چلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تجربے کی بنیاد پر نہیں فرما رہے بلکہ وحی کی بنیاد پر فرما رہے ہیں اس لئے اب اس نے یہ شہد پورے یقین کے ساتھ دیا۔ ایک چیز بعض اوقات بغیر یقین کے استعمال کی جائے اس کا فائدہ نہیں ہوتا اور وہی چیز پورے یقین کے ساتھ استعمال کی جائے تو اس کا فائدہ ہو جاتا ہے تو یہاں فائدے میں ہو سکتا ہے کہ اس کے یقین کا بھی دخل ہو۔

قسطِ بحری حلق سمیت کئی بیماریوں کا علاج

(۹) وَعَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : « إِنَّ أَمْثَلَ مَا تَدَاوَيْتُمْ بِهِ الْحِجَامَةُ والْقُسْطُ الْبَحْرِيُّ » متفق عليه.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بہتر چیز جس کے ذریعے تم علاج کرو پچھنے لگانا اور قسطِ بحری ہے۔

اگلی حدیث کا پہلے ترجمہ دیکھ لیں اس کے بعد پھر قسط بحری پر گفتگو کرتے ہیں۔

بچوں میں ورم حلق کا علاج

(۱۰) وَعَنْهُ رضي الله عنه قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : « لَا تُعَذِّبُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالْغَمْزِ مِنَ الْعُذْرَةِ ، عَلَيْكُمْ بِالْقُسْطِ » متفق عليه .

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے بچوں کو حلق کی بیماری کی وجہ سے گلا دبا کر تکلیف نہ پہنچاؤ اور تم قسط کو اختیار کرو۔

یہاں لفظ آیا ہے ''من العُذْرة'' عذرہ حلق کی ایک بیماری کو کہتے ہیں جس میں حلق پھول جاتا اور اس میں ورم آجاتا ہے۔ اس کی دو صورتیں زیادہ مشہور ہیں ایک تو یہ کہ حلق میں چھوٹے چھوٹے غدود ہوتے ہیں جن کو قدیم اطبا کی اصطلاح مین لوزتین کہا جاتا ہے ان پر ورم آجاتا ہے اور دوسری صورت اس کی یہ ہے کہ اگر منہ کھولیں تو درمیان میں

ایک گوشت کا ٹکڑا سا لٹکا ہوا نظر آتا ہے جسے عرف عام میں 'کوّا' کہا جاتا ہے اس پر ورم ہو جاتا ہے یا اس کے ارد گرد ورم ہو جاتا ہے۔ اس بیماری کو عرف عام میں ''کوا گرنا'' کہا جاتا ہے۔ اس کا عربوں میں ایک خاص طریقۂ علاج مروج تھا۔ ہمارے ہاں بھی دیہاتی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی تھیں ایک تو یہ کہ گلا دبا کر اس کو بعض طریقوں سے اٹھایا جاتا تھا، اس علاج کو ''کوّا اٹھانا'' کہتے تھے۔ کبھی انگلی منہ میں داخل کر کے اس کو پرانی سیانی عورتیں اٹھایا کرتی تھیں اور اس کے بعد توے کی سیاہی اس پر لگا دی جاتی تھی۔ عربوں میں بھی یہ طریقے چلتے تھے۔ اور ایک طریقہ عربوں میں یہ چلتا تھا یہاں کبھی نہیں دیکھا کہ خاص قسم کی بتی سی بنا کر اس پر ہو سکتا ہے کہ دوائی بھی لگاتے ہوں ناک کے ذریعے اندر داخل کرتے تھے ان سب طریقوں میں ہوتا یہ تھا یا ہوتا یہ ہے کہ اس جگہ پر جو پیپ وغیرہ پڑی ہوتی ہے وہ نکل جاتی ہے اور وہ جگہ صاف ہوتی ہے اس طریقہ علاج کے لئے احادیث میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً یہاں لفظ 'غمز' استعمال ہوا ہے جس کے اصل معنی گلا دبانے یا کسی بھی چیز کو دبانے کے ہیں۔ اس کو اعلاق یا علاق بھی کہتے ہیں جیسا کہ اگلی روایت میں یہ لفظ آ رہا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اعلاق لفظ ٹھیک ہے علاق ٹھیک نہیں ہے لیکن راجح یہ ہے کہ دونوں لفظ ٹھیک ہیں[1]۔ اس طرح کرنے کو عربی میں 'دغر' بھی کہہ دیتے ہیں جیسا کہ اگلی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "علام تدغرن أولادکن"۔

اس طریقۂ علاج سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے یہ تو کہیں نظر سے نہیں گذرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ یہ علاج کا طریقہ ہی نہیں ہے اور اس کا فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے منع کرنے کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ اس سے بچے کو تکلیف ہوتی۔ اس کے علاوہ بعض جدید اطباء نے یہ بھی لکھا ہے کہ دبا کر جو پیپ وغیرہ نکالی گئی ہے اس کے بارے میں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ وہ سانس وغیرہ کی نالی میں چلی جائے تو تکلیف دہ بھی ہے اور خطرہ سے بھی خالی نہیں ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متبادل علاج بتایا کہ قسط بحری کو استعمال کرو۔ تو حاصل یہ نکلا کہ

1۔ شرح النووی علی صحیح مسلم باب التداوی بالعود الہندی

جب آسان علاج موجود ہے تو اس کے ہوتے ہوئے مشکل علاج میں اور تکلیف دہ علاج میں نہیں پڑنا چاہئے۔

قسطِ بحری ایک خاص دوائی ہے، جس کی تفصیل اگلی حدیث کے ذیل میں آرہی ہے۔ بچوں میں گلے کی مذکورہ بیماری میں اس کے استعمال کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں، جن میں سے ایک طریقہ اگلی روایت میں سعوط کا بھی آرہاہے، یعنی اس کا پانی وغیرہ ناک کے راستے سے دیا جائے، واللہ أعلم بالصواب۔

عودِ ہندی: کئی بیماریوں کا علاج

(۱۱) وَعَنْ أُمِّ قَيْسٍ قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : « عَلَامَ تَدْغَرْنَ أَوْلَادَكُنَّ بِهَذَا العَلَاقِ؟ عَلَيْكُنَّ بِهَذَا الْعُوْدِ الهِنْدِيِّ ؛ فَإِنَّ فِيْهِ سَبْعَةَ أَشْفِيَةٍ ، مِنْهَا ذَاتُ الجَنْبِ ، يُسْعَطُ مِنَ الْعُذْرَةِ ، وَيُلَدُّ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ » . متفق عليه .

حضرت ام قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس علاق کے ذریعے اپنے بچوں کے گلے کو کیوں دباتی ہو، تم اس عودِ ہندی کو اختیار کرو، اس لئے کہ اس کے اندر سات بیماریوں سے شفا ہے، ان میں سے ایک بیماری ذات الجنب (یعنی نمونیا یا پسلی کا درد) ہے، ورمِ حلق میں اسے ناک کے راستے دیا جائے اور ذات الجنب میں منہ کے راستے۔

ان حدیثوں میں جس دوائی کا ذکر ہے اس کے بارے میں الفاظ مختلف آرہے ہیں بعض روایتوں میں القُسط البحری کا لفظ آرہاہے اور بعض میں صرف القُسط آرہاہے، بعض میں الکست اور بعض میں العود الہندی آرہاہے اور بعض روایتوں میں اس سے ملتے جلتے اور الفاظ ہیں اس لئے سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ دوائی کون سی ہے۔ اس کے بارے میں بعض لوگوں کو اچھا خاصا اشتباہ پیدا ہو گیا ہے۔ عود کا اطلاق بکثرت اس لکڑی پر بھی کیا جاتا ہے جس کو اردو زبان میں

'اگر' کہا جاتا ہے اور یہ لکڑی دھونی لینے کے لئے استعمال ہوتی یعنی انگیٹھی وغیرہ پر یہ لکڑی ڈال دی جاتی ہے جس سے کمرے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سارے لوگوں نے یہاں حدیث میں بھی یہی مراد لیا ہے، لیکن حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ یہاں پر یہ مراد نہیں ہے۔ اسی طریقے سے بعض حدیثوں میں ایک اور خوشبو کا ذکر آتا ہے جس کو "قُسط اَظفار" کہا جاتا ہے اور عام طور پر عورتیں حیض سے پاک ہونے کے بعد اس کی بدبو کو مکمل طور زائل کرنے کے لئے استعمال کرتی تھیں۔ اغلب یہ ہے کہ یہ بھی یہاں پر مراد نہیں ہے بلکہ یہاں پر مراد ایک خاص دوائی ہے جو ایک مخصوص پودے کی درحقیقت جڑ ہوتی ہے اور یہ پودا کشمیر اور چین وغیرہ کے علاقوں میں بکثرت پایا جاتا ہے اس کی جڑ مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال ہوتی ہے اس کو اردو میں کوٹھ یا کوٹ کہا جاتا ہے۔ گویا یہ قسط سے ملتا جلتا لفظ ہے۔ اس کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ایک تلخ ہوتی ہیں اور ایک شیریں۔ تلخ کھانے میں مفید نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات مضر ہوتی ہے البتہ بیرونی استعمال میں وہ استعمال کی جاسکتی ہے مثلاً لیپ وغیرہ کرنے کے لئے یا اس کا تیل وغیرہ نکال کر یا تیل میں ملا کر جسم میں ملنے کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے کھانے کے لئے نہیں۔ اور جو شیریں ہوتی ہے یہ کھانے کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور مختلف بیماریوں کے علاج میں اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ حدیث میں لفظ دو آرہے ہیں ایک القسط البحری اور دوسرے القسط الہندی یا العود الہندی اس کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ قسط کی یا عود کی دو قسمیں ہیں ایک عود بحری یا قسط بحری اور دوسرے قسط ہندی یا عود ہندی اور ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ عود ہندی یا قسط ہندی تو ہندوستان میں ہوتی ہے اور قسط بحری سمندر میں کہیں ہوتی ہو گی۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں یہ دو قسمیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں چونکہ یہ ہندوستان سے لائی جاتی تھی اس لئے اس کو العود الہندی یا القسط الہندی کہہ دیا جاتا تھا اور چونکہ یہ سمندری راستے سے لائی جاتی تھی اس لئے اس کو القسط البحری یا العود البحری کہہ دیا جاتا تھا اس لئے یہ دو قسمیں نہیں ہیں۔ بعض نے رنگت کے اعتبار سے مختلف اقسام کی ہیں کہ ایک سفید ہوتی ہے اور ایک کالی ہوتی ہے لیکن بعض ماہرین نے یہ کہا ہے کہ رنگت کا فرق محض علاقہ کے بدلنے سے پڑ جاتا ہے ورنہ یہ کوئی باقاعدہ اقسام نہیں ہے۔ آج کل یہ دوائی دواخانوں میں عود ہندی کے نام سے زیادہ ملتی ہے۔ سفید بھی ہوتی ہے اور کالی بھی دونوں طرح کی ہوتی ہے۔

اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایاہے کہ اس میں سات بیماریوں کا علاج ہے۔ سات شفائیں ہیں۔ ان میں سے دو کاذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحتاً فرمادیا لیکن باقی پانچ کاذکر نہیں فرمایا۔

اس حدیث کی تشریح میں دو احتمال ہیں ایک احتمال تو یہ ہے کہ سات کا عدد تحدید کے لئے ہو یعنی سات ہی بیماریاں مراد ہیں۔ ہو سکتاہے کہ اور بیماریوں میں بھی یہ مفید ہوں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ سات بیماریوں میں یہ خاص طور پر مفید ہے۔ بعض شارحین نے یہ کہا اور یہ بات بھی مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ سات کا عدد یہاں تحدید کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کے لئے ہے۔ عربی محاورے میں سات کا عدد تکثیر کے لئے بکثرت استعمال ہوتا تھا جیسا کہ اردو میں کہتے ہیں کہ میں نے بیسیوں مرتبہ کہا تو مطلب یہ ہوتاہے کہ کئی مرتبہ کہا خاص عدد مراد نہیں ہوتا اسی طرح سات کا لفظ بول کر عربی زبان میں بعض اوقات خاص عدد مراد نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہوتاہے کہ یہ کثیر تعداد میں ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ فان فیہ سبعۃ اشفیۃ کہ اس میں بہت ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ چنانچہ قدیم اور جدید اطباء نے اس دوائی کے بے شمار فوائد ذکر کئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بلغمی امراض میں مفید ہے، اسی طریقے سے یہ محلل اُورام ہے یعنی ورموں کو تحلیل کرتی ہے، کاسرِ ریاح ہے یعنی جو ریحیں جمع ہو گئیں ہوں ان کو ختم کرتی ہے، پیٹ کے کیڑے بھی مارتی اور نکالتی ہے، سانس کی نالیوں کو کھولتی ہے اور سانس کی بیشتر بیماریوں میں مفید ہے بلکہ بعض جدید تحقیقات کے مطابق دمہ میں بھی یہ مفید ہے اور دمہ کی بعض انگریزی دوائیوں کا متبادل اسے قرار دیا گیاہے۔ لیکن یہ فرق بیان کیا گیاہے کہ یہ انگریزی دوائیاں فوری اثر شروع کر دیتی ہے جبکہ اس کا اثر فوری نہیں ہوتا دیر سے شروع ہوتاہے لیکن جہاں اس کا اثر دیر سے شروع ہوتاہے تو رہتا بھی دیر تک ہے تو دمہ کے امراض میں خاص طور پر اس کو مفید پایا گیاہے۔ اسی طریقے سے ہمارے زمانے کے ایک ڈاکٹر ہیں ڈاکٹر خالد غزنوی انہوں نے طب نبوی کے موضوع پر کافی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ٹی بی کی بھی بہت ساری قسموں میں مفید ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ ٹی بی کے بہت سارے مریضوں پر ہم نے اس کو استعمال کرکے دیکھاہے اور عام طور پر عام حالات میں ٹی بی کے مریض کو صحیح ہونے کے لئے کم از کم نو مہینے درکار ہوتے ہیں بعض دفعہ اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتاہے

اور مسلسل بلاناغہ دوائی کھانا پڑتی ہے لیکن ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے بہت سارے مریضوں پر اس کا تجربہ کیا ہے وہ نسبتاً جلدی ٹھیک ہو گئے ہیں تو ٹی بی کی بھی بہت ساری اقسام میں بقول ڈاکٹر خالد غزنوی اس کو مفید بہت پایا گیا ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ پیشاب اور حیض کو بھی کھولتی ہے اس لئے پیشاب کی بندش ہو یا حیض تکلیف سے آتا ہو اس میں بھی مفید ہے۔اس کے اور بھی کئی فوائد قدیم اور جدید اطبا نے لکھے ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

قسط کا ذات الجنب یا نمونیے میں استعمال:

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بیماریوں کا صراحتاً ذکر فرمایا پہلی بیماری تو ہے ذات الجنب اس کا ترجمہ عموماً نمونیا(pneumonia) کیا جاتا ہے اور اس بیماری کی تعریف اطبا نے یہ کی ہے کہ پسلیوں کے نیچے ایک خاص قسم کی جھلی ہوتی ہے اس میں ورم آجاتا ہے یا خاص قسم کا انفیکشن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے اس کو عربی زبان میں ذات الجنب کہا جاتا ہے۔جدید طب میں نمونیا سے مراد پھیپھڑوں کا ایسا ورم لیا جاتا ہے جس کا باعث عموماً کوئی انفیکشن بنتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے العود الهندی کے بارے میں فرمایا کہ ذات الجنب میں یہ مفید ہے لیکن ذات الجنب میں کیسے استعمال کی جائے اس کے بارے میں تو اس حدیث میں صرف اتنا ہی آیا کہ منہ کے راستے سے دیا جائے یعنی یہ دوائی کھلائی جائے جبکہ دوسری بعض حدیثوں میں یہ بھی آتا ہے کہ اس کو زیتون کے تیل کے ساتھ ملا کر دیا جائے زیتون کے تیل کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ پسلی وغیرہ پر مالش کی جائے اور دوسرا یہ کہ زیتون میں ملا کر اسے کھلایا جائے تو دونوں ہی احتمال ہو سکتے ہیں اور دونوں میں فائدہ ہے۔

یہاں پر بعض حضرات نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ اطبا نے تو یہ لکھا ہے کہ قُسط چونکہ گرم ہوتی ہے اس لئے یہ ذات الجنب میں مفید نہیں ہے بلکہ بعض نے یہاں تک لکھا ہے کہ یہ مضر ہوتی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کو ذات الجنب میں مفید قرار دیا ہے تو آپ نے یہ بات کیسے فرمادی۔اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ایک جواب تو وہ ہے جو ابن القیم وغیرہ نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ ان اطبا کے تجربات ناقص ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات وحی پر مبنی ہوتی ہے اس لئے ہم ان ناقص تجربات کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کا انکار نہیں کر سکتے اور اس کو غلط قرار نہیں کہا جاسکتا ہے۔پھر اطبا نے بعض باتیں ایسی بھی لکھی ہیں جن سے بذات خود اس کے ذات الجنب میں مفید ہونے کی تائید ہوتی ہے؛ مثلاً یہ لکھا ہے کہ یہ ورموں کو تحلیل کرتی ہے اور جراثیم کو ختم کرتی ہے اور ذات الجنب کے اندر بھی ایسی دوائیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

دوسرا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ اصل میں ذات الجنب کی دو قسمیں ہیں ایک ذات الجنب حقیقی دوسرا ذات الجنب عرفی یا مجازی۔ذات الجنب حقیقی تو وہ ہے جس کو اطبا اصطلاح میں ذات الجنب کہتے ہیں یعنی پسلی کے نیچے خاص جھلی کو ورم آجاتا ہے ، لیکن عربوں کے ہاں ذات الجنب کا اس طرح کا اصطلاحی معنی مروّج نہیں تھا بلکہ عربوں کے ہاں پسلی کے نیچے ہونے والے ہر درد کو ذات الجنب کہہ دیا جاتا ہے، چاہے وہ کسی بھی وجہ سے ہو۔عموماً یہ درد نمونیہ یا ذات الجنب کی وجہ سے کم ہوتا ہے دوسرے عوارض مثلاً ریاح وغیرہ کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے اور قسط بحری کا ریاح میں مفید ہونا اور ریاح کے لئے کاسر ہونا طے شدہ امر ہے اس لئے ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ حدیث میں ذات الجنب کی یہی قسم مراد ہے یعنی ذات الجنب حقیقی مراد نہیں ہے بلکہ ذات الجنب غیر حقیقی مراد ہے۔اتنی بات ماننا ضروری ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو ذات الجنب بھی مراد لیا ہے اس کے لئے یہ قسطِ بحری بہر حال مفید ہے۔

ذات الجنب کے علاج میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا یُلدّ من ذات الجنب کہ قسط بحری بطور لدود کے لی جائے۔لدود عربوں کے ہاں دوائی استعمال کرنے مختلف طریقوں میں سے ایک تھا۔اس کے اصل معنی ہوتے ہیں منہ کے راستے دوائی لینا لیکن اس کے ساتھ اس کے معنی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ منہ کی ایک جانب سے دوائی لی جائے۔منہ کے درمیان میں نہ ڈالی جائے ، بلکہ دائیں طرف کر کے ڈالی جائے یا بائیں طرف کر کے ڈالی جائے۔اب خاص جہت سے دوائی لینے کی کیا حکمت ہے تو ہو سکتا ہے کہ عربوں نے اپنے تجربات سے اس میں افادیت

محسوس کی ہو کہ فلاں بیماری میں دائیں جانب سے دوائی دی جائے تو فائدہ ہوتا ہے فلاں بیماری میں بائیں جانب سے دوائی دی جائے تو فائدہ ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے اس کی اور وجہ لکھی ہے وہ یہ کہ اصل مقصود تو منہ کے راستے دوائی دینا ہے دائیں طرف سے لینے یا بائیں طرف سے دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ جو خود بھی دوائی نہیں پی سکتے اور کوئی دوسرا ان کو پلائے لیکن پینے کے لئے اٹھ کر بیٹھ جائے یہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ لیٹے لیٹے ان کو دوائی پلانی پڑتی ہے۔ اس صورت میں دوائی یک لخت منہ کے درمیان میں ڈال دی جائے تو اس کے حلق میں پھنسنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے تھوڑی تھوڑی کر کے منہ کی ایک جانب سے ڈالی جاتی ہے تاکہ آہستہ آہستہ ڈالی جائے اور کسی قسم کے نقصان کا خطرہ نہ رہے تو یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

قُسط کا استعمال ورم حلق میں:

دوسری بیماری جس کے لئے عود ہندی یا قسط ہندی کو حضور اقدس ﷺ نے یہاں مفید قرار دیا ہے وہ ہے 'العذرة' جس کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں یعنی حلق کی بیماری اور حلق کا ورم۔ اس کے لئے عربوں میں علاج کا طریقہ مروج تھا یعنی انگلی کے ذریعے دبا کر یا ناک کے ذریعے ڈال کر علاج کیا جاتا تھا اس سے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا ایک تو تکلیف دہ علاج ہے دوسرا اس میں نقصان کا بھی خطرہ ہے۔ اس کے متبادل کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطِ بحری کو تجویز فرمایا۔ اس مرض میں قسط کیسے دی جائے منہ کے راستے سے دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ تجویز فرمایا وہ یہ کہ ناک کے راستے دی جائے اب ناک کے راستے دینے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ نسوار کے طور پر دی جائے اس کے علاوہ بھی کئی طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس کو پیس کر باریک کر کے پانی وغیرہ میں ڈال کر ناک میں ڈالی جائے یا زیتون کے تیل میں ڈال کر ناک میں ڈال دیا جائے۔ لیکن بعض روایتوں میں جو طریقہ صراحتاً آتا ہے وہ یہ ہے کہ پانی وغیرہ میں اس کو رگڑ کر ناک میں ڈال دیا جائے اور اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ اگر اس کو کوٹ کر ڈالیں گے تو کتنا بھی کوٹ لے پورے طور پر باریک نہیں ہو گی کچھ موٹی ہو گی اور موٹی دوائی کا ناک میں ڈالنا اچھا نہیں ہے اور جب رگڑیں گے تو اس کے جو اجزا پانی وغیرہ میں

آئیں گے وہ بہت لطیف اور باریک ہوں گے ان سے کسی نقصان کا خطرہ نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں قسط کے ساتھ 'ورس' کا بھی ذکر آتا ہے کہ ورس اور زیتون ملا کر دیا جائے تو دونوں علاج ہی مفید ہو سکتے ہیں اور دونوں علاجوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے کہ قسط بھی دے دی جائے اور ورس اور زیتون بھی دے دیا جائے۔ گویا تینوں چیزوں کو ملا کر دے دیا جائے۔

ڈاکٹر خالد غزنوی نے یہاں پر بھی اپنا یہ تجربہ لکھا ہے کہ میں نے ہزاروں مریضوں پر خاص طور پر بچوں پر اس کو آزمایا ہے اور مفید پایا ہے۔ البتہ یہ ہے کہ بیماری ٹھیک ہونے میں ذرا وقت لگتا ہے اور کم از کم دو ہفتوں میں فایدہ شروع ہوتا ہے اور پورا علاج ہونے میں پانچ چھ ہفتے لگ جاتے ہیں لیکن ان کے بقول فائدہ ہوتا ضرور ہے البتہ کچھ بچوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان میں تندرستی تو شروع ہو گئی لیکن ٹھیک ہونے کا سلسلہ ایک خاص جگہ پر جا کر رک گیا تو ایسے بچوں کیلئے قسط کے ساتھ ورس کو بھی استعمال کیا گیا تو اس سے مکمل فائدہ ہو گیا۔

بخار کا علاج پانی سے

(۱۲) وَعَنْ عَائِشَةَ وَرَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : « الْحُمَّى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ ؛ فَأَبْرِدُوْهَا بِالْمَاءِ » . متفق عليه .

حضرت عائشہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخار جہنم کی گرمی سے ہے لہٰذا تم اس کو پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔

اس حدیث میں پہلی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی کہ بخار جہنم کی گرمی سے ہے بعض

حضرات نے یہ کہا کہ ہو سکتا ہے کہ واقعتاً بخار کی گرمی کا جہنم کے ساتھ کوئی تعلق ہو اور واقعتاً جہنم کے کچھ اجزا غیر مرئی اور غیر محسوس طریقے پر انسان کے جسم پر اثر انداز ہوتے ہوں اس لئے یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے۔

بعض حضرات نے یہ کہا کہ یہ حدیث تشبیہ پر مبنی ہے "من فیح جہنم" کے معنی یہ نہیں کہ جہنم کی گرمی کا ایک حصہ اور اس کا ایک جزء ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ جہنم کی طرح گرم ہے یعنی جس طرح جہنم گرم ہے اسی طرح بخار بھی گرمی کا نتیجہ ہے۔ چونکہ یہ گرمی کا نتیجہ ہے اگرچہ جہنم کی گرمی نہیں دنیاوی گرمی ہے اور دنیاوی گرمی کا علاج پانی کے ساتھ کیا جاتا ہے اس لئے بخار کو بھی پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔

بعض حضرات نے اس جملے کا ایک اور مطلب بھی بیان کیا ہے وہ یہ کہ بخار جہنم کی گرمی میں سے ہے، مطلب یہ کہ یہ گناہوں کا نتیجہ ہے۔ کبھی تو گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ آخرت میں دیتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کے گناہ معاف کرنے کے لئے اس کے گناہ جھاڑنے کے لئے دنیا میں اسے کسی تکلیف یا بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں، ان بیماریوں سے ایک بیماری بخار بھی ہے تو بخار جہنم کا گویا ایک دنیاوی متبادل ہے کہ جو جہنم آخرت میں بھگتنی ہے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ تم دنیا کے اندر ہی گرمی بھگت لو۔ اس بات کی تائید اُن حدیثوں سے ہوتی ہے جن میں یہ آتا ہے کہ "الحمّی حظ کل المؤمن من النار"[1] کہ بخار دوزخ میں سے ہر مؤمن کا ایک حصہ ہے یعنی ہر مؤمن سے کچھ نہ کچھ تو گناہ ہو ہی جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ دوزخ کی سزا کا مستحق بن جاتا ہے، لیکن دوزخ کا وہ حصہ اسے دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے تاکہ آخرت میں نہ بھگتنا پڑے، تو ان لفظوں سے اس تشریح کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگلے جملے میں یوں کہنا چاہئے تھا "فاستغفروا من الذنوب" کہ چونکہ یہ بخار گناہوں کی وجہ سے ہے لہٰذا ایسے گناہوں سے استغفار کرو، جب استغفار سے گناہ دُھل جائیں گے تو بخار کے

---

١ – رواه البزار ، وإسناده حسن (مجمع الزوائد ٣٠٦/٢) .

ذریعے انہیں صاف کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی، لیکن آنحضرت ﷺ نے یہ نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا فأبردوها بالماء یعنی اسے پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔

اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں اور دونوں باتیں اپنی جگہ پر درست ہیں، بعض حدیثوں میں پہلی بات بتانا مقصود ہے اور بعض میں دوسری۔ بعض میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بخار گرمی کا نتیجہ ہوتا ہے اور گرمی دور کرنے کے لئے پانی استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا یہاں پر بھی پانی استعمال کروایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فابردوہا بالمآء بھی ساتھ فرمادیا اور بعض حدیثوں میں دوسرا معنی بتانا مقصود ہے کہ یہ جہنم کا ایک حصہ ہے یعنی انسان کے گناہوں کا نتیجہ ہے لہٰذا دوسری بات کی وجہ سے پہلی بات کی نفی نہیں ہوسکتی دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ زیرِ بحث حدیث میں یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ بخار گناہوں کا نتیجہ ہے، بلکہ اس میں اصل مقصود بخار کا ظاہری علاج بتانا ہے۔

دوسری بات اس حدیث میں بخار کے علاج سے متعلق ہے وہ یہ کہ بخار کو پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو۔ یہ بات بکثرت حدیثوں میں ہے کہ بخار کو پانی کے ساتھ ٹھنڈا کرو لیکن پانی کے ساتھ ٹھنڈا کیسے کرنا ہے اس کا طریقہ عام روایات میں نہیں آتا۔ طریقے مختلف ہوسکتے ہیں پینا بھی ایک طریقہ ہوسکتا ہے، جسم کے بعض حصوں پر پانی چھڑکنا بھی ایک طریقہ ہوسکتا ہے اور غسل کرنا بھی ایک طریقہ ہوسکتا ہے، تو استعمال کے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں عام احادیث میں کسی طریقہ کی تعیین نہیں کی گئی۔ البتہ دو روایتیں اس سلسلہ میں آتی ہیں ایک مرفوع حدیث ہے اور ایک موقوف اثر ہے۔ ترمذی میں ایک مرفوع حدیث آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو بخار ہوتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ صبح کے وقت کسی نہر وغیرہ کے کنارے پر جائے اور جس طرف سے پانی آرہا ہے اس طرف کو رخ کرکے پانی میں غوطہ لگائے اور ساتھ دعا بھی کرے کہ اے اللہ میری اس بیماری کو دور کردیجئے اور اپنے نبی کی بات

کو سچا کر دیجئے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن سے فائدہ نہ ہو دوسرے دن کریں، دوسرے دن سے فائدہ نہ ہو تیسرے دن کریں، لیکن نو دن سے زیادہ ایسا نہیں کرنا پڑے گا اور ان شاءاللہ ٹھیک ہو جائے گا[1]۔

جدھر سے پانی آرہا ہے ادھر رخ کر کے غوطہ لگانے میں شاید حکمت یہ ہو کہ سر پر پانی اچھے طریقے سے پڑے کیونکہ اس صورت میں سر پر پانی پورے دباؤ اور زور کے ساتھ لگے گا۔البتہ بعض شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ یہ طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے لئے بیان نہیں فرمایا، اہلِ حجاز میں جو بخار کثرت سے ہوتا تھا اور ان کے ہاں بخار زیادہ تر گرمی کی وجہ سے ہوتا تھا اس کے علاج کے طور پر یہ بات فرمائی ہے۔اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ علاج نہیں ہے بلکہ بطور خرق عادت اور معجزے کے علاج ہے۔

دوسرا طریقہ حضرت اسماء بنت ابی ابکر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب کسی کو بخار ہوتا تھا تو حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اس کے گریبان والے حصے پر یعنی سینے کے اوپر والے حصے اور گردن پر پانی چھڑکا کرتی تھیں[2]، ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ طریقہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحتاً نقل نہیں کیا۔ حدیث میں جو مجموعی بات آئی ہے وہ یہ ہے کہ پانی بخار کے علاج میں مفید ہے لیکن اس کے طریقۂ استعمال کو ہر زمانے اور ہر شخص کے حالات پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ کوئی ماہر طبیب دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون سا طریقہ اختیار کرنا ہے۔

1۔ جامع الترمذی، کتاب الطب حدیث نمبر: ۲۹۸۴

2۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۷۲۴ کتاب الطب: باب الحمی من فیح جہنم، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۲۱۱ باب لکل داء دواء۔

یہ حدیث اعجاز نبوی پر مشتمل ہے:

کسی زمانہ میں بعض لوگوں نے نعوذ باللہ ان حدیثوں کا مذاق بھی اڑایا اور یہ کہا کہ بخار میں تو پانی نقصان دہ ہوتا ہے۔ چنانچہ عربوں کے ہاں یہی تصور پایا جاتا تھا کہ مریض کو پانی کے قریب بھی نہ جانے دو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمارہے ہیں کہ پانی بخار میں مفید ہے۔ لیکن بعد کے طبّی تجربات اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ واقعتاً پانی بخار کا علاج ہے اور خاص طور پر جدید طب میں تو یہ طریقہ انتہائی مسلمہ ہے اور ڈاکٹر اکثر و بیشتر بخار جب زیادہ ہو جائے تو پانی ہی سے علاج تجویز کرتے ہیں۔ کئی طریقے تجویز کرتے ہیں ایک تو یہ کہ گلے، پیشانی اور سر پر پانی کی پٹیاں رکھی جائیں اور جب یہ پٹیاں ایک مرتبہ گرم ہو جائیں تو دوبارہ انہیں دوبارہ پانی میں بھگو کر رکھا جائے۔ جسم کے دوسرے اجزا پر بھی بعض اوقات پانی لگانے کا کہا جاتا ہے، ہاتھ اور پاؤں پر بھی پانی لگانے کا کہا جاتا ہے اور تجربہ گواہ ہے کہ بخار اس سے بہت جلدی نیچے آجاتا ہے بلکہ بعض ڈاکٹروں کا تو یہ بھی کہنا ہے کہ بخار اتارنے والی بعض ادویہ ایسی ہیں جو شدید بخار کی حالت میں دینی بھی نہیں چاہئیں بلکہ پہلے پانی وغیرہ کے ذریعے اس کی شدت کو کم کرنا چاہئے اس کے بعد دوائی دینی چاہئے۔ بخار کی اکثر و بیشتر اقسام میں خاص طور پر اگر سردی کا موسم نہ ہو تو غسل کرنا بھی مفید ہوتا ہے۔ بلکہ بعض بچوں کے بارے میں ڈاکٹروں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ آپ پیراسٹامول وغیرہ دے دیں یا بچے کو نہلا دیں دونوں برابر ہیں اگر دوائی دیں گے تو بچے کے معدے پر بھی خواہ مخواہ کا بوجھ اور دباؤ پڑے گا۔ سردیوں میں تو نہلانے سے دوسرے عوارض کی وجہ سے نقصان ہو سکتا ہے لیکن گرمیوں میں عموماً اس طرح کے نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تو بچے کو پکڑ کر نہلا دو۔ بڑے آدمی کے لئے بھی یہی مسئلہ ہے، بعض کو تو ڈاکٹر یہ بتلاتے ہیں کہ بخار زیادہ ہو جائے تو پانی کی ٹونٹی کے نیچے بیٹھ جاؤ، گویا اس سے ملتی جلتی بات ہوگئی جو غوطے لگانے والی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ غوطہ لگانے والی جو بات ہے اس کو بھی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ بھی عام علاج ہے، ہاں البتہ مزاج کے بدلنے سے، عمر کے بدلنے سے یا بخار کی نوعیت کے بدلنے سے تھوڑا بہت فرق پڑ سکتا ہے اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس طرح کا کوئی کام طبیب کے

مشورہ سے ہی کیا جائے۔ لیکن اتنی بات اب حتمی ہو چکی ہے کہ بخار اتارنے میں پانی سب سے مفید ہے اور خاص طور پر نہانا انتہائی مفید ہے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہاں دو چیزیں ہیں ایک ہے بخار اور دوسرا ہے بخار کا سبب بننے والی اصل بیماری، مثلاً گلے کی تکلیف کی وجہ سے کبھی بخار ہو جاتا ہے یا پیٹ میں کسی سوزش وغیرہ کی وجہ سے بخار ہوتا ہے یا اور بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں، تو ایسی صورت میں دو قسم کے علاج کی ضرورت ہوتی ہے ایک تو یہ کہ وقتی طور پر بخار کو قابو میں رکھا جائے، اور دوسرا یہ کہ اصل بیماری کا ازالہ کیا جائے تو پانی پہلے مقصد کے لئے مفید ہے دوسرے مقصد کے لئے مفید ہونا کسی حدیث میں نہیں آتا کہ کسی اور بیماری کی وجہ سے اگر بخار ہو رہا ہے تو نہانے سے وہ بیماری بھی چلی جائے گی، بلکہ اس کے لئے الگ سے علاج کرنا پڑے گا، مستقل فائدہ پھر ہی ہوگا البتہ صرف بخار کی حد تک پانی کا استعمال مفید ہے۔

بعض بیماریوں میں دَم وغیرہ کی اجازت

(١٣) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ : رَخَّصَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الرُّقْيَةِ مِنَ الْعَيْنِ وَالحُمَةِ وَالنَّمْلَةِ . رواه مسلم

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی اجازت دی ہے نظرِ بد، زہریلی چیز کے ڈس لینے اور نملہ کی وجہ سے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی اجازت دی نظرِ بد اور زہریلی چیز کے ڈس لینے اور نملہ کی وجہ سے، یعنی تین چیزوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کی خاص طور پر اجازت دی، اگرچہ یہ اجازت ان تین چیزوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ اور بیماریوں میں بھی اجازت ہے۔

پہلی چیز نظر بد ہے (نظر بد کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آجائے گی)

دوسری چیز ہے 'الحُمَة' (حا کے پیش کے ساتھ) یعنی کسی زہریلے جانور کا کاٹ لینا مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کا ڈس لینا۔

اور تیسری چیز 'نَمْلہ' ہے۔ نملہ کا معنی بیان کیا گیا ہے کہ جسم پر خاص قسم کے سرخ دانے یا آبلے سے نکل آتے ہیں، نملہ اصل میں چیونٹی کو کہتے ہیں اس بیماری کو نملہ کہنے کی وجہ ایک تو یہ بیان کی گئی ہے کہ جس طرح چیونٹیاں پھیل جاتی ہیں اسی طرح یہ بیماری بھی پورے جسم پر پھیل جاتی اور بعض نے یہ وجہ بیان کی کہ جسم پر خارش اور جلن ہوتی ہے اور ایسے لگتا ہے کہ جیسا کہ جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں اس لئے اس بیماری کو نملہ کہہ دیا جاتا ہے۔ بہر حال جو بھی وجہ ہو یہ جسم پر خارش کے دانے اور آبلے وغیرہ نکلنے کی ایک خاص بیماری ہے بعض نے اس ترجمہ کا کڑا لاکڑا بھی کیا ہے یعنی چکن پاکس یہ بیماری بڑوں میں بھی ہو جاتی ہے لیکن بچوں میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔

جھاڑ پھونک کا حکم تو آگے دو تین حدیثوں کے بعد بیان کریں گے۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ جب جھاڑ پھونک کی بعض شرطوں کے ساتھ دیگر بیماریوں میں بھی اجازت ہے تو ان بیماریوں کا خاص طور پر کیوں ذکر کیا گیا ہے تو اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ ان کا کوئی طبّی اور طبعی علاج نہیں تھا، نظر بد کا تو ظاہر ہے کہ طبّی علاج ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ طبّی بیماری ہی نہیں ہے، اسی طرح سانپ اور بچھو وغیرہ کے ڈسنے کا بھی کوئی لگا بندھا علاج عربوں میں نہیں پایا جاتا تھا، اور یہی معاملہ نملہ کا ہے، بلکہ آج کل بھی اس طرح کی اکثر بیماریاں چونکہ وائرس کی وجہ سے ہوتی ہیں اس لئے عموماً ان کا باقاعدہ علاج نہیں ہوتا، چنانچہ لاکڑا کاکڑا میں بھی یہی ہوتا ہے اس کا باقاعدہ علاج نہیں، بلکہ اپنی میعاد پوری کر کے ختم ہوتا ہے جو دوائی دی جاتی ہے وہ یا انٹی الرجک ہوتی ہے خارش وغیرہ روکنے کے لئے یا بخار اتارنے اور درد روکنے کی ہوتی ہے، یا مزید انفیکشن وغیرہ سے بچنے کے لئے انٹی بائیوٹک دی جاتی ہے۔

نظرِ بد کی وجہ سے دم کرانا

(١٤) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ : أَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ أَنْ نَسْتَرْقِيَ مِنَ الْعَيْنِ . متفق عليه.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا (یعنی اجازت دی) کہ ہم نظرِ بد کی وجہ سے دم (یا عملیات) کروائیں۔

(١٥) وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى فِيْ بَيْتِهَا جَارِيَةً فِيْ وَجْهِهَا سَفْعَةٌ [١]ـ يَعْنِيْ صُفْرَةً ـ فَقَالَ : « اسْتَرْقُوْا لهَا فَإِنَّ بِهَا النَّظْرَةَ » . متفق عليه .

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان (ام سلمہؓ) کے گھر میں ایک باندی کو دیکھا جس کے چہرے کی رنگت کالی پیلی ہو رہی تھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے دم کراؤ، اس لئے کہ اسے نظرِ بد لگی ہوئی ہے۔

"في وجهها سفعة" سفعہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، بعض نے کہا اس سے مراد جلد خصوصا

---

١ – قال الحافظ في الفتح : بفتح المهملة ويجور ضمها وسكون الفاء بعدها عين مهملة وحكى عياض ضم أوله (كتاب الطب : باب رقية العين) .

چہرے کی رنگت کا زرد پڑ جانا، جیسا کہ زیرِ بحث روایت میں سفعہ کی تفسیر ''صفرة'' سے کی گئی ہے، غالباً یہ تفسیر حدیث کے راوی زہری نے کی ہے، بعض نے اس کے معنی کئے ہیں چہرے کی رنگت کا کالا پڑ جانا، بعض نے اس سے مراد رنگت کی سرخی لی ہے، ابن قتیبہ کہتے ہیں سفعہ کے معنی ہیں کہ چہرے کا رنگ اصلی اور قدرتی رنگ سے (کسی بیماری کی وجہ سے) بدل جائے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ان تفسیروں میں کوئی اختلاف اور تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ اصل معنی تو یہی ہیں کہ بیماری کی وجہ سے چہرے کی رنگت بدل جائے، لیکن اس تبدیلی کے نظر آنے والے آثار اصل رنگ کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں، مثلا چہرے کا اصلی رنگ سفید ہے تو بیماری کی وجہ سے تبدیلی اور طرح کی ہوگی، اصلی رنگ سیاہ ہے تو بیماری کی وجہ سے تبدیلی اس سے مختلف رنگت کی نظر آئے گی، وغیرہ وغیرہ۔

چہرے کے رنگت کی تبدیلی مثلا اس کا کالا یا پیلا پڑ جانے کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، مثلا یرقان یا جگر کی بعض بیماریوں کی وجہ سے بھی ایسا ہو جاتا ہے، یہاں حضور اقدس ﷺ نے محسوس فرمایا کہ اسے جو بھی بیماری ہے اس کی اصل وجہ نظرِ بد ہے، اس لئے آپ نے انہیں نظرِ بد کا علاج کرانے کا کہا۔

(۱۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ : نَهَى رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الرُّقَى ، فَجَاءَ آلُ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ ، فَقَالُوْا : يَا رَسُوْلَ اللهِ إِنَّهُ كَانَتْ عِنْدَنَا رُقْيَةٌ نَرْقِي بِهَا مِنَ الْعَقْرَبِ وَأَنْتَ نَهَيْتَ عَنِ الرُّقَى، فَعَرَضُوْهَا عَلَيْهِ ، فَقَالَ : « مَا أَرَى بِهَا بَأْساً ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَنْفَعَ أَخَاهُ فَلْيَنْفَعْهُ » . رواه مسلم

حضرت جابر رضي الله عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جھاڑ پھونک (دم وغیرہ) سے منع فرمادیا تو عمرو بن حزم کے خاندان کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے پاس ایک منتر تھا جس کے ذریعے ہم بچھو (کے ڈسے ہوئے) کا دم کرتے تھے، اور آپ نے دم سے منع فرمادیا ہے (اب ہم بچھو کے اس عمل کے بارے میں کیا کریں؟) پھر انہوں نے وہ دم

آں حضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا، تم میں جو شخص اپنے بھائی کو (اس طرح کے دم کے ذریعے) نفع پہنچا سکے تو اسے نفع پہنچانا چاہیے

عملیات کے احکام

عملیات جیسے تعویذ گنڈے اور دم وغیرہ کے بارے میں بظاہر مختلف احادیث نظر آرہی ہیں، صرف مشکاۃ کے زیر بحث باب کی احادیث ہی کو اگر دیکھا جائے تو تین طرح کی حدیثیں ہمارے سامنے آتی ہیں، پہلی قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں عملیات سے منع کیا گیا ہے، مثلاً آگے نمبر ۳۹ پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضي اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے جس میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا " إن الرقى والتمائم والتولة شرك " یعنی دم، لٹکانے والے تعویذ اور محبت کے عملیات سب شرک ہیں۔ اسی طرح نمبر ۴۱ پر حضرت عبداللہ بن عمرو رضي اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے کہ تریاق، شعر کہنا اور تعویذ لٹکانا ایسے برے کام ہیں کہ اگر میں یہ کام کروں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں میں اور کیا کام کرتا ہوں، یعنی میرے برا ہونے کے لئے یہی کام کافی ہیں۔ اسی سے اگلی حدیث حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضي اللہ عنہ کی آرہی ہے کہ جو شخص کیّ کے ذریعے علاج کرواتا یا دم وغیرہ کرواتا ہے وہ توکل سے بری ہے۔ اس سے اگلی حدیث حضرت عبداللہ بن عکیم رضي اللہ عنہ کی ہے کہ انہیں ایک دفعہ حمرۃ کی بیماری تھی تو ان سے عرض کیا گیا کہ آپ تعویذ وغیرہ کیوں نہیں گلے میں ڈال لیتے تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں، اس لئے کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کوئی چیز لٹکائے گا اسے اس کے سپرد کر دیا جائے گا۔

دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن سے عملیات کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس طرح کی احادیث بھی کافی تعداد میں ہے، صرف مشکوۃ کے اس باب کی حدیثوں کو دیکھیں تو وہ بھی کافی بن جاتی ہیں، مثلاً ابھی حدیث نمبر ۱۳ سے حدیث نمبر ۱۶ تک حضرت انس، عائشہ، ام سلمہ اور جابر رضی اللہ عنہم کی حدیثوں میں متعدد بیماریوں یا عوارض میں آں حضرت ﷺ رقیہ کی اجازت دے رہے ہیں۔ اسی طرح کی حدیثیں اگلی فصل میں حضرت عمران بن حصین، اَنس،

اُسماءبنت عمیس، شفابنت عبداللہ رضی اللہ عنہم سے آرہی ہیں۔اگر مشکوۃ کے علاوہ پورے ذخیرۂ حدیث سے اس طرح کی احادیث کو جمع کیا جائے تو خاصی بڑی تعداد ہو سکتی ہے۔بہر حال دوسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن میں عملیات (رُقی)کا جواز بیان کیا گیا ہے، جبکہ پہلی قسم کی احادیث میں ان سے ممانعت تھی۔

تیسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن کے ذریعے پہلی دو قسم کے احادیث میں آسانی کے ساتھ تطبیق ہو جاتی ہے ۔مثلاً آگے حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت آرہی ہے کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، ہم نے اس کے بارے میں حضور اقدس ﷺ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا ''جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ اس میں شرک نہ ہو''،اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جھاڑ پھونک وغیرہ سے منع کیا گیا ہے وہ خاص علّت کی وجہ سے ہے،اور وہ علّت شرک ہے،اور قاعدہ ہے کہ جو حکم معلول بالعلہ ہو اس کا دارو مدار علت پر ہوتا ہے،اگر وہ علت پائی جائے تو حکم بھی لاگو ہوتا ہے وگرنہ نہیں،اور رُقی سے منع کرنے کی علت چونکہ شرک ہے لہذا جس رقیہ میں شرک پایا جائے گا وہ ناجائز ہوگا باقی جائز ہوگا۔یہی بات حضور اقدس ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتی ہے کہ ''دم مجھ پر پیش کر لیا کرو''، مقصد یہ تھا کہ میں دم کا مضمون دیکھ لوں گا،اگر اس کے مضمون میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوگی تو اس کی اجازت دے دوں گا۔یہی بات یہاں حضرت جابر رضي اللہ عنہ کی اس زیر بحث حدیث میں ہے پہلے تو حضور اقدس ﷺ نے جھاڑ پھونک سے منع فرمایا، لیکن عمرو بن حزم کے خاندان نے اپنا بچھو کا دم حضور اقدس ﷺ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا ''میں اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا، جو شخص اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکتا ہو اسے چاہیئے کہ وہ نفع پہنچائے'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے پہلے جو منع فرمایا تھا الفاظ اگرچہ عام تھے ،بظاہر بلا استثنا آپ نے رقی سے منع فرمایا تھا، لیکن آپ کا مقصد عموم نہیں تھا، بلکہ خاص قسم کے دم سے ہی منع کرنا مقصود تھا، لیکن چونکہ زمانۂ جاہلیت سے جو دم چلے آرہے تھے وہ عموماً ایسے ہی ہوتے تھے اس لئے آپ نے تعبیر عام استعمال فرمائی، جب آپ کے سامنے ایسا دم پیش کیا گیا جو اس نوعیت میں داخل نہیں تھا جس سے آپ منع فرمانا چاہتے تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔ابن حبان نے حضرت ابن ابی حثمہؓ کی حدیث روایت کی ہے کہ ان کی والدہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک

کیا کرتی تھیں، جب اسلام آیا تو انہوں نے کہا کہ میں حضور اقدس ﷺ سے پوچھے بغیر یہ کام نہیں کروں گی، چنانچہ ان کی والدہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں اجازت طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے فرمایا ((ارقي ما لم يكن فيه شرك)) یعنی جب تک اس میں شرک نہ ہو دم کر لیا کرو۔ اس حدیث پر ابن حبان نے عنوان یہ قائم کیا ہے «ذكر الخبر الدال على أن الرقى المنهي عنها إنما هي الرقى التي يخالطها الشرك بالله جل وعلا دون الرقى التي لا يشوبها شرك »(صحیح ابن حبان 458/13)۔

بہر حال اس طرح کی متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کا اصل مقصد ایسے عملیات سے منع کرنا تھا جن میں شرک پایا جاتا ہو، اور عملیات میں شرک دو طرح سے آتا ہے، ایک تو یہ کہ اس کا مضمون ہی شرکیہ ہو، یا اس طرح کی کسی چیز کو مؤثر لذاتہ سمجھ لیا جائے، اس لئے کہ مؤثر حقیقی اللہ تعالی کی ذات ہے۔ علاج اور عملیات کی بعض انواع کو مؤثر لذاتہ سمجھتے تھے، اس لئے بھی اس طرح کے کئی کاموں سے حضور اقدس ﷺ نے منع فرمایا[1]۔

شرک سے محفوظ ہونا عملیات کے جواز کی اوّلیں شرط ہے، اس کے علاوہ ہر کام کا دار و مدار چونکہ نیت پر ہوتا ہے اس لئے عملیات کے جواز کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ کیا جارہا ہے وہ مقصد بھی صحیح ہو، اگر مقصد غلط ہو تو شرک سے محفوظ ہونے کے باوجود وہ عمل ناجائز ہوگا، مقصد صحیح ہونے کی مثال جیسے کسی بیماری کے

1- چنانچہ مشہور محدث ابن حبان (۱۳/۴۵۴ کتاب الرقی والتمائم) لکھتے ہیں: «العلة في الزجر عن الاكتواء ، والاسترقاء هي أن أهل الجاهلية كانوا يستعملونهما ويرون البرء منهما من غير صنع الباري جل وعلا فيه ، فإذا كانت هذه العلة موجودة ، كان الزجر عنهما قائما ، وإذا استعملهما المرء وجعلهما سببين للبرء الذي يكون من قضاء الله دون أن يرى ذلك منهما كان ذلك جائزا »

علاج کے لئے عملیات کرنا یا کروانا، ایک عورت کا خاونداس کی طرف صحیح توجہ نہیں دیتا اور اس کے حقوقِ واجبہ ادا نہیں کرتا، اس کا اپنے خاوند کو اپنے اوپر مہربان کرنے کے لئے کوئی عمل کرانا۔ غلط مقصد کی مثال جیسے لوگوں میں تفریق اور عداوت ڈالنے کے لئے عملیات کرنا، یا ایک عورت کا خاونداس کے حقوق صحیح ادا کرتا ہے تب بھی وہ اپنے خاوند کے میلان کے لئے تعویذ کراتی ہے تاکہ وہ میرے اشاروں پر چلے اسے حضرت تھانویؒ نے ناجائز لکھا ہے اور وجہ اس کی یہ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح کے تعویذات بھی معنوی نوعیت کا دباؤ ہی ہوتے ہیں، جس طرح کسی پر ظاہری دباؤ ڈال کر اسے کسی کام پر مجبور کرنا ناجائز ہے اسی طرح مخفی دباؤ ڈال کر کوئی کام کروانا بھی ناجائز ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ عملیات میں اگر شرک بھی نہ ہو، انہیں مؤثر لذاتہ بھی نہ سمجھا جائے اور ان کا مقصد بھی صحیح ہو تو یہ جائز ہیں، اور اگر ان میں کوئی شرط مفقود ہو، مثلاً اس کا مضمون شرکیہ ہو، یا اسے سبب کی بجائے مؤثر لذاتہ سمجھا جائے یا اس کا مقصد ناجائز ہو تو ایسا عمل ناجائز ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض احادیث میں جو بعض خاص بیماریوں کا نام لے کر کہا گیا ہے کہ ان میں آں حضرت ﷺ نے دم وغیرہ کی اجازت دی ہے، ان کا مقصد جواز کو انہی بیماریوں کے ساتھ خاص کرنا نہیں ہے، جہاں حصر کا صیغہ بھی ہے وہاں بھی حصرِ حقیقی مراد نہیں بلکہ حصرِ اضافی مراد ہے، اس لئے کہ خود احادیث سے جواز وعدمِ جواز کی علت صراحت سے معلوم ہو گئی ہے، اس لئے اب حکم کا مدار علت پر ہوگا، لہذا ہر ایسا دَم وغیرہ جس میں شرک پایا جائے وہ ناجائز ہوگا، خواہ وہ ان بیماریوں میں سے کسی کے لئے ہو جن کا نام لے کر احادیث میں ان کے لئے رُقیہ کی اجازت دی گئی ہے، اور اگر اس میں شرک نہ ہو تو وہ جائز ہوگا خواہ جس بیماری کے لئے وہ دَم کیا گیا ہے صراحت کے ساتھ اس کا نام کسی حدیث میں مذکور نہ ہو۔ جن احادیث میں حصر کا صیغہ ہے ان میں حصر کے اضافی ہونے کا ایک واضح قرینہ یہ بھی جن احادیث میں بیماریوں کا نام لے کر جواز بیان کیا گیا ہے ان میں مختلف حدیثوں میں الگ الگ بیماریوں کا ذکر ہے، اگر ان میں حصر کو حقیقی سمجھا جائے تو خود ان حدیثوں میں تعارض ہو جائے گا، مثلاً اگلی فصل میں حضرت

عمران بن حصینؓ کی حدیث آ رہی ہے جس میں آں حضرت ﷺ نے فرمایا لا رقية إلا من عين أو حمة اس میں صرف نظرِ بد اور زہریلے جانور کے ڈسنے سے دم کا ذکر ہے، جبکہ اس سے چند حدیثوں کے بعد آ رہا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شفا بنت عبد اللہؓ کو یہ فرمایا کہ حضرت حفصہؓ کو 'نملہ' کا دم سکھا دیں، اب اگر حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث میں حصر کو حقیقی سمجھا جائے تو مطلب یہ بنے گا نظر بد اور بچھو وغیرہ کے ڈسنے کے علاوہ کسی بھی بیماری میں دَم جائز نہیں ہے، جبکہ شفا بنت عبد اللہ والی حدیث سے ان دو کے علاوہ ایک بیماری میں دَم کا جواز معلوم ہو رہا ہے۔ اس لئے صحیح یہ ہے کہ ان حدیثوں میں حصر حقیقی نہیں ہے، بلکہ اضافی ہے۔

غیر مسلم سے عملیات کروانا:

مذکورہ بالا تفصیل سے ایک اور مسئلے کا حکم بھی معلوم ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ کسی غیر مسلم سے دَم وغیرہ کرانا جائز ہے یا نہیں، اس میں امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ اہلِ کتاب سے دم کرانے کو مکروہ قرار دیتے تھے، جبکہ امام مالک ہی کے ایک شاگرد ابنِ وہب اس کو جائز قرار دیتے تھے، امام شافعی سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے[1]، ابنِ وہب نے حضرت ابو بکر صدیق رضي اللہ عنہ کے ایک اثر سے استدلال کیا ہے جسے امام مالک نے موطا میں اور ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں روایت کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں اور ایک یہودیہ انہیں دَم کر رہی تھی، تو حضرت صدیق اکبر رضي اللہ عنہ نے اس یہودیہ سے کہا کتاب اللہ سے دم کرنا[2] عام شارحین نے کہا ہے کہ یہاں کتاب اللہ سے مراد تورات ہے، اس لئے کہ یہودی عموماً تورات سے دم کیا کرتے تھے، البتہ ابن حبان نے اس کا مطلب یہ بیان کیا

---

١ – معرفة السنن والآثار للبيهقي ١٤/ ١٢٠.

٢ – موطا رقم : ٣٤٧٢ ، مصنف ابن أبي شيبة ٤٧/٥

ہے کہ ایسا دم کرو جو کتاب اللہ یعنی قرآن کی رو سے مباح ہو[1]، جواز اور کراہت کے ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ ابن عبدالبر نے موطا کی شرح الاستذکار میں فرمایا ہے کہ امام مالک نے اسے مکروہ اس لئے قرار دیا ہے کہ معلوم نہیں کہ وہ کن الفاظ کے ساتھ دم کریں گے[2]۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن حضرات نے اجازت دی ہے وہ اس صورت میں ہے جبکہ یہ اطمینان ہو کہ وہ شرکیہ قسم کا عمل نہیں کرے گا، اور جنہوں نے منع کیا ہے انہوں نے اس صورت میں جبکہ ایسا اطمینان نہ ہو۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ رُقی کے جواز اور عدم جواز کا مدار شرک ہونے یا نہ ہونے پر ہے، لہذا جہاں یقین یا ظنِ غالب ہو کہ شرکیہ یا ناجائز مضمون ہی سے عمل کرے گا وہاں عمل کروانا ناجائز ہوگا اور جہاں ناجائز مضمون کا ظنِ غالب تو نہ ہو لیکن تردد ہو وہاں بھی بچنا ہی چاہئے، امام مالکؒ نے اسی صورت کو مکروہ قرار دیا ہے۔

تعویذ لکھ کر لٹکانا یا پلانا:

جب یہ واضح ہوگیا کہ ممانعت کی اصل علت شرک ہے تو کچھ دَم کرنے کی طرح لکھ کر لٹکانے یا پلانے وغیرہ کا حکم بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ان میں بھی اگر شرک پایا جائے تو ناجائز ہے ورنہ جائز ہے۔ آج کل بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کچھ پڑھ کر دم کرنا تو مذکورہ شرطوں کے ساتھ جائز ہے، لیکن تعویذ وغیرہ کی شکل میں کچھ لکھ کر گلے میں لٹکانا جائز نہیں ہے۔ ان حضرات کا ایک استدلال تو حضرت ابن مسعود رضي اللہ عنہ کی حدیث سے ہے جس میں آں حضرت ﷺ نے فرمایا « إن الرقى والتمائم والتولة شرك » اس میں 'التمائم' کے لفظ سے یہ حضرات استدلال کرتے ہیں، لیکن اوّل تو تمائم خاص قسم کے خرمہروں کو کہا جاتا تھا جنہیں زمانۂ جاہلیت میں عرب بچوں کے گلے میں

---

۱ – صحيح ابن حبان ١٣/٤٦٤ .

۲ – الاستذكار ٨/٤١١ .

لٹکادیا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس سے نظرِ بد سے حفاظت ہوتی ہے، جیسا کہ ابن الاثیر نے النہایہ میں لکھا ہے[1]،امام طحاوی نے حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو تکلیف آجانے کے بعد لٹکایا جائے وہ تمیمہ نہیں ہے[2]۔ دوسرے ابوداود کے شارح معروف اہلِ حدیث عالم مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے عون المعبود میں تمائم کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد ایسا تعویذ ہے جس میں اللہ تعالی کے نام وغیرہ نہ ہوں۔ خود اس حدیث میں ''التمائم'' کے ساتھ ''الرقی'' کا بھی ذکر ہے اور الرقی کے بارے میں اتفاق ہے کہ ان سے ممانعت مطلقاً نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ شرکیہ قسم کا رقیہ ہو، یہی تفصیل ''التمائم'' میں ہونی چاہئے، بلکہ خود اس حدیث میں ان چیزوں کو حرام کہنے کی بجائے شرک کہا گیا ہے جس سے پتا چل رہا ہے کہ ان چیزوں سے جو منع کیا جارہا ہے وہ شرک کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث میں 'تمیمہ' لٹکانے کے ساتھ تریاق پینے اور شعر کہنے کی بھی مذمت ہے، حالانکہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ تریاق پینا اور شعر کہنا مطلقاً ممنوع ہے، بلکہ سب کے نزدیک ممانعت خاص قسم کے تریاق اور خاص قسم کے شعر سے ہے، اسی طرح اس حدیث میں تمیمہ کے بارے میں بھی یہی کہنا چاہئے کہ یہاں خاص قسم کے تمیمہ کی بات ہورہی ہے، یعنی وہ تعویذ جو شرکیہ ہو۔

ابن أبی شیبہ نے اپنے المصنف میں ''من رخّص فی تعلیق التعویذ'' کے عنوان کے تحت سلف کے اس طرح

---

۱ – نیز ابن قتیبۃ تاویل مختلف الحدیث (ص ۴۶۶) میں لکھتے ہیں: « والتمائم خرز رقط، كانت الجاهلية تجعلها في العنق والعضد، تسترقي بها، وتظن أنها تدفع عن المرء العاهات، وتمد في العمر، قال الشاعر:

إذا مات لم تفلح مزينة بعده ... فنوطي عليه يا مُزَينُ التمائما

يقول: علقي عليه هذا الخرز، لتقيه المنية.

۲ – شرح معاني الآثار (٣٢٥/٤) كتاب الكراهة : باب الكي هو مكروه أم لا.

کے کافی آثار جمع کر دیئے ہیں جن میں انہوں نے تعویذ لکھنے اور لٹکانے کی اجازت دی ہے، مثلاً سعید بن المسیب سے تعویذ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر چمڑے وغیرہ میں ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، چمڑے وغیرہ کا اس لئے فرمایا آیت یا اللہ کے نام وغیرہ کی بے ادبی کا امکان نہ رہے۔ مجاہد لٹکانے کے لئے لوگوں کو تعویذ لکھ کر دیا کرتے تھے۔ عطا کہتے ہیں کہ اگر عورت نے تعویذ باندھا ہوا ہو اور اس کے مخصوص ایام شروع ہو جائیں تو اگر وہ تعویذ چاندی وغیرہ میں مڑھا ہوا ہو تو اسے اتارنے کی ضرورت نہیں اور اگر چمڑے میں ہو تو مخصوص ایام میں اتار دینا چاہئے۔ ایوب سختیانی کہتے ہیں کہ میں نے عبید اللہ بن عبد اللہ بن عمر کے بازو پر دھاگا بندھا ہوا دیکھا۔ امام جعفر صادق اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ چمڑے وغیرہ پر کوئی آیت لکھ کر لٹکا دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ سب سے بڑھ کر حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ اگر کسی شخص کو نیند کے دوران خوف لاحق ہو (مثلاً کوئی ڈراؤنا خواب دیکھے) تو اسے چاہئے کہ یہ دعا پڑھے «أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُونِ» تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا، اس کے راوی کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ اپنے گھر کے سمجھدار افراد کو یہ دعا یاد کرادیا کرتے تھے، اور چھوٹے بچوں کے لئے لکھ کر ان کے گلے میں لٹکا دیا کرتے تھے[1]، یہ روایت مشکوۃ کے باب الاستعاذۃ الفصل الثانی میں بھی موجود ہے، حضرت عبد اللہ بن عمروؓ کے اس عمل کی اہمیت یہ ہے کہ "تمائم" سے ممانعت کی ایک حدیث بھی ان سے مروی ہے جو آگے الفصل الثانی میں نمبر ۱۴ پر آرہی ہے، ایک طرف تو حضرت عبد اللہ بن عمروؓ تمائم کی مذمت میں حدیث نقل کر رہے ہیں اور دوسری طرف خود یہ دعا اپنے بچوں کے لکھ رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کا تعویذ ان کے نزدیک اس وعید میں داخل نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

1- سنن أبي دواد حدیث نمبر:3893 باب کیف الرقی، جامع الترمذی حدیث نمبر:3528

ويجوز أن يكتب للمصاب وغيره من المرضى شيئا من كتاب الله وذكره بالمداد المباح ويغسل ويسقى كما نص على ذلك أحمد وغيره

یعنی یہ جائز ہے کہ بیمار وغیرہ کے لئے کتاب اللہ یا ذکر اللہ قبیل کی کوئی چیز مباح روشنائی کے ساتھ لکھے اور اسے دھو کر پلائے جیسا کہ امام احمد وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے، اس کے بعد ابن تیمیہؒ نے ابن عباسؓ کا اثر نقل کیا ہے کہ ہے کہ اگر عورت کو ولادت میں تنگی سامنا ہو تو یہ الفاظ لکھے جائیں

بسم الله لا إله إلا الله الحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم الحمد لله رب العالمين كأنهم يوم يرونها لم يلبثوا إلا عشية أو ضحاها كأنهم يوم يرون ما يوعدون لم يلبثوا إلا ساعة من نهار بلاغ فهل يهلك إلا القوم الفاسقون

ایک روایت میں ہے کہ یہ الفاظ دھو کر پلائے جائیں اور ناف کے نیچے اس پانی کے چھینٹے مارے جائیں اور ایک روایت میں ہے لکھ کر بازو پر باندھے جائیں اور تکمیلِ ولادت کے ساتھ ہی جلدی سے اتار لیا جائے، اس اثر کے ایک روای کہتے ہیں کہ ہم نے بارہا اس کا تجربہ کیا اس مقصد کے لئے ہم نے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں پائی[1]۔ دیکھئے یہ روایت ابن تیمیہ نقل کر رہے ہیں جس میں یا تو ذکر ہے تعویذ دھو کر پلانے کا یا ذکر ہے باندھنے کا تو پتہ چلا یہ حضرات بھی اسے جائز سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ابن القیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد (۳۲۶/۴) میں بھی بعض تعویذات نقل کئے ہیں، مثلاً امام احمد

---

[1] – مجموع فتاوى ابن تيمية ٦٤/١٩ .

رحمہ اللہ سے بخار کا ایک تعویذ نقل کیا ہے تو پتہ چلا کہ ابن القیم بھی اس طرح تعویذات کو جائز سمجھتے تھے۔

دَم وغیرہ میں پھونک مارنا:

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ دم وغیرہ کرتے ہوئے پھونک نہیں مارنی چاہئے، چنانچہ بعض تابعین سے بھی یہ بات منقول ہے، لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، خاص طور پر جبکہ جسے پھونک ماری جارہی ہے وہ اس میں کراہت محسوس نہ کرے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آں حضرت ﷺ کے گھر میں کوئی بیمار ہوتا تو آپ معوذات پڑھ کر پھونک مارتے تھے، امام نووی نے صحیح مسلم کی اس روایت پر باب ہی یہ قائم کیا ہے "باب رقیۃ المریض بالمعوذات والنفث"۔ ابن ابی شیبہ نے اپنے المصنف میں "باب من رخص فی النفث فی الرقی" کے تحت اس طرح کی کافی روایات جمع کر دی ہیں، مثلاً محمد بن حاطب جُمحیؓ کہتے ہیں کہ میرے بچپن میں ہنڈیا سے میرا ہاتھ جل گیا تو میری والدہ مجھے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں لے کر گئیں، آپ ﷺ میرے ہاتھ پر پھونک بھی مار رہے تھے اور کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔ اسی طرح حبیب بن فویکؓ کہتے ہیں کہ میرے والد مجھے بچپن میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے کر گئے، اس وقت تک ان کی آنکھیں سفید تھیں اور ان سے نظر کچھ نہیں آتا تھا، آں حضرت ﷺ نے ان کی آنکھوں میں پھونک ماری تو ان کی بینائی درست ہو گئی، راوی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں اسّی سال کی عمر میں دیکھا کہ وہ سوئی میں دھاگا آسانی سے ڈال لیتے تھے۔ حضرت عائشہؓ بھی جب دم کرتی تھی تو پھونک مارا کرتی تھیں۔

بعض حضرات پھونک مارنے کے عدمِ جواز پر ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں آں حضرت ﷺ نے پانی میں سانس لینے یا پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔ لیکن کتاب الأطعمۃ میں جہاں یہ حدیثیں گذری ہیں وہاں یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ خاص علت کی وجہ سے ہے وہ یہ کہ اس سے دوسرے شخص کو گھن آتی ہے، اس لئے جہاں دوسرا شخص خود اسے باعثِ برکت سمجھتا ہو اور اس کا طالب ہو وہاں یہ علت نہیں

پائی جاتی، چنانچہ مشکوۃ کے آخر میں باب المعجزات میں اس طرح کی احادیث کثرت سے ذکر کی جائیں گی جہاں آں حضرت ﷺ نے بعض مواقع پانی یا کھانے وغیرہ کی چیز میں اپنا لعاب مبارک بھی ڈالا ہے، اگر کھانے پینے کی چیز میں پھونک مارنے کی ممانعت مطلق ہوتی تو آں حضرت ﷺ کبھی اپنا لعاب مبارک کھانے کی چیز میں نہ ڈالتے، اس لئے لعاب ڈالنا تو پھونک مارنے سے اگلا درجہ ہے۔

سب عملیات دین کا باقاعدہ حصہ نہیں:

دم وغیرہ ہوں یا تعویذات وغیرہ یا دوسرے عملیات ان کے بارے میں ایک بات یہ ذہن میں رکھنی چاہئے کہ بعض دم وغیرہ تو صراحتاً حدیثوں میں آتے ہیں جن میں سے چند اس باب کے اندر آجائیں گے وہ تو باقاعدہ تعلیماتِ نبویہ کا حصہ ہیں اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ ان کے علاوہ باقی دم یا تعویذات وغیرہ میں اگرچہ قرآنی الفاظ پائے جاتے ہیں یا ان الفاظ سے کئے جائیں تب بھی باقاعدہ وہ شریعت کا مسئلہ اور حصہ نہیں ہیں بلکہ لوگوں کے تجربات ہیں وہ تجربہ درست بھی ہو سکتا ہے غلط بھی۔ ان کا شریعت کے ساتھ دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہیں، یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی لوگوں کو ہو جاتی ہے کہ ان عملیات کو بھی دین کے علم ایک حصہ سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس کو دین آتا ہے دین کا عالم ہے اس کو ان عملیات سے بھی واقف ہونا چاہئے، یہ غلط فہمی قابل اصلاح ہے۔ چنانچہ خود بہت سارے دم ایسے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں آتے تھے آپ ﷺ کے صحابہ کو آتے تھے۔ آپ کو تب پتہ چلا جب ان کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ کو سنائے گئے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت شفاء بنت عبداللہؓ کو یہ کہا تھا کہ جیسے تم نے حضرت حفصہؓ کو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے اسی طرح انہیں نملہ کا دم بھی سکھا دو تو اس سے پتا چلا کہ نملہ کا یہ دم شفاء بنت عبداللہ کو آتا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں آتا تھا، ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت حفصہؓ کو سکھا دیتے۔

اسی طریقہ سے بعض لوگ عملیات کے ذریعے علاج کرنے کو روحانی علاج کہتے ہیں۔ تو ہمارے ہاں بزرگوں

نے اس تعبیر کو بھی پسند نہیں کیا۔ کسی کی اپنی اصطلاح ہو تو الگ بات ہے لیکن جس روحانیت کی شریعت نے تعلیم دی ہے اس کے ساتھ اس کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح بعض لوگ ان عملیات کو تصوف و سلوک کا حصہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی کے ہاتھ پر بیعت ہوا ہے سلوک کی منازل طے کر رہا ہے اس کے نصاب میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنے پیر سے جھاڑ پھونک تعویذ گنڈے بھی سیکھے تو تصوف و سلوک کے ساتھ بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسلام میں جس روحانیت کی تعلیم دی گئی ہے یا تصوف و سلوک میں جس روحانیت کی تکمیل کرائی جاتی ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ انسان کا ظاہر و باطن شریعت کے مطابق ہو جائیں خاص طور پر انسان کے باطن سے رذائل کی اصلاح ہو جائے برے اخلاق جیسے کبر، حسد، بغض وغیرہ نکل جائیں اور اخلاق حمیدہ دل میں پیدا ہو جائیں جیسے اللہ کی محبت، توکل راضی بقضاء رہنا، تواضع وغیرہ یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو سمجھو کہ روحانیت اور تصوف و سلوک کا مقصد حاصل ہے چاہے اسے ایک دم کرنا بھی نہ آتا ہو اور ایک تعویذ بھی لکھنا نہ آتا ہو تو یہ دم اور تعویذات اپنی شرائط کے ساتھ اگرچہ جائز ہیں لیکن دین، روحانیت اور تصوف و سلوک کا باقاعدہ حصہ نہیں ہیں، بلکہ جس طرح عام طب ہوتی ہے کہ بعض لوگ اس کا علم حاصل کرتے ہیں اور ان کو اس کا تجربہ حاصل ہو جاتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک طب اور طریقۂ علاج ہے۔

عام عملیات کا ترک کمالِ توکل کا تقاضا ہے:

اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ وہ رقی جو احادیث میں صراحتاً آ گئے وہ تو اسباب وہمیہ میں سے نہیں ظنیہ میں سے ہیں اسی طرح اور بھی بعض عملیات ایسے ہو سکتے ہیں جن کے بکثرت تجربے کی وجہ سے ظنی بن گئے ہوں وہمی نہ رہے ہوں ان کی بات تو الگ ہے لیکن زیادہ تر عملیات وغیرہ اسبابِ وہمیہ کے قبیل سے ہوتے ہیں اس لئے اگرچہ یہ جائز ہیں لیکن ان کا ترک اولیٰ ہے اور کمال توکل کا تقاضا ہے جیسا کہ شروع میں تفصیل سے گذرا کہ اسباب وہمیہ کا ترک کمالِ توکل کے لئے ضروری ہے۔

اپنے دَم مجھے سنالیا کرو

(۱۷) وَعَن عوفِ بن مَالك الْأَشْجَعِيّ قَالَ: كُنَّا نَرْقِي فِي الجَاهِلِيَّةِ فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ كَيْفَ تَرَى فِي ذَلِكَ؟ فَقَالَ: «اعْرِضُوا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَأْسَ بِالرُّقَى مَا لم يكن فِيهِ شرك» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضي اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اپنے دَم مجھ پر پیش کر لیا کرو (یعنی مجھے چیک کروالیا کرو) اس لئے کہ جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس میں شرک نہ ہو۔

نظرِ بد کی تاثیر

(۱۸) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْعَيْنُ حَقٌّ فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ وَإِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فاغسِلوا» . رَوَاهُ مُسلم.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نظرِ بد لگ جانا برحق ہے، اگر کوئی چیز ایسی ہوتی ہو جو تقدیر سے بھی آگے نکل جاتی تو نظرِ بد تقدیر سے بازی لے جاتی، اور جب تمہیں اعضاد ھونے کا کہا جائے تو اعضاد ھویا کرو۔

اس حدیث میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں:

نظر لگنا بر حق ہے

پہلی بات تو یہ کہ نظر لگ جانا بر حق ہے، یعنی نظر لگنے کا اثر ہوتا ہے۔ نظر ویسے اچھی بھی لگتی ہے بُری بھی، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی اگر کسی پر نظر پڑ جائے تو ان کا کام بن جاتا ہے اور نظر کبھی بری لگتی ہے کہ جس کو نظر لگی اس کا برا حال ہو گیا۔ یہاں پر دوسری قسم کی ہی نظر کی بات ہو رہی ہے، یعنی نظرِ بد کی بات ہو رہی ہے۔ یہ جو فرمایا کہ اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے نکلنے والی ہوتی تو وہ نظر ہوتی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی چیز تقدیر پر بھی فائق ہو سکتی ہے، بلکہ یہ بات بطور فرض کے ارشاد فرمائی گئی ہے کہ اگر بالفرض تقدیر کو بدلنے والی کوئی چیز ہوتی تو وہ نظرِ بد ہوتی۔

نظر بد کیسے لگتی ہے:

نظر بد کیسے لگتی ہے؟ اس کی کئی وجوہ لوگوں نے بیان کی ہیں۔ مثلاً بعض نے یہ کہا کہ عائن یعنی نظر لگانے والے کی آنکھوں سے خاص قسم کے زہریلے اثرات نکلتے ہیں جو غیر مرئی ہوتے ہیں اور وہ مسامات کے ذریعے معیون یعنی جس کو نظر لگی ہے اس کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اس سے اس کو نقصان ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہ عائن کی آنکھوں سے بعض قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں اور یہ شعاعیں معیون سے جا کر ٹکراتی ہیں۔ یہ شعاعیں دو قسم کی ہوتی ہیں مثبت بھی منفی بھی بعض لوگوں سے مثبت شعاعیں نکلتی ہیں اگر مثبت شعاعیں ہوں تو جس کو لگیں اس کا کام بن جاتا ہے۔ اور اگر منفی شعاعیں ہوں تو کام بگڑ جاتا ہے۔

معروف لغت دان اصمعی کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظر بہت کثرت سے لگ جاتی تھی، ایک مرتبہ ایک گائے جو دودھ بہت زیادہ دیتی تھی، اس نے دودھ دوہنے کی آواز سن کر پوچھا کہ یہ کونسی ہے، انہوں نے اصل گائے کے علاوہ کسی اور کے بارے میں کہہ دیا کہ فلاں ہے، ہوا یہ کہ دونوں ہی اس کی نظرِ بد کی وجہ سے مر گئیں، وہ بھی جو حقیقت میں زیادہ دودھ دیتی تھی اور وہ بھی جس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ ہے، اصمعی

کہتے ہیں میں اس شخص سے ملا ہوں، اس نے مجھے بتایا کہ جب مجھے کوئی چیز پسند آتی ہے تو مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے میری آنکھوں سے حرارت نکل رہی ہو(1)۔

اور بھی وجوہ بعض نے بیان کی ہیں لیکن یہ شریعت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے کہ نظر کیسے لگتی ہے۔ چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں فرمادیا کہ نظر لگ جانا برحق ہے اس لئے یہ طے شدہ امر ہے کہ اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کیسے ہوتا ہے۔

نظر بد کا علاج

دوسری بات اس حدیث میں نظر بد کے علاج کی ہے نظر بد کا علاج دو طرح کا ہے۔ ایک ہے حفظ ماتقدم یعنی نظرِ بد لگنے سے پہلے حفاظت کی جائے اور دوسرا ہے نظر بد لگ جانے کے بعد علاج کرنا۔

نظرِ بد سے حفظِ ماتقدم:

جہاں تک تعلق ہے حفظ ماتقدم کا تو اس میں ایک بات تو احادیث میں صراحتاً آتی ہے کہ اگر کوئی ایسی چیز دیکھو جو تمہیں پسند آئے اور تمہیں خطرہ محسوس ہو کہ میری نظر اس کو لگ جائے گی تو اس کی اچھائی کے بارے میں اللہ کا حوالہ دے دو یہ اللہ کی طرف سے ہے مثلاً یہ کہہ دو کہ ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ۔ دوسری بات یہ ہے اس شخص یا اس چیز کو برکت کی دعا دے دو مثلاً یوں کہہ دو بارک اللہ، ایک صحابی کی کسی کو نظر لگ گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر لگانے والے سے یہ فرمایا کہ اَلاَّ بَرَّکتَ کہ تم نے اس کے لئے دعائے برکت کیوں نہ کر دی تو پتا چلا کہ بارک اللہ

---

١ – تفسير القرطبي ٩/٢٢٧ تحت قوله تعالى : وقال يابني لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقة [يوسف : ٦٧] .

کہنے سے بھی نظرِ بد سے حفاظت ہو جاتی ہے۔ یہ تو طریقہ ہے اس شخص کے حق میں جس کی نظر لگتی ہے کہ وہ ماشاء اللہ یا بارک اللہ کہہ دے۔ لیکن جس کو نظر لگ رہی ہے اس کے لئے کیا طریقہ کار ہے، اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ نظر بد لگانے والا ایسا نہ کہے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظر بد بدنیتی کی وجہ سے لگتی ہے کہ کوئی اچھائی دیکھ کر جل گیا اب ظاہر ہے کہ جو جل رہا ہے وہ ماشاء اللہ یا بارک اللہ تو نہیں کہے گا۔ اور بسا اوقات حسد اور بدنیتی نہ ہونے کے باوجود بھی محض وہ چیز پسند آجانے کی وجہ سے نظر بد لگ جاتی ہے۔ تو دوسری قسم کا آدمی تو ماشاء اللہ اور بارک اللہ وغیرہ کہے گا لیکن پہلی قسم کا آدمی نہیں کہے گا۔ اس لئے دوسری قسم کے لوگوں کی نظرِ بد سے بچنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے تو احادیث میں تو اس سلسلے میں کوئی صریح بات نہیں ملی البتہ ایک بات قرآن کریم سے سمجھ میں آتی ہے اور ایک بات بعض صحابہ کے آثار سے۔ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو یہ کہا تھا کہ جب عزیز مصر کے شہر میں داخل ہونا تو متفرق دروازوں سے داخل ہونا ایک دروازے سے اکھٹے داخل نہ ہونا، اس کی وجہ مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ اکھٹے دیکھ کر نظرِ بد نہ لگ جائے تو اس سے نظر بد سے حفاظت کا ایک طریقہ یہ سمجھ میں آیا کہ جس خوبی اور کمال پر نظر بد لگ سکتی ہو اگر اسے چھپانا ممکن ہو تو اسے چھپالیا جائے ایسے لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر ہی نہ کیا جائے جن کی نظر لگنے کا امکان ہو، بلاوجہ اپنے کمالات اور اپنی خوبیوں کو ظاہر کرنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اور دوسرا طریقہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ جس خوبی یا اچھائی کو نظر لگنے کا امکان ہو اس میں کچھ ظاہری دِکھاوے میں تبدیلی کردے، بعض حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے لیکن سند کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیسی ہے انہوں نے ایک بچہ دیکھا جو بہت خوبصورت تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس کی ٹھوڑی پر تھوڑی سی سیاہی لگا دو، تو اس سے پتا چلا کہ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے،[1] اگرچہ اس وقت اس کی سند کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اوپر ذکر کردہ یعقوب علیہ السلام کی اپنے بیٹوں کو ہدایت سے اس کی تائید ضرور ہوتی ہے، اس لئے کہ اس طریقے کا مقصد بھی اس بچے کے حسن کو چھپانا

1۔ شرح السنۃ للبغوی ۱۲/۱۶۶، کتاب الطب والرقی باب مارخص فیہ من الرقی۔

ہے اور حضرت یعقوب ں کی ہدایت کا حاصل بھی اس چیز کو چھپانا ہے جس کی وجہ سے نظر لگنے کا امکان ہو۔

قرآن وحدیث میں استعاذہ کی جو ادعیہ منقول ہیں ان میں سے بیشتر کے عموم میں نظرِ بد بھی داخل ہے، مثلاً قرآن کریم آخری دو سورتیں معوذتین، مشہور دعا أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ، اسی طرح یہ دعا بِسْمِ اللهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْئٌ فِيْ الْأَرْضِ وَلَا فِيْ السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم ، ان کے علاوہ بعض ادعیہ میں صراحتاً بھی نظرِ بد سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، مثلاً حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے لئے ان لفظوں میں پناہ کی دعا کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی حضرت اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کے لئے ان لفظوں میں پناہ مانگا کرتے تھے : أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِّ التَّامَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّة اس طرح کی ساری ادعیہ بھی حفظِ ماتقدّم میں داخل ہیں۔

اس کے علاوہ لوگوں کے تجربات اور بعض تعویذات ہوتے ہیں کہ ان کے باندھنے سے نظرِ بد کا اثر نہیں ہوتا۔

نظرِ بد لگ جانے کے بعد علاج:

دوسرا علاج نظرِ بد لگ جانے کے بعد کا ہے، حدیث میں اس سلسلے میں ایک چیز کا ذکر ہے اور وہ ہے جس کی نظر لگی ہے اس کے اعضا دھو کر معین پر یعنی جس کو نظر لگی ہے اس پر ڈالنا۔ اس زیر بحث حدیث میں بھی اس چیز کا ذکر ہے کہ تمہیں اعضا دھونے کے لئے کہا جائے تو اعضا دھو دیا کرو، یعنی اکڑ فوں نہ کرو کہ میری نظر کیسے لگ سکتی ہے خوامخواہ شبہ کررہے ہو بلکہ دھودو، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اس کا اگر وہم ہوگا تو زائل ہو جائے گا اگر حقیقتاً نظر لگی ہے تو ہو سکتا ہے کہ فائدہ ہو جائے اس لئے تمہیں کوئی کہے کہ ہمیں شبہ ہے کہ آپ کی نظر لگ گئی ہو

گی اس لئے اپنے اعضا دھو کر اس کا پانی دے دو تو اس میں کوئی لیت و لعل سے کام نہ لو۔

اعضا دھونے کا یہ طریقۂ علاج حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً تلقین نہیں فرمایا بلکہ عربوں میں بظاہر لگتا ہے کہ پہلے ہی سے مروج تھا، البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تقریر ضرور فرمائی، اگلی فصل میں ایک حدیث آئے گی کہ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نظر لگ گئی تھی تو ان پر اسی طریقے سے پانی ڈالا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئے، اُس حدیث سے یہ بھی پتہ چل رہا ہے کہ کون سے اعضا دھونے چاہئے۔ اس حدیث میں آتا ہے کہ سہل بن حنیف کو نظر لگی تھی عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی، تو عامر بن ربیعہؓ نے پہلے تو اپنا چہرہ دھویا اور پھر اپنے ہاتھ دھوئے اور پھر اپنی کہنیاں دھوئیں اور اس کے بعد گھٹنے دھوئے اور اس کے بعد اپنے پاؤں کے کناروں کو دھویا اور اس کے بعد لفظ آرہا ہے داخلۃ ِازار، تہہ بند کے اندرونی حصہ کو دھویا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک مطلب تو یہ کہ جو لنگی باندھی ہوئی ہے باندھتے وقت اس کا اوپر والا ایک کنارہ اندر کی جانب دبا دیا جاتا ہے جس کو پنجابی میں "ڈب" کہتے ہیں وہ کنارا مراد ہے اس کو داخلۃ الازار کہا جارہا ہے تو اس کو بھی دھو لیا جائے اور بعض میں داخلۃ ازارہ سے مراد لیا ہے استنجا کرنا، لیکن بظاہر پہلی تشریح زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے، اگر استنجا والا معنی مراد لیا جائے تو وہ ایسی حالت میں کرنا چاہئے کہ اعضا پاک ہوں و گرنہ ظاہر ہے کہ پانی بھی ناپاک ہو جائے گا۔ یہ پانی حضرت سہل بن حنیفؓ پر ڈالا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئے۔ اعضا دھونے کی یہ تفصیل خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو تلقین نہیں فرمائی لیکن اتنی بات طے شدہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں آپ کے صحابہ نے اس ترتیب سے اعضا کو دھو کر پانی مریض پر ڈالا ہے اس لئے اس کی بہر حال ایک حقیقت ہے۔

حدیث سے جو علاج ثابت ہو رہا ہے وہ اتنا ہی ہے اس کے علاوہ اور بہت سے علاج نظر بد کے ہیں، لیکن وہ تجربات سے تعلق رکھتے ہیں حدیث میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اسی اعضا کو دھونے والے طریقہ علاج میں بعض حضرات نے اپنے تجربے سے یہ قید بھی شامل کی ہے کہ جس وقت اعضا دھوئے جارہے ہوں تو اس وقت پانی کا یہ برتن زمین پر نہ رکھا جائے بلکہ کوئی آدمی پکڑ کر کھڑا رہے یا بیٹھا رہے لیکن زمین پر نہ لگے۔ یہ قید بھی لگائی ہے کہ

پانی مریض پر پیچھے کی جانب سے آکر ڈالا جائے کہ اس کو پہلے سے اندازہ بھی نہ ہو کہ مجھ پر پانی ڈالا جائے گا۔ یہ ساری کی ساری چیزیں تجربات سے تعلق رکھتی ہیں براہِ راست حدیث سے جو بات سمجھ میں آرہی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ اعضا کو دھو کر پانی مریض پر ڈالنے سے فائدہ ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی

بڑھاپے کے علاوہ ہر بیماری کا علاج ہے

(١٩) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ شَرِيكٍ قَالَ: قَالُوا: يَا رَسُول الله أفنتداوى؟ قَالَ: « نَعَمْ ، يَا عِبَادَ اللّٰہ تَدَاوَوْا ؛ فَإِنَّ اللّٰہ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ لَهُ شِفَاءً ، غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ الْهَرَم » . رَوَاهُ أَحْمد وَالتِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد.

حضرت اسامۃ بن شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ! کیا ہم دوا استعمال کیا کریں تو آپ نے فرمایا کہ اے اللہ کے بندو دوا استعمال کیا کرو؛ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بیماری بھی پیدا کی ہے اس کے لئے شفا بھی ضرور پیدا کی ہے سوائے ایک بیماری کے اور وہ ہے بڑھاپا۔

اس حدیث میں بڑھاپے کو بھی بیماری قرار دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپا اگرچہ بیماری نہیں لیکن بہت سی بیماریوں کا باعث اور سبب ہے، جیسا کہ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک باباجی کسی حکیم کے پاس گئے اور کہا کہ حکیم صاحب بلغم بہت آتی ہے، حکیم صاحب نے کہا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے، انہوں نے کہا کہ گھٹنوں میں بھی درد رہتی

ہے تو حکیم صاحب نے کہا کہ بڑھاپے کی وجہ سے ہے، انہوں نے شکایت کی کہ رات کو نیند بھی نہیں آتی حکیم صاحب نے کہا کہ یہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے، تو بڑے میاں کو غصہ آیا اور اٹھ کر حکیم صاحب کے ایک تھپڑ رسید کیا تو حکیم صاحب نے کہا کہ مجھے اس پر غصہ نہیں آیا اس لئے کہ یہ بھی بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ بہر حال بڑھاپا بہت سی بیماریوں کا سبب ہے اس لئے اس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری قرار دیا۔

بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کا کوئی علاج نہیں ہے اس لئے جو لوگ دعویٰ کرتے یا مشقیں کرتے ہیں اعادۂ شباب کی تو یہ ایک بے کار کام ہے، حقیقت میں اعادۂ شباب ممکن نہیں ہے، وقتی طور پر طبیعت میں کچھ جوش اور اٹھان سی پیدا ہو جانا الگ بات ہے لیکن اس کو جوانی نہیں کہا جاسکتا، تاہم یہ ضرور ممکن ہے کہ متوازن اور اچھی غذا صحت کی بہتر نگہداشت اور صحت افزا اندازِ زندگی اور عادات کے ذریعے عمر رسیدگی کے اثرات کو کم یا مؤخر کیا جاسکے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا انکارٹا میں عمر رسیدگی (aging) کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے ''زندہ اشیا میں امتدادِ وقت کی وجہ سے پیدا ہونے والی وہ حیاتیاتی تبدیلیاں جو ناقابل واپسی (irreversible) ہوتی ہیں اور آخر کار موت پر منتج ہوتی ہیں''۔

مریض کو کھانے پر مجبور نہ کیا جائے

(٢٠) وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « لَا تُكْرِهُوا مَرْضَاكُمْ عَلَى الطَّعَامِ ، فَإِنَّ اللّٰهَ يُطْعِمُهُمْ وَيَسْقِيهِمْ » . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيث غَرِيب

حضرت عقبہ بن عامر بن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے مریضوں کو کھانے پر مجبور نہ کیا کرو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کھلاتے اور پلاتے ہیں۔

تیمارداری کا ادب:

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مریض کی دیکھ بال اور تیمارداری کا ایک ادب بیان فرمایا ہے کہ جو آدمی مریض کی دیکھ بھال پر مقرر ہو اس کو چاہئے کہ وہ مریض کو کھانے پینے پر مجبور نہ کرے جتنا اس کا دل مانے اور جب دل مانے کھالے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ مریض کو مجبور کر کے کھلایا جاتا ہے، یہ مناسب نہیں ہے۔ اس کی وجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں کھلاتے اور پلاتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کھانے پینے کی چیزیں ملتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو کھانے اور پینے کا مقصد ہے وہ اللہ تعالیٰ ویسے ہی پورا کر دیتے ہیں اور غذا کی ضرورت بغیر کھائے پیئے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک بات مسلّمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں ایک صلاحیت رکھی ہے جس کی وجہ سے جسم بہت ساری توانائی محفوظ کر لیتا ہے تو ایسے موقعوں پر وہ توانائی کام آجاتی ہے اس لئے ایک صحت مند آدمی کو جتنی کھانے کی ضرورت ہوتی ہے بیمار کو اتنی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے مجبور کر کے اس کو نہیں کھلانا چاہیئے۔

یہ بات بظاہر ان چیزوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما رہے ہیں جو کہ علاج کے قبیل سے نہیں ہوتیں۔ جو چیزیں علاج کے قبیل سے ہوں وہ تو بظاہر مجبور کر کے بھی کھلائی جاسکتی ہیں، مثلاً دوائی وغیرہ، اسی طرح غذا کا اتنا درجہ اور حصہ جو علاج معالجے کا حصہ اور صحت یابی کے لئے ناگزیر ہو۔

سرخ بادہ کی وجہ سے داغ

(۲۱) وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَوَى أَسْعَدَ بْنَ زُرَارَةَ مِنَ

الشَّوْكَةِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيث غَرِيب

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو داغ دیا سرخ بادہ کی وجہ سے۔

حضرت اسعد بن زُرارۃ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہجرت سے کافی عرصہ پہلے حضرت ذکوان بن عبد القیسؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا، کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں اسلام کا پیغام لانے والے اور یہاں جمعہ پڑھانے والے سب سے پہلے صحابی یہی ہیں۔ بیعتِ عقبہ اولی اور بیعتِ عقبہ ثانیہ میں شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر سے پہلے مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا، ایک قول کے مطابق یہ سب سے پہلے صحابی ہیں جن کی نماز جنازہ حضور اقدس ﷺ نے پڑھائی، اس سے پہلے نمازِ جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔

شوکہ ایک خاص قسم کی بیماری ہوتی ہے جس میں چہرہ اور جسم سرخ ہو جاتا ہے اور اردو میں کئی حضرات نے اس کا ترجمہ سرخ بادہ کیا ہے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آں حضرت ﷺ جانتے تھے کہ کیّ سے بھی ان کی بیماری درست نہیں ہو گی، لیکن چونکہ عربوں میں یہ علاج اس طرح کے موقع پر کیا جاتا تھا، اس لئے آپ نے اتمامِ حجت اور ازالۂ حسرت کے لئے یہ علاج اختیار فرمایا، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لأبلغن في أبي أمامة عذراً، ابوامامہ حضرت اسعد بن زُرارہ کی کنیت ہے، مسند احمد کی ایک روایت کے لفظ یہ ہیں لا أدعُ في نفسي حَرجًا مِن سَعْد أو أسعد بن زُرارة[1] یعنی اسعد بن زُرارہ کے بارے میں میں اپنے دل میں کسی

---

[1] – مسند أحمد برقم : ١٦٦١٨ .

کھٹک کی گنجائش نہیں رہنے دوں گا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد آپ نے فرمایا ميتة سوء لليهود ، يقولون : فهلا دفع عن صاحبه ؟ وما أملك له ولا لنفسي شيئا[1] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے یہودیوں کے اسی طرح کے اعتراضات کہ انھوں نے اپنے بندے کا خیال بھی نہیں رکھا کے امکان کے پیشِ نظر یہ کی ّیعنی داغ دینے کو استعمال فرمایا ہو، چنانچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے مذکورہ جملہ بھی ابو امامہ یعنی اسعد بن زُرارہؓ کے انتقال سے پہلے انہیں داغ دینے کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا[2]۔

ذات الجنب کا علاج

(۲۲) وَعَن زيد بن أَرقم قَالَ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَتَدَاوَى مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ بِالْقُسْطِ البحريِّ وَالزَّيْت. رَوَاهُ التِّرْمِذِي

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا کہ ہم ذات الجنب (دردِ سینہ یا نمونیا) کا علاج قسط بحری اور زیتون کے تیل کے ساتھ کریں۔

(۲۳) وَعَنْهُ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْعَتُ الزَّيْتَ وَالْوَرْسَ مِنْ ذَاتِ الْجَنْبِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

---

١ – سنن ابن ماجه كتاب الطب : باب من اكتوى حديث: ٣٤٩٢، مصنف ابن أبي شيبة ٥٢/٥ باب الكي من رخص فيه.

٢ – التمهيد لابن عبد البر ٦١/٢٤ الحديث الحادي والستون ، ترجمة يحيى بن سعيد الأنصاري.

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ذات الجنب میں زیتون کا تیل اور ورس تجویز فرمایا کرتے تھے۔

ورس ایک خاص بوٹی ہوتی ہے، جو اس زمانے میں کپڑوں وغیرہ کو زرد رنگ دینے کے لئے بھی استعمال ہوتی تھی، کہا جاتا ہے یمن میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں حضرت زید بن ارقمؓ فرمارہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ذات الجنب میں ورس اور زیتون کا تیل تجویز فرمایا کرتے تھے، دونوں کا الگ الگ استعمال بھی مراد ہو سکتا ہے اور ملا کر بھی۔ مالش کے طور پر ہو سکتا ہے اور منہ کے راستے استعمال کے ذریعے بھی، واللہ اعلم بالصواب۔

سنا بطور ملیّن و مسہل

(٢٤) وَعَن أَسْمَاءَ بِنْتِ عُمَيْسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَهَا: «بِمَ تستَمشِينَ؟» قَالَت: بالشُّبْرمِ قَالَ: «حارٌّ جارٌّ» . قَالَتْ: ثُمَّ اسْتَمْشَيْتُ بِالسَّنَا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَوْ أَنَّ شَيْئًا كَانَ فِيهِ الشِّفَاءُ مِنَ الْمُوْتِ لَكَانَ فِي السَّنَا» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيث حسن غَرِيب

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم کس چیز سے جلاب لیتی ہو۔ انہوں نے کہا کہ شبرم کے ساتھ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو بہت گرم ہے۔ یہ فرماتی ہیں کہ پھر میں نے سنا مکی کے ساتھ جلاب لیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی چیز ایسی ہوتی جس میں موت سے بھی شفا ہوتی تو یہ بات سنا (مکی) کے اندر ہوتی۔

مسہل اور جلاب کے ذریعے علاج:

اس حدیث میں استمشا کا ذکر ہے، استمشا یا المشی دونوں کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی مسہل اور جلاب لینا۔ یہ بھی باقاعدہ علاج کا ایک طریقہ تھا کہ کوئی ایسی چیز کھائی جاتی تھی جس سے اجابت بار بار ہو تاکہ پیٹ صاف ہو جائے اور اس میں جو فاسد ذرات اور بیماری کے اور اجزا ہیں وہ نکل جائیں۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ کسی بیماری میں پیشاب آور ادویہ لینا بھی اس میں داخل ہے کیونکہ مقصد دونوں کا ایک ہے تاکہ پیشاب یا پاخانے کے ذریعے اجزائے فاسدہ جسم سے خارج ہو جائیں لیکن مشہور معنی استمشا کا پہلا ہی ہے۔

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پہلے جلاب لینے کے لئے شُبْرُم کو استعمال کیا ہے۔ یہ شبرم ایک دوائی ہوتی ہے گھاس کی شکل میں اس پر دانے سے بھی لگتے ہیں، بعض نے کہا کہ وہ گھاس مراد ہے بعض نے کہا کہ اس کے دانے مراد ہیں جو کہ مسور کی طرح ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے جلاب لینے کو پسند نہیں فرمایا۔اور وجہ یہ بیان فرمائی ''حارٌ جارٌ'' حار کا معنی تو واضح ہے کہ گرم ہے جار کا کیا معنی ہے تو پہلے یہ سمجھئے کہ یہاں پر دو نسخے ہیں۔ایک نسخہ ہے مشکوٰۃ کا ''حارٌ حارٌ''،یعنی حار کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اس صورت میں تو مطلب واضح ہے کہ دوسرا لفظ پہلے کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ واقعتاً گرم ہے۔ اور دوسرا نسخہ وہ ہے جو ہمارے سامنے ہے ۔اس میں جار کے معنی میں دو احتمال ہیں ایک معنی تو یہ ہے کہ یہ حار ہی کی تاکید ہے۔ بعض اوقات تاکید کے لئے اسی سے ملتا جلتا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے روٹی ووٹی، چائے وائے۔اسی طرح آنحضرت ﷺ نے حار کے ساتھ جار کا لفظ بڑھا دیا۔ بعض نے کہا کہ یہاں جارٌ، جر یجر سے مشتق ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ زیادہ دست آور ہے یعنی مسہل ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے ہلکے پھلکے انداز سے جلاب آئیں جو بہت زیادہ دست جاری کر دے ایسا جلاب مناسب نہیں ہے کیونکہ اس سے ضعف اور نقاہت پیدا ہو جاتی ہے اور نقصان کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔اصول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دیا کہ مسہل کے ذریعے کا علاج کرنا ہو تو ہلکا پھلکا مسہل ہونا چاہئے تیز اور گرم نہیں ہونا چاہئے۔

اس کے بعد حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جلاب لینے کی ضرورت پڑی تو اب شُبرُم کی بجائے سنا سے جلاب لیا۔ سنا ایک خاص قسم کی گھاس ہوتی ہے جو حجاز میں بکثرت ہوتی ہے خاص طور پر مکہ مکرمہ کے علاقہ میں ،اس لئے اطبا کے ہاں یہ دوائی سنا مکی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ مشہور دوائی ہے کسی بھی دواخانے سے سنا مکی ہی کے نام سے بآسانی مل جاتی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے جلاب لیا تو ٹھیک کیا اس لئے کہ یہ ایک ایسی مفید اور شفا بخش چیز ہے کہ اگر کسی دوائی میں موت کا علاج موجود ہوتا تو سنا کے اندر ہوتا، لیکن موت کا علاج چونکہ ہے ہی نہیں تو اس میں موت کا علاج تو نہیں البتہ موت کے علاوہ اور بہت ساری بیماریوں کا علاج موجود ہے۔ تو دو باتیں سمجھ میں آئیں ایک تو یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا مکی کو جلاب لینے کے لئے موزوں ترین قرار دیا اس لئے کہ یہ ایک ہلکے درجے کی ملین ہے اس لئے اس سے جلاب تو آتے ہیں لیکن بہت زیادہ نہیں آتے۔ اور بعض ڈاکٹروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ دنیا میں قبض کشا کے طور پر ہزاروں دوائیاں مروّج رہی ہیں۔ اکثر دوائیاں چلتی ہیں پھر بند ہو جاتی ہیں اس کی جگہ اور آ جاتی ہیں اور وہ بھی بند ہو جاتی ہیں لیکن سنا مکی جن اجزا پر مشتمل ہے یہ اجزا ہر دور میں کسی نہ کسی طریقہ پر قبض کشا کے طور پر استعمال ہوتے رہیں ہیں اور آج بھی کسی نہ کسی صورت اور شکل میں استعمال ہو رہے ہیں۔ تو قبض کشا کے طور پر سنا مکی کی افادیت صدیوں سے مسلمہ چلی آ رہی ہے، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ عربوں سے پہلے کسی اور کے ہاں یہ علاج مروّج نہیں تھا اور کسی اور قدیم طب کے ہاں اس کا کوئی نشان بھی نہیں ملتا طب کے اندر سب سے پہلے اس کو عربوں نے متعارف کرایا ہے اور عربوں نے یہ چیز لی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طب پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔

سنا اور سنوت:

سنا کے بارے میں دوسری چیز یہ بیان فرمائی ہے کہ اس میں بہت ساری بیماریوں سے شفا ہے۔ چنانچہ اطبا نے اس کے بہت سارے فوائد لکھے ہیں جو متعلقہ کتابوں میں بوقت ضرورت دیکھے جا سکتے ہیں۔ ابن ماجہ وغیرہ کتابوں میں سنا کے ساتھ ایک اور چیز کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے ''سنوت''، تو شارحین میں یہ بحث چلی ہے کہ سنوت سے مراد کیا ہے۔

اس میں مختلف اقوال ہیں، ایک قول جس کو آج کل کے بہت سارے محققین نے بھی اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ اس سے مراد سوئے یا سونف ہے۔ سونف تو مشہور اور سوئے بھی سونف ہی کی طرح ایک چیز ہوتی ہے لیکن اس سے تھوڑی سی بڑی ہوتی ہے اور اس کے بھی اطبا نے بڑے فوائد لکھے ہیں۔ بعض نے کہا کہ سنوت سے مراد شہد ہے اور خاص طور پر وہ شہد جو گھی والے برتن میں رکھا گیا ہو چمڑے کی کوپیاں وغیرہ ہوتی تھیں جن میں گھی وغیرہ رکھا کرتے تھے۔ تو اس میں گھی ڈالنے کی بجائے بعض اوقات شہد ڈال دیا جاتا تھا تو کسی نہ کسی درجے میں گھی کا اثر بھی اس میں آجاتا تھا، تو بعض نے اس سے یہ شہد مراد لیا ہے۔ بعض نے اس سے کھجور مراد لی ہے۔

بعض اطبا نے یہ لکھا ہے کہ سنا اصل میں بہت اچھی چیز ہے خاص طور پر اگر بطورِ ملین اور قبض کشا کے طور پر استعمال کرنی ہو، لیکن یہ پیٹ کے اندر تھوڑی سی تیزی پیدا کرتی ہے تو سونف یا سوئے اس کے لئے مصلح کا کام دیتے ہیں اور شہد بھی مصلح کا کام کرتا ہے اس لئے کہ وہ بھی معدے کو درست کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنوت کو یہاں سنا کے مصلح کے طور پر تجویز فرمایا ہے۔

حرام چیز سے علاج مت کرو

(٢٥) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « إِنَّ اللهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ ، وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً ؛ فَتَدَاوُوا ، وَلَا تداوَوْا بحرامٍ » . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ نے بیماری بھی اتاری ہے اور دوا بھی اور ہر بیماری کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوا پیدا کی ہے۔ لہٰذا تم دوا استعمال کیا کرو اور حرام چیز کے ساتھ علاج نہ کرو۔

حرام چیز سے علاج کا حکم:

تداوی بالحرام (حرام چیز سے علاج) کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہوا ہے کہ جو چیز ویسے حرام ہے دوائی کے طور پر اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں خود حنفیہ کے اقوال مختلف ہیں، مثلاً ایک قول یہ ہے کہ جو چیزیں حرام ہیں انہیں دوا کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے، کیونکہ یہ ضرورت ہے اور ضرورت کی وجہ سے ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جایا کرتی ہیں، چنانچہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے الضرورات تبیح المحذورات۔ بعض نے کہا کہ خمر اور مسکرات کو تو دوا کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے باقی چیزوں کو استعمال کرنا جائز ہے۔ لیکن راجح اور صحیح یہی ہے کہ حرام چیز کو جس طرح ویسے استعمال کرنا ناجائز ہے اسی طرح حالتِ اختیار میں دوا کے اندر استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ حالتِ اختیار سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ اس حرام چیز سے علاج ہو سکتا ہو لیکن اس کا متبادل کسی حلال چیز کے ذریعے بھی ممکن ہو۔ اس کے بالمقابل ضرورت کا یا اضطرار کی حالت ہے۔ حالتِ اضطرار سے مراد یہ ہے کہ بیماری شدید ہو اور اس کا علاج ظن غالب کے طور پر کسی حرام چیز میں منحصر ہو کہ کوئی چیز حرام ہے لیکن اس بیماری کا علاج خاص اس چیز کے علاوہ کسی اور چیز میں معلوم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس حرام چیز کو بطورِ دوا کے استعمال کرنا جائز ہے۔ عام حالات میں دوا کے طور پر استعمال کرنا جائز نہیں ہے اس لئے کہ کئی حدیثوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تداوی بالحرام سے منع فرمایا جن میں ایک یہ زیرِ بحث حدیث بھی ہے کہ جس میں ہے کہ لاتداووا بحرام۔

دوائے خبیث سے ممانعت

(٢٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: نَهَى رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الدَّوَاءِ الْخَبِيثِ. رَوَاهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

دوائے خبیث سے منع فرمایا۔

دوائے خبیث سے کیا مراد ہے اس میں کئی احتمال ہیں اور یہ ساری چیزیں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔

1. ایک یہ کہ اس سے حرام دوا مراد ہے۔ جس دوا میں کوئی حرام چیز ڈالی ہو بغیر ضرورت کے درجے کے جائز نہیں ہے۔
2. دوسرا یہ کہ اس سے ناپاک دوا مراد ہے۔ایسی دوا جس میں کوئی ناپاک چیز ڈالی گئی ہو۔
3. تیسرا یہ کہ دوائے خبیث سے مراد ایسی دوا ہے جو بعض بیماریوں کا علاج تو ہو لیکن اپنے اندر زہریلے اثرات بھی رکھتی ہو۔چنانچہ بعض زہریں بھی اطبا کے ہاں دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً طب یونانی میں سمّ الفار ایک دوائی ہے جو بعض بیماریوں میں علاج کے طور پر استعمال کی جاتی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ایک زہر ہے۔اسی طرح سنکھیا دوائی بنیادی طور پر ایک زہر ہے لیکن اس کو مار کر اطبا نے خاص بیماریوں میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ جہاں مجبوری ہو اور اس کے برے اثرات سے تحفظ کا یقین کر لیا گیا ہو اور ماہر طبیب کی زیر نگرانی استعمال کیا جا رہا ہو وہاں ایسی دوا کا استعمال جائز تو ہے لیکن بہر حال جہاں متبادل علاج موجود ہو تو وہاں خوامخواہ اس طرح کا خطرہ مول لینا اچھا نہیں ہے کہ ایک بیماری تو ٹھیک ہو جائے لیکن اس کی جگہ دوسری کوئی بڑی بیماری لگ جانے کا خطرہ ہو۔تو مطلب یہ ہوا کہ حتی الامکان خطرناک علاج سے بچا جائے چاہے وہ دوا کے ذریعے سے ہو یا کسی اور ذریعے سے۔ ہاں کوئی اور راستہ نہ ہو اور علاج نہ کرنے کی صورت میں ویسے ہی جان جانے کا خطرہ ہو تو پھر اور بات ہے۔
4. چوتھا معنی دوائے خبیث کا ہے بدمزہ دوائی۔ مطلب یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدمزہ دوائی سے منع فرمایا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج یہی ہے کہ مریض کو علاج کے لئے خواہ مخواہ تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ بدمزہ دوائی کے بغیر اگر اس کا علاج ہو سکتا ہے تو بلا ضرورت اس کو بدمزہ دوائی نہیں دینی چاہئے یا بدمزہ دوائی دینی ہی پڑ رہی ہے لیکن اس کو کسی اور طریقہ سے خوشگوار بنایا جا سکتا ہے جیسا کہ آج

کل بہت سی دوائیاں شوگر کوٹڈ ہوتی ہیں کہ گولیاں بنائی جاتی ہیں اور ان پر مٹھاس کی تہہ لگادی جاتی ہے اور مریض اسے کھالیتا ہے اور بعض دوائیاں کیپسول کے اندر بند کرکے دے دی جاتی ہیں اگر اس طرح کی دوائی دینی ہو اور کوئی طریقہ اس کو خوشگوار بنانے کا ہو تو خوشگوار بنا کر دی جائے۔ تو اس سے پتا چلا کہ آج کل بعض دوائیوں وغیرہ میں پھلوں کے ذائقے شامل کردیئے جاتے ہیں خاص طور پر بچوں کی دوائیوں میں۔ تو یہ بھی اس حدیث کے مطابق اچھی بات ہے۔

سر درد کا پچھنوں اور پاؤں کے درد کا مہندی سے علاج

(٢٧) وَعَنْ سَلْمَى خَادِمَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتْ: مَا كَانَ أَحَدٌ يَشْتَكِي إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَعًا فِي رَأْسِهِ إِلَّا قَالَ: « احْتَجِمْ » وَلَا وَجَعًا فِي رِجْلَيْهِ إِلَّا قَالَ: «اخْتَضِبْهُمَا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت سلمیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خادمہ (باندی) تھیں وہ کہتی ہیں کہ جو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سر میں درد کی شکایت کرتا تو آپ اسے فرماتے کہ پچھنے لگالو اور جو بھی اپنے پاؤں میں درد کی شکایت کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرماتے کہ مہندی لگالو۔

یہ بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانے کے مخصوص سر درد اور پاؤں کے درد کے بارے میں فرمارہے ہیں، ان کا علاج پچھنے لگانے یا مہندی لگانے میں تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ سر درد کا یا پاؤں درد کا ہر موقع پر یہی علاج ہو، اس لئے کہ سر درد یا پاؤں درد کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں اور ہر ایک کا علاج جدا ہوتا ہے۔

یہاں ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ مہندی کے ذریعے علاج میں مرد کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ناخنوں کو مہندی نہ لگے، تاکہ ممکنہ حد تک عورتوں کے ساتھ تشبہ سے بچا جاسکے۔ لیکن یہ بظاہر اس لئے غیر ضروری معلوم

ہوتی ہے کہ یہاں بات پاؤں کی ہو رہی ہے، ہاتھوں کے ناخنوں کو رنگنے میں تو تشبہ بالنساء کا امکان ہے، پاؤں میں بظاہر ایسا نہیں ہے۔

زخم اور چوٹ کا علاج مہندی سے

(۲۸) وعنها قَالَت: مَا كَانَ يَكُونَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُرْحَةٌ وَلَا نَكْبَةٌ إِلَّا أَمَرَنِي أَنْ أَضَعَ عَلَيْهَا الْحِنَّاء. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

حضرت سلمیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی زخم ہوتا یا کوئی چوٹ لگ جاتی تو آپ مجھے حکم دیتے کہ میں اس پر مہندی رکھ دوں۔

پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت گذر چکی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مہندی کی مہک پسند نہیں تھی، لیکن یہاں چونکہ علاج کے لئے ضرورت ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گوارا فرما لیا۔ حضرت سلمیٰ فرماتی ہیں کہ آپ کے جسم پر کوئی زخم ہوتا یا کوئی داغ وغیرہ آجاتا تو آنحضرت ﷺ مجھے حکم دیتے کہ اس پر مہندی لگا دی جائے۔ چنانچہ مہندی زخموں کو مندمل کرنے میں بھی انتہائی مؤثر ہے اور کئی جلدی امراض میں بھی فائدہ مند ہے۔

آنحضرت ﷺ کا سر اور کندھوں کے درمیان پچھنے لگوانا

(۲۹) وَعَن أَبِي كَبْشَةَ الْأَنْمَارِيِّ : أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يحتجم على هامَتِهِ وَبَين كَتِفَيْهِ وَهُوَ يَقُولُ: « مَنْ أَهَرَاقَ مِنْ هَذِهِ الدِّمَاءِ فَلَا يَضُرُّهُ أَنْ لَا يَتَدَاوَى بِشَيْءٍ لِشَيْءٍ » . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وَابْنُ مَاجه

حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر کے درمیان پچھنے لگایا کرتے تھے اور اپنے دونوں کندھوں کے درمیان میں بھی لگواتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو آدمی ان خونوں کو نکال دے تو اس کو کوئی ضرر نہیں ہو گا اگر کسی بیماری کے لئے کوئی اور علاج نہ کرے۔

موچ یا چوٹ کی وجہ سے پچھنے

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ عَلَى وَرِكِهِ مِنْ وَثْءٍ كَانَ بِهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کولہے پر پچھنے لگوائے ایک موچ کی وجہ سے جو آپ کو آگئی تھی۔

وثأ کہتے ہیں ایسی چوٹ وغیرہ جس میں ہڈی نہ ٹوٹے، البتہ کسی رگ وغیرہ کو بل آجانے کی وجہ سے تکلیف محسوس ہو جس کو اردو میں موچ آنا کہا جاتا ہے۔

معراج کے موقع پر حجامت کی تاکید

(۳۱) وَعَن ابنِ مَسْعُود قَالَ: حَدَّثَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ لَيْلَةَ أُسَرِيَ بِهِ : أَنَّهُ لَمْ يَمُرَّ عَلَى مَلَأٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا أَمَرُوهُ: «مُرْ أُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيث حسن غَرِيب

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس رات کے بارے میں جب آپ کو اسراء کرائی گئی آپ نے فرمایا کہ آپ کا فرشتوں کی جس جماعت پر بھی گذر ہوا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ اپنی امت کو پچھنے لگانے کا حکم دیجئے۔

مینڈک کو دوا میں استعمال کرنے کا حکم

(۳۲) وَعَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عُثْمَانَ: أَنَّ طَبِيبًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ضِفْدَعٍ يَجْعَلُهَا فِي دَوَاءٍ فَنَهَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَتْلِهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت عبدالرحمن بن عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک طبیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا مینڈک کے بارے میں جسے وہ کسی دوائی میں ڈالنا چاہتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مینڈک کو قتل کرنے سے منع کر دیا۔

مینڈک دو قسم کا ہوتا ہے ایک دریائی یا پانی کا مینڈک دوسرا خشکی کا مینڈک۔ پانی کے مینڈک سے مراد وہ ہے جو پانی کے بغیر باہر زندہ رہ ہی نہ سکے جیسا کہ مچھلی ہوتی ہے۔اور خشکی کے مینڈک سے مراد ہے کہ وہ پانی کو پسند تو بہت کرتا ہے لیکن پانی کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔دونوں کی علامت بعض حضرات نے یہ بیان فرمائی ہے کہ دریائی مینڈک کی انگلیاں الگ الگ نہیں ہوتی بلکہ جڑی ہوئی ہوتی ہیں پورا ایک پنجا سا بنا ہوا ہوتا ہے اور خشکی کے مینڈک کی انگلیاں الگ الگ ہوتی ہیں۔ جہاں تک دریائی مینڈک کا تعلق ہے تو شافعیہ وغیرہ کے ہاں تو وہ ویسے ہی حلال ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک پانی کے جانوروں میں اصل حلت ہے اصل یہی ہے کہ وہ سارے کے سارے حلال ہیں سوائے ایک آدھ کے۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے کوئی اور جانور حلال نہیں

توشافعیہ کے نزدیک ایسے مینڈک کااستعمال بلا تکلف جائز ہوگا چاہے بیرونی استعمال کے لئے ہو یااندرونی استعمال کے لئے۔بیرونی استعمال سے مراد ہے ایسی دوائی وغیرہ جس کو کھایا نہیں جاتا مثلاًاس کو جسم پر ملا جاتااور مالش کی جاتی ہے اوراندرونی استعمال سے مراد ہے کہ اسے کھایا جائے۔دریائی مینڈک کااستعمال شافعیہ کے ہاں دونوں طرح جائز ہے ۔لیکن حنفیہ کے ہاں چونکہ یہ مینڈک حرام ہے اس لئے اس کااندرونی استعمال تو جائز نہیں ہے البتہ حنفیہ کے نزدیک پانی کے سارے کے سارے جانور پاک ضرور ہیں اگرچہ حلال نہیں ہیں اس لئے دریائی مینڈک کو بیرونی استعمال کی دوائیوں میں بلا تردد ڈالا جاسکتا ہے۔

اب رہ گیا مسئلہ خشکی کے مینڈک کا،اس کااستعمال خاص طور پر حنفیہ کے نزدیک بیرونی بھی جائز نہیں اندرونی بھی جائز نہیں،اس لئے کہ وہ ناپاک بھی ہے حرام بھی۔البتہ اسے اگر باقاعدہ ذبح کرلیا جائے تو حرام جانور کو بھی ذبح کرنے سے حنفیہ کے نزدیک وہ حلال تو نہیں ہوتاالبتہ پاک ہو جاتا ہے سوائے خنزیر کے یاامام محمد کے قول کے مطابق سوائے کتے کے ۔اس لئے ذبح کرنے کے بعد ایسے مینڈک کے اجزابیرونی استعمال کی دوائیوں میں استعمال ہو سکتے ہیں ۔اندرونی استعمال کی دوائیوں میں بغیر ضرورت شرعیہ استعمال نہیں کئے جاسکتے۔اگر ذبح نہ کیا جائے تو نہ اندرونی استعمال جائز ہے اور نہ ہی بیرونی۔

یہ حدیث حنفیہ کی دلیل ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ مینڈک کے اندر اصل یہی ہے کہ اس کو دوا کے اندر استعمال نہیں کیا جاسکتا،اس لئے کہ اس طبیب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مینڈک کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کو قتل کرنے اور مارنے سے منع فرمایا۔اس کی تاویل بعض شافعیہ کی طرف سے یہ کی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈک کے استعمال یااس کے کھانے سے منع نہیں فرمایابلکہ اس کو مارنے سے منع فرمایا اس لئے کہ اس کو مارناایک قسم کی بے رحمی ہے۔لیکن یہ محض تاویل ہی ہے اس لئے کہ جس چیز کااستعمال جائز ہو اس کو مارنے یاذبح کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں،اس لئے کہ جانور تو اللہ تعالی نے بنائے ہی انسان کے فائدے اور استعمال کے لئے ہیں مچھلی کا کھانا جائز ہے اس لئے اس کو مارنا بھی جائز ہے اس کو پانی سے نکالو اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

بکری کا کھانا جائز ہے تو اس کا ذبح کرنا بھی جائز ہے تو اگر مینڈک کا استعمال اور دوائی میں ڈالنا جائز ہوتا تو اسے مارنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے تھا۔اس کو مارنے سے منع فرمایا یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کا استعمال بھی جائز نہیں ہے۔

یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہوتا ہے کہ علاج معالجہ میں کون سے کام جائز ہیں اور کون سے ناجائز ہیں اس موضوع پر حضرت حکیم محمد مصطفی رحمہ اللہ کا ایک رسالہ ہے۔ یہ حکیم محمد مصطفیؒ وہ ہیں جنہوں نے بہشتی زیور میں طب والا یعنی نسخوں والا حصہ لکھا ہے،انہی کا ایک رسالہ جو طبّی جوہر کے نام سے بہشتی زیور کے نویں حصے میں لگا ہوا ہے اس میں اس موضوع پر انہوں نے کچھ اصول ذکر کر دیئے ہیں اور بعض جزئیات پر ان اصولوں کا انطباق بھی کیا ہے۔اس موضوع پر بصیرت پیدا کرنے کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہے۔

آنحضرت ﷺ کہاں اور کب پچھنے لگواتے تھے

(۳۳) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْتَجِمُ فِي الْأَخْدَعَيْنِ وَالْكَاهِلِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ ، وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ: وَكَانَ يحتجمُ سبعَ عشرَة وتسع عشرَة وَإِحْدَى وَعشْرين.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گردن کی دونوں رگوں کے پاس اور کندھوں کے درمیان پچھنے لگوایا کرتے تھے۔یہ ابوداؤد کی روایت ہے،ترمذی اور ابن ماجہ کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ سترہ،انیس اور اکیس تاریخ کو پچھنے لگوایا کرتے تھے۔

الکاہل کہتے ہیں اس جگہ کو جو دو کندھوں کے درمیان میں ہے اور اخدعین دو رگوں کا نام ہے جو کہ گردن میں دائیں اور بائیں جانب ہوتی ہیں،تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی پچھنے لگواتے تھے ان رگوں کے پاس،اور کبھی پچھنے

لگواتے تھے دو کندھوں کے درمیان میں۔اس کے علاوہ آپ نے حسبِ ضرورت اور جگہوں پر بھی پچھنے لگوائے ہیں۔ جیسا موقع ہوتا اس کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لگوایا کرتے تھے۔ پچھنے کہاں لگوانے ہیں اور کہاں نہیں لگوانی اس کا فیصلہ ہر انسان اور ہر بیماری کے مطابق ہی کیا جاسکتا ہے اس لئے ماہر معالج کی رائے کے بغیر اس طرح کا فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اگر کسی نے اس طرح کا فیصلہ کرلیا اور کچھ نقصان ہوا تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ چنانچہ آگے روایت آرہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے زہر کے علاج کے طور پر اپنے سر کے تالو پر پچھنے لگوائے تو حدیث کے ایک راوی معمر کہتے ہیں کہ میں نے زہر کے بغیر ہی یہاں پر پچھنے لگوا لیئے تو اس کا نقصان یہ ہوا کہ میری یادداشت ختم ہوگئی، یہاں تک کہ نماز میں فاتحہ بھی اگر کوئی مجھے تلقین کرتا تو پڑھ سکتا تھا۔اس سے پتہ چلا کہ بغیر سوچے سمجھے محض حدیث میں دیکھ کر کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جسم کے فلاں حصے پر پچھنے لگوائے ہیں آدمی خود یہ کام کرے یہ درست نہیں اس لئے کہ بیماری بیماری اور انسان انسان سے فرق پڑجاتا ہے۔

پچھنے لگوانے کے سلسلے میں تاریخوں اور دنوں کی بحث

پچھنے لگوانے کے سلسلے میں بعض حدیثوں میں بعض تاریخوں اور دنوں کا بھی ذکر آتا ہے لیکن تاریخوں اور دنوں کے بارے میں اکثر روایات سنداً ضعیف ہیں خاص طور پر دنوں کے بارہ میں۔ دنوں کے بارے میں رویات زیادہ ضعیف ہیں بنسبت تاریخوں کے۔تاریخوں کا متعدد روایات میں ذکر آتا ہے،ان میں سے بعض سنداً قابل قبول بھی ہیں،اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہے۔اس لئے اس کا مطلب سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ جن تاریخوں میں پچھنے لگوانے کو پسند فرمایا ہے وہ ہیں سترہ،انیس اور اکیس ۔یہاں مراد چاند کی تاریخیں ہیں شمسی تاریخیں نہیں۔اب ان تاریخوں کی خصوصیت کیا ہے؟ وجہ کیا ہے؟ یہ اللہ ورسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان تاریخوں کے اندر کوئی خصوصیت ہو جس سے اثر پڑتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے لوگوں کے اعتبار سے فرمائی ہو ہر ایک کے لئے یہ حکم نہ ہو۔ بہرحال اتنی بات طے شدہ

ہے کہ چاند کی تاریخوں کا خاص طور پر رات کے اوقات میں اثر پڑتا ہے۔اور رات میں خاص طور پر اس لئے کہ چاند کے اندر بھی ایک کششِ ثقل ہے اور وہ زمین کو اپنی طرف کچھ کھینچتا ہے اور اسی طرح سورج کے اندر بھی ایک کشش ہے اور سورج بھی زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور سائنسی طور پر یہ بات مسلّمہ ہے کہ چاند کی ساری تاریخوں میں کششِ ثقل یکساں نہیں ہوتی بلکہ بعض تاریخوں میں یہ زیادہ ہوتی ہے اور بعض کے اندر کم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چاند بھی اسی طرف ہوتا ہے اور سورج بھی اسی طرف ہوتا ہے چاند اور سورج دونوں ایک جہت میں آجاتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں کشش بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ سورج بھی زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور چاند بھی اسی طرف۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ ان تاریخوں میں زمین کی سطح اوپر ہو جاتی ہے۔ جب چاند اور سورج بالکل محاذات میں ہوں یعنی زمین کے ایک طرف چاند ہے اور دوسری طرف سورج ہے تو یہ کشش انتہائی کم ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف سے طرف سے چاند کھینچ رہا ہے لیکن چونکہ دوسری طرف سے سورج بھی کھینچ رہا ہے اس لئے چاند کی کشش کی تاثیر کمزور پڑ گئی۔ان تاریخوں میں زمین کی سطح سائنسدان کہتے ہیں کہ کچھ تھوڑی سی پست ہو جاتی ہے۔ سمندر میں جو مد و جزر ہوتا ہے کہ بعض تاریخوں میں پانی سمٹ جاتا ہے اور بعض دنوں میں پھیل جاتا ہے یہ بھی چاند کی اسی کشش کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جن تاریخوں میں کشش زیادہ ہوتی ہے ان تاریخوں میں سمندر کا پانی سمٹ جاتا ہے اور اس کو جزر کہتے ہیں اور جن تاریخوں میں کشش کم ہوتی ہے جوں جوں کم ہوتی چلی جاتی ہے پانی پھیلنے لگ جاتا ہے اس کو مد کہتے ہیں۔ بہر حال چاند کی تاریخوں کا زمین کی مختلف چیزوں پر اثر پڑنا مسلم ہے تو ہو سکتا ہے کہ چاند کی ان تاریخوں کا انسان کے خون پر بھی اثر پڑتا ہو۔اس لئے بعض تاریخوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حوالے سے پسند فرمایا یہ کوئی اتنی مستبعد اور عجیب بات بھی نہیں ہے۔

دنوں کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند ایام میں پچھنے لگوانے سے منع فرمایا، مثلاً آپ نے ہفتے کے دن پچھنے لگوانے سے منع فرمایا، اسی طرح منگل اور بدھ کے دنوں میں بھی پچھنے لگوانے سے منع فرمایا۔ان تین دنوں میں آپ نے پچھنے لگوانے سے منع فرمایا ہفتہ، منگل اور بدھ۔ منگل کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ یوم الدم ہے

،اوراس کی تفصیل یہ فرمائی کہ اس دن میں ایک گھڑی ایسی گھڑی ہوتی ہے کہ اس وقت میں اگر پچھنے لگوائے جائیں توخون رکتا نہیں ہے بہتا ہی رہتا ہے۔اب پتا نہیں کہ وہ گھڑی کون سی ہو،اس لئے فرمایا کہ اس دن پچھنے لگواؤ ہی نہیں ۔بدھ کے دن کے بارے میں بعض روایتوں میں یہ آتاہے کہ اس میں حضرت ایوب علیہ السلام بیماری کے اندر مبتلا ہوئے تھے۔ہفتہ اور بدھ کے دنوں کے بارے میں یہ بھی آتاہے کہ ان میں پچھنے لگوانے سے برص کی بیماری لگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔لیکن یہ ساری کی ساری روایتیں جو دِنوں کے بارے میں ہیں کافی ضعیف ہیں بلکہ ان میں سے بعض روایتوں کو موضوع بھی قرار دیا گیا ہے۔اگرانہیں صحیح مان لیا جائے تو ہو سکتاہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس سلسلے میں کوئی بات بتائی گئی ہو اور یہ بھی ہو سکتاہے کہ یہ اس زمانے اور لوگوں کے ساتھ خاص ہو۔

منگل کے دن کے بارے میں حدیثوں میں کچھ تعارض بھی ہے کہ یہاں الفصل الثانی میں جو حدیثیں آرہی ہیں ان میں منگل کے دن آپ نے پچھنے لگوانے سے منع فرمایا،لیکن آگے الفصل الثالث میں بعض روایتیں ایسی ہیں جن میں منگل کے دن آپ ﷺ نے پچھنے لگوانے کی ترغیب دی ہے تو ان میں تطبیق یہ ہے کہ ترغیب اس صورت میں ہے جبکہ منگل کا دن سترہ تاریخ کو پڑتا ہو اور ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ منگل کا دن سترہ تاریخ کے علاوہ کسی اور تاریخ میں پڑتا ہو۔

(٣٤) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَسْتَحِبُّ الْحِجَامَةَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ وَتِسْعَ عَشْرَةَ وَإِحْدَى وَعِشْرِينَ. رَوَاهُ فِي شرح السّنة.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سترہ،انیس اور کیس تاریخ کو پچھنے لگوانا پسند فرماتے تھے۔

(٣٥) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنِ احْتَجَمَ لِسَبْعَ عَشْرَةَ وَتِسْعَ عَشْرَةَ وَإِحْدَى وَعِشْرِينَ كَانَ شِفَاءً لَهُ مِنْ كُلِّ دَاءٍ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی سترہ، انیس اور اکیس تاریخ کو پچھنے لگوائے تو یہ ہر بیماری سے شفا ہو گی۔

(٣٦) وَعَن كبشةَ بنت أبي بكرة: أَنَّ أَبَاهَا كَانَ يَنْهَى أَهْلَهُ عَنِ الْحِجَامَةِ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَيَزْعُمُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَنَّ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ يَوْمُ الدَّمِ وَفِيهِ سَاعَةٌ لَا يَرْقَأُ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت کبشہ بنت ابی بکرہ فرماتی ہیں کہ ان کے والد حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر والوں کو منگل کے دن پچھنے لگوانے سے منع کیا کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نقل کرتے تھے کہ منگل کا دن خون والا دن ہے اور اس میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے جس میں خون رکتا نہیں ہے۔

یوم الدم کے معروف معنی تو یہی ہے ہیں کہ اس میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں خون رکتا نہیں ہے۔ بعض نے یہ معنی بھی بیان فرمائے کہ اس دن میں سب سے پہلا خون ہوا ہے، یعنی آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا ہے۔

(٣٧) وَعَنِ الزُّهْرِيِّ مُرْسَلًا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ احْتَجَمَ يَوْمَ الْأَرْبِعَاءِ أَوْ يَوْمَ السَّبْتِ فَأَصَابَهُ وَضَحٌ فَلَا يَلُومَنَّ إِلَّا نَفْسَهُ» . رَوَاهُ أَحْمَدُ

وَأَبُو دَاوُدَ وَقَالَ: وَقَدْ أَسْند وَلَا يَصح.

حضرت زہریؒ(مشہور تابعی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاًروایت کرتے ہیں کہ جس آدمی نے ہفتہ یابدھ کے دن پچھنے لگوائے اوراسے برص کی بیماری لاحق ہو جائے تو وہ اپنے علاوہ کسی کوملامت نہ کرے۔(یعنی اس کی اپنی غلطی کا نتیجہ ہے)۔

تعویذ گنڈوں میں شیطان کا کردار

(۳۹) وَعَنْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللهِ رَأَى فِي عُنُقِي خَيْطًا، فَقَالَ: مَا هَذَا؟، فَقُلْتُ: خَيْطٌ رُقِيَ لِي فِيهِ، قَالَتْ: فَأَخَذَهُ فَقَطَعَهُ، ثُمَّ قَالَ: أَنْتُمْ آلَ[1] عَبْدَ اللهِ لَأَغْنِيَاءُ عَنِ الشِّرْكِ؛ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُول: «إِنَّ الرُّقَى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ»، فَقُلْتُ: لِمَ تَقُولُ هَكَذَا؟ لَقَدْ كَانَتْ عَيْنِي تُقْذَفُ[2] وَكُنْتُ أَخْتَلِفُ إِلَى فُلَانٍ الْيَهُودِيِّ فَإِذَا رَقَاهَا سَكَنَتْ، فَقَالَ عَبْدُ اللهِ: إِنَّمَا ذَلِكِ عَمَلُ الشَّيْطَانِ كَانَ يَنْخَسُهَا بِيَدِهِ، فَإِذَا رُقِيَ كَفَّ عَنْهَا

[1] – منصوب على النداء أو الاختصاص.

[2] – ضبطه بعضهم بصيغة المجهول «تُقذَف» وبعضهم بصيغة الفاعل «تَقذِف»، ورجح الطيبي الأول، وقوله: «كف عنها» ذكره القاري بصيغة المجهول، لكن المعلوم أيضا متّجه أي كف الشيطان عنها، والله أعلم.

، إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكِ أَنْ تَقُولِي كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: « أَذْهِبِ الْبَاسَ ، رَبَّ النَّاسِ ، وَاشْفِ ، أَنْتَ الشَّافِي ، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَماً» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت زینب جو کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی ہیں وہ روایت کرتی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میری گردن میں ایک دھاگا بندھاہوا دیکھا تو انہوں نے کہا یہ کیا ہے ؟ میں نے کہا کہ یہ ایسا دھاگا ہے جس میں میرے لئے دم کیا گیا ہے۔ زینب کہتی ہیں کہ حضرت ابن مسعود نے اس کو لیا اور کاٹ دیا پھر فرمایا کہ اے عبداللہ کے گھر والو تمہیں شرک کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ دم اور منکے اور محبت کے تعویز شرک ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ آپ یوں کیوں کہتے ہیں حالانکہ میری آنکھ پھڑکا کرتی تھی تو میں فلاں یہودی کے پاس جایا کرتی تھی، جب وہ اس پر دم کرتا تھا تو یہ ٹھہر جاتی تھی اس کو سکون ہو جاتا تھا۔ تو ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کام تھا کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کو چھوتا اور جب اس پر دم کیا جاتا تھا تو وہ اپنا ہاتھ اس سے روک لیتا تھا، تمہارے لئے یہی کافی تھا کہ تم وہ الفاظ کہتی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے « أَذْهِبِ الْبَاسَ ، رَبَّ النَّاسِ ، وَاشْفِ ، أَنْتَ الشَّافِي ، لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَماً» (اے لوگوں کے رب اس تکلیف کو دور کردیجئے اور شفا دے دیجئے، آپ ہی شفا دینے والے ہیں، آپ کی شفا کے علاوہ کوئی اور شفا نہیں ہے، آپ ایسی شفا دیجئے جو کسی بیماری کو باقی نہ رہنے دے)۔

اس حدیث میں تمائم کا لفظ آیا ہے اور یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ تمائم تمیمہ کی جمع ہے اور تمیمہ اصل میں کہتے تھے خاص قسم کے مہروں کو جو بچوں کی گردن میں نظر بد وغیرہ سے حفاظت کے لئے ڈالتے تھے۔ اس لئے میں اس کا حاصل ترجمہ منکے کیا ہے۔ تِولہ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، معروف معنی یہ ہیں کہ ایسا عمل جس کے ذریعے

عورت اپنے خاوند کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے کرتی ہے۔ یہ بات بھی پہلے گذر چکی ہے کہ رُقی اور تعویذات کب جائز ہیں اور کب ناجائز ہیں، اس حدیث میں مذکور تمائم اور تِوَلہ کے بارے میں بھی وہی تفصیل ملحوظ رہنی چاہئے [1]۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی تعویذ اور دم ناجائز ہوتا ہے مثلاً غلط مضمون پر مشتمل ہوتا ہے اس کے باوجود اس سے فائدہ ہو جاتا ہے اس کی وجہ کیا ہے تو ایک وجہ یہاں حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کی ہے کہ اصل میں جو بیماری ٹھیک ہوتی ہے وہ حقیقت میں سچ مچ کی بیماری ہوتی ہی نہیں ہے بلکہ شیطان کی طرف سے اس بندے کو غلط کام پر لگانے کے لئے ایک شرارت ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود کی بیوی نے اپنا یہی اشکال پیش کیا کہ کسی زمانے میں میری آنکھ پھڑکا کرتی تھی اور میں ایک یہودی سے دم کرایا کرتی تھی جب وہ دم کرتا تھا تو ٹھیک ہو جاتی تھی۔ تو حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ اصل میں ہوتا یوں تھا کہ تمہیں اس کام پر لگانے کے لئے شیطان تمہاری آنکھ کو ہلاتا تھا اور یہودی جب دم کر دیتا تھا تو وہ ہلانا بند کر دیتا تھا اور تم سمجھتی تھی کہ شفا ہو گئی، حالانکہ بیماری سرے سے کوئی تھی نہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اپنی بیوی کو ایک متبادل مسنون دم بتایا ہے اور یہ الفاظ اور بھی کئی احادیث سے ثابت ہیں اور بہت ہی جامع الفاظ ہیں ہر بیماری کے لئے ان کو پڑھنا چاہئے۔ ابن ماجہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ تمہیں آنکھوں پر چھینٹے مار کر یہ دعا پڑھنی چاہئے تھی۔

---

[1] – في نيل الأوطار (٨/٢٤٤) : فأما ما تحبب به المرأة إلى زوجها من كلام مباح كما يسمى الغنج وكما تلبسه للزينة أو تطعمه من عقار مباح أكله أو أجزاء حيوان مأكول مما يعتقد أنه سبب إلى محبة زوجها لها لما أودع الله تعالى فيه من الخصيصة بتقدير الله لا أنه يفعل ذلك بذاته. قال ابن رسلان: فالظاهر أن هذا جائز لا أعرف الآن ما يمنعه في الشرع.

بخاری کی ایک روایت کے مطابق آں حضرت ﷺ یہ دعا پڑھنے کے ساتھ تکلیف والی جگہ پر اپنا دایاں ہاتھ بھی پھیرتے تھے[1]۔

جنات اور آسیب کا عمل

(٤٠) وَعَن جَابر قَالَ: سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ النُّشْرَةِ فَقَالَ: « هُوَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ » . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ شیطان کے عمل میں سے ہے۔

نُشرہ (exorcism) سے مراد ہے ایسا عمل ایسا دم وغیرہ جس کا مقصد جنات اور آسیب وغیرہ کے اثر کو زائل کرنا ہو اور بعض نے کہا کہ اس کا مقصد جنون کو زائل کرنا ہوتا تھا، اصل میں جنون کے بارے میں بھی یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ بھی جنات کے اثر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے عملیات میں وبھی وہی تفصیل ہے جو عملیات کے بارے میں پہلے گذر چکی ہے کہ مضمون جائز ہو کوئی شرکیہ بات اس میں نہ پائی جائے تو جائز ہے و گرنہ ناجائز ہے[2]۔ اس زمانے میں اس طرح کے عملیات زیادہ ایسے ہوتے تھے جن میں شیاطین وغیرہ سے مدد طلب کی گئی ہوتی تھی، اس لئے آں حضرت

---

١ – صحیح بخاری حدیث نمبر ۵۷۴۳ کتاب الطب: باب رقیۃ النبی ﷺ۔

٢ – في السنن الصغير للبيهقي (٧٥/٤) : والنشرة ضرب من الرقية والعلاج يعالج به من كان يظن به مس من الجن، وكل ذلك إذا كانت الرقية بغير كتاب الله وذكره، فإذا كانت بما يجوز فلا بأس بها على وجه التبرك بذكر الله " وقال في السنن الكبرى : والقول فيما يكره من النشرة وفيما لا يكره كالقول في الرقية.

ﷺ نے اسے شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ نُشرۃ کی جائز صورتوں کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں کافی تفصیل سے بحث کی ہے[1]۔

تریاق، تمائم اور شعر کی مذمت

(٤١) وَعَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: « مَا أُبَالِي مَا أَتَيْتُ إِنْ أَنَا شَرِبْتُ تِرْيَاقًا أَوْ تَعَلَّقْتُ تَمِيمَةً أَوْ قُلْتُ الشِّعْرَ مِنْ قِبَلِ نَفْسِي » . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں کیا کام کر رہا ہوں اگر میں تریاق پینے لگ جاؤں یا منکا لٹکاؤں یا اپنی طرف سے شعر کہنے لگ جاؤں۔

یہاں مشکوۃ کے مروجہ نسخے میں حدیث کے راوی کا نام ہے عبداللہ بن عمر ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ عبداللہ ابن عمر نہیں ہیں بلکہ اس حدیث کو روایت کرنے والے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔

شعر کے ساتھ من قبل نفسی کی قید لگائی ہے کہ اپنی طرف سے شعر کہوں اس لئے کہ برا شعر کہنا تو مطلقاً مذموم ہے اور اچھا شعر کہنا اگرچہ مذموم نہیں ہے لیکن اچھا شعر بنانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے منافی ضرور ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے وما علمناه الشعر وماينبغى له [يس : ٦٩] ، یہ

1۔ فتح الباری ۱۰/۲۳۳ کتاب الطب: باب ہل یستخرج السحر۔

توبکثرت ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے دوسروں کے شعر پڑھے، لیکن اپنی طرف سے شعر کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت نہیں تھی۔ اتفاقی طور پر کلام موزوں آپ کی زبان پر جاری ہو جائے تو یہ الگ بات ہے۔ مزید تفصیل ان شاء اللہ باب البیان والشعر میں آجائے گی۔

جھاڑ پھونک اور داغ توکل کے منافی

(٤٢) وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « مَنْ اكْتَوَى أَوِ اسْتَرْقَى فَقَدْ بَرِئَ مِنَ التَّوَكُّلِ » . رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيّ وَابْن مَاجَه.

حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی داغ کے ذریعے علاج کروائے یا جھاڑ پھونک کروائے تو وہ توکل سے بری ہے۔

(٤٣) وَعَنْ عِيسَى بْنِ حَمْزَةَ قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى عبدِ الله بن عُكيم وَبِهِ حُمْرَةٌ فَقُلْتُ: أَلَا تُعَلِّقُ تَمِيمَةً؟ ، فَقَالَ: نَعُوذُ بِاللهِ مِنْ ذَلِكَ ، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِلَ إِلَيهِ ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُد .

عیسی بن حمزہؒ کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اس حال میں کہ ان کا جسم سرخ ہو رہا تھا تو میں نے کہا کہ آپ تعویذ کیوں نہیں لٹکاتے انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی اس سے پناہ مانگتا ہوں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو آدمی کوئی چیز لٹکائے تو اس کو اسی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

بعض بیماریوں میں دم

(٤٤-٤٥) وَعَن عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ» . رَوَاهُ أَحْمد وَالتِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد. وَرَوَاهُ ابْن مَاجَه عَن بُرَيْدَة

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دم نہیں ہوتا مگر نظر بد کی وجہ سے یا زہریلے جانور کے ڈس لینے کی وجہ سے، یہ حدیث تو (عمران بن حصینؓ سے) احمد ترمذی اور ابوداود نے روایت کی ہے، اسی مضمون کی ایک حدیث ابنِ ماجہ حضرت بریدہؓ سے روایت کی ہے۔

(٤٦) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ أَوْ دَمٍ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دم نہیں ہوتا مگر نظر بد لگ جانے کی وجہ سے یا زہریلے جانور کے ڈس لینے سے یا خون (یعنی نکسیر وغیرہ) سے۔

(٤٧) وَعَن أَسمَاء بنت عُميس قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ وَلَدَ جَعْفَرٍ تُسْرِعُ إِلَيْهِمُ الْعَيْنُ أَفَأَسْتَرْقِي لَهُمْ؟ ، قَالَ: «نَعَمْ ؛ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابِقَ الْقَدَرِ لَسَبَقَتْهُ العينُ » . رَوَاهُ أَحْمد وَالتِّرْمِذِيّ وَابْن مَاجَه

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ جعفر کے بیٹوں کو جلدی نظر لگ جاتی ہے تو کیا میں انہیں دم کروادوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اس لئے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہوتی جو تقدیر سے سبقت لے جانے والی ہوتی تو نظر بد تقدیر سے سبقت لے جاتی۔

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضرت جعفر بن ابی طالبؓ جنہیں جعفر طیار بھی کہا جاتا ہے ان کے نکاح میں تھیں اس لئے اس لئے کہا کہ جعفر کی اولاد کو نظرِبد لگ جاتی ہے یعنی میری اولاد کو جو جعفر سے ہے نظر بد لگ جاتی ہے۔حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں بھی رہی ہیں تو یہ کئی صحابہ کے نکاح میں رہی ہیں۔

نظرِبد وغیرہ سے متاثر ہونا روحانی کمال کے منافی نہیں ہے:

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظرِبد وغیرہ سے متاثر ہونا مقبولیت یا روحانی کمال کے منافی نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں جن کی بات ہو رہی ہے وہ حضرتِ جعفر بن ابی طالب کے بچے ہیں، حضرت جعفرؓ جلیل القدر صحابی، حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور خاندانِ نبوت کے چشم وچراغ ہیں۔

(٤٨) وَعَن الشَّفاءِ بنت عبد الله قَالَتْ: دَخَلَ رَسُولُ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا عِنْدَ حَفْصَةَ فَقَالَ: «أَلَا تُعَلِّمِينَ هَذِهِ رُقْيَةَ النَّمْلَةِ كَمَا عَلَّمْتِيهَا الْكِتَابَةَ؟» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

ترجمہ: حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

گھر میں تشریف لائے جبکہ میں حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس موجود تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے (یعنی حضرت حفصہؓ کو) نملہ کا دم کیوں نہیں سکھا دیتیں جیسا کہ تم نے انہیں لکھنا سکھایا ہے۔

شفا بنت عبداللہؓ ایک فاضل خاتون:

حضرت شفا بنت عبداللہ بڑے درجے کی صحابیات میں سے ہیں اور پڑھی لکھی خاتون سمجھی جاتی تھیں۔ لکھنا پڑھنا بھی جانتی تھیں جبکہ اس زمانے میں ایسے مرد بھی بہت کم ہوتے تھے جنہیں لکھنا پڑھنا آتا ہو خواتین تو بہت ہی کم ہوتی تھیں۔ان کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ یہ عقل منداور فاضل عورتوں میں سے سمجھی جاتی تھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر بکثرت تشریف بھی لاتے تھے اور بعض اوقات قیلولہ بھی فرماتے تھے اس لئے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک مستقل بستر تیار کر رکھا تھا اور بعد میں وہ بستر کئی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا اور لوگوں نے اسے اپنے پاس بطور تبرک کے رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان پر بہت زیادہ اعتماد فرماتے تھے ان کے تذکرہ نگاروں ابن حجر اور ابن عبدالبر وغیرہ نے لکھا ہے بہت سے معاملات میں مشورے کے اندر ان کی رائے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے مشورہ بھی اہتمام سے لیا کرتے تھے اور بعض موقعوں پر حضرت عمرؓ نے بازار کے امور کی بھی ذمہ داری ان کو سونپی ہے، طبقات ابن سعد میں ہے کہ بازار کی ذمہ داریاں سونپے جانے کو ان کے بیٹے پسند نہیں کرتے تھے[1]۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امورِ ریاست میں عورت مشورہ کی اہل سمجھی جاتی ہے۔اگر حجاب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عورت کی صلاحیتوں سے استفادہ کر لیا جائے

---

۱ – ويقال إن عمر بن الخطاب استعملها على السوق، وولدها ينكرون ذلك ويغضبون منه (الطبقات الكبرى ۳۷۹/۱ ترجمة أبي حثمة).

تو اس میں کوئی حرج نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے ایک صاحبزادے سلیمان بن أبي حثمہ کو قیامِ رمضان کے لئے عورتوں کا امام مقرر کیا تھا، بعد میں حضرت عثمانؓ نے انہیں عورتوں اور مردوں کا مشترکہ امام مقرر کیا تھا[1]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شفابنت عبداللہ سے کہا کہ جیسے تم نے حفصہ کو لکھنا سکھایا ہے انہیں نملہ کا دم بھی سکھادو۔ یہ نملہ پہلے بھی گذر چکا ہے ایک بیماری ہے جس میں جسم پر دانے سے نکل آتے ہیں۔ اور بعض نے اس کا ترجمہ چکن پاکس یا کاکڑا لاکڑا بھی کیا ہے۔ حضرت شفاؓ اس کا ایک دم جانتی تھی اور انہیں زمانۂ جاہلیت سے ہی آتا تھا اسلام میں نہیں سیکھا تھا البتہ انہوں نے اپنا یہ دم اسلام لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی اجازت دے دی تھی اس لئے کہ اس میں کوئی خلافِ شرع مضمون نہیں تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں اور ابنِ عبدالبر نے الاستیعاب میں ان کے حالات کے اندر وہ دم نقل بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے بعض الفاظ کا صحیح تلفظ کیا ہے یہ میں صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا تاہم وہ لفظ یہ ہیں «بِسْمِ اللهِ، صلو صلب جبر تَعَوُّذًا مِنْ أَفْوَاهِهَا فَلا تَضُرُّ أَحَدًا، اللّٰهمّ اكْشِفِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ» ۔ ایک خاص طریقہ کار بھی ہے کہ کُرکُم[2] کی لکڑی پر یہ الفاظ سات مرتبہ پڑھ کر دم کیا جائے اور اس کے بعد اسے ایک پتھر پر رکھ کر شراب کا سرکہ اس لکڑی پر ملا جائے اور پھر وہ لکڑی بیمار پر ملی جائے۔ یہ رقیہ شفا پہلے سے جانتی تھیں، آں حضرت ﷺ نے صرف اس کی اجازت مرحمت فرمائی ہے، بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے یوں سوال کیا تھا إني كنت أرقي برقى الجاهلية، اپنے اس دم کو جاہلیت کا دم کہہ کر پوچھ رہی ہیں، اس کے باوجود آپ ﷺ نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی، اس سے پتا چلا کہ دم کے جواز کے لئے اتنا ہی کافی ہے وہ خلافِ شریعت نہ ہو اس کا نص سے ثابت ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ تو زمانہ

---

١ – الطبقات الكبرى لابن سعد (١٩/٥) ترجمة سليمان بن أبي حثمة.

2- وَرس کی طرح کی ایک بوٹی ہے، بعض نے اس کا ترجمہ زعفران کیا ہے۔

جاہلیت سے چلا آرہا تھا اور یہ بھی پتہ چلا کہ دم وغیرہ کی اگرچہ اجازت ہے لیکن بنیادی طور پر یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ باقی علاج وغیرہ تجربے سے تعلق رکھتے ہیں یہ بھی تجربے سے تعلق رکھتا تھا کہ یہ دم زمانہ جاہلیت سے چلا آرہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی تعلیم نہیں دی۔

عورت کا لکھنا پڑھنا سیکھنا:

یہاں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ تم انہیں نملہ کا دم سکھادو جیسا کہ تم نے انہیں لکھنا سکھایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے کتابت سیکھنا، لکھنا پڑھنا سیکھنا جائز ہے۔ بعض علما نے اس کو ممنوع بھی قرار دیا ہے لیکن صحیح یہی معلوم ہوتا ہے یہ کہ جائز ہے۔ جائز ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ناجائز ہونے کی کوئی صحیح دلیل موجود نہیں ہے اور کاموں کے اندر اصل اباحت ہوتی ہے اس لئے حجاب وغیرہ کے ضروری احکام کی پابندی کرتے ہوئے کوئی عورت اس طرح کی کوئی چیز سیکھ لے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت حفصہ نے ان سے لکھنا سیکھا تھا اور یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی تھی اس کے باوجود آپ نے اس پر انکار نہیں فرمایا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ لکھنا پڑھنا سیکھنا عورت کے لئے جائز ہے۔

عورت کا دنیوی ہنر سیکھنا:

اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ عورت کو دین کا علم تو بقدرِ ضرورت حاصل کرنا ہی چاہئے کیونکہ بقدرِ ضرورت دین کا علم حاصل کرنا مردوں کی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے اس کے علاوہ عورت حجاب کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اگر کوئی دنیاوی ہنر یا کام سیکھ لے یا کسی دنیاوی علم میں مہارت حاصل کرلے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے جیسا کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کے کتابت سیکھنے پر انکار نہیں فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ

حضرت حفصہ کو باقاعدہ نملہ کا دم سیکھا دو حالانکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دم اور منترا گرچہ جائز ہیں لیکن یہ دین کا حصہ نہیں بلکہ ایک دنیاوی کام ہیں تو ایک دنیاوی فن حضرت شفابنت عبداللہ کے پاس تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنا یہ فن اور ہنر حضرت حفصہ کو بھی سکھا دو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے میں حضرت عروۃ بن زبیر کہتے ہیں ما رأیتُ أعلم بفقہ ولا بطب ولا بشعر من عائشۃ میں نے حضرت عائشہ سے زیادہ فقہ، طب اور شعر کو جاننے والا کوئی نہیں دیکھا تو اس سے پتا چلا کر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا صرف دینی علوم کی ماہر نہیں تھیں بلکہ طب اور شعر پر بھی انہیں اچھی طرح عبور حاصل تھا اس سے پتا چلا کہ دنیاوی ہنر عورت کے لئے سیکھنا بالکلیہ ناجائز نہیں ہے۔

نظر بد کے علاج کے لئے غسل کا طریقہ

(٤٩) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ: رَأَى عَامِرُ بْنُ رَبِيعَةَ سَهْلَ بْنَ حُنَيْفٍ يَغْتَسِلُ فَقَالَ: وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ كَالْيَوْمِ وَلَا جِلْدَ مُخَبَّأَةٍ قَالَ: فَلُبِطَ سَهْلٌ فَأُتِيَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَقِيلَ لَهُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ هَلْ لَكَ فِي سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ؟ وَاللّٰهِ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ ، فَقَالَ: « هَلْ تَتَّهِمُونَ لَهُ أَحَدًا؟ » فَقَالُوا: نَتَّهِمُ عَامِرَ بْنَ رَبِيعَةَ. قَالَ: فَدَعَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامِرًا فَتَغَلَّظَ عَلَيْهِ وَقَالَ: « عَلَامَ يَقْتُلُ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ؟ أَلَا بَرَّكْتَ؟ اغْتَسِلْ لَهُ » . فَغَسَلَ لَهُ عَامِرٌ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ وَمِرْفَقَيْهِ وَرُكْبَتَيْهِ وَأَطْرَافَ رِجْلَيْهِ وَدَاخِلَةَ إِزَارِهِ فِي قَدَحٍ ثُمَّ صُبَّ عَلَيْهِ. فَرَاحَ مَعَ النَّاسِ لَيْسَ لَهُ بَأْس. رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ وَرَوَاهُ مَالِكٌ وَفِي رِوَايَتِهِ: قَالَ: «إِن الْعين حق تَوَضَّأ لَهُ».

حضرت ابو امامہ سہل بن حنیف کہتے ہیں کہ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم میں نے آج کے دن کی طرح کوئی خوبصورت جلد نہیں دیکھی حتی کہ کسی پردہ نشین عورت کی بھی جلد (ایسی نہیں دیکھی)، حضرت عامر بن ربیعہ کا یہ کہنا ہی تھا کہ حضرت سہل غش کھا کر گر پڑے۔ انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور عرض کیا گیا یارسول اللہ کیا آپ کو حضرت سہل بن حنیف کے علاج میں رغبت ہے، اللہ کی قسم وہ تو اپنا سر بھی اوپر نہیں اٹھا رہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تمہارا کسی کے بارے میں خیال ہے (کہ فلاں کی نظر لگ گئی ہوگی) تو لوگوں نے کہا کہ ہمارا عامر بن ربیعہ کے بارے میں خیال ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عامر کو بلایا اور ان پر اظہار ناراضگی فرمایا اور یہ فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے بھائی کو قتل کیوں کرتا ہے، تم نے انہیں دیکھ کر دعائے برکت کیوں نہ کردی اب ان کے لئے اعضا دھوؤ۔ چنانچہ حضرت عامرؓ نے ان کے لئے اپنے چہرے اور ہاتھوں کہنیوں گھٹنوں اور پاؤں کے اطراف اور تہہ بند کے اندرونی حصے کو ایک پیالے میں دھویا، پھر وہ برتن حضرت سہل پر انڈیل دیا گیا تو حضرت سہل بن حنیف لوگوں کے ساتھ ایسی حالت میں ہو گئے کہ انہیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں۔ مؤطا امام مالک کی ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نظر بد لگ جانا برحق ہے لہٰذا تم ان کے لئے وضو کرو چنانچہ عامر نے ان کیلئے وضو کیا۔

(٥٠) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنَ الْجَانِّ وَعَيْنِ الْإِنْسَانِ حَتَّى نَزَلَتِ الْمُعَوِّذَتَانِ، فَلَمَّا نَزَلَتْ أَخَذَ بِهِمَا وَتَرَكَ سِوَاهُمَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ ، وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيث حسن غَرِيب.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پناہ

مانگا کرتے تھے جنوں سے اور انسانوں کی نظرِ بد سے یہاں تک کہ معوذ تین نازل ہو گئیں۔ جب یہ نازل ہو گئیں تو آپ نے ان دونوں کو اختیار فرمایا اور باقی چیزوں کو چھوڑ دیا۔

مطلب یہ کہ پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں پناہ مانگا کرتے تھے اعوذ باللہ من الجان وعین الانسان کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں جنوں سے بھی اور انسانوں کی نظر بد سے بھی، لیکن اس کے بعد معوذ تین نازل ہو گئیں یعنی سورہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس تو پناہ مانگنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں استعمال کرنے لگے پہلے جو کلمات استعمال فرماتے تھے انہیں چھوڑ دیا۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ پہلے جو کلمات تھے وہ غلط تھے مضمون ان کا بھی صحیح ہے۔ نبی کریم ﷺ کی زبان سے جو مضمون صادر ہو ظاہر ہے کہ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ چھوڑنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دو سورتوں کے اندر جتنی جامعیت ہے وہ جامعیت ان کلمات کے اندر نہیں ہے اس لئے کہ ان سورتوں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی گئی ان میں ہر قسم کے شرور و فسادات بلیات اور مصائب اور تکالیف ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ یہ سورتیں اتنی جامع ہیں کہ کوئی بری چیز بچتی نہیں ہے، مثلاً یہ ہے من شر ما خلق تو سب کچھ تو اسی کے اندر آ گیا باقی ساری تو تخصیص مع التعمیم ہے وگرنہ تو من شر ما خلق کے اندر ہی سب کچھ آ گیا کہ اللہ کی ہر مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ کی کوئی مخلوق بھی میرا کوئی نقصان نہ کر سکے مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔

جنات اور آسیب کا اثر:

یہ حدیثیں اس طرح کی اور بھی کئی حدیثیں ہیں کہ جن میں جنات وغیرہ اور ان کے اثر سے پناہ مانگی گئی ہے اس سے پتا چلا کا جنات اور آسیب کا انسان پر اثر ہو جاتا ہے یہ بالکل خلافِ حقیقت بات نہیں ہے۔ البتہ ہمارے عرف اور ماحول میں حقیقت کم ہوتی ہے اور توہم پرستی زیادہ ہوتی ہے۔ جن بیماریوں میں جنات اور آسیب کا اثر سمجھا جاتا ہے ان میں بہت تھوڑی ہوتی ہیں جو واقعی اس طرح کے کسی اثر کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ زیادہ تر وہ ذہنی اور نفسیاتی بیماری ہوتی ہے اور اس کو جنات وغیرہ کا اثر سمجھ لیا جاتا ہے اور عامل اور کاروباری قسم کے لوگ لوگوں کو مزید توہمات میں مبتلا

کر دیتے ہیں۔ بیماری کچھ اور ہوتی ہے مثلاً نفسیاتی بیماری ہوتی ہے لیکن وہ خوامخواہ دھونیاں دے دے کے ناک کا براحال کر دیتے ہیں۔ تو اسلام میں یہ تو نہیں ہے کہ جنات اور آسیب کا اثر ہوتا ہی نہیں ہے بلکہ ہوتا ہے اور جہاں ہوتا ہے اس کا علاج بھی ہو سکتا ہے اگرچہ یہ علاج بھی کوئی شرعی معاملہ نہیں ہے بلکہ زیادہ تر تجربے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں میں اور جنات اور آسیب کے اثر میں التباس ہو جاتا ہے بیماری کچھ اور ہوتی ہے سمجھا کچھ اور جاتا ہے۔

(٥١) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ لِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «هَلْ رُئِيَ فِيكُمُ الْمُغَرِّبُونَ؟» قُلْتُ: وَمَا الْمُغَرِّبُونَ؟ قَالَ: «الَّذِينَ يَشْتَرِكُ فِيهِمُ الْجِنُّ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد. وذُكر حديثُ ابْن عباسٍ: «خيرَ مَا تداويتم» فِي «بَاب التَّرَجُّل».

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ تمہارے اندر مغرّبین نظر آتے ہیں؟ میں نے کہا کہ مغربین کون سے ہوتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ لوگ جن میں جنات شریک ہو جاتے ہیں۔

''المغربون'' غرابت سے مشتق ہے، جس کے معنی اجنبیت کے ہوتے ہیں، یعنی وہ لوگ جن میں کسی اجنبی چیز کا دخل ہو، یہاں حضور اقدس ﷺ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ لوگ جن میں جِنّ شریک ہوں۔ جن شریک ہونے کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بیوی سے ہمبستری کرنے سے پہلے اللہ کا نام نہ لیا جائے تو اس سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے اس میں شیاطین کا اثر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس دعا کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں بھی شیطان کے اثر سے بچائیے جو اولاد آپ ہمیں عطا کریں گے اسے بھی شیطان کے اثر سے بچائیے۔ جب یہ دعا پڑھیں گے اور یہ دعا قبول ہو گی تو اولاد کا شیطانی اثرات سے محفوظ ہونا یقینی ہو گا، اگر یہ دعا نہیں پڑھیں گے تو اس اولاد میں شیطانی اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الذین یشترک فیہم الجن یعنی جن میں جنات شریک ہوتے ہیں یعنی جن پر جنات اور شیاطین یا آسیب وغیرہ کا اثر ہوتا ہے۔ جنات کی شرکت کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آدمی شیاطین کے بہکاوے میں آکر غلط کام کرنے لگ جائے۔ مزید تفصیل کے لئے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت [وشاركهم في الأموال والأولاد] کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

الفصل الثالث

معدہ انسانی صحت کی اساس

(٥٢) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « الْمِعْدَةُ حَوْضُ الْبَدَنِ وَالْعُرُوقُ إِلَيْهَا وَارِدَةٌ ؛ فَإِذَا صَحَّتِ الْمِعْدَةُ صَدَرَتِ الْعُرُوقُ بِالصِّحَّةِ ، وَإِذَا فَسَدَتِ الْمِعْدَةُ صَدَرَتِ الْعُرُوقُ بِالسَّقَمِ»

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ معدہ بدن کا حوض ہے اور رگیں اس کی طرف غذا لینے کیلئے آتی ہیں ، جب معدہ صحیح ہو تو رگیں صحت لے کر واپس لوٹتی ہیں اور جب معدہ خراب ہو تو رگیں بیماری لے کر واپس لوٹتی ہیں۔

اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور دونوں باتیں اس حدیث کے عموم میں داخل ہیں۔

پہلا مطلب یہ کہ اس حدیث کا تعلق طبِّ ظاہر کے ساتھ ہے، مطلب یہ ہے کہ انسانی صحت کا کافی حد تک دارومدار معدہ پر ہے۔ معدہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حوض اور تالاب کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور رگوں وغیرہ کو

یا جتنا بھی غذا کا پورے جسم میں خون کے ذریعے سپلائی کا نظام ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشبیہ دی ہے وارده کے ساتھ۔ وارده ان جانوروں کو کہتے ہیں جو کسی حوض یا تالاب یا گھاٹ وغیرہ پر پانی پینے کے لئے آئیں۔ تو اگر تالاب صاف ستھرا ہے تو یہ جانور صاف ستھرا پانی لے کر جائیں گے اور اگر وہ تالاب گندا ہے تو یہ جانور بھی گندا پانی لے کر جائیں گے اسی طرح اگر معدہ صحیح سالم ہے اور اس میں جو غذا ڈالی گئی ہے وہ بھی صاف ستھری ہے تو پورے جسم میں صحت کی سپلائی ہوگی اور صحت مند غذا پہنچے گی اور اگر معدے میں ہی خرابی ہے یا کوئی گندگی ہے بیماری کے اجزا اور جراثیم ہیں تو اس کا اثر پورے جسم پر پڑے گا اور پوری صحت جسمانی اس سے متأثر ہوگی۔

دوسرا مطلب اس حدیث یہ ہے کہ اس کا تعلق طب روحانی کے ساتھ ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ حلال کی خوراک اگر انسان کے پیٹ میں جائے تو اس سے انسان کا سارا بدن صحیح ہو جاتا ہے یعنی نیک کاموں کی توفیق ملتی ہے اور حرام کی خوراک اگر انسان کے پیٹ میں چلی جائے تو اس سے انسان کا پورا جسم بگڑ جاتا ہے یعنی سارے اعضا سے غلط کام صادر ہوتے ہیں۔ تو انسان کے نیک اور بد ہونے کا دارومدار اس غذا پر ہے جو انسان کھاتا ہے کہ وہ حلال کی ہے یا حرام کی۔ یہ دو مطلب اس حدیث کے جو بیان کئے گئے ہیں اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی اس میں داخل ہیں۔

بچھو کے ڈسنے کا علاج

(۵۳) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: بَيْنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ يُصَلِّي فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْأَرْضِ ، فَلَدَغَتْهُ عَقْرَبٌ ، فَنَاوَلَهَا رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَعْلِهِ فَقَتَلَهَا ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ: «لَعَنَ اللّٰهُ الْعَقْرَبَ مَا تَدَعُ مُصَلِّيًا وَلَا غَيْرَهُ أَوْ نَبِيًّا وَغَيْرَهُ» ، ثُمَّ دَعَا بِمِلْحٍ وماءٍ ، فَجعله فِي إِناءٍ ثمَّ جَعَلَ يَصُبُّهُ عَلَى

أُصْبُعِهِ حَيْثُ لَدَغَتْهُ وَيَمْسَحُهَا وَيُعَوِّذُهَا بِالْمُعَوِّذَتَيْنِ. رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ .

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اسی اثنا میں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ نے اپنا دست مبارک زمین پر رکھا تو آپ کو ایک بچھو نے ڈس لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا جوتا رسید کیا اور اس کو مار ڈالا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو بچھو پر کہ یہ نہ تو نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو یا یوں فرمایا کہ نبی کو بھی نہیں چھوڑتا اور غیر نبی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ پھر آپ نے کچھ نمک منگوایا اور پانی منگوایا اور اس نمک اور پانی کو ایک برتن میں ڈالا، پھر اسے اپنی اس انگلی پر ڈالنے لگے جہاں پر بچھو نے آپ کو ڈسا تھا اور اس پر اپنی انگلی پھیرنے لگے اور ان پر معوذتین کے ذریعے دم کرنے لگے۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بظاہر دو علاجوں کو جمع کیا ایک علاج بالدواء اور دوسرے علاج بالقرآن ۔علاج بالقرآن تو یہ کہ آپ نے معوذتین پڑھیں اور علاج بالدواء یہ کہ اس پر نمک ملا ہوا پانی لگایا، اس لئے کہ نمک کے اندر زہر کو کم کرنے یا ختم کرنے کی تاثیر ہوتی ہے ، چنانچہ بعض اطبا سے سنا ہے کہ اگر کسی جگہ پر بھڑ کاٹ لے تو فوری طور پر وہاں نمک لگا دیا جائے تو اس کے زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ بہر حال نمک کے اندر زہر کو کم کرنے یا ختم کرنے کی صلاحیت ہے۔

تبرک والی چیز کے ذریعے علاج

(٥٤) وَعَن عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَوْهَبٍ قَالَ: أَرْسَلَنِي أَهْلِي إِلَى أُمِّ سَلَمَةَ بِقَدَحٍ مِنْ مَاءٍ ، وَكَانَ إِذَا أَصَابَ الْإِنْسَانَ عَيْنٌ أَوْ شَيْءٌ بَعَثَ إِلَيْهَا مِخْضَبَهُ

فَأَخْرَجَتْ مِنْ شَعْرِ رَسُولِ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَكَانَتْ تُمْسِكُهُ فِي جُلْجُلٍ مِنْ فِضَّةٍ ، فَخَضْخَضَتْهُ لَهُ فَشَرِبَ مِنْهُ ، قَالَ: فَاطَّلَعْتُ فِي الْجُلْجُلِ فَرَأَيْت شَعرَاتٍ حَمْرَاء. رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

عثمان بن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ میرے گھر والوں نے مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں پانی کا ایک پیالہ دے کر بھیجا اور جب کسی انسان کو نظر بد لگ جاتی تھی یا کوئی اور بیماری لاحق ہوتی تھی تو وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف چھوٹا ٹب (یا بڑا پیالہ) بھیج دیتا تھا تو وہ (حضرت ام سلمہؓ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو نکالتیں اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے یہ بال چاندی کی ایک نلکی سی میں سنبھال کر رکھے ہوئے تھے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس کے لئے ان بالوں کو پانی میں ڈال کر حرکت دیتیں تو وہ شخص اس پانی کو پی لیتا اور اسے شفا ہو جاتی تھی۔ عثمان بن عبداللہ ابن موہب کہتے ہیں کہ میں نے اس نلکی میں جھانک کر دیکھا تو میں نے اس نلکی میں سرخ رنگ کے بال دیکھے۔

کھمبی اور عجوہ کی افادیت

(٥٥) وَعَن أبي هريرةَ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوا لرسولِ الله: الْكَمْأَةُ جُدَرِيُّ الْأَرْضِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْكَمْأَةُ مِنَ الْمَنِّ وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ وَالْعَجْوَةُ مِنَ الْجَنَّةِ وَهِيَ شِفَاءٌ مِنَ السُّمِّ» . قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَأَخَذْتُ ثَلَاثَةَ أَكْمُؤٍ أَوْ خَمْسًا أَوْ سَبْعًا فَعَصَرْتُهُنَّ وَجَعَلْتُ مَاءَهُنَّ فِي قَارُورَةٍ وَكَحَّلْتُ بِهِ جَارِيَةً لِي عَمْشَاءَ فَبَرَأَتْ. رَوَاهُ

التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ حسن.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے کچھ آدمیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کھنبی زمین کی چیچک ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھنبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا ہے اور عجوہ کھجور جنت میں سے ہے اور یہ زہر سے شفا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے تین یا پانچ یا سات کھنبیاں لیں اور ان کو نچوڑا اور ان کا پانی ایک شیشی میں ڈال لیا اور اسے سرمے کی طرح اپنی ایک باندی کو لگایا جو کہ چُندھی تھی تو اس کی برکت سے وہ تندرست ہو گئی۔

عجوہ کھجور اور کھنبی کے بارے میں کچھ احادیث کتاب الاطعمۃ میں گذر چکی ہیں، وہاں ان پر بات بھی ہو چکی ہے۔

شہد کی افادیت

(٥٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ لَعِقَ الْعَسَلَ ثَلَاثَ غَدَوَاتٍ فِي كلِّ شهر لم يصبهُ عَظِيم الْبلَاء»

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ جو آدمی ہر مہینے میں تین دن صبح کے وقت شہد چاٹ لے تو اس کو کوئی بڑی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہد بہت ساری بیماریوں سے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ اس حدیث کی سند محدثانہ نقطۂ نظر سے اتنی صحیح نہیں ہے، تاہم اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو مہینے میں تین دن شہد استعمال کرنے سے آفات سے حفاظت کی وجہ

سمجھ میں آئے یانہ آئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے اس لئے بہر حال اس میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو گی ۔بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بالکل نہار منہ استعمال کیا جائے اور بہت سارے محدثین نے یہ لکھا ہے اور بعض احادیث اور صحابہ کے آثار سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہد کو پانی میں ملا کر استعمال کیا جائے یہاں پر اگرچہ شہد چاٹنے کا ذکر ہے اور چاٹنا بظاہر اسی وقت ہو گا جب کہ اس میں پانی وغیرہ نہ ملایا جائے تو یہ ایک مستقل طریقۂ استعمال ہے۔ اور دوسرا ایک الگ مستقل طریقہ استعمال ہے جو کہ مجرب اور آزمودہ کہ صبح کے وقت نہار منہ پانی کے اندر شہد ملا کر پی لیا جائے۔ یہاں تو تین دن کا ذکر ہے ویسے پانی میں ڈالنے والا طریقہ مسلسل ہے۔ بہر حال اس حدیث کا درجۂ صحت جو بھی ہو شہد کا شفا ہونا خود قرآن میں مذکور ہے اور اس کی بے پناہ افادیت صدیوں کے انسانی تجربات سے ثابت ہے۔

شہد اور قرآن شفا ہیں

(٥٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: « عَلَيْكُمْ بِالشِّفَاءَيْنِ: الْعَسَلِ وَالْقُرْآنِ ». رَوَاهُمَا ابْنُ مَاجَهْ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ ، وَقَالَ: وَالصَّحِيحُ أَنَّ الْأَخِيرَ مَوْقُوفٌ عَلَى ابْنِ مَسْعُودٍ.

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم دو شفاؤں کا اہتمام کرو یعنی شہد اور قرآن۔

یہ حدیث مرفوع ہے یا موقوف ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یا حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد ہے اس میں روایتیں اگرچہ مختلف ہیں لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ارشاد بھی اگر ہو تب بھی ہمارے لئے ایک حجت اور دلیل ہے کہ ابن مسعودؓ نے فرمایا یا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دو شفا کی چیزیں ایسی ہیں جن کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہئے۔ ایک شہد اور دوسرا قرآن۔ ان دونوں کو قرآن کریم میں بھی شفا

قرار دیا گیا ہے مثلاً قرآن کریم کے بارے میں قرآن کریم میں آتا ہے [وننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين] اور شہد کے بارے میں بھی آتا ہے [فيه شفاء للناس] کہ اس میں لوگوں کے لئے بڑی شفا ہے۔ تو ان دونوں کو قرآن کریم نے شفا قرار دیا ہے اس لئے علاج میں ان دونوں کو استعمال کرو۔

بعض مفسرین نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک اثر نقل کیا ہے کہ استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ کئی چیزوں کو جمع کرے، پہلے تو اپنی بیوی کو جو مہر دیا ہے اس میں سے اس سے کہے کہ کچھ رقم مجھے ہبہ کر دو اور اس سے شہد خریدے اور کسی چیز پر قرآنی آیات لکھ کر بارش کے پانی کے ساتھ اسے دھوئے اور اسے شہد میں ملا کر استعمال کرے ۔ گویا چار چیزیں جمع ہو گئیں، ایک تو بیوی کے مہر میں سے جو اس نے ہبہ کیا ہے بشرطیکہ بطیبِ خاطر وہ دینے کے لئے تیار ہو، اس لئے اس کو قرآن کریم نے ہنیئا مریئا کہا ہے خوشگوار اور برکت والا، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے [فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شيء منه فكلوه هنيئا مريئاً] [النساء:۴] اور دوسری چیز بارش کا پانی ہے اسے قرآن کریم نے ماءً مبارکاً قرار دیا ہے یعنی برکت والا پانی، تیسری چیز شہد ہے جس کو قرآن کریم نے شفا قرار دیا ہے، اور چوتھی چیز قرآنی آیات ہیں ان کو بھی اللہ تعالی نے شفا قرار دیا ہے [وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِين] [الإسراء:۸۲]۔

علاج میں خودرائی کا نتیجہ

(۵۸) وَعَن أبي كَبْشَة الْأَنْمَارِيِّ: أَنَّ رَسُولَ اللهَّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ احْتَجَمَ عَلَى هَامَتِهِ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُومَةِ ، قَالَ مَعْمَرٌ: فَاحْتَجَمْتُ أَنَا مِنْ غَيْرِ سُمٍّ كَذَلِكَ فِي يَافُوخِي ، فَذَهَبَ حُسْنُ الْحِفْظِ عَنِّي حَتَّى كُنْتُ أُلَقَّنُ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ فِي الصَّلَاةِ. رَوَاهُ رزين

حضرت ابو کبشہ انماری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زہر آلود بکری کھالینے کی وجہ سے اپنے سر کے درمیان پچھنے لگوائے، معمر کہتے کہ میں نے بھی بغیر زہر کے اسی طرح اپنے سر کے درمیان میں پچھنے لگوالئے تو میری اچھی یاداشت ختم ہو گئی یہاں تک اب مجھے نماز میں فاتحۃ الکتاب کی بھی تلقین کی جاتی تھی۔

زہریلی بکری کھانے سے مراد یہ ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع پر ایک یہودیہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور ایک بکری بھون کر پیش کی لیکن اس میں زہر ملا دیا، خاص طور پر اس کی دستی میں، کیونکہ اس کو پتا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت پسند ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تناول فرمایا لیکن کھایا نہیں گیا، بلکہ پہلا لقمہ ہی منہ میں ڈالا تو آپ کو وحی کے ذریعے یا آپ کی فراست کے ذریعے پتہ چل گیا کہ اس میں زہر ہے تو آپ نے وہ لقمہ جو منہ میں ڈالا ہوا تھا جس لقمہ کو چبا رہے تھے وہ پھینک دیا۔ آپ کو دیکھ کر باقی صحابہ نے بھی کھانا چھوڑ دیا، لیکن کچھ حضرات تھوڑا بہت کھا چکے تھے، آنحضرت ﷺ نے اگرچہ کچھ کھایا نہیں لیکن منہ میں ڈال کر کچھ چبایا ضرور تھا اس لئے آپ پر بھی زہر کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا۔ اس اثر کے ازالے کے لئے آپ نے فوری طور پر اپنے سر پر پچھنے لگوائے۔ زہر کے اثر کے ازالے کے لئے سر میں پچھنے لگوانے کی آپ نے مناسبت کچھ نہ کچھ دیکھی ہو گی جس کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا۔ آپ کے صحابہ میں سے اس وقت تو کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن بعد میں آپ کے صحابہ میں سے بشر بن براء بن معرور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسی زہر کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فوری طور پر اثر نہیں ہوا لیکن بعض روایات میں آتا ہے کہ اور صحیح روایتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرض الوفات میں یہ فرمایا تھا کہ اسی زہر کا اثر عود کر آیا ہے اور میری یہ بیماری اسی زہر کے اثر کی وجہ سے ہے۔

اس حدیث میں معمر کہتے ہیں کہ میں نے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اپنے سر پر پچھنے لگوالئے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگوائے تھے زہر کی وجہ سے۔ اور میں نے ویسے ہی لگوالئے تو اس کا نقصان ہوا، اور نقصان یہ ہوا کہ یاداشت ختم ہو گئی۔ اس سے پتا چلا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے سلسلے میں جو کچھ

فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرنے کے لئے کسی ماہر طبیب کی رائے لینی چاہئے۔ اس لئے کہ بیماری بیماری، شخص شخص اور مزاج مزاج سے فرق پڑ جاتا ہے۔

(٥٩) وَعَن نافعٍ قَالَ: قَالَ ابنُ عمر: يَا نَافِع يَنْبغ بِي الدَّمُ ، فَأْتِنِي بِحَجَّامٍ ، وَاجْعَلْهُ شَابًّا ، وَلَا تَجْعَلهُ شَيخا وَلَا صَبيّا. وَقَالَ ابْنُ عُمَرُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «الْحِجَامَةُ عَلَى الرِّيقِ أَمْثَلُ ، وَهِيَ تَزِيدُ فِي الْعَقْلِ ، وَتَزِيدُ فِي الْحِفْظِ ، وَتَزِيدُ الْحَافِظَ حِفْظًا ، فَمَنْ كَانَ مُحْتَجِمًا فَيَوْمَ الْخَمِيسِ عَلَى اسْمِ اللهِّ تَعَالَى، وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَوْمَ السَّبْتِ وَيَوْمَ الْأَحَدِ ، فَاحْتَجِمُوا يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَيَوْمَ الثُّلَاثَاءِ وَاجْتَنِبُوا الْحِجَامَةَ يَوْمَ الْأَرْبِعَاءِ. فَإِنَّهُ الْيَوْمُ الَّذِي أُصِيبَ بِهِ أَيُّوبُ فِي الْبَلَاءِ. وَمَا يَبْدُو جُذَامٌ وَلَا بَرَصٌ إِلَّا فِي يَوْمِ الْأَرْبِعَاءِ أَوْ لَيْلَةَ الأرْبعاءِ » . رَوَاهُ ابنُ مَاجَهْ

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ اے نافع! میرا خون جوش مار رہا ہے اس لئے میرے پاس پچھنے لگانے والے کو بلا کر لاؤ۔ اور یہ کوئی جوان ڈھونڈ کر لانا بوڑھا اور بچہ ڈھونڈ کر نہ لانا اور نافع کہتے ہیں کہ مجھ سے ابنِ عمر نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سینگی لگوانا نہار منہ زیادہ بہتر ہے اور یہ سینگی لگوانا عقل میں بھی اضافہ کرتا ہے اور یاداشت میں بھی اضافہ کرتا ہے اور جس کی یاداشت اچھی ہو اس کی یاداشت اور زیادہ کرتا ہے جس آدمی نے سینگی لگائی ہو وہ جمعرات کے دن لگائے اللہ کا نام لے کر اور تم جمعہ اور ہفتے کے دن سینگی لگانے سے بچو اور اسی طرح اتوار کے دن اس کے بعد پیر اور منگل کے دن سینگی سینگی لوا سکتے ہو اور بدھ کے دن بھی سینگی لگوانے سے بچو اس لئے کہ یہ وہ دن ہے جس دن حضرت ایوب علیہ السلام بیماری میں

مبتلا ہوئے تھے اور جذام اور برص ظاہر نہیں ہوتے مگر بدھ کے دن میں یا بدھ کی رات میں۔

یہ حدیث سند کے اعتبار سے کافی ضعیف ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جن حدیثوں میں حجامت کے حوالے سے بعض دنوں کی افادیت یا نقصان کا ذکر آتا ہے وہ بیشتر ضعیف ہیں۔

یہاں ابنِ عمر نے یہ فرمایا کہ سینگی لگانے والا بلا کر لاؤ لیکن جوان ہونا چاہئے بوڑھا یا بچہ نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ بچہ تو ویسے ہی ناتجربہ کار ہوگا اور بوڑھا ایک تو پورے زور کے ساتھ خون نہیں کھینچ سکے گا پچھنے لگانے کا مقصد پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکے گا دوسرا یہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ بوڑھا ہونے کی وجہ سے اس کا ہاتھ کانپ جائے گا اس کی وجہ سے وہ سے زخم کہیں اور کرنا چاہتا ہو اور ہو کہیں اور جائے کچھ نقصان ہو جائے اس لئے فرمایا کہ بوڑھا بھی نہیں ہونا چاہئے۔

(٦٠) وَعَنْ مَعْقِلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْحِجَامَةُ يَوْمَ الثُّلَاثَاءِ لِسَبْعَ عَشْرَةَ مِنَ الشَّهْرِ دَوَاءٌ لِدَاءِ السَّنَةِ» . رَوَاهُ حَرْبُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ الْكِرْمَانِيُّ صَاحِبُ أَحْمَدَ ، وَلَيْسَ إِسْنَادُهُ بِذَاكَ هَكَذَا فِي الْمُنْتَقى ، وروى رزين نَحوه عَن أبي هُرَيْرَة .

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہینے کی سترہ تاریخ کو منگل کے دن سینگی لگوانا سال بھر کی بیماریوں کا علاج ہے۔

پہلے اسی باب کی حدیث نمبر ۳۶ میں کہ گذرا کہ منگل کے دن پچھنے نہیں لگوانے چاہئیں، اس لئے کہ اس دن میں ایک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے جس میں خون بہ پڑے تو جلدی رکتا نہیں ہے، جبکہ اس زیر بحث حدیث میں منگل کے دن پچھنے لگوانے کو شفا قرار دیا جارہا ہے۔ تو اوّل تو یہ دونوں حدیثیں سنداً صحیح نہیں ہیں، بلکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا

حجامت کے سلسلے میں پچھنے لگانے کے بارے میں جتنی بھی حدیثیں ہیں عموماً ان کی سندوں میں محدثانہ نقطۂ نظر سے کلام کی گنجائش موجود ہے۔ اگر ان دونوں حدیثوں کو صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ تطبیق خود اس حدیث کے الفاظ سے واضح ہے، اس لئے کہ اس حدیث میں علی العموم منگل کو حجامت کی ترغیب نہیں دی جارہی، بلکہ اس منگل کی بات ہورہی ہے جو قمری مہینے کی سترہ تاریخ کو پڑتا ہو، ایسے مخصوص منگل میں پچھنے لگوانا تو شفا ہے، عام منگل کے بارے میں یہ بات نہیں۔ واللہ تعالیٰ أعلم بالصواب۔

باب الفال والطیرۃ

یہاں باب کے عنوان میں دو لفظ ہیں، الفال اور الطیرۃ۔ دونوں کے معنی بنیادی طور پر ملتے جلتے ہیں، یعنی فال اور شگون لینا، خواہ اچھا شگون ہو یا برا۔ شگون سے مراد ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر بطورِ توہم کے دوسری چیز کا اندازہ لگانا کہ چونکہ یہ ہوا ہے اس لئے ایسا ہو جائے گا۔ ایک تو یہ ہے ان دونوں چیزوں میں اسباب کے درجے میں کوئی تعلق ہو تو یہ محض شگون نہیں ہے، مثلاً بادل آرہے ہیں، ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں، اس سے اندازہ لگایا کہ شاید بارش ہو جائے تو یہ شگون میں داخل نہیں ہے، شگون تب بنے گا جب کہ بطور توہم پرستی کے ایسا کیا جائے، یعنی اسباب کے درجے میں دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق نہ ہو۔

یہ شگون اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ مثلاً کسی کے گھر میں اُلو آگیا تو یہ سمجھے کہ اب نحوست ہو گئی اور برکت نہیں رہے گی، صبح کے وقت گھر سے نکلے کہیں سفر پر روانہ ہوئے تو جس سواری سے واسطہ پڑا وہ بہت تکلیف دہ تھی یا جس ڈرائیور یا کنڈیکٹر سے واسطہ پڑا وہ بڑا بد تمیز تھا تو سوچتے ہیں کہ سفر شروع ہوتے ہی یہ معاملہ ہوا تو اب پتا نہیں آگے کیا بنے گا؟ لگتا یہ ہے کہ آگے کام خراب ہو جائے گا۔ صبح گھر سے نکلے، نکلتے ہی گاڑی خراب ہو گئی، سوچتے ہیں گھر سے نکلتے ہی گاڑی خراب ہو گئی ابتدا میں ہی کام خراب ہو گیا تو لگتا ہے کہ آج کا یہ سفر منحوس ہو گا، باہر نکلے سب سے پہلے جو آدمی ملا اس سے نام پوچھا تو اس کا نام ہی بڑا ڈراؤنا قسم کا تھا تو سمجھے کہ ابتدا ہی میں یہ منحوس لفظ سننا پڑ گیا ہے تو لگتا یہ ہے کہ آج کا دن بے برکت ثابت ہو گا یہ تو بد شگونی کی مثالیں ہیں۔ نیک شگونی بھی ہوتی ہے، مثلاً صبح گھر سے نکلے کسی اچھے آدمی سے واسطہ پڑ گیا یا جب گھر سے نکلے تو سب سے پہلے جو ملا اس سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے اس نے کہا کہ میرا نام نجیح ہے جس کا معنی کامیابی ہوتا ہے، یا میرا نام اسلم ہے تو یہ سمجھے کہ آج جس مقصد کے لئے نکلے اس میں کامیابی اور سلامتی ہو گی۔ ایک رکشہ والا اور ٹیکسی والا اپنا رکشہ اور ٹیکسی لے کر نکلا تو پہلے پہلے جو سواری ملی وہ بہت اچھی ملی، سب پہلے جو آدمی ملا وہ بہت نیک دل کا آدمی تھا اور کرایہ جتنا مانگا اتنا ہی اس نے دے دیا تو وہ (پنجابی میں) کہتا ہے کہ

'بھونی' اچھی ہو گئی یعنی کام کا آغاز اچھا ہو گیا ہے تو آج کی دیہاڑی اچھی لگ جائے گی تو یہ نیک فال ہے۔

عربی زبان میں فال اور طیرۃ کا اطلاق اچھے یا برے شگون پر کیا جاتا ہے، عموماً اچھے شگون کے لئے فال کا لفظ اور برے شگون کے لئے طیرۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

فال کا حکم:

فال کا حکم کیا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے صراحتاً یہ بات معلوم ہوئی کہ شریعت میں نیک فالی کی تو گنجائش ہے اس کو پسند کیا گیا ہے لیکن بدفالی اور بدشگونی سے منع کیا گیا ہے۔

بدفالی کے درجات:

بدفالی کے کئی درجے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ اس چیز کو مؤثر بالذات سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے جیسا کہ عربوں کے ہاں یہ اس طرح کی توہم پرستی پائی جاتی تھی۔ان کے ہاں فال لینے کے کئی طریقے مروج تھے،ان میں سب سے معروف طریقہ یہ تھا کہ کسی سفر پر روانہ ہوتے وقت پرندہ اڑاتے تھے یا توازخود کوئی پرندہ اڑتا ہوا نظر آجاتا اگر وہ دائیں کو جارہا ہے تو سمجھتے تھے کہ کام ٹھیک ہو جائے گا اور سفر پر روانہ ہو جاتے اور اگر وہ بائیں طرف کو جارہا ہے تو سمجھتے کہ یہ سفر منحوس ہے اس لئے اس سفر سے رک جاتے تھے اور اگر خود بخود کوئی پرندہ اڑتا ہوا نظر نہ آتا تو کسی گھونسلے میں بیٹھے پرندے کو بٹی وغیرہ مار کر وہاں سے اڑاتے تھے اگر اڑ کر دائیں طرف کو چلا جاتا تو سمجھتے کہ یہ سفر ٹھیک ہو گا اور اگر بائیں طرف کو جاتا تو یہ سمجھتے کہ سفر منحوس ہو گا۔اسی طریقے سے بعض جانوروں کے ساتھ بھی ان کے کئی طرح کے تصورات وابستہ تھے کہ گھر سے نکلیں گے اگر فلاں جانور سامنے آیا

تو سمجھو کہ سفر مبارک ہے اور اگر سب سے پہلے یہ جانور نظر آ گیا مثلاً الو نظر آ گیا تو مطلب یہ ہے کہ یہ سفر منحوس ہے۔ یہ لوگ پرندوں کے دائیں یا بائیں گذرنے یا خاص جانوروں کے راستہ کاٹنے اور سامنے سے گذرنے کو بذاتِ خود مؤثر سمجھتے تھے۔ بد شگونی کا ایک درجہ یہ ہے کہ اس کو مؤثر بالذات سمجھا جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شرکیہ عقیدہ ہے اس لئے کہ مؤثر حقیقی صرف اللہ کی ذات ہے باقی چیزیں اسباب کے درجہ میں ہیں، اور وہ بھی وہ اسباب جن کی تاثیر کم از کم تجربے سے تو ثابت ہو، و گرنہ محض توہم پرستی ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسی کسی چیز کو مؤثر حقیقی تو نہ سمجھا جائے لیکن بد شگونی کے اس خیال پر عمل کر لیا جائے۔ یہ شرکیہ عقیدہ تو نہیں ہے لیکن احادیث مبارکہ کی روشنی میں یہ ممنوع ضرور ہے۔

۳۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ بد شگونی کا محض خیال دل میں پیدا ہوا لیکن اس کے تقاضے پر عمل نہیں کیا۔ گھر سے نکلتے ہی ایک بد تمیز قسم کے آدمی سے واسطہ پڑ گیا تو سوچتا ہے کہ آج کا دن پتا نہیں کیسا گزرے گا سفر کیسے گزرے گا، از خود غیر اختیاری طور پر یہ خیال دل میں پیدا ہو گیا تو اس پر شرعاً کوئی مواخذہ نہیں ہے، کیونکہ یہ غیر اختیاری خیال ہے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال عموماً پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہما کا ارشاد اسی باب میں آگے آ رہا ہے کہ ما منا الا کہ ہم میں سے ہر ایک آدمی کسی نہ کسی درجے میں بد شگونی میں مبتلا ہو ہی جاتا ہے۔ اسی طریقے سے حافظ ابن حجر عسقلانی[1] ؒ نے عبد الرزاق کے حوالے سے ایک روایت ذکر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو انسان میں پیدا ہو ہی جاتی ہیں ایک حسد، دوسرے بد گمانی اور تیسرے بد شگونی۔ مراد ہے ان تین چیزوں کا غیر اختیاری طور پر دل میں خیال پیدا ہو۔ فرمایا کہ جب حسد کا غیر اختیاری خیال دل میں پیدا ہو مثلاً

---

[1]- فتح الباری ۱۰/۲۱۳ کتاب الطب: باب الطیرۃ

کسی معاصر کے بارے میں پتا چلا کہ اسے فلاں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے تو غیر ارادی طور پر ٹیس سی محسوس ہوئی کہ ہائے! ایسا کیوں ہو گیا تو اس خیال کے مقتضا پر عمل نہ کرو اور اس کی وجہ سے کسی پر زیادتی نہ کرو روایت کے لفظ ہیں إذا حسدت فلا تبْغِ۔ اور اگر کسی کے بارے میں بدگمانی دل میں از خود پیدا ہو جائے تو اس کو بالکل نظر انداز کرو اس کی تحقیق کی فکر میں بھی مت پڑو، بس خود کو ٹھیک کرنے کی فکر کرو وإذا ظننت فلا تحقق۔ اور بدشگونی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ اس کے تقاضے پر بالکل عمل نہ کرو، یعنی دیگر پہلوؤں سے وہ فیصلہ قابل عمل لگ رہا ہے تو محض بدشگونی کے خیال سے اس سے رکو نہیں فإذا تطيرت فلا ترجع۔ تو اس سے پتا چلا کہ بدشگونی کا غیر اختیاری خیال دل میں پیدا ہو ہی جاتا ہے اور اس پر شرعاً کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

بدشگونی کا علاج:

اس آخری درجے پر غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے اگرچہ مؤاخذہ نہیں ہے گناہ نہیں ہے لیکن قابل علاج بہر حال ضرور ہے اور احادیث سے اس کے دو علاج معلوم ہوتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ اس خیال کے تقاضے پر عمل نہ کرے، چنانچہ اسی باب کے آخر میں ایک حدیث آرہی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ولا تردُّ مسلما یعنی یہ بدفالی کسی مسلمان کو کسی کام سے روکے نہیں۔ اور دوسرا علاج اس کا توکل ہے۔ مثلاً حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا وما منا إلا ، لكن الله يُذهبه بالتوكل ، کہ ہر آدمی بدشگونی میں مبتلا ہو ہی جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ توکل کی برکت سے اسے زائل کر دیتے ہیں۔ آدمی یہ خیال کرے کہ ان چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا، ہو گا وہی جو اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔ توکل میں کمال میں دو چیزیں اور ہیں، ایک یہ کہ زبان سے اس بات کا اظہار کرے کہ ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، زبان سے معاملہ اللہ کے سپرد کرنے کا اظہار کرے،

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی مانگے کہ اس خیال اور شگون کی برائی سے اللہ تعالیٰ مجھے بچالیں۔ ان دو باتوں کا اظہار کیسے کرے، اس کے لئے اس باب کی آخری حدیث میں لفظ آرہے ہیں کہ جب تم میں کوئی شخص کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے (جو بد شگونی کا باعث بن سکتی ہو) تو اسے چاہئے کہ یوں کہے «اللَّهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ ، وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ» یعنی اے اللہ اچھائیاں عطا کرنے والے بھی صرف آپ ہیں اور سیئات اور برائیوں کو دور کرنے والے بھی صرف آپ ہیں، مطلب یہ کہ آپ اس کام کی اچھائی عطا فرمادیجئے اور اس کی برائی سے بچالیجئے۔ اگر کسی کو یہ جا کر کہیں کہ آپ بڑے دینے والے ہیں بڑے سخی ہیں تو دیکھنے میں تو یہ خبر ہے حقیقت میں یہ انشاء ہے مطلب یہ ہے کہ مجھ پر بھی سخاوت کردیں۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ سے یہ کہیں گے کہ آپ ہی اچھائیاں دینے والے اور آپ ہی برائیوں سے بچانے والے ہیں تو مطلب یہ کہ آپ مجھے اچھائیاں عطا کردیجئے اور برائیوں سے بچالیجئے۔ برائی سے بچنے کی کلی طاقت اور نیکی کرنے کی قوت صرف اور صرف اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ ان الفاظ میں دعا بھی ہے اور تفویض و توکل کا اظہار بھی۔ یہ الفاظ کہنے سے بد شگونی کا اگر کوئی ممکنہ اثر ہو بھی یا محض نفسیاتی اثر ہو وہ زائل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح متعدد روایات میں ایسے موقع کے لئے ایک اور دعا آتی ہے « اللَّهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ، وَلَا طَيْرَ إِلَّا طَيْرُكَ، وَلَا إِلَهَ غَيْرُكَ » ، یہ دعا متعدد روایات میں آتی ہے ، مثلاً حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی ایک روایت میں آں حضرت ﷺ نے اس دعا کو بد شگونی کا کفارہ قرار دیا ہے، علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں کہا ہے کہ ابن لہیعہ کے علاوہ اس کی سند کے سارے راوی ثقہ ہیں[1]، اور ابن لہیعہ کی حدیث بھی کم از حسن ضرور ہوتی ہے۔

---

۱ – مجمع الزوائد ۱۰۵/۵ کتاب الطب : باب ما يقول إذا تطير.

اچھے اور برے شگون میں فرق کی وجہ:

یہاں پر ایک سوال ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے کہ جن چیزوں کا عموماً شگون لیا جاتا ہے کہ واقع میں اس کی تاثیر ہے یا نہیں؟ اگر واقعتاً تاثیر ہے تو پھر اس سے منع کیوں کیا گیا؟ ۔مثلاً دائیں طرف پرندے کے اڑ کر جانے سے سفر اچھا ہوتا ہے اور بائیں طرف اڑ کر جانے سے سفر برا ہوتا ہے۔تو اگر واقعتاً اس میں تاثیر ہے تو اس سے منع نہیں کرنا چاہئے اور اگر اس میں کوئی تاثیر نہیں پرندے دائیں طرف اڑ کر جائیں یا بائیں طرف اڑ کر جائیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو نیک اور برے شگون دونوں کا ایک ہی حکم ہونا چاہئے۔اس کی کیا وجہ ہے کہ بدشگونی سے تو منع کیا گیا اور نیک شگون کی اجازت دی گئی بلکہ اسے پسند کیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت اور اپنی ماہیت کے اعتبار سے تو نیک شگون اور برے شگون میں کوئی فرق نہیں ۔یعنی ان چیزوں کا حقیقت میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ البتہ نتائج کے اعتبار سے بدشگونی اور نیک شگونی میں فرق ہے کہ بدشگونی پر بعض برے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور نیک فالی پر اچھے ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً بدشگونی کا برا نتیجہ ایک یہ ہوتا ہے کہ آدمی مایوس ہو جاتا ہے اور مایوسی بری چیز ہے۔ تعطل کا شکار ہو جاتا ہے اور تعطل بری چیز ہے۔ ایک اچھے بھلے کام پر جا رہا تھا محض اس وجہ سے کہ راستے میں اُلو نظر آ گیا گھر میں آرام سے بیٹھ گیا تو یہ ایک بدشگونی کا برا نتیجہ ہے کہ مایوسی پیدا ہو گئی اور جب مایوسی پیدا ہوتی ہے تو آدمی پہلے سے ہی ذہن میں یہ سوچ لیتا ہے کہ یہ کام خراب ہو جائے گا۔اس الو کا کوئی اثر ہو یا نہ ہو پرندے کے بائیں طرف جانے کا کوئی اثر ہو یا نہ ہو اس کے تصور اور ذہن میں یہ بیٹھ جانا کہ کام بس خراب ہو گیا، اس کا اثر ضرور ہو گا۔ جب آدمی یہ طے کر لے کہ کام خراب ہی ہو گا تو واقعتاً خراب ہو جاتا ہے۔آدمی کے تصورات کا ضرور اثر پڑتا ہے۔آدمی یہ سوچنے لگے کہ تھوڑی دیر کے بعد میں بس مرنے والا ہوں تو موت نہ بھی آئی ہوئی ہو آدھ موا ضرور ہو جائے گا۔

ہوتا اصل میں یہ ہے کہ جب آدمی کے ذہن پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے تو آدمی کی قوت فکر یہ بھی معطل

ہو جاتی ہے اور قوت عملیہ بھی۔ جب یہ طے کر لیتا ہے کہ یہ کام ہو گا ہی نہیں یا خراب ہو گا ایک تو وہ کام کرتا نہیں دوسرا اس کے اسباب سوچتے میں انسان کا ذہن نہیں چلتا ذہن بند ہو جاتا ہے۔ جب ذہن بھی بند ہو گیا تدبیریں نہیں سوجھ رہیں اور عملاً بھی کام کی ہمت نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ کام تو خراب ہی ہو گا۔ تو بد شگونی کی اپنی تو کوئی حقیقت نہیں تھی لیکن اس پر یہ برا نتیجہ ضرور مرتب ہوتا ہے۔

اس کے برعکس نیک شگون کا اگرچہ اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی اثر نہیں لیکن یہ ثمرہ ضرور مرتب ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں امید پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے طبیعت میں ایک خاص قسم کا نشاط اور بشاشت پیدا ہو جاتی ہے اس کے نتیجے میں اس کی ہمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے، عملی قوت بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور ذہن بھی اس کا اس کام میں زیادہ چلتا ہے۔ کیونکہ اس کو پتا ہے کہ یہ کام ہونا ناممکن نہیں ہے تو اس کے لئے اس کو نئی سے نئی تدبیریں اور نئے سے نئے طریقے سوجھتے ہیں۔ اس کا ذہن پہلی صورت کی طرح نہیں ہوتا۔

چونکہ بد شگونی کے اثرات اور نتائج برے ہیں اور نیک شگونی کے نتائج اچھے ہیں اس لئے بد شگونی سے منع کر دیا گیا اور نیک فالی کو پسند کیا گیا۔ اسی کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بد شگونی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ سوءِ ظن پایا جاتا ہے اور نیک شگونی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن پایا جاتا ہے کہ بندہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا کام ٹھیک کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن بھی مطلوب ہے یہ بھی ایک فائدہ ہے نیک فالی کا۔ تو اپنی ذات کے اعتبار سے تو کوئی تاثیر نہیں لیکن اس ایک جانبی فائدہ کی وجہ سے نیک فالی کو پسند کیا گیا۔ چنانچہ بعض احادیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں سفر پر روانہ ہوتے تو آپ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کو یا راشد یا نجیح وغیرہ کے الفاظ سنائی دیں یہ بھی نیک فالی میں داخل ہے۔

شگون اور لطافتِ ذوق میں فرق:

ایک چھوٹا سا سوال اور جو آگے آنے والی ایک حدیث کے متعلق ہے، لیکن یہیں پر اس کو بھی حل کر لیا جائے

۔ وہ یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا نام پوچھتے تو اگر اس کا نام اچھا ہوتا تو آپ خوش ہوتے اور اگر بُرا ہوتا تو آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوتے۔ اسی طرح آپ ﷺ جب کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس بستی کا نام پوچھتے کہ اس کا نام کیا ہے اگر اچھا نام ہوتا ہمارے محاورے میں مثال کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نام راشد آباد ہے، بستی کا نام ہدایت پور ہے تو خوش ہو جاتے اور خوشی کے آثار آپ کے چہرے پر دیکھائی دیتے اور اگر برا نام ہوتا تو ناپسندیدگی کے آثار آپ کے چہرے پر دیکھائی دیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اچھی فال کا بھی اثر لیتے تھے اور بری فال کا بھی حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بدشگونی سے منع فرمایا ہے۔

اس سوال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ اصل میں یہ نام سن کر ناپسندیدگی چہرے پر ظاہر ہونا شگون کے قبیل سے نہیں بلکہ لطافتِ طبع کے قبیل سے ہے۔ جتنا اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے عموماً ذوق میں بھی لطافت پیدا ہو جاتی ہے، اور اللہ کے نبی کا ذوق تو ظاہر ہے کہ سب سے لطیف ہوگا۔ عموماً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جتنا کوئی شخص اللہ کا مقرب ہوگا اتنا ہی وہ جمالیاتی حس سے خالی ہوگا، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ لطیف ذوق پر بر تری اور بے ڈھنگی چیز گراں گزرتی ہے اگر چیزیں بے ترتیبی رکھی ہوں تو اس سے گرانی ہوتی ہے اگر کوئی بدشکل ہو تو دیکھ کر گرانی ہوتی ہے۔ یہی اثر الفاظ کا بھی ہوتا ہے کہ بدھے الفاظ سن کر طبیعت میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ گرانی ہونا لطافتِ ذوق کی وجہ سے تھا بدشگونی کی وجہ سے نہیں تھا۔ اگر شہر کا اچھا نام ہوتا تو لطافتِ ذوق کے مطابق ہونے کی وجہ سے طبیعت میں بشاشت پیدا ہو جاتی اور اگر برا نام ہوتا ہے مثلاً ہمارے عرف کے مطابق کسی جگہ کا نام ''ڈنڈے والا'' ہے، ''لاٹھی والا'' ہے تو اس طرح کے نام سن کر لطیف طبیعت والے پر گرانی ہوتی ہے۔

شرح احادیث باب الفال والطیرۃ

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: « لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَأْلُ » قَالُوا: وَمَا الْفَأْلُ؟ قَالَ: «الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يسْمعهَا أحدكُم» متفق عليه .

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ برے شگون کی کوئی حقیقت نہیں، اور ان میں سے فال (نیک شگون) اچھا ہوتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ فال کیا ہوتی ہے (یعنی فال سے مراد یہاں کیا ہے) تو آپ نے فرمایا کہ کوئی اچھا بول جسے تم میں سے کوئی آدمی سنے۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتیں ارشاد فرمائیں ہیں، باقی باتوں کی وضاحت تو آگے آنے والی حدیثوں کے تحت کی جائے گی، یہاں سب سے پہلی بات کی وضاحت مقصود ہے وہ یہ آپ ﷺ نے فرمایا لاعدوی، عدوی کی کوئی حقیقت نہیں۔ عدوی کا معنی ہوتا ہے۔ بیماری کا متعدی ہونا، یعنی ایک سے دوسرے کو بیماری لگ جانا تو مطلب یہ ہوا کہ یہ تصور کہ ایک آدمی سے دوسرے کو اور ایک جانور سے دوسرے کو بیماری لگ جاتی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

چھوت چھات اور امراض کے متعدی ہونے کے بارے میں اسلامی تصور

امراض متعدی ہوتے ہیں یا نہیں، اس کے بارے میں احادیث بظاہر مختلف نظر آرہی ہیں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تعدیہ امراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مثلاً ایک تو یہی حدیث کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

بات فرمائی "لاعدوی" تو ایک بدو نے کہا یا رسول اللہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ہمارے اونٹ بالکل صحیح سالم اور تندرست ہوتے ہیں کوئی خارش وغیرہ ان پر نہیں ہوتی لیکن کوئی خارشی اونٹ ان کے ساتھ آکر ملتا ہے تو باقی اونٹوں کو بھی خارش لگ جاتی ہے یہ تو ہمارے مشاہدے کی بات ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ پہلے اونٹ کو خارش کس نے لگائی مطلب یہ تھا کہ پہلے اونٹ کو خارش تعدیہ کی وجہ سے نہیں لگی بلکہ اس کا سبب کوئی اور ہے تو جس سب سے پہلے کو لگی ہے اسی سبب سے دوسرے کو لگ سکتی ہے۔ پہلے کو بیماری لگانے والی اصل میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنی حکمت کے تحت لگاتے ہیں تو دوسروں کو جو بیماری لگی وہ بھی اسی طرح لگی اس حدیث سے بھی پتہ چلا کہ تعدیہ امراض کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

لیکن اس کے برعکس بعض احادیث سے تعدیہ امراض کا حقیقت ہونا ثابت ہوتا ہے مثلاً اسی حدیث کے آخر میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جذام کے مریض سے اسی طرح دور رہو جیسا کہ تم شیر سے دور رہتے ہو۔ بعض حدیثوں میں آیا کہ تم جذام کے مریض سے ایک یا دو نیزے کے فاصلے پر رہو، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ثقیف کا ایک وفد بیعت کرنے کے سلسلے میں حاضر ہوا ان میں ایک جذام کا مریض بھی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیغام بھیجا کہ ہم نے تمہیں زبانی اور غائبانہ بیعت کر لیا ہے اس لئے تمہارے یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے بھی پتا چلا کہ ایک سے بیماری دوسرے کو لگ جاتی ہے۔ اسی طرح ابوداؤد کی ایک حدیث ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور یہاں مشکوۃ کے اسی باب کی الفصل الثانی میں بھی آرہی ہے کہ ایک آدمی نے یہ عرض کیا کہ ہم پہلے ایک جگہ پر رہتے تھے جہاں ہماری تعداد بھی زیادہ تھی اور ہمارے ہاں ایک زمین ہے کہ جس سے ہم غلہ حاصل کرتے ہیں لیکن وہاں وبائی بیماریاں بہت ہوتی ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس زمین کو چھوڑ دو یعنی اس کی جگہ کوئی اور زمین لے لو اور اس کے بعد فرمایا فان من القرف التلف۔ قرف کے معنی ہیں بیمار کے پاس جانا تو مطلب یہ ہوا کہ مریض کے پاس جانے سے ہلاکت ہوتی ہے۔ پتا چلا کہ ایک سے دوسرے کو بیماری لگ جاتی ہے کیوں کہ مریض کے پاس جانے سے ہلاکت کا یہ مطلب ہے کہ اس کی بیماری تمہیں بھی لگ جائے گی۔ اسی

طرح بعض حدیثوں میں آتا ہے اور صحیحین کی حدیث ہے کہ جس بستی وغیرہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہو وہاں کے رہنے والے اس بستی سے باہر نہ جائیں اور باہر والے اس بستی کے اندر نہ آئیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ لکھی ہے کہ اگر باہر والے بستی کے اندر جائیں گے تو انہیں بھی طاعون کی بیماری لگ جائے گی۔اسی طرح اگر بستی والے باہر جائیں گے تو ایک یہ ہے کہ جس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اسی بستی میں رہنے پر مجبور ہیں ان کا حوصلہ ٹوٹ جائے گا۔اور دوسرا یہ کہ جب یہ اپنی بستی چھوڑ کر دوسری جگہ جائیں گے تو یہ بیماری دوسری جگہوں پر بھی پھیلائیں گے۔اس سے بھی پتا چلا کہ بیماری ایک سے دوسرے کو لگ سکتی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک دفعہ شام کے علاقے میں گئے تو وہاں کسی جگہ پر طاعون پھیلا ہوا تھا، اب صحابہ سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں کہ نہ جائیں۔بعض نے مشورہ دیا کہ چلے جائیں کچھ نہیں ہوتا اور بعض نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں کو اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو خطرے میں ڈالنا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے۔حضرت عمرؓ نے دوسری رائے کو ترجیح دی اور وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، بلکہ واپسی کا ارادہ کر لیا۔حضرت عمرؓ کا مقصود اپنے ساتھیوں کا تحفظ تھا۔بعد میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے یہ حدیث بھی سنادی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بستی میں طاعون پھیلا ہوا ہو اس میں نہ جاؤ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خوشی ہوئی کہ جو فیصلہ ہم نے کیا ہے اس کے مطابق حدیث بھی مل گئی۔اس موقع پر کسی نے حضرت عمرؓ سے یہ بھی کہا کہ افرارا من قدر اللہ کہ کیا اللہ کی تقدیر سے بھاگتے ہو تو حضرت عمرؓ نے بہت شاندار جواب دیا اور فرمایا نعم نفرّ من قدر الله الی قدر الله اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں اللہ کی تقدیر ہی کی طرف۔ مطلب یہ کہ یہ تو اسباب کے درجہ میں ہے جہاں تک اللہ کی تقدیر کا تعلق ہے تو اس سے کوئی بھی نہیں چھوٹ سکتا اگر بیماری لگنی ہی مقدر ہے تو دوسری جگہ بھی لگ جائے گی اور اگر نہیں لگنی تو جس طرح وہاں جاکر بیمار ہونا اللہ کی تقدیر ہے اسی طرح واپس ہو کر بیماری سے بچنا بھی اللہ کی تقدیر ہو گی، تم نے یہ مفروضہ قائم کر لیا کہ وہاں جائیں اور بیماری میں جاکر مریں گے یہ تو اللہ کی تقدیر ہو گی اور وہاں نہیں گئے اور ان اسباب کی وجہ سے بیماری سے بچ گئے تو یہ اللہ کی تقدیر نہیں ہو گی۔گویا کسی عمل پر برا نتیجہ مرتب ہو تو وہ تقدیر ہے، اچھا نتیجہ مرتب ہو تو تمہارے خیال میں

تقدیر نہیں ہے، حالانکہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالی جس طرح اچھا نتیجہ اللہ کی تقدیر ہے اسی طرح بعض اسباب پر برا نتیجہ مرتب ہونا بھی اللہ کی تقدیر ہے۔ حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ ایسی بستی میں جانے کی وجہ سے بیماری لگ سکتی ہے۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض امراض متعدی بھی ہوتے ہیں۔ تو دو طرح کی حدیثیں ہو گئی بعض سے تعدیہ کی نفی ہو رہی ہے اور بعض سے تعدیہ کا اثبات ہو رہا ہے[1]۔ان دو طرح کی حدیثوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔

دونوں طرح کی حدیثوں کو بعض نے تو یوں جمع کیا کہ اصل تو یہی ہے کہ تعدیۂ امراض کی کوئی حقیقت نہیں لیکن جہاں مریض کے پاس جانے سے منع کیا ہے مثلاً یہ کہا کہ مجذوم سے دور رہو تو یہ بات اس لئے نہیں فرمائی کہ یہ بیماری واقعتاً اس سے لگ جائے گی بلکہ یہ بات سداًللذریعہ بداعتقادی سے بچانے کیلئے فرمائی کہ مجذوم کے پاس جانے سے بطور تعدیہ کے تو بیماری نہیں لگے گی لیکن یہ امکان تو ہے کہ من جانب اللہ ابتداءً اس کو بیماری لگ جائے۔ تو اگر اس کو اللہ کے حکم سے از خود بیماری لگ گئی تو یہ سمجھے گا کہ چونکہ میں فلاں مریض کے پاس گیا تھا اس لئے مجھے بیماری لگ گئی ہے۔ تو تعدیہ کی کوئی حقیقت تو نہیں لیکن عدوی والی بداعتقادی میں مبتلا ہو جائے گا تو اس سے بچانے کے لئے یہ کہا کہ اس کے پاس جاؤ ہی نہیں۔

لیکن یہ توجیہ فر من المجذوم کما فر من الاسد پر تو منطبق ہو سکتی ہے کہ مجذوم سے بچنے کا حکم سداًللذریعہ دیا گیا ہے لیکن فان من القرف التلف یہ بظاہر صراحتاً تعدیہ کو ثابت کرتی ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ بیمار کے پاس جانے سے ہلاکت ہوتی ہے اگرچہ اس کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ ہلاکت ہوتی ہے یعنی

---

[1]- دونوں طرح کی احادیث کی مزید تفصیل اور حوالہ جات کے لئے ملاحظہ ہو تکملۃ معارف السنن ج ا ص ۵۸۹ باب ما جاء فی الفرار من الطاعون۔

عقیدے کے اعتبار سے لیکن یہ توجیہ سیاق وسباق سے بعید ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ بیمار کے پاس جانے سے ہلاکت ہوگی یعنی تمہیں بھی بیماری لگ جائے گی اس لئے اس کو سد ذریعہ پر محمول کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا واپسی کا فیصلہ بھی اپنے ساتھیوں کو بد اعتقادی سے بچانے کے لئے نہیں تھا اور انہیں طاعون کی بیماری سے بچانے کے لئے تھا۔ اسی طرح آں حضرت ﷺ نے مجذوم کو بیعت کرنے سے جو انکار فرمایا اس کی یہ توجیہ بھی مشکل ہے۔ ملا علی قاریؒ نے شرح مشکوۃ میں اس پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر آپ ﷺ کا مقصد لوگوں کو تعدیہ امراض سے بچانا ہی تھا تو اس مقصد کے لئے اسے بیعت کرنا زیادہ مفید تھا، بنسبت بیعت نہ کرنے کے، اس لئے کہ بیعت نہ کرنے سے تو تعدیہ کا اعتقاد اور پختہ ہوگا۔

دوسرا حل اور جس کو کئی محدثین نے اختیار فرمایا مثلاً متقدمین میں سے ابن قتیبہ، امام طحاوی اور بیہقی وغیرہ نے اسے اختیار کیا ہے اور متأخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ وغیرہ نے اسے اختیار کیا ہے، خود مشکوۃ کے شارح ملا علی قاری نے بھی اسے ترجیح دی ہے اور علامہ تور پشتیؒ سے بھی یہی بات نقل کی ہے۔ ان حضرات کی بات کو سمجھنے کے لئے پہلے عدوی کی حقیقت سمجھ لینی چاہئے۔ عدوی کی حقیقت اصل میں یہ ہے کہ ایک صحت مند آدمی کے کسی بیمار کے قریب جانے کو اس کے بیمارے ہونے میں لذاتہ مؤثر سمجھا جائے یعنی تعدیہ کو مؤثر حقیقی سمجھا جائے اور اس کو اسباب کے درجے کی چیز نہ سمجھا جائے، بلکہ مافوق الاسباب سمجھا جائے۔ چنانچہ عربوں کے ہاں عدوی کا یہی تصور تھا جہاں تک اسباب کا تعلق ہے تو اسباب کے درجے میں عربوں کے ہاں کوئی باضابطہ طب مروّج نہیں تھی اور نہ ہی طبّی اصولوں سے زیادہ واقف تھے اس لئے اسباب کے درجے میں انہیں یہ پتا نہیں ہوتا تھا کہ فلاں بیماری متعدی ہوتی ہے اور فلاں بیماری متعدی نہیں ہوتی اور جو متعدی ہوتی ہے وہ کیسے ہوتی ہے۔ لعاب کے ذریعے سے ہوتی ہے سانس کے ذریعے ہوتی ہے یا کسی اور ذریعے سے۔ وہ عدوی کے مافوق الاسباب ہونے کے قائل تھے۔ اسی طرح اور بھی کئی مذاہب اور تہذیبوں میں یہی تصور تھا کہ یہ بیماری فلاں دیوتا کی وجہ سے لگتی ہے فلاں دیوی کی وجہ سے لگتی ہے وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ اس مریض کے قریب جاؤ گے تو وہ دیوتا یا

دیوی تمہیں بھی بیماری لگادے گی۔ بہت ساری بیماریوں کو اسی طرح کے بہت سارے دیوتاؤں اور جعلی خداؤں کے نام سے منسوب کیا کرتے تھے۔ بہر حال عربوں کے ہاں عدوی کا جو تصور تھا وہ مافوق الاسباب کے درجے میں تھا۔

تو یہاں دو چیزیں ہو گئیں ایک تو یہ کہ یہ بیماری ایک سے دوسرے کو لگتی ہے اور یہ لگنا مافوق الاسباب کے درجہ میں ہے یا یوں کہئے کہ کسی تجرباتی یا سائنٹیفک بنیاد کے بغیر توہم پرستی کے درجہ میں کوئی تعدیہ امراض کا قائل ہو ۔عربوں کے ہاں عدوی یہی تھا۔اور دوسرا یہ کہ طبّی تجربات سے یہ بات غلبۂ ظن یا یقین کی حد تک پہنچ گئی ہو کہ بیماری ایک سے دوسرے کو لگ جاتی ہے، اور اسباب کے درجے میں یہ سمجھا جائے کہ بیماری دوسرے میں منتقل ہوتی ہے۔ جیسے ایک آدمی نے اپنے جسم پر سیاہی ملی ہوئی اور وہ گیلی ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرا آدمی جب اپنا جسم اس کے جسم کے ساتھ لگائے گا تو اس کا جسم بھی کالا ہو جائے گا یہ سیاہی منتقل ہو رہی ہے لیکن یہ منتقل ہونا واضح طور پر اسباب کے درجے میں ہے، مافوق الاسباب کوئی چیز نہیں ہے۔اسی طرح ایک آدمی کی جلد پر فرض کریں بیماری ہے تو ظاہر ہے کہ اس بیماری کا کوئی وجود تو ہے تو اس کا کوئی سبب بھی ضرور ہوگا چاہے، جراثیم کہہ لیں یا بیماری کے باریک اجزا کہہ لیں یا کوئی اور نام دے لیں لیکن کوئی چیز تو ہے جو اس بیماری کا سبب بن رہی ہے ۔ جس طرح اس کی جلد پر سیاہی لگی ہوئی ہو اور دوسرے کی جلد لگنے سے یہ سیاہی اسے بھی منتقل ہو سکتی ہے۔اسی طرح بیماری بھی منتقل ہو سکتی ہے۔ جو چیز اس کی جلد پر لگی ہوئی ہے وہ دوسرے کی جلد پر بھی لگ جائے گی لیکن یہ منتقل ہونا اسباب کے درجہ میں ہے۔ایک آدمی نے فرض کیجئے اپنے جسم پر توے کی سیاہی ملی ہوئی ہے۔اس نے کپڑے پہنے ظاہر ہے کہ وہ کپڑے بھی کالے ہو جائیں گے یہ کالک کپڑوں کو لگ جائے اور وہی کپڑا کوئی دوسرا آدمی پہن لے تو ظاہر ہے کہ وہ کالک اس کو بھی لگ جائے گی تو یہ کالک منتقل ہو رہی ہے یہ نہیں سمجھا جا رہا ہے کہ مافوق الطبعیہ یا مافوق الاسباب کے درجہ میں منتقل ہو رہی ہے یا خود اس کالک کے اندر بذاتِ خود یہ طاقت آگئی ہے کہ وہ کسی کو لگ جائے، بلکہ ہر کوئی سمجھتا ہے کہ سبب کے درجہ میں منتقل ہو رہی ہے کہ یہ کپڑا واسطہ بن گیا منتقل ہونے کا۔اسی طریقے سے بیماری بھی مریض کے کپڑے میں منتقل ہو گئی اور پھر وہی کپڑے کسی دوسرے نے پہنے تو وہ اس کے جسم پر منتقل ہو گی تو جس طریقہ سے یہ سیاہی منتقل ہو رہی ہے اس طریقہ

سے بیماری بھی منتقل ہورہی ہے ۔ایک جگہ پر گندگی ہے ایک تو یہ سمجھا جائے کہ وہاں سے گندگی کسی دیوتا نے اٹھاکر یہاں منتقل کردی اور ایک یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کا مافوق الطبعیہ یا مافوق الاسباب درجہ میں یہ گندگی خود کسی اور جگہ منتقل ہوسکتی ہے اور ایک یہ ہے کہ یہ سوچے کہ اگر تیز ہوا چلی تو یہ گندگی اڑکر میرے جسم پر بھی پڑ سکتی ہے تو یہ بھی اس گندگی کے منتقل ہونے کا قائل ہے اور پہلے دو بھی قائل تھے، لیکن یہ تیسرا شخص اسباب کے درجہ میں اس کا قائل ہے اوراسباب بھی ایسے ہیں کہ جن کی تاثیر واضح ہے کیونکہ ہوا سے گندگی اڑکر بکثرت آتی رہتی ہے جبکہ پہلے دو شخصوں کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ پھر یہ تیسرا شخص اسباب کے درجے میں جو سمجھ رہا ہے وہ اس طرح کا نہیں ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ اگر آندھی چلی اور یہ جو سامنے بلڈنگ کھڑی ہے یہ ساری کی ساری اڑکر میرے اوپر گر جائے گی یا ہوا چلی تو یہ پہاڑ اڑکر میرے اوپر آجائے گا اس لئے یہ آدمی اگرچہ اسباب کے درجے میں قائل ہے اور ہوا کو سبب کے طور پر مان رہا ہے لیکن ہے یہ بالکل توہم ۔ جبکہ پہلا آدمی جو یہ سمجھ رہا کہ مٹی اڑکر پڑ جائے گی وہ چیز چونکہ بکثرت مشاہدے میں آتی ہے اس لئے وہ اسباب کے درجے میں بھی ہے اور محض وہم بھی نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ امراض کا منتقل ہونا دو طرح کا ہو گیا ایک یہ کہ مافوق الاسباب اور توہم پرستی کے درجہ میں قائل ہو، دوسرا یہ کہ اسباب کے درجہ میں قائل ہو اور اسباب بھی ایسے جن کا بار بار بکثرت مشاہدہ ہو چکا ہے اور اس کی وجہ سے غلبہ ظن یا یقین درجہ میں پہنچ جائے۔ اصل میں عدوی کہتے ہی پہلی صورت کو ہیں۔ دوسری نوعیت باب العدوی سے نہیں ہے بلکہ یہ باب الطب سے ہے۔ جن حدیثوں میں نفی ہے ان میں عدوی پہلے معنی میں ہے اور جن میں بیماری منتقل ہونے کا ثبوت ہے ان کا تعلق باب الطب سے ہے، اس لئے دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ چنانچہ بہت سارے شارحین محدثین نے لکھا ہے کہ آب وہوا کا اثر ہونا یہ سب کے ہاں مسلم ہے وبا کا اثر ہونا سب کے ہاں مسلم ہے۔ اب وبا کا اثر کیا ہے تو ظاہر ہے وبا کا اثر یہی ہے کہ ہوا وغیرہ کے اندر بیماری کے اجزا ہیں جو آدمی کے اندر منتقل ہو جاتے ہیں، اس لئے بیک وقت کئی لوگ اس بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو اگر ہوا سے انسان میں بیماری منتقل ہو سکتی ہے تو انسان سے انسان میں بھی منتقل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا تعلق طب کے ساتھ ہے عدوی کے ساتھ نہیں ہے۔

اب پوری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ توہم پرستی کے درجہ میں تو تعدیہ اَمراض کا قائل ہونا درست نہیں لیکن جہاں باقاعدہ طب اور طب کا منضبط علم کسی مرض کو متعدی قرار دے دے تو اس پر عمل کر لینے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے لٰہذا جس مرض کے بارے میں ڈاکٹر وغیرہ یہ کہہ دیں کہ اس میں جراثیم ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو کر بیماری بھی دوسرے کو لگ سکتی ہے۔ وہاں احتیاطی تدابیر اختیار کر لینی چاہئے اور یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ان احادیث کے منافی نہیں ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدوی کی نفی فرمائی۔

البتہ اس میں یہ خیال رہے کہ اس طرح کی احتیاطی تدابیر وہیں اختیار کرنی چاہئیں جہاں واقعتاً اطبا اور ڈاکٹر کہہ دیں کہ بیماری دوسرے کو لگ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ہر بیماری کے بارے میں از خود ہی مفروضہ قائم کر لیا جائے، جیسا کہ بہت سارے لوگوں کا یہ انداز ہوتا ہے اور وہ کسی بھی بیمار کے قریب نہیں جاتے، کسی کا جھوٹا پینے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایک ہے طبعاً کسی کا جھوٹا پینے کو دل نہ چاہے وہ الگ بات ہے لیکن مرض کے تعدیہ سے بچنے کے لئے محض اس احتمال پر کہ شاید اس کو کوئی بیماری ہو اور شاید وہ بیماری متعدی ہو اور شاید وہ مجھے لگ جائے تو اس طرح کی شاید پر عمل کرنا توہم پرستی ہے اس پر تو عمل نہیں کرنا چاہئے اس لئے خواہ مخواہ ہر بیمار سے دو بھاگتے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ البتہ جہاں پر واقعتاً ڈاکٹر متعدی بتا دیں تو وہاں احتیاطاً ان کی تدابیر پر عمل کر لینا چاہئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگرچہ بیماریاں متعدی ہوتی ہیں لیکن ہر بیماری متعدی نہیں ہوتی۔ لٰہذا ہر بیماری میں احتیاط کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔

پھر جو بیماریاں متعدی ہوتی ہیں ان کے بارے میں بھی یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ متعدی بیماریاں ایک ہی طریقے سے متعدی نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے متعدی ہونے کے انداز اور ذرائع مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ہر ایک میں احتیاط کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے، مثلاً بعض بیماریاں لعاب کے ذریعے سے منتقل ہوتی ہیں۔ جراثیم وغیرہ مریض کے لعاب میں ہوتے ہیں، جب اس کے جھوٹے وغیرہ کے ذریعے وہ لعاب دوسرے مریض میں منتقل ہوتا ہے تو اس کے بھی بیمار ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، ایسی متعدی بیماریوں میں مریض کے پس خوردہ اور جھوٹے سے بچنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، اس کے ساتھ ملنے جلنے، اس کے قریب جانے، اس کے ساتھ بات چیت کرنے سے گریز کرنا سوائے

مریض کی دل شکنی اور اس کی بے جا تذلیل ہے کے اور کچھ نہیں ہے۔

بعض بیماریاں ہوا کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں یعنی ان کے جراثیم یا وائرس ہوا کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں، مثلاً مریض یا ان جراثیم کا حامل زور سے کھانسا تو سانس جب زور سے نکلی تو وہ سانس دوسرے کے منہ پر جا کر پڑی ناک پر جا کر پڑی اور اس راستے سے اس تن درست کے منہ یا ناک کے راستے سے وہ بیماری اس کے اندر چلی گئی۔ اس لئے شریعت کا حکم ہے—جیسا کہ آگے کتاب الآداب کی حدیثوں میں آئے گا- جب چھینک وغیرہ آئے تو منہ پر ہاتھ یا کپڑا رکھ لو۔ ایسی متعدی بیماریوں میں احتیاط بھی سانس تک محدود رہنی چاہئیے۔ جسے اپنے بارے میں اس طرح کے مرض کا یقین ہو اسے بھی چاہیئے کہ وہ اس میں خود احتیاط رکھے، مثلاً جب ضرورت اور موقع ہو وہاں منہ اور ناک پر ماسک رکھ لے۔ بعض بیماریاں خون کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں کہ ایک کا خون دوسرے کو لگایا گیا تو پہلے کی بیماری دوسرے کو بھی لگ گئی۔ بعض بیماریاں جسم کے جسم کے ساتھ ملنے سے منتقل ہوتی ہیں، چاہے یہ ملاپ براہ راست ہو یا بالواسطہ مثلاً ایک آدمی کو متعدی خارش ہے اس کے ساتھ دوسرے آدمی کا جسم کسی طریقے سے ٹکرایا معانقہ کیا مصافحہ کیا اس کے اندر بھی منتقل ہو گئی۔ بالواسطہ ملاپ کی مثال کہ وہ ایک بستر پر لیٹا تھا تو بیماری بستر میں آگئی اور دوسرا آدمی اسی بستر میں آکر لیٹا اس کو بھی لگ گئی۔ بعض بیماریاں منتقل ہوتی ہیں جنسی تعلق کے ذریعے۔ آج کل بکثرت پھیلنے والی متعدد خطرناک بیماریوں کے پھیلاؤ کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔

حاصل یہ کہ اول تو ساری بیماریاں متعدی نہیں ہیں اس لئے ہر بیماری میں مریض سے دور رہنا یہ ٹھیک نہیں ہے بلکہ اطبا کی رائے لینی چاہئے کہ احتیاط کی ضرورت بھی ہے یا نہیں اور پھر جو بیماریاں متعدی ہوتی ہیں وہ ایک طریقے سے نہیں بلکہ متعدد طریقوں سے متعدی ہوتی ہیں اس لئے ہر بیمار کے جھوٹے سے بچتے رہو یا اسے بالکل ہی الگ تھلگ کر دو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ جس حد تک واقعتا کوئی ماہر طبیب یہ کہہ دے کہ احتیاط کرنی چاہئے اس حد تک تو احتیاط واقعتا کرنی چاہئے لیکن اس سے زائد توہمات میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ بعض لوگ جراثیم سے ضرورت سے زیادہ ڈرتے اور ڈراتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض بیماریاں متعدی ہوتی ہیں اور خطرناک بھی ہوتی ہیں لیکن مطلقاً ہر جگہ

پر جراثیم خطرناک ہوں ایسا نہیں ہوتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک حد تک اللہ تعالیٰ نے قوت مدافعت رکھی ہے اور بہت سارے جراثیم کی مدافعت انسان کا جسمانی نظام خود بخود کرلیتا ہے۔اس میں خواہ مخواہ جو لوگ حد سے زیادہ توہمات میں پڑتے ہیں ان کا عموماً دفاعی نظام کمزور ہو جاتا ہے۔اب بہت سارے لوگ ہیں جو عام سادہ پانی پیتے ہیں ابالے بغیر بھی پیتے ہیں اور شریعت اس سے منع نہیں کرتی کہ پانی ابال کر پی لو یا کوئی اور احتیاط کر لو مسئلہ کی نہیں تجربہ کی بات کر رہا ہوں جو لوگ سادہ پانی پیتے ہیں ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے اور جو لوگ منرل واٹر اور بوتلوں کے اندر پیک پانی پیتے ہیں ان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ کبھی کبھار وہ بھی بیمار ہوتے ہیں وہ بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے جو شفاف پانی پینے کا عادی ہوگا اس کو کہیں دوسرا پانی آدھا گلاس بھی پینا پڑ گیا تو اس کا پیٹ خراب ہو جائے گا جراثیم اس میں ہوتے ہیں لیکن جو وہی پانی پیتے ہیں ان کے اندر ایک مدافعتی قوت پیدا ہو چکی ہوتی ہے اور جو زیادہ نازک مزاج ہوتے ہیں ان کا یہ مدافعتی نظام جواب دے چکا ہوتا ہے اس لئے ان جراثیم کے بارے میں شریعت ان کی نفی تو نہیں کرتی البتہ وہم میں پڑنے اور بہت زیادہ حساس بننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اب ایسے لوگ بھی ہیں جو ذرا سا عام لوگوں کے بستر پر بیٹھ جائیں تو ان کو خارش ہو جاتی ہے اور ایسے لوگ بھی ہیں جو دیہاتوں میں گندے پانی میں نہاتے ہیں انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اس طرح کے گندے پانی میں نہانا چاہیئے ، کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ آدمی بہت زیادہ نازک نہ بنے تو اس کے جسم میں مدافعتی نظام ٹھیک رہتا ہے اگر خواہ مخواہ نازک مزاجی اختیار کرتا رہے تو مدافعتی نظام کمزور پڑ جاتا ہے۔البتہ فطری طور پر بھی طبیعت کا فرق ہوتا ہے بعض ذرا احساس اور نازک ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے۔ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق سب کو چلنا چاہیئے۔ اس مسئلے پر میں نے اپنی عربی کتاب ''تکملۃ معارف السنن'' کی پہلی جلد کے باب ماجاء فی الفرار من الطاعون میں تفصیل بات کی ہے،مزید تفصیل وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ

وَلَا هَامة وَلَا صَفَرَ وَفِرَّ مِنَ الْمَجْذُومِ كَمَا تَفِرُّ مِنَ الأَسَدِ» . رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھوت چھات کی کوئی حقیقت نہیں، بد شگونی نہیں، ہامہ (کھوپڑی) کا تصور بھی کچھ نہیں اور صفر (کے بارے میں مروّجہ تصورات) کی بھی کوئی حقیقت نہیں اور کوڑھ کے مریض سے ایسے بھاگو جیسا کہ تم شیر سے بھاگتے ہو۔

عدوی کے بارے میں بات تو گذشتہ حدیث کے تحت ہو چکی ہے۔اسی طرح طیرۃ (بد شگونی کے بارے میں بحث بھی باب کے شروع میں ہو چکی ہے، مزید جن چند چیزوں کی حدیث میں نفی کی گئی ہے ان کے بارے میں یہاں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

ھامہ کا مطلب:

ہامۃ (میم کی تشدید کے بغیر) کے معنی عربی زبان میں کھوپڑی کے بھی آتے ہیں اور اُلو کے بھی جو کہ ایک مشہور پرندہ ہے۔اس حدیث کی تشریح میں مشہور قول دو ہیں، اور دونوں باتیں ہی اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ایک قول یہ ہے کہ یہاں ہامہ سے مراد اُلو ہے، عربوں کے ہاں اسے منحوس جانور سمجھا جاتا تھا، اس کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ جس گھر میں یہ آجائے وہاں نحوست ہوتی ہے، وجہ اس کی یہ بیان کرتے تھے کہ یہ رات کا جانور ہے، اس لئے کہ دن کے وقت یہ اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتا، اس لئے اس کی ساری سرگرمیاں رات کے وقت ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ لا ہامۃ کہہ کر اس خیال کی نفی کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں کوئی نحوست نہیں ہوتی۔

اس حدیث کی تشریح میں دوسرا قول یہ ہے کہ عربوں کے ہاں کسی شخص کے قتل ہو جانے کی صورت میں اس کا بدلہ لینے کو بہت اہم اور مقتول کا اپنے لواحقین کے ذمے ایک حق سمجھا جاتا تھا۔اس سلسلے میں ان کے ہاں یہ تصور بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی روح ایک الو یا اس جیسے کسی اور پرندے کی شکل اختیار کر لیتی ہے،

یااس کی کھوپڑی سے ایک پرندہ نکلتا ہے اور وہ پرندہ چیختا ہے اسقونی ، اسقونی میری پیاس بجھاؤ، میری پیاس بجھاؤ، اس کا یہ چیخنا انتہائی منحوس ہوتا ہے، اور جب تک اس کی پیاس نہ بجھ جائے تب تک وہ چیختا رہتا ہے۔ اسے پیاس پانی کی نہیں بلکہ قاتل کے خون کی ہوتی ہے، لہذا جب اس کے خون کا بدلہ لے لیا جاتا ہے تو وہ پرندہ پر سکون ہو جاتا ہے اور اس کے نحس اثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث میں لاھامۃ کہہ کر زمانۂ جاہلیت کے اسی توہم کی نفی کرنا مقصود ہے۔

لاصفر:

اس جملے کی بھی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، سب سے مشہور تفسیر یہ ہے کہ صفر سے مراد اپیٹ کی ایک خاص بیماری ہے، شاید اسے صفر کہنے کی وجہ یہ ہو کہ اس میں جسم کی رنگت پیلی پڑ جاتی ہو گی، اس کے بارے میں عربوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ انتہائی چھوت کی بیماری ہے، یہاں حدیث کے اس جملے کے ذریعے اسی خیال کی نفی کرنا مقصود ہے۔ اس تشریح کے مطابق اس جملے کا بنیادی مفہوم وہی ہے جو لاعدوی کا تھا۔ چونکہ اس بیماری کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے لوگ زیادہ 'عدوی' کے قائل تھے اس لئے اس کا خاص طور پر ذکر کر دیا گیا۔

بعض نے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں صفر کے مہینے کے بارے میں جو توہم پرستانہ خیالات پائے جاتے تھے، مثلاً یہ کہ یہ مہینہ بہت منحوس ہوتا ہے اس کی نفی کرنا مقصود ہے۔ بعض نے کہا کہ زمانۂ جاہلیت میں کئی عرب صفر کے مہینے کو ایک سال محترم مہینوں (اشہر حرم) میں شمار کرتے تھے اور ایک سال عام مہینوں میں، اس کی تردید مقصود ہے۔

کوڑھی سے بھاگنے کا حکم:

مجذوم سے دور رہنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی ایک وجہ بعض حضرات کے قول کے مطابق یہ ہو سکتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں من جانب اللہ جذام کی بیماری لاحق ہو جائے اور تم اسے عدوی سمجھ کر بداعتقادی کا شکار ہو جاؤ، یا سبب کے درجے میں اس سے تمہاری طرف بیماری منتقل ہو جائے اور تم اسے مؤثر لذاتہ سمجھ لو۔ اس قول کے مطابق

اصل مقصود غلط اعتقاد سے بچانا ہے۔ دوسرے قول کے مطابق آں حضرت ﷺ سمجھتے تھے کہ جذام کی بیماری طب کے درجے میں متعدی ہوتی ہے، جیسا کہ بیشتر جلدی امراض میں ہوتا ہے، اس لئے دوسروں کو اس بیماری سے بچانے کے لئے اس سے دور رہنے کا حکم فرمایا۔ مزید تفصیل پچھلی حدیث کے تحت گذر چکی ہے۔

بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ خود حضور اقدس ﷺ نے ایک مجذوم کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرمایا، یہ بات بظاہر زیرِ بحث حدیث کے خلاف معلوم ہوتی ہے، اس کا جواب اگلی فصل میں حدیث نمر ۱۰ کے تحت آئے گا، إن شاءاللہ۔

بیماری وغیرہ اصل میں اللہ کی طرف سے ہے

(۳) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا عَدْوَى وَلَا هَامَةَ وَلَا صَفَرَ» . فَقَالَ أَعْرَابِي: يَا رَسُول الله فَمَا بَالُ الْإِبِلِ تَكُونُ فِي الرَّمْلِ لَكَأَنَّهَا الظِبَاءُ فَيُخَالِطُهَا الْبَعِيْرُ الْأَجْرَبُ فَيُجْرِبُهَا؟ فَقَالَ رَسُولُ الله صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَمَنْ أَعْدَى الأَوْلَ». رَوَاهُ الْبُخَارِيّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھوت چھات کچھ نہیں ہے، ہامہ کچھ نہیں ہے، صفر کچھ نہیں ہے۔ تو ایک اعرابی کے یا رسول اللہ، کیا وجہ ہے کہ اونٹ ریتلے علاقے میں ایسے ہوتے ہیں جیسا کہ وہ ہرن ہوں (یعنی ہرن کی طرح ان کی جلد صاف ستھری ہوتی اور خارش سے پاک ہوتی ہے، یا صحت منداور چست ہونے میں ہرن کی طرح ہوتے ہیں) پھر خارشی اونٹ ان سے آملتے ہیں تو انہیں بھی خارشی بنادیتے ہیں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پھر پہلے کو کس نے خارشی کیا ہے؟

ستارے بارش نہیں دیتے

(٤) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا عَدْوَى وَلَا هَامَةَ وَلَا نَوْءَ وَلَا صَفَرَ». رَوَاهُ مُسلم.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا چھوت چھات کچھ نہیں ہے، ہامہ کچھ نہیں ہے، ستاروں کی منزلیں کچھ نہیں ہیں اور صفر کچھ نہیں ہے۔

اس حدیث میں نئی بات ہے لانوء۔ أنواء کی تفسیر اگلے باب کی ایک حدیث میں آجائے گی۔ یہاں اجمالا اتنا سمجھ لیا جائے کہ عرب بارش ہونے کو خاص ستاروں کے خاص منازل میں ہونے کی طرف منسوب کرتے تھے، یہاں اس خیال کی نفی مقصود ہے، اگلے باب میں آئے گا کہ اس کی بجائے یہ کہنا چاہئے کہ مُطِرنا بفضل اللہ، یعنی اللہ کے فضل سے بارش ہوئی ہے۔

بھوت کچھ نہیں

(٥) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «لَا عَدْوَى وَلَا صَفَرَ وَلَا غُولَ». رَوَاهُ مُسلم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عدوی کچھ نہیں، صفر کچھ نہیں اور بھوت کچھ نہیں۔

بھوت کی حقیقت:

غُول (غین کے پیش کے ساتھ)، اس کے معنیٰ ہیں خاص قسم کے ڈراؤنے جنات جو عموماً جنگلوں میں ہوتے ہیں، اس کا اردو عموماً بھوت کیا جاتا ہے۔ عربوں کا خیال تھا کہ یہ بھوت رات کے وقت مسافروں کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں اور انہیں ڈراتے بھی ہیں اور صحیح راستے بھی بھٹکا دیتے ہیں۔ قرآن کریم سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب جنات اور شیاطین کی غیر معمولی قدرت اور طاقت کے قائل تھے، چنانچہ جب وہ کسی وادی سے گذرتے تھے تو وہاں کے جنات کے سربراہ سے پناہ کے طلب گار ہوتے تھے، قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے جنات کے سامنے اس طرح عاجزی ظاہر کرنے کی وجہ سے ان کے دماغ خراب ہو گئے تھے اور ان کی سرکشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ سورۃ الجن میں ہے [وَأَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِنَ الإِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِنَ الجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا]۔

اس حدیث میں بھوتوں کے وجود کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کے بارے میں اہلِ جاہلیت کے جو خیالات تھے، خصوصاً ان کی غیر معمولی طاقت کے جو تصورات تھے، یا خواہ مخواہ ہر چیز کو ان کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے اس کی نفی کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ جنگل میں رات کے سنّاٹے میں ویسے ہی آدمی ڈر جاتا ہے اور اسے وہمی طور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی حرکت ہو رہی ہو اور کوئی آہٹ یا آواز سنائی دے رہی ہو، اسے بھی وہ لوگ بھوتوں کے کھاتے میں ڈال دیتے تھے، اسی طرح رات کے وقت آدمی کا راستہ بھولنا معمول کی چیز ہے، دن کے وقت صحیح راستہ معلوم کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا رات کو ہوتا ہے، خصوصاً آدمی تنہائی یا کسی اور وجہ سے سہما ہوا بھی، تو وہ لوگ راستے کے اس بھولنے کو بھی بھوتوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔

یہ جو ہم نے کہا حدیث میں غول (بھوت) کے خود وجود کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ بعض احادیث سے ان کا وجود ثابت بھی ہوتا ہے مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہی کی ایک حدیث ہے (زیرِ بحث حدیث لا غول بھی حضرت جابر ہی سے مروی ہے) کہ آں حضرت ﷺ نے سفر کے آداب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب

دورانِ سفر بھوت ظاہر ہوں تو اذان کہا کرو[1]۔اسی مضمون کی حدیث حضرت سعد بن أبي وقاص اور حضرت ابوہریرة سے بھی مروی ہے[2]۔اس سے معلوم ہوا کہ غول (بھوت) کا بذاتِ خود وجود ہے، یہاں اس کے وجود کی نفی مقصود نہیں بلکہ اس کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے تصورات کی نفی مقصود ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوڑھی کو واپس فرمادیا

(٦) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الشَّرِيدِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: كَانَ فِي وَفْدِ ثَقِيفٍ رَجُلٌ مَجْذُومٌ فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّا قد بايعناك فَارْجِع» . رَوَاهُ مُسلم.

حضرت عمرو بن الشرید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بنو ثقیف کے وفد میں ایک کوڑھ کا مریض تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف پیغام بھجوایا کہ ہم نے تمہیں (زبانی اور غائبانہ طور پر) بیعت کر لیا ہے، اس لئے واپس چلے جاؤ۔

الفصل الثاني

1۔ مسند أحمد حدیث نمبر ۱۴۲۷۷، ہیثمی نے مجمع الزوائد (۲۱۳/۳) میں اسے مسند ابویعلی کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد کہا ہے رجالہ رجال الصحیح۔

2۔ مجمع الزوائد ۱۳۴/۱۰۔

آنحضرت ﷺ کو اچھا نام پسند تھا

(۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَفَاءَلُ وَلَا يَتَطَيَّرُ، وَكَانَ يُحِبُّ الِاسْمَ الْحَسَنَ. رَوَاهُ فِي شَرْحِ السّنة

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اچھی فال کا اثر لیتے تھے اور برا شگون نہیں لیتے تھے، اور آپ اچھے نام کو پسند فرماتے تھے۔

(۸) وَعَن قَطن بن قَبيصةَ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْعِيَافَةُ وَالطَّرْقُ وَالطِّيَرَةُ مِنَ الْجِبْتِ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت قبیصہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا پرندوں کے ذریعے فال لینا، کنکریاں پھینک کر فال لینا اور بد شگون جادو ٹونے میں سے ہے۔

حدیث میں تین لفظ آئے ہیں

العیافۃ کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، سب سے معروف معنی یہ ہیں کہ عربوں کے ہاں پرندوں کے ذریعے اچھی یا بری فال حاصل کرنے کا رواج تھا، مثلا اگر کسی جگہ عُقاب آگیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عِقاب اور سزا و تکلیف کا موجب ہوگا، کوّا پردیس اور تنہائی کی علامت ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض نے عیافہ سے پرندوں کو اپنے گھونسلوں سے اڑا کر قسمت معلوم کرنا ہے، جس کی کچھ وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

الطرق یہ بھی قسمت یا کام اور فیصلے کا انجام جاننے کا ایک ذریعہ تھا، جس کا ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ عورتیں

خاص انداز سے کنکریاں یابٹیاں پھینک کران سے مخصوص نتائج حاصل کرتی تھیں۔

من الجبت ، جِبت کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، مثلاً جادو، جادو گر، کاہن، بت، شرک وغیرہ، یہاں جادو یاشرک والے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔

بدشگونی سے بچاؤ: توکل کے ذریعے

(۹) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الطِّيَرَةُ شِرْكٌ» قَالَهُ ثَلَاثًا ، وَمَا مِنَّا إِلَّا ، وَلَكِنَّ اللّٰہَ يُذْهِبُهُ بِالتَّوَكُّلِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ إِسْمَاعِيلَ يَقُولُ: كَانَ سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ يَقُولُ فِي هَذَا الْحَدِيثِ: «وَمَا مِنَّا إِلَّا وَلَكِنَّ اللّٰہَ يُذْهِبُهُ بِالتَّوَكُّلِ» . هَذَا عِنْدِي قَوْلُ ابْنِ مَسْعُودٍ.

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا بدشگونی شرک ہے۔ یہ بات آپ نے تین دفعہ ارشاد فرمائی، (اور فرمایا) ہم میں ہر کوئی (مبتلا) ہو ہی جاتا ہے البتہ اللہ تعالی توکل کی برکت سے اسے زائل کردیتے ہیں۔ سلیمان بن حرب (حدیث کے ایک راوی) کہتے ہیں کہ یہ آخری جملہ ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے۔

مطلب یہ کہ بری فال کا خیال ایسی چیز ہے جس میں آدمی غیر اختیاری طور پر کچھ نہ کچھ مبتلا ہو ہی جاتا ہے، یعنی اس طرح کا خیال خود بخود ذہن میں آہی جاتا ہے، لیکن غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے ویسے ہی معاف ہے جب تک اس کے مقتضی پر عمل نہ کرے، دوسرے اگر آدمی توکل اختیار کرے تو اس طرح کے خیال کا کوئی برا اثر بھی مرتب نہیں

ہوتا۔اس موضوع پر کچھ بات بد شگونی کے علاج کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

حدیث کے آخری جملے کے بارے میں امام ترمذی نے اپنے شیخ امام بخاریؒ کے حوالے ایک بڑے درجے کے محدث سلیمان بن حرب کا قول نقل کیا ہے کہ ''ما منا إلا'' سے آخر تک یہ جملہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نہیں ہے، بلکہ ابنِ مسعودؓ کا قول ہے۔ لیکن اس حدیث کے جتنے بھی طرق ہیں ان سب میں اس جملے کو باقی حدیث کے ساتھ ہی ذکر کیا گیا ہے، کوئی ایسا لفظ کسی طریق میں نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہاں مرفوع حدیث یعنی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ختم ہو گیا ہے اور ابن مسعود کا قول شروع ہو گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ علامہ مناوی نے ابن القطان نے سلیمان بن حرب کی اس بات پر گرفت کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ ادراج کا دعوی کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے[1]۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان بن حرب نے جو کہا ہے وہ کسی اسنادی قرینے پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں چونکہ جمع متکلم کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس لئے انہیں یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی کہ نبی کریم ﷺ اپنے بارے میں کیسے فرما سکتے ہیں کہ ہم میں بد شگونی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہاں بالفعل مبتلا ہونے کی بات نہیں ہو رہی، بلکہ غیر اختیاری وسوسے کی بات ہو رہی ہے، دوسرے جمع متکلم کا صیغہ بول آپ ﷺ اپنی امت کی بات کرنا چاہتے ہیں، اپنی نہیں[2]۔

---

١ – لكن تعقبه ابن القطان بأن كل كلام مسوق في سياق لا يقبل دعوى دَرْجه إلا بحجة (فيض القدير ٤/ ٢٩٤).

٢ – ولو كان مرفوعا كان المراد وما منا، أي: من المؤمنين من الأمة (حاشية السندي على ابن ماجه).

مجذوم کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل کرنا

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ بِيَدِ مَجْذُومٍ فَوَضَعَهَا مَعَهُ فِي الْقَصْعَةِ ، وَقَالَ: «كُلْ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَتَوَكُّلًا عَلَيْهِ» . رَوَاهُ ابْنِ مَاجَه

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کوڑھ کے ایک مریض کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھانے کے بڑے برتن میں شامل کیا اور فرمایا: اللہ پر بھروسا اور توکل کر کے کھاؤ۔

یہاں صاحبِ مشکوۃ نے یہ حدیث ابن ماجہ کے حوالے سے ذکر کی ہے، یہی حدیث ابوداود اور ترمذی وغیرہ میں بھی موجود ہے اور ان میں ثقة بالله سے پہلے بسم الله کے لفظ بھی ہیں۔امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث دو طرح سے روایت کی گئی ہے، ایک تو یہی مرفوع روایت جو ہمارے سامنے ہے، جس میں یہ ہے مجذوم کے ساتھ کھانے کا واقعہ نبی کریم ﷺ کا ہے، دوسری روایت وہ ہے جو حضرت عمرؓ سے موقوفاً روایت کی گئی ہے، یعنی اس کے مطابق مجذوم کو کھلانے کا واقعہ حضرت عمرؓ کا ہے۔امام ترمذی نے اس دوسری روایت کو زیادہ درست قرار دیا ہے۔

پہلے گذر چکا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے مجذوم سے دور رہنے کا حکم فرمایا ہے، اسی طرح آپ نے ایک مجذوم کو دست بدست بیعت کرنے سے بھی انکار فرمادیا اور اسے بذریعہ کلام ہی بیعت فرمانے پر اکتفا کیا، جبکہ اس زیرِ بحث روایت میں حضور اقدس ﷺ خود ایک مجذوم کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل فرمارہے ہیں، یہ حدیث بظاہر گذشتہ حدیثوں کے معارض ہے۔

اس کے بارے میں پہلی بات تو یہ کہی گئی ہے کہ مجذوم سے بچنے کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں، جبکہ یہ حدیث سنداً ان احادیث کے ہم پلہ نہیں ہے، اس لئے کی اس کی سند میں ایک راوی مفضل بن فضالہ بصری جن پر اس کی سندوں کا مدار

ہے ضعیف ہیں، اور اگر ان کی روایت کو قبول بھی کرلیا جائے تو بقول امام ترمذی کے وہ روایت زیادہ قابل قبول ہے جس میں شعبہ نے مفضل کے حوالے سے یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نقل کیا ہے، نہ کی نبی کریم ﷺ کا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص واقعہ ہے جسے خاص صورتِ حال پر محمول کیا جاسکتا ہے، مثلاً آنحضرت ﷺ نے یہاں قرائن یا کسی ذریعے سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ اس مجذوم کے ساتھ کھانے سے کوئی برا اثر نہیں پڑے گا، بعض نے اس کی وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام ایسے امراض اور عوارض سے محفوظ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو نفرت ہوتی ہو، اس لئے آپ ﷺ کو یقین تھا کہ یہ بیماری مجھ تک متعدی نہیں ہوگی، جہاں حضور اقدس ﷺ نے مجذوم سے گریز فرمایا ہے وہ دوسروں کی تعلیم کے لئے ہوگا۔ میں نے کہیں یہ بھی پڑھا ہے کہ جذام کی بیماری کے مختلف سٹیج ہوتے ہیں، بعض میں یہ بیماری متعدی ہوتی ہے بعض میں نہیں۔ اگر یہ بات درست ہو تو حضور اقدس ﷺ کے مختلف مجذوموں کے ساتھ مختلف طرزِ عمل اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ مریض مختلف بیماری کے مختلف مراحل میں ہوں گے۔ واللہ أعلم بالصواب۔

گھر، سواری اور عورت میں نحوست

(۱۱) وَعَن سعدِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا هَامَةَ وَلَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ ، وَإِنْ تَكُنِ الطِّيَرَةُ فِي شَيْءٍ فَفِي الدَّارِ وَالْفرس وَالْمَرْأَة» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت سعد بن مالک (سعد بن ابی وقاص) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھوپڑی کی کوئی حقیقت نہیں، عدوی کی کوئی حقیقت نہیں، بد شگونی کچھ نہیں۔ اگر بد شگونی کسی چیز میں ہوتی تو گھر، گھوڑے اور عورت میں ہوتی۔

یہ بات متعدد حدیثوں میں مختلف لفظوں کے ساتھ آئی ہے کہ ان تین چیزوں میں نحوست ہوتی ہے۔ ان حدیثوں کا مطلب کیا ہے، اس میں علما کے مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً بعض نے یہ کہا کہ اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ کسی چیز میں نحوست نہیں ہوتی، تاہم حضور اقدس ﷺ ان تین چیزوں کو اس قاعدے سے مستثنےٰ فرمارہے ہیں۔ بعض نے کہا کہ ان تین چیزوں میں نحوست کو ثابت کرنا فرض اور تقدیر پر مبنی ہے، یعنی کسی چیز میں نحوست ہوتی تو نہیں ہے تاہم بالفرض اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ہو وہ ان تین چیزوں میں ہوتی۔ ان حضرات کی تائید زیرِ بحث حدیث کے الفاظ سے بھی ہو رہی ہے، اس لئے کہ اس میں یہ بات جملہ شرطیہ کے انداز میں کہی گئی ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہاں نحوست سے مراد طبیعت کے موافق نہ ہونا ہے۔ اور بھی کئی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو طبیعت کے موافق نہیں ہوتیں ان تین چیزوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر اس لئے کیا کہ یہ اگر طبیعت کے موافق نہ ہوں تو انسان کو تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ گھر مرضی کے مطابق نہ ہو، سواری آرام دہ نہ ہو یا زندگی کا ساتھ طبیعت کے موافق نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

(١٢) وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُعْجِبُهُ إِذَا خَرَجَ لِحَاجَةٍ أَنْ يَسْمَعَ: يَا رَاشِدُ، يَا نَجِيحُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کام کے لئے نکلتے تھے تو آپ کو یہ لفظ سننا اچھا لگتا تھا یا راشد، یا نجیح۔

(١٣) وَعَنْ بُرَيْدَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ لَا يَتَطَيَّرُ مِنْ شَيْءٍ، فَإِذَا بَعَثَ عَامِلًا سَأَلَ عَنِ اسْمِهِ، فَإِذَا أَعْجَبَهُ اسْمُه فَرِح بِهِ وَرُئِيَ بِشْرُ ذَلِك على وَجْهِهِ، وَإِنْ كَرِهَ اسْمَهُ رُئِيَ كَرَاهِيَةُ ذَلِكَ على وَجْهِهِ. وَإِذَا دَخَلَ قَرْيَةً سَأَلَ عَنِ

اسْمِهَا ، فَإِنْ أَعْجَبَهُ اسْمُهَا فَرِحَ بِهِ وَرُئِيَ بِشْرُ ذَلِكَ فِي وَجْهِهِ ، وَإِنْ كَرِهَ اسْمَهَا رُئِيَ كَرَاهِيَة ذَلِك فِي وَجْهِه. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ براشگون تو نہیں لیتے تھے، تاہم جب کسی کو عامل بنا کر بھیجنا ہوتا تو اس سے اس کا نام پوچھتے، اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو آپ اس سے خوش ہوتے تو اس خوشی کا اثر آپ کے چہرہ مبارک پر نظر آتا اور اگر اس کا نام آپ کو اچھا نہ لگتا تو اس کی ناگواری کا اثر آپ کے چہرے پر نظر آتا۔ (اسی طرح) جب کسی بستی میں داخل ہوتے تو اس کے نام کے بارے میں پوچھتے، اگر آپ کو اس کا نام پسند آتا تو آپ اس کی وجہ سے خوشی ہوتے اور اس خوشی کا اثر آپ کے چہرہ مبارک پر نظر آتا اور اگر اس کا نام ناپسند ہوتا تو ناگواری کا اثر آپ کے چہرے پر نظر آتا

(١٤) وَعَن أنس قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّا كُنَّا فِي دَارٍ كَثُرَ فِيهَا عَدَدُنَا وَأَمْوَالُنَا فَتَحَوَّلْنَا إِلَى دَارٍ قَلَّ فِيهَا عَدَدُنَا وَأَمْوَالُنَا. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «ذَرُوْهَا ذَمِيْمَة». رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یارسول اللہ، ہم ایک ایسے گھر میں تھے جس میں ہماری تعداد بھی زیادہ تھی اور ہمارا مال بھی۔ پھر ہم ایک ایسے گھر میں منتقل ہوگئے جس میں ہماری تعداد بھی کم ہوگئی اور مال بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس گھر کو چھوڑ دو کہ وہ برا ہے۔

اس گھر یا علاقے سے منتقل ہونے کا حکم حضور اقدس ﷺ نے ہو سکتا ہے اس وجہ سے دیا ہو کہ اس کی آب وہوا ان کے موافق نہ آئی ہو اور ہو سکتا ہے یہ محض ان کا وہم اور حضور اقدس ﷺ نے ان کے وہم کے ازالے کے لئے انہیں ایسا فرمایا ہو۔ یاد رہے کہ عربوں کے مال مویشیوں کو بھی مال کہہ دیا جاتا تھا۔

(١٥) وَعَنْ يَحْيَى بْنِ عَبْدِ اللهِّ بْنِ بَحِيرٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي مَنْ سَمِعَ فَرْوَةَ بْنَ مُسَيْكٍ يَقُولُ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِّ عِنْدَنَا أَرْضٌ يُقَالُ لَهَا أَبْيَنُ وَهِيَ أَرْضُ رِيفِنَا وَمِيرَتِنَا ، وَإِنَّ وَبَاءَهَا شَدِيدٌ. فَقَالَ: «دَعْهَا عَنْكَ فَإِنَّ من القَرَف التّلف» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت فروہ بن مُسَیک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ہماری ایک زمین ہے، جسے ابین کہا جاتا ہے، یہ ہماری کھیتی باڑی اور غلے کی زمین ہے، لیکن وہاں کی وبا سخت ہے۔ تو حضوراقدس ﷺ نے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اس لئے کہ بیمار کے قرب سے ہلاکت ہوتی ہے۔

الفصل الثالث

(١٧) عَن عُرْوَة بن عَامر قَالَ: ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ رَسُولِ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: " أَحْسَنُهَا الْفَأْلُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِّ ". رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ

حضرت عروہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے شگون کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا اس میں نیک فال اچھی ہوتی ہے۔ اور (کوئی شگون) کسی مسلمان کو (کسی) کام سے روکے نہیں۔ جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز دیکھے جو اسے بری لگے (اور اس سے بد شگونی دل میں پیدا ہو جائے) تو اسے چاہئے کہ یوں کہے کہ اللَّهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ

إِلَّا أَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰه (اے اللہ اچھائیاں لانے والے صرف آپ ہیں، برائیاں دور کرنے والے بھی صرف آپ ہیں، برائی سے بچنے اور اچھائی کے حصول کی طاقت بھی صرف اللہ کی مدد سے ہوتی ہے)

باب الکھانۃ

مقدمہ

مستقبل بینی کے ذرائع اور عربِ جاہلیت میں ان کا چلن

انسان اپنے ماضی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے، اسی طرح وہ اپنے حال سے بھی ناواقف نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت میرے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ ماضی اور حال کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم نہیں ہے اسے معلوم کرنا بھی انسان کے لئے نسبتاً آسان ہے۔ مستقبل کا معاملہ حال اور ماضی سے خاصا مختلف ہے۔ مستقبل انسان کی نظروں سے کافی اوجھل رہتا ہے، لیکن مستقبل کے حوالے سے تجسس اور اسے جاننے کا شوق ہمیشہ سے انسان میں موجود رہا ہے۔ اسی طرح حال اور ماضی کی کئی چیزیں ایسی ہوتیں ہیں جنہیں انسان عام ظاہری اور ہر ایک کے لئے میسر ذرائعِ علم سے جان نہیں پاتا، اس کے لئے بھی انسان کے اندر ایک تجسس رہا ہے کہ میں روٹین سے ہٹ کر کسی ذریعے سے ان مخفی چیزوں کو جان لوں۔ آپ کی چوری ہوگئی، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ظاہری یا مروّج ذرائعِ علم سے آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ چوری فلاں نے کی ہے، مثلاً کوئی عینی شاہد آپ کو اس بارے میں بتادے، چور خود کسی کے سامنے اقرار کرلے، اس سے مسروقہ مال برآمد ہو جائے، یا بعض قرائن آپ کے سامنے ہوں اور آپ اپنی ذہانت استعمال کرکے کوئی درست نتیجہ نکال لیں۔ اس طرح سے آپ کو چوری کا جو علم ہوا ہے وہ عام روٹین کے ذرائع سے ہوا ہے۔ اگر اس طرح کے ذرائع جواب دے جاتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ کسی میں یہ خواہش پیدا ہو کہ میں روٹین کے ان ذرائع سے ہٹ کر اس مخفی امر یعنی اس چوری کے بارے میں جان لوں۔ تاریخ انسانی میں مستقبل میں جھانکنے اور مخفی امور کو جاننے کے لئے کئی تجربے اور کوششیں کی گئی ہیں۔ اس مقصد کے لئے باقاعدہ علوم اور پیشے وجود میں آئے۔ اس باب کا مقصد اسی نوعیت کی کوششوں کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر بیان کرنے والی احادیث کو ذکر کرنا ہے۔

مستقبل یا غیبی امور کو جاننے کے ذرائع دو طرح کے ہیں، بعض اختیاری ہیں، جن کے بارے میں یہ دعوی کیا جاتا رہا ہے کہ ہم جب چاہیں ان ذرائع سے کسی چیز کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔ بعض غیر اختیاری ہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ انسان جب چاہے ان کے ذریعے علم حاصل کرلے، بلکہ اللہ تعالی کی جب مرضی ہوتی ہے ان ذریعوں سے کسی کو علم عطا کر دیتے ہیں۔ غیر اختیاری ذرائع میں ایک تو وحی الٰہی ہے، جو انبیا اور رسل پر نازل ہوتی ہے، اور اس سے حاصل ہونے والا علم قطعی، سو فیصد درست اور شک وشبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔ دوسری چیز کشف اور الہام ہے۔ کشف اور الہام سے حاصل ہونے والا علم وحی کی طرح قطعی تو نہیں ہوتا، تاہم یہ بھی ایک ذریعۂ علم ہے۔ یہ ذریعہ بھی انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے اس سے علم حاصل کرلے۔ تیسری چیز فراستِ صادقہ ہے۔ یہ تین ذرائع تو خاص خاص لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں، نبوت ورسالت کا دروازہ تو ویسے ہی بند ہو چکا ہے۔ چوتھا ذریعہ ہے جس کا دروازہ ہر انسان کے لئے کم وبیش کھلا ہے اور وہ خواب ہے، خواب بھی علم کا ایک ذریعہ ہے، لیکن یہ بھی غیر اختیاری ہے، انسان کے عام اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جب چاہے جو چاہے یا جس موضوع پر چاہے خواب دیکھ لے[1]۔ ان غیر اختیاری ذرائع کو اسلام نے کسی نہ درجے میں معتبر قرار دیا ہے، لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان میں اطراد کا دعوی نہیں کیا جاسکتا، یعنی ایسا نہیں ہے کہ انسان جب چاہے ان ذرائع سے علم حاصل کرلے۔ اس باب میں ان غیر اختیاری ذرائع کے بارے میں احادیث ذکر کرنا مقصود نہیں ہے۔ خواب کے بارے میں اگلا باب ''باب الرؤیا'' آرہا ہے۔

1۔ اگرچہ بعض ایسے عملیات بھی بیان کئے جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے کرنے سے کسی خاص موضوع پر خواب میں آدمی کو صحیح صورتِ حال بتادی جاتی ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ایسے عملیات یا پڑھنے کے الفاظ کو 'حالومہ' کہا جاتا ہے، انہوں نے اس سلسلے میں اپنے کچھ تجربات بھی لکھے ہیں۔ قطع نظر ان کے درجۂ صحت سے یہ بھی ان ذرائع میں داخل ہوگا جو انسان کی کوشش کا محتاج ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اس باب کا مقصد پہلی قسم کے بارے میں احادیث ذکر کرنا ہے۔اس طرح کے ذرائعِ علم بے شمار تھے، لیکن عربوں میں چونکہ ان میں سب سے زیادہ رواج کہانت کا تھا اور احادیث مبارکہ میں بھی زیادہ ذکر اسی کا ملتا ہے، اس لئے یہاں باب کے عنوان میں اسے ذکر کر دیا گیا ہے۔ کہانت اگرچہ ایک طریقے یا ذریعے کا نام ہے لیکن عنوانِ باب میں اس طرح کے تمام ذرائع مراد ہیں۔اس طرح عنوانِ باب میں جس کہانت کی بات ہو رہی ہے اس کہانہ کی تعریف ہم یوں کر سکتے ہیں کہ غیب کی یعنی غیر مرئی چیزوں کی مستقل مہارت کے ذریعے یا مستقل پیشے کے طور خبر دینا جس کی خبر عام اسباب کے ذریعے عموماً حاصل نہیں کی جاسکتی۔

ہم نے ایک قید تو لگائی ہے کہ مستقل مہارات کے ذریعے غیب کی غیر مرئی چیزوں کی خبر دینے کا دعویٰ کرنا ، یہ قید وحی اور الہام کو نکالنے کے لئے لگائی گئی۔ اللہ کے نبی بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ لیکن وہ خبریں کسی اکتسابی یا غیر اکتسابی مستقل مہارت پر مبنی نہیں ہوتی اور نہ ہی کسی مہارت پر مبنی ہونے کا دعویٰ ہوتا ہے۔ بلکہ وہ خالصتاً اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ یہی حال الہام کا بھی ہے کہ اس کا تعلق بھی اکتساب کے ساتھ نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی غیب کی خبروں میں اطراد کا دعویٰ نہیں کرتا کہ جس وقت بھی جو کچھ بھی مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں ضرور بتادوں گا، بلکہ اللہ کی جانب سے جو بات بتادی جاتی ہے وہ آگے لوگوں کو بتادیتا ہے اور جو بات اللہ کی جانب سے نہیں بتائی جاتی تو وہ اس سے لاعلمی کا بھی واضح طور پر اقرار کرلیتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کے قیامت سے متعلق سوال کے جواب میں فرمایا ماالمسؤل عنہا باعلم من السائل ، اسی طرح جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسی جگہیں اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہیں تو آپ نے فرمایا کہ پوچھ کر بتاؤں گا۔ جبکہ کاہن اطراد کا دعویٰ بھی کیا کرتے تھے کہ جو بات بھی جب بھی پوچھو گے ہم تمہیں بتائیں گے اس لئے کہ یہ ان کا باقاعدہ پیشہ ہوتا تھا، چاہے وہ اسے کسبی طور پر حاصل کرنے کا دعوی کرتے ہوں یا پیدائشی طور پر بعض لوگوں میں یہ صلاحیت موجود ہونے کا نظریہ

ہو، بہر صورت اسے وہ مستقل صلاحیت شمار کرتے تھے اور اس کے بارے میں ان کا دعوی اطراد کا ہوتا تھا۔یہی معاملہ مستقبل بینی کے بارے میں دیگر علوم یامہارات کا ہے جن پر آگے چل کر ہم بات کریں گے [1]۔

ایک قید ہم نے یہ لگائی کہ اس کا علم عام اسباب میں داخل نہ ہو۔اگر اس چیز کا علم عام اسباب میں داخل ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ان عام اسباب میں بعض نے مہارت حاصل کر لی ہے اور بعض نے مہارت حاصل نہیں کی یہ بھی کہانہ میں داخل نہیں۔جیسا کہ اُس زمانے میں عربوں کے ہاں قائف ہوتے تھے یعنی قیافہ شناس۔ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ شکل دیکھ کر بتاتے تھے کہ اس کا نسب فلاں سے ملتا ہے۔اب شکل دیکھ کر یہ بتانا کہ یہ فلاں کا کچھ لگتا ہے کہ اس کی شکل فلاں سے ملتی ہے یہ عام اسباب کے اندر داخل ہے۔البتہ بعض لوگ چونکہ اس چیز پر توجہ نہیں دیتے اس لئے انہیں اس میں مہارت نہیں ہوتی بہت زیادہ مشابہت ہو تو انہیں پتا چل جاتا ہے کہ مشابہت ہے وگرنہ پتا نہیں چلتا، بعض لوگوں نے اس پر محنت زیادہ کی ہوتی ہے اس لئے وہ معمولی سی مشابہت سے جان لیتے ہیں اور اس سے انہیں پتا چل جاتا ہے۔یہ کہانہ میں داخل نہیں۔یہ الگ مسئلہ ہے کہ نسب کے ثبوت میں قیافہ کا دخل ہے یا نہیں بہر حال کہانہ میں داخل نہیں ہے۔اسی طرح قدیم عربوں کے ہاں حزّاز یا حارز ہوتے تھے یعنی کھوجی، جو قدموں کے نشان دیکھ کر یا کسی کی چال دیکھ کر فیصلہ کرتے تھے کہ اس طرف جو چور آیا ہے وہ یہی تھا۔اور یہ بھی چونکہ عام اسباب میں داخل ہے کہ یہ قدم اس طریقے سے پڑے ہوئے ہیں اور اس کے قدم بھی اسی طریقے سے پڑ رہے ہیں لہٰذا یہ نشان اسی کے قدموں کے ہیں اور رات کو یہی آیا تھا، اسی نے چوری کی ہے۔اس لئے یہ بھی کہانہ میں داخل نہیں۔

---

[1]۔کہانت کے تفصیلی تعارف اور کہانت، خواب، عرافت اور خواب وغیرہ کے درمیان فرق کے لئے ملاحظہ ہو: مقدمہ ابن خلدون ۱/۱۲۰ الباب الأول من الکتاب الأول المقدمۃ السادسۃ۔

اسی طرح آج کل بہت سی ایسی سائنسز آگئی ہیں جن کی بنیاد پر پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں مثلاً محکمہ موسمیات والے بتاتے ہیں موسم خشک رہے گا، ابر آلود رہے گا، بارش ہوگی نہیں ہوگی، برف باری ہوگی نہیں ہوگی یہ بھی چونکہ عام اسباب کے ذریعہ علم حاصل کیا جاتا ہے کہ ہواؤں کا یہ رخ ہے بادل فلاں طرف سے آرہے ہیں اس لئے یہ چیز ہے یہ چیز نہیں ہے تو یہ بھی کہانہ میں داخل نہیں ہے۔

زمانۂ جاہلیت اور رسالت کی ابتدا میں عربوں میں جو کہانت مروّج تھی اس کی تین شکلوں کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔

کہانت کی پہلی صورت:

پہلی قسم جس پر زیادہ تر کہانت کا اطلاق کیا جاتا تھا بلکہ اصل کہانت یہی کہلاتی تھی وہ یہ کہ کچھ لوگ بعض شیاطین یا جنوں کو اپنے تابع کر لیا کرتے تھے یا ان کی بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جنات یا شیاطین ان کے تابع ہیں [1]۔

1۔ کوئی آدمی کاہن اپنی کوشش سے بھی بن سکتا تھا یا جنات وشیاطین از خود جس پر مہربان ہو کر اور اس کے تابع ہو کر اسے خبریں دینے لگ جاتے تھے وہ کاہن ہوتا تھا، اس حوالے سے زمانۂ جاہلیت کا تصور واضح نہیں ہے۔ دورِ جاہلی کی تاریخ کے نامور محقق ڈاکٹر جواد علی نے بھی اس حوالے سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے (المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام ۱۲/۳۳۸)۔ جاہلی ادب —جو کہ اس دور کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہے— کے مطالعہ سے بظاہر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ ان کے ہاں کہانت کی مہارت حاصل کرنے کا باقاعدہ اکتسابی طریقہ موجود نہیں تھا، اس طرح کی مثالیں نہیں ملتیں کہ کہانت سیکھنے سکھانے کا کوئی رواج ہو یا اس مقام پر فائز ہونے کے لئے کوئی خاص طریقے اختیار کئے جاتے ہوں، اس سے بظاہر اندازہ یہی ہوتا ہے کہ اہلِ جاہلیت کے ہاں یہ منصب وہبی تھا، البتہ جس کو اس منصب کا حامل سمجھ لیا جاتا تھا وہ یہ نہیں کہتا تھا کہ بعض باتیں مجھے معلوم ہیں اور بعض نہیں، بلکہ وہ ایک طرح سے اطراد اور عمومیت کا دعوی کرتا تھا، اور اس سے جو کچھ

ان جنات کو ان کی اصطلاح میں التابع یا الرئی ــ بروزن فعیل ــ کہا جاتا تھا۔ آج کل کی اصطلاح میں ہم اسے موکل کہہ سکتے ہیں[1]۔ ان کے یہ تابعین گھوم پھر کر ادھر ادھر کی خبریں لاتے تھے اور آکر ان کاہنوں کو بتاتے تھے اور یہ پھر آگے لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ ان کاہنوں کے کئی کام ہوتے تھے، مثلاً چوری بتانا کہ کس نے کی ہے کسی گمشدہ چیز کا بتانا کہ وہ کہاں پر ہے۔ مستقبل کے بارے میں بھی پیش گوئیاں دیا کرتے تھے۔ کسی قبیلے نے غارت گری پر یا کسی جنگی مہم پر جانا ہے تو وہ پہلے ان سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ کامیاب ہوگی یا نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی کئی چیزیں یہ بتایا کرتے تھے۔ ان کا بنیادی ذریعۂ علم بعض شیاطین اور جنات ہوتے تھے۔ حدیث میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے چنانچہ اس باب کی تیسری اور چوتھی حدیث میں اس کی تفصیل آرہی ہے کہ کس طرح شیاطین ان کے تابع ہوتے تھے اور یہ شیاطین کاہن سے لے کر آسمان تک اوپر نیچے ایک لائن بنا لیتے تھے اور اوپر جو فرشتے آپس میں باتیں وغیرہ کرتے ہیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے تمہیں یہ حکم ملا ہے میں یہ کروں گا تم یہ کروگے تو یہ باتیں سن لیتے تھے، اوپر والا نیچے والے کو بتاتا تھا اور نیچے والا اپنے سے نیچے والے کو بتاتا وہ اپنے نیچے والا کو بتاتا تھا اس طریقے سے جو سب سے نیچے ہوتا تھا وہ اپنے کاہن کو بتاتا تھا کہ اوپر اس طرح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اوپر سے جب نیچے تک بات پہنچتی تھی تو یہ درمیان والے شیاطین اپنی طرف سے بھی اس میں کافی سارا جھوٹ ملا لیتے تھے، یوں آدھی سچی اور آدھی جھوٹی بات اس کاہن تک پہنچتی اور ہوتی بھی وہ ادھوری۔ چونکہ وہ بات ادھوری ہوتی تھی اس لئے کہانی کو پورا کرنے کے لئے خود کاہن کو بھی اپنی

بھی پوچھا جاتا تھا اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتا تھا۔ یہیں سے کہانت اور نبوت میں دیگر فروق کے علاوہ ایک فرق یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کبھی اطراد کا دعوی نہیں کرتا۔ مسعودی (مروج الذہب ۱۵۴/۲) کا کہنا ہے کہ زیادہ تر اپاہج اور جسمانی طور پر معذور لوگ کاہن بنتے تھے، مسعودی کی یہ بات کلی طور پر درست نہ بھی ہو بلکہ زیادہ تر حالات میں ایسا ہوتا ہو تو تب بھی اس سے نبوت اور کہانت میں ایک اور بڑا فرق سامنے آجاتا ہے، اس لئے کہ نبی ہمیشہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے تام الخلقت ہوتا ہے اور ہر قسم کے عیب اور کمی سے پاک ہوتا ہے۔

[1]۔ مغربی مراجع میں خبریں لانے والے اس طرح کے واسطے لئے oracle کی اصطلاح بھی استعمال ہوئی ہے۔

طرف سے قیاس آرائی کرکے کچھ حاشیہ لگاناپڑتاتھا،اس طرح حاشیہ لگی ہوئی کہانی وہ کاہن اپنے گاہک کے سامنے پیش کرتا جس میں کچھ تھوڑابہت سچ بھی ہوتالیکن بیشتر حصہ جھوٹ یایا قیاس آرائی اور اندازے پر مبنی ہوتا تھا۔ یہ کہانہ کی حقیقت تھی۔اور چونکہ پوری بات ان کو بھی معلوم نہیں ہوتی تھی ادھوری بات ہوتی تھی اس لئے زیادہ تر پیش گوئیاں یہ سجع بندی کے انداز میں کیا کرتے تھے اور ایسے جملے ہوتے تھے جن کا معنی اور مفہوم ہی متعین کرنا مشکل ہوتا، اور ایک جملے کے کئی معانی ہوسکتے تھے۔ کاہنوں کی پیشیں گوئیاں سجع کی شکل میں کیوں ہوتی تھی اس کے بارے میں ابن خلدون کی گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے اس عمل کی نوعیت اور طبیعت کا یہ تقاضا ہوتا تھا، ان کو خبر کا القاہی اس انداز سے ہوتا تھا، یہ بات ابن خلدون نے تفصیل سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، بقول ابن خلدون کے یہ کہانت کی اعلی ترین شکل تھی۔ لیکن اس طرح کی سجع میں خبر دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے اور بعض محققین نے یہ بیان بھی کی ہے ان کا اصل مقصود گول مول بات کرناہی ہوتا تھاتاکہ ہر صورت میں ہماری پیش گوئی سچی رہے[1]۔ یہ اسی طرح کی بات ہے کہ کسی پیر صاحب کے پاس جب کوئی اولاد کی دعا کرانے کے لئے جاتااور وہ کہتا کہ دعا کردیجئے کہ بیٹا ہوجائے یادعا کردیجئے کہ بیٹی ہوجائے تووہ جواب میں کہتے "بیٹانہ بیٹی"۔ اگر بیٹا پیدا ہوتاتو کہتے کہ میں نے پہلے ہی کہا تھابیٹا، نہ بیٹی۔اور اگر بیٹی ہوتی تو کہتے کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ بیٹانہ، بیٹی۔اور اگر کچھ بھی نہ ہوتاتو کہتے کہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ بیٹانہ بیٹی۔ توان کاہنوں کی سجع بھی عموماً اسی قسم کی ہوتی تھی۔اصل مقصد مبہم قسم کی بات کرناہوتا تھا۔

کاہنوں کا کام صرف پیش گوئیوں اور غیب کی خبریں دینے تک منحصر نہیں تھا، بلکہ بعض اوقات انہیں معاشرے کا صاحبِ علم طبقہ سمجھ کر باعزت مقام بھی دیا جاتا تھا۔ جنوبی عرب کی قدیم تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی

1۔ دکتور جواد علی: المفصل فی تاریخ العرب قبل الإسلام ۳۳۵/۱۲

ہیں جب بعض لوگوں کو کہانت کی وجہ سے بادشاہ کا منصب —جسے ان کے ہاں تُبّع کہا جاتا تھا— بھی عطا ہوا[1]۔ ابن خلدون نے بَرْبَرْ اقوام کے بارے میں بھی بعض ایسی مثالیں ذکر کی ہیں[2]۔

کاہنوں کا یہ کردار تو عربوں میں بہت معروف ومشہور تھا کہ لوگ مختلف تنازعات میں تصفیہ کرانے کے لئے کاہنوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔اس مقصد کے لئے عموماً فریقین باہمی طور پر پہلے یہ طے کرتے تھے کہ کونسے کاہن کے پاس جانا ہے۔ مزید اطمینان کے لئے بعض اوقات اصل قابلِ تصفیہ قضیہ پیش کرنے سے پہلے اس سے بطور آزمائش کچھ سوالات کیا کرتے تھے۔ درست جواب پاکر فیصلہ کرانے کے لئے متنازعہ معاملہ اس کے سامنے رکھتے۔ قرآنِ کریم کی آیت ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ (النساء:٦٠) کا شانِ نزول بھی یہ روایت کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی اور ایک منافق —جسے بظاہر مسلمان سمجھا جارہا تھا— کے درمیان کوئی تنازعہ ہوگیا، یہودی کا کہنا تھا اس کا فیصلہ مسلمانوں سے کروایا جائے، اس لئے کہ اسے یقین تھا کہ مسلمان حق وانصاف کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں اور رشوت نہیں لیتے، جبکہ منافق کا کہنا تھا فیصلہ کسی یہودی سے کروایا جائے، کیونکہ وہ رشوت دے کر اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کروانا چاہتا تھا۔ بالآخر دونوں میں یہ طے ہوا کہ ان دونوں کی بجائے کسی کاہن سے فیصلہ کروالیا جائے، چنانچہ وہ قبیلہ جہینہ کے کسی کاہن کے پاس فیصلہ کرانے کے لئے گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں اللہ تعالی نے یہ شکوہ کیا ہے کہ ان کا بظاہر دعوی تو یہ ہے کہ وہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان لاتے تھے جیسا کہ منافق کی صورتِ حال تھی، یا آپ سے پہلے نازل

1-ابن سعید اندلسی: نشوۃ الطرب فی جاہلیۃ العرب ص ۱۳۹

2-تاریخ ابن خلدون ۷/۱۲

ہونے والی وحی پر ایمان لاتے ہیں جیسا کہ یہودی کی حالت تھی لیکن فیصلہ کسی طاغوت سے کرواتے ہیں۔ طاغوت سے مراد یہاں کاہن ہی ہے[1]۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ سے پہلے کے دور میں کاہنوں کی ایسی بے شمار خبریں یا پیشین گوئیاں نقل کی گئی ہیں جو واقعہ کے بالکل مطابق تھیں یا بالکل سچی ثابت ہوئیں[2] ابن خلدون کا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا زمانہ جن کاہنوں نے پایا ہے وہ در حقیقت نبی کریم ﷺ کی صداقت کو جانتے تھے لیکن اکثر وبیشتر حسد کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوئے، بعض کو اللہ تعالی نے مسلمان ہونے کی توفیق بھی عطا فرمادی۔ صحیح بخاری میں بھی اس طرح کا ایک واقعہ نقل ہوا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے کہ ایک خوبصورت شخص گذرا، حضرت عمرؓ نے فرمایا یا تو یہ شخص زمانۂ جاہلیت میں کاہن رہا ہے، یا اب بھی اپنے پرانے کسی دین

1-ملاحظہ ہو تفسیر طبری، تفسیر قرطبیؒ وغیرہ سورۂ نساء آیت: ۶۰

2-اسی سلسلے میں ایک واقعہ حضرت معاویہؓ کی والدہ ہند بنت عتبہ کا ہے کہ ان کے پہلے خاوند نے ان پر بدکاری کی تہمت لگائی تو ان کے والد عتبہ فیصلہ کرانے کے لئے یمن کے ایک کاہن کے پاس گئے، عتبہ نے کاہن کو آزمانے کے لئے راستے میں اپنے گھوڑے کی مخصوص جگہ میں گندم کا دانہ چھپادیا اور کاہن سے پہلے یہ پوچھا کہ بتاؤ میں نے تمہاری آزمائش کے لئے کیا چیز کہاں چھپائی ہے، اس نے بالکل صحیح صحیح بتادیا، اس کے بعد اصل معاملے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے نہ صرف ہند کی براءت کا اظہار کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس کے بطن سے ایک بادشاہ پیدا ہوگا جس کا نام معاویہ ہوگا (البدایہ والنہایہ ۔۸/ ۱۲۵)۔ اسی سلسلے کا وہ مشہور واقعہ بھی ہے جو اکثر سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے جد امجد ہاشم اور خاندان بنو امیہ کے بڑے اُمیہ کے درمیان اختلاف ہوا اور فیصلہ کرانے کے لئے عمرو بن الحمقؓ کے دادا جو الکاہن الخزاعی سے مشہور تھے کے پاس گئے تو اس نے بہت واضح الفاظ میں ہاشم کی امیہ پر فضیلت بیان کی (السیرۃ الحلبیہ ۱/ ۱۰ وغیرہ کتب سیرت وتاریخ)۔

پر قائم ہے۔ چنانچہ اس کو بلایا گیا، اس نے اقرار کیا کہ میں زمانۂ جاہلیت میں کاہن تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ اپنی کہانت کے دور کا کوئی دلچسپ واقعہ سناؤ۔ اس نے کہا کہ ایک دفعہ میرے تابع جو جنیہ تھی وہ بہت پریشانی کے عالم میں میرے پاس آئی اور کہنے لگی: ألم تر الجنّ وإبلاسَها ويأسَها من بعد إنكاسِها، ولحوقَها بالقلاص وأحلاسِها[1] جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے دیکھا کہ جنات (یعنی کاہنوں کو خبر دینے والے جنات) کس طرح پریشان حال اور مایوس ہیں، اور کس طرح یہ پیشہ اور کام چھوڑ کر دوبارہ وہ اپنے چوپاؤں وغیرہ کے پاس آرہے ہیں۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد حالات ایسے بن گئے ہیں کہ ہمارے لئے اس کام کو جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔

کہانت کی اس قسم پر پابندی اور شہابِ ثاقب:

جیسا کہ اس باب کی احادیث میں آگے آرہا ہے کہ کہانت کی اس قسم کا سب سے بڑا ذریعہ جنات کا اوپر جا کر فرشتوں کی گفتگو سننا تھا، نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جنات کے لئے یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا کہ جو بھی جنّ یا شیطان اوپر تھوڑی بہت بات سننے کے لئے جاتے ہیں ان پر شہابِ ثاقب پھینک دیا جاتا۔ شہابِ ثاقب کی حقیقت کیا ہے، اور کہانت میں اس کے ذریعے رکاوٹ کیسے ہوتی تھی اس پر بات ان شاءاللہ حدیث نمبر: ۳ کے ذیل میں ہوگی، یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے نزولِ وحی کے زمانے میں وحی کو محفوظ بنانے اور وحی اور کہانت میں التباس سے بچاؤ کے لئے یہ خاص انتظام کیا گیا تھا۔ چنانچہ بعض علما کی یہ رائے بھی ہوئی ہے کہ شہابِ ثاقب کے ذریعے ان شیاطین کو سنگسار کرنے کا سلسلہ صرف عہدِ رسالت ﷺ میں تھا، آپ کے انتقال کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی، جیسا کہ آپ ﷺ کے دور سے پہلے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کہانت کی عربوں میں یہ سب سے زیادہ مروج قسم نبوت و وحی کے مدّمقابل کی حیثیت رکھتی تھی۔

1۔ صحیح البخاری: کتاب المناقب: باب إسلام عمر بن الخطاب۔

کہانت کی دوسری شکل:

کہانت کی دوسری شکل جس کا حدیث میں ذکر ملتا ہے یہ ہوتی تھی کہ بعض علامات کے ذریعے مستقبل کے واقعات بتانے کی کوشش کی جاتی تھی جن میں سے ایک علم الرمل ہے۔

علم الرمل:

رمل ریت کو کہتے ہیں۔رمل کا مطلب یہ ہے کہ خاص انداز سے لکیریں کھینچ کر مستقبل کی خبریں دیا کرتے تھے۔اور یہ لکیریں زیادہ تر چونکہ ریت میں کھینچا کرتے تھے اس لئے اس کا نام علم الرمل پڑ گیا،اس باب کی پہلی حدیث میں آرہا ہے کہ اللہ کے ایک نبی لکیریں کھینچنے کا کام کیا کرتے تھے، جس کی لکیریں ان کے موافق ہوں وہ درست ہوتا ہے۔

کہانت کی تیسری شکل:

علم النجوم:

کہانہ کی تیسری قسم کو علم النجوم کہہ سکتے ہیں۔یعنی اجرام فلکیہ کی حرکات کو دیکھ کر مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرنا۔اس کی بھی آگے کئی شاخیں ہیں۔ علم النجوم کا تذکرہ بعض روایات میں ملتا ہے، جیسا کہ اس بات کی حدیث نمبر: ۷ میں بھی آئے گا۔تاہم یہ بات واضح نہیں ہے کہ عربوں کے ہاں اس فن سے کس حد تک شناسائی موجود تھی۔

عربوں کی کہانت کی چند خصوصیات:

بہر حال عربوں میں مستقبل یا غیب کی خبریں دینے کی سب سے زیادہ مروّج شکل پہلی ہی تھی، اس لئے بہت سے علما کا کہنا یہ ہے کہ اصل معنی کے لحاظ کہانت کہتے ہی اس کو ہیں۔ عربوں میں پائی جانے والی اس کہانت کا عمومی جائزہ لینے سے جو چند بنیادی باتیں سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں:

- بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہانت کوئی اکتسابی چیز نہیں تھی اور نہ ہی اس کے سیکھنے سکھانے کا تصور تھا، غالباً یہی سمجھا جاتا تھا کہ خبریں لانے والا جن جس پر از خود مہربان ہو جاتا اور اس کے تابع ہو جاتا وہ کاہن بن جاتا تھا۔
- اس کے باوجود کاہن یہ نہیں کہتے تھے کہ جب جس چیز کی خبر جن لا دے گا اس کے بارے میں وہ بتا دیں گے بلکہ اس چیز کو انہوں نے بطور پیشہ اس طرح اختیار کیا ہوا تھا کہ غیب کی خبریں دینے کے بارے میں وہ عمومیت کا دعوی کرتے تھے جس وقت جو پوچھا جائے گا وہ بتائیں گے۔
- اس سے معلوم ہوا کہ مافوق الفطرت طاقتوں کے ساتھ مستقل رابطہ اس زمانے کی کہانت کا ایک اہم عنصر تھا۔
- ان کو معاشرے میں خدا رسیدہ یا برگزیدہ قسم کے لوگ بھی سمجھا جاتا تھا، جس کا اندازہ یہاں سے ہوتا ہے کہ قرآن نے کاہن کو ایسے 'طاغوت سے' تعبیر کیا ہے جس کے کفر یعنی انکار کا حکم دیا گیا ہے۔
- بعض پہلوؤں سے کہانت کا نبوت کے ساتھ ایسا اشتباہ ہو رہا تھا یا پیدا کیا جا رہا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کو بھی ''قول کاہن'' قرار دیتے تھے۔

کاہن، شاعر اور ساحر:

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کاہنوں کے بارے میں دورِ جاہلیت کے عربوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ انہیں بعض غیبی قوتوں (جنات وشیاطین) کی مدد حاصل ہے اسی طرح کا خیال ان کے

ہاں شعرا کے بارے میں بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ ان کے ہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک جن یا شیطان ہوتا ہے جو اسے کلام کا القا کرتا ہے۔ جبکہ ساحروں کے بارے میں بھی اس طرح کا تصور پایا جاتا تھا کہ انہیں غیبی قوتوں کی مدد حاصل ہے۔ فرق یہ تھا کہ کاہن اور شاعر ان غیر مرئی قوتوں سے استفادہ کر کے کچھ بتانے یا کہنے کے قابل ہو جاتے تھے جبکہ ساحر کے بارے میں یہ سمجھا جاتا کہ وہ اس طرح کی قوتوں کو مختلف تصرفات اور تبدیلیوں کے لئے بھی استعمال کر سکتا ہے۔ مشرکین نے حضور ﷺ کو کاہن، شاعر اور ساحر — نعوذ باللہ — تینوں سے تعبیر کیا ہے، کاہن شاید انباء عن المغیبات (غیب کی خبریں دینے) کی وجہ سے، شاعر کلام کے معیار اور اس کی تاثیر کی وجہ سے اور ساحر معجزات کی وجہ سے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مستقبل بینی کے دیگر ذرائع

کہانت اور اس کے متعلقات کے شرعی حکم کی طرف آنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر مستقبل بینی کے دیگر ذرائع پر بھی ڈال لی جائے۔ جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا مستقبل کو جاننے کا تجسس انسان کو شروع ہی سے رہا ہے، اس مقصد کے لئے انسان نے نامعلوم کتنے تجربات کئے یا ٹکریں ماری ہیں اور نامعلوم کون کون سے ذرائع استعمال کئے ہیں، اگر اس طرح کے تمام تجربات، ذرائع اور علوم کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لئے خاصا وقت چاہئے، اس لئے کہ — حقیقی یا وہمی ہونے سے قطع نظر - یہ پوری ایک دنیا ہے۔ تاریخ کے مختلف مراحل میں مختلف تہذیبوں میں جن جن طریقوں سے لوگوں نے غیب بینی یا مستقبل بینی کے دعوے کئے ہیں ان کی اگر صرف فہرست ہی ذکر کی جائے تو وہ بہت طویل ہو جائے گی، اور صورتِ حال یہ ہے کہ یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے، نہ صرف غیر ترقی یافتہ، کم تعلیم یافتہ معاشروں میں بلکہ ترقی یافتہ سمجھے جانے والے اور پڑھے لکھے معاشروں میں بھی اس طرح کے پیشے مقبول اور مروج ہیں جو مختلف ذریعوں سے مستقبل کے حالات کی اطلاع دینے کا دعوی کرتے ہیں۔ قدیم

یونانیوں، رومیوں، فارسیوں، ہندیوں سے لے کر جدید دور تک ہر زمانے کے حکمران ایسے پیشوں سے وابستہ لوگوں کے اسیر رہے اور اہم امور میں ان کی راہ نمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔

ایسے ذرائع میں سب سے زیادہ مروج اور نسبتاً زیادہ قابلِ اعتماد سمجھا جانے والا علم ، علمِ نجوم Astrology ہے۔ جس میں انسان کی پیدائش کی تاریخ، وقت اور جگہ معلوم کرکے یہ پتا چلایا جاتا ہے کہ اس وقت مختلف برجوں میں سیاروں کی کیا پوزیشن تھی، یا یہ کہ وہ شخص کون سے سیارے یا برج کی طرف منسوب ہے۔ پھر کسی دیئے گئے وقت — جس کے بارے میں پیش گوئی مقصود ہو — کے بارے میں دیکھا جاتا ہے اس وقت ان کی کیا پوزیشن ہے، ان کا مخصوص انداز سے جائزہ لے کر یا ریڈنگ کرکے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ فلاں وقت اس شخص کے لئے فلاں پہلو سے مثلاً شادی کے اعتبار سے، سماجی تعلقات کے اعتبار سے، مالی معاملات وغیرہ وغیرہ کے اعتبار سے کیسا ہوگا۔ علمِ نجوم یا آسٹرالوجی کا شمار اس حوالے سے دنیا کے چند قدیم ترین علوم میں سے کیا جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں دوسرے نمبر سب سے زیادہ مشہور علم دست شناسی Palmistry ہے۔

غیب بینی، مستقبل بینی یا قسمت شناسی کے فنون یا طریقوں کو اگر دیکھا جائے تو انہیں بنیادی طور پر دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ، ایک یہ کہ کچھ لوگوں کا یہ دعوی ہو کہ ان کا عالم بالا یا مافوق الفطرۃ (supernatural) سے براہِ راست یا بالواسطہ رابطہ ہوتا ہے اور اس طرح انہیں ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو عام لوگوں کو معلوم نہیں ہوتیں۔ مختلف تہذیبوں میں مختلف ناموں سے اس طرح کے لوگ موجود رہے ہیں۔ اوپر ذکر کردہ عربوں کی کہانت بھی اسی نوع میں داخل ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں عالمِ بالا یا supernatural سے رابطے کا اس طرح کا دعوی تو نہیں ہوتا، تاہم بعض مقدمات اور علامات کے ذریعے ایسے اشارات اخذ کئے جاتے ہیں جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ ان سے خدا کا ارادہ جاننے میں مدد ملتی ہے، اس کی بے شمار صورتیں تھیں، بعض لوگ پرندوں کی نقل و حرکت کے ذریعے اس طرح کا علم حاصل کرنے کا دعوی کرتے تھے، اس طرح کے لوگ عربوں میں بھی موجود تھے۔ بعض جان دار چیزوں بالخصوص پرندوں کے اندرونی اعضا جیسے

دل وغیرہ کا معائنہ کر کے مستقبل یا مخفی امور کو جاننے کا دعوی کرتے تھے۔ بعض لوگ سیپی وغیرہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔

اس طرح کے علوم کس قدر قابل اعتماد ہو سکتے ہیں، شرعی نقطہ نظر کی وضاحت تو آگے چل کر ہم کریں گے، یہاں ایک تو یہ عرض کرنا ہے کہ ان میں سے بعض علوم مثلاً علمِ نجوم (Astrology) یا دست شناسی کے خود مغربی دنیا اور ترقی یافتہ ملکوں میں بہت زیادہ مروّج ہونے کے باوجود انہیں باقاعدہ سائنس تسلیم نہیں کیا جاتا[1]۔ بعض سائنسی حلقے اسے غیر حقیقی سائنس pseudo sciences میں شمار کرتے ہیں[2]، یعنی معلومات کا ایسا مجموعہ جس کے بارے میں سائنٹیفک ہونے کا دعوی تو کیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس میں سائنسی طریق کار اختیار نہیں کیا جاتا۔

آسٹرالوجی یا پامسٹری جیسے علوم کے بارے میں یہ بات قابلِ تحقیق ہے کہ اس کے اصول اور ان سے اخذ کردہ نتائج کو کہاں تک سائنسی انداز سے تجربے کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے، بظاہر اس طرح کے کسی عمل کی کوئی مثال سامنے نہیں ہے۔ یعنی جس طرح عام سائنسی تحقیقات مثلاً میڈیکل سائنس کی تحقیقات میں خاص بیماری کے حامل لوگوں کے اعداد و شمار اکٹھے کئے جاتے ہیں، ان پر تجربات کئے جاتے اور تجربات کے نتائج کو اعداد و شمار کے انداز میں مرتب کیا جاتا اور ان کی رشنی میں حقیقت تک رسائی کی کوشش کی جاتی ہے، اس طرح کی مثالیں شاید مستقبل بینی کے علوم میں موجود نہیں ہیں۔ مثلاً علمِ نجوم میں خاص برج کی طرف منسوب لوگوں کو خاص تعداد میں زیرِ ملاحظہ رکھا گیا ہو، اور یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہو فلاں پہلو سے مثلاً کاروباری اعتبار سے یا گھریلو تعلقات کے اعتبار سے سیاروں کی

1۔ مثلاً ملاحظہ ہو: Encyclopedia Encarta: article Astrology

2۔ Wikipedia.org: article pseudoscience (last accessed ٢٦/٠٦/١١

کس کیفیت میں وقت کیسے گذرتا ہے، یا دست شناسی میں خاص قسم کی لکیروں کے حامل لوگوں کو خاص تعداد میں زیرِ ملاحظہ رکھا گیا ہو اور یہ جائزہ لیا گیا ہو کہ ان کے حالات کیسے رہے، پھر ان ملاحظات کو سائنسی انداز مرتب کیا گیا ہو اس کی غالباً کوئی مثال نہیں ملتی، اگر ایسا ہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعبوں میں ابھی تک تحقیق کا سائنسی طریقِ کار اختیار نہیں کیا گیا۔ محض مغربی دنیا میں مروّج ہونے سے کوئی چیز سائنسی نہیں بن جاتی، اس کے لئے سائنسی طریقِ کار کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن کسی چیز کے غیر سائنسی ہونے کے معنی لازماً اس کے غلط یا خلافِ واقعہ ہونے کے بھی نہیں ہیں، بلکہ اس صورت میں اس کی حیثیت محض ٹوٹکوں کی ہو جاتی ہے، جو صحیح بھی نکلتے ہیں اور غلط بھی۔ یہ اسی طرح کی چیز ہو جائے گی جس کو ہم کتاب الطب میں اسبابِ وہمیہ سے تعبیر کر چکے ہیں۔

کہانہ کا حکم

کہانہ کا حکم کیا ہے، بالخصوص اس کی پہلی قسم جو حقیقی معنی کے اعتبار سے کہانت کہلاتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟ اس باب کی احادیث سے یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ پیشہ بھی شرعاً ناجائز ہے اور اس پیشے والوں کے پاس جانا اور غیب کی خبریں معلوم کرنا اور ان کی تصدیق کرنا بھی ناجائز ہے۔ چنانچہ اس باب کی احادیث کے ترجمے سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ یہ پیشہ اختیار کرنا یا اس کی تصدیق کرنا شرک ہے یا نہیں، یہ کام تو شرکیہ ہے لیکن ایسا شرک جس سے انسان دائرہ اسلام سے نکل جائے ایسا شرک ہے یا نہیں۔ اس میں تھوڑی سی تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی کاہن یا عراف وغیرہ کی تصدیق کرتا ہے اسے عالم الغیب سمجھ کر پھر تو یہ شرک ہے، اگر عالم الغیب سمجھ کر اس کی تصدیق نہیں کرتا تو شرک تو نہیں ہے لیکن گناہ پھر بھی ہے۔ اب یہاں یہ جاننے کی ضروت ہو گی کہ عالم الغیب کسے کہتے ہیں اور علم الغیب کی حقیقت کیا ہے۔

علم غیب کی تعریف:

علمِ غیب سے پہلے خود غیب کے معنی معلوم ہونا ضروری ہیں، غیب کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ مالا ئیدرکہ الحواس ولاتقتضیہ بداہۃالعقل کہ جس کا حواس کے ذریعے مثلاً دیکھنے کی قوت، سننے کی قوت، چکھنے کی قوت، سونگھنے کی قوت وغیرہ سے ادراک نہ ہوسکے اور بداہتِ عقل بھی اس کا تقاضانہ کرے۔ علم الکلام کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ذرائعِ علم تین ہیں حواس، عقل، خبر صادق جس میں وحی بھی داخل ہے۔ پھر عقل سے علم حاصل ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ فکر و نظر کے بغیر بداہۃً عقل کسی چیز کا علم حاصل کرے۔ دوسرے یہ کہ اسے جاننے کے لئے عقل کو استدلال وغیرہ سے کام لیناپڑے۔ غیب کہتے ہیں ایسے علم کوجوان ذرائعِ علم میں سے ڈیڑھ کے ذریعہ حاصل نہ ہو کسی اور سبب سے حاصل ہو یانہ ہواس ڈیڑھ ذریعۂ علم کی پہنچ میں نہ ہو۔ان میں سے ایک ذریعہ تو ہے حواس۔کہ حواس سے اس کاادراک نہ ہوسکے جس کاادراک حواس سے ہوسکتاہے اس کا جاننا علمِ غیب نہیں اور وہ بات غیب کی بات نہیں ہوگی۔اور دوسرا ہے عقل کی دو قسموں میں سے ایک قسم یعنی بداہتِ عقل سے بھی اس کاادراک نہ ہوسکے۔ جس کا بداہتِ عقل سے بھی ادراک ہو رہاہے وہ بھی غیب نہیں ہے۔تو غیب وہ ہے کہ جس کا حواس سے بھی ادراک نہ ہوسکے اور بداہتِ عقل سے بھی ادراک نہ ہوسکے لیکن اس سے عام ہے کہ عقلِ استدلالی یا خبر صادق سے اس کا علم حاصل ہوتاہے یا نہیں۔

اس اعتبار سے غیب کی دو قسمیں ہوگئیں—فی الحال بات علمِ غیب کی نہیں ہو رہی بلکہ غیب کی ہو رہی ہے- غیب کی ایک قسم تو یہ ہوئی کہ حواس سے اور بداہتِ عقل سے تو اس کا پتا نہیں چل سکتا لیکن عقلی استدلال یا خبرِ صادق سے اس کا پتا چل سکتاہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود کہ استدلال عقلی سے انسان کو پتا چل گیا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے، یا جیسا کہ جنت ودوزخ کہ حواس سے ہمیں اس کا پتا نہیں چلا کیونکہ حواس سے ہم نے اس کو دیکھا نہیں ہے اور عقل بھی بداہۃً اس کا تقاضا نہیں کرتی یعنی بدیہیات میں سے نہیں ہے، ہاں البتہ خبرِ صادق سے یعنی انبیا علیہم السلام

کے بتانے سے ہم کو پتا چل گیا کہ جنت ودوزخ ہے۔ جنت ودوزخ کا وجود غیب ہے جس کا ادراک اگرچہ بداہتِ عقل سے نہیں ہو رہا تھا، حواس سے بھی نہیں ہو رہا تھا لیکن خبر صادق سے ہو گیا۔

غیب کی دوسری قسم وہ ہے جس کا ادراک جس طرح حواس اور بداہتِ عقل سے نہیں ہو رہا اسی طرح اس کا ادارک استدلالِ عقلی اور خبرِ صادق سے بھی نہ ہو جیسے زید کو مثلاً یہ پتا نہیں کہ کل کو وہ کیا کرے گا استدلال عقلی سے بھی پتہ نہیں چلتا اور حواس سے بھی نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ اس کا منصوبہ ہے کہ میں کل کیا کروں گا لیکن واقعتا یہ کر بھی سکے گا کہ نہیں اس کا علم بداہتِ عقل سے یا حواس سے اسے حاصل نہیں اور کوئی خبر بھی اس کے پاس موجود نہیں ہے، استدلالِ عقلی سے بھی اس کا پتا نہیں چل رہا، کسی بھی ذریعۂ علم سے اس کا علم حاصل نہیں ہو رہا جیسا اللہ تعالی نے سورہ لقمان کے آخر میں فرمایا ہے: وماتدری نفس ماذاتکسب غدا اسی طرح فرمایا وماتدری نفس بای ارض تموت زید کہاں مرے گا اسے موت کب آئے گی اس کا نہ تو بداہتِ عقل سے پتا چلا اور نہ ہی حواس سے۔ استدلالِ عقلی سے بھی اس کا پتا نہیں چل سکتا۔ خبرِ صادق بھی مہیا نہیں ہے۔

غیب کی دو قسمیں ہو گئیں ایک یہ کہ جس کا کم از کم استدلالِ عقلی یا خبرِ صادق سے پتا چل جائے اور دوسری وہ جس کا کسی بھی ذریعے سے علم حاصل نہ ہو جس کو علم ہو بغیر ذریعے کے ہو۔ صرف اللہ تعالی کا علم ہی ہے جو بغیر کسی ذریعے کے ہے، ان کا علم اکتسابی اور عطائی علم نہیں ہے بلکہ ذاتی ہے، جبکہ اللہ تعالی کے علاوہ جس کو بھی جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کسی نہ ذریعے سے اور کسی کے دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

قرآن وسنت میں غیب کا اطلاق دونوں قسموں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب غیب کے ساتھ ایمان کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے جیسے الذین یؤمنون بالغیب تو وہاں پہلی قسم کا غیب مراد ہوتا ہے جس کا بداہتِ عقل اور حواس کے ذریعے تو پتا نہیں چلا لیکن خبر صادق یعنی انبیا علیہم السلام اور انبیاء علیہم السلام کو وحی کے ذریعے پتہ چل گیا، اس لئے کہ سرے سے اس کا علم نہیں ہے تو ایمان کیسے لائیں گے، ایمان تو فرع ہے علم کی۔ لیکن جب قرآن وسنت میں غیب کے

ساتھ علم کا لفظ بولا جاتا ہے، علم الغیب کہا جاتا ہے تو وہاں مراد دوسری قسم کا غیب ہوتا ہے یعنی جس کا کسی بھی ذریعۂ علم سے ادراک نہ ہو سکے۔ اور چونکہ انسان کو جو بھی علم حاصل ہو سکتا ہے وہ ذریعہ سے ہی ہو سکتا ہے بغیر ذریعے کے حاصل ہی نہیں ہو سکتا اس لئے علمِ غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، کوئی اور عالم الغیب نہیں۔ وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو (الأنعام: 59)، عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا (الجن: 26)۔ علمِ غیب کا جب اطلاق کیا جائے تو اس سے مراد دوسری قسم ہوتی ہے، البتہ اظہار علی الغیب اطلاع علی الغیب انباء عن الغیب یہ بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کسی چیز کا حواس اور بداہتِ عقل سے پتا نہیں چلتا اللہ تعالیٰ اس کا علم اپنے کسی نبی کو وحی کے ذریعہ سے دے دیں یا کسی ولی کو الہام کے ذریعہ سے دے دیں جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر سے ایک دن پہلے بتادیا کہ فلاں مشرک یہاں پر مرے گا، فلاں مشرک یہاں پر مرے گا یہ علم الغیب نہیں ہے بلکہ اظہار علی الغیب، اطلاع علی الغیب یا انباء الغیب ہے اس لئے کہ علمِ غیب تو وہ ہے جس کا کسی بھی ذریعہ سے علم حاصل نہ ہو، یہاں علم حاصل ہوا لیکن خبرِ صادق سے کیونکہ وحی بھی خبر صادق ہی کی ایک قسم ہے لہٰذا یہ غیب کی پہلی قسم میں آگیا دوسری قسم میں داخل نہیں ہے۔

اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کو عالم الغیب کہتا ہے اس معنی میں کہ غیب کی دوسری قسم کا علم اسے حاصل ہے ،یعنی بغیر کسی ذریعہ کے اسے علم حاصل ہو گیا ہے یہ تو شرک ہے کیونکہ یہ وصف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کو عالم الغیب کہتا ہے اس معنی میں کہ اللہ نے اس کو علم دے دیا ہے یہ شرک تو نہیں لیکن غلط بات پھر بھی ہے اس لئے کہ اسے قرآن وسنت کی اصطلاح میں علمِ غیب نہیں کہتے علمِ غیب کہتے ہی اسے ہیں جو بغیر دیے حاصل ہو۔

اگر کوئی آدمی کاہن کے پاس جاتا ہے اور اس کی خبروں کی تصدیق کرتا ہے اسے عالم الغیب سمجھ کر تو یہ شرک ہے۔ اور اگر مذکورہ معنی میں اسے عالم الغیب نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے علم ایک ذریعہ سے حاصل ہوا ہے تو بھی یہ غلط نظریہ ہے۔ اگر کسی بھی درجہ میں کسی بھی معنی میں اسے عالم الغیب نہیں سمجھتا لیکن بہر حال اس کی

تصدیق کرتا اور اس پر یقین کرتا ہے تو ہے یہ بھی ناجائز ہے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کاہن کے پاس جانے اور اس کی تصدیق کرنے سے منع فرمایا اور اس پر وعید بیان فرمائی ہے۔

بغیر تصدیق کے کاہن کے پاس جانا:

احادیث میں کہانت سے ممانعت کی حدیثیں تین طرح کی ہیں—فی الحال یہاں بات جاہلیت والی کہانت کی ہورہی ہے، پیش گوئی کے دیگر ذرائع پر بات آگے چل کر کریں گے-ایک وہ حدیثیں ہیں جن میں یہ وعید بیان فرمائی گئی ہے کہ اس نے اس چیز کا انکار کیا جسے محمد ﷺ لے کر آئے ہیں، ان حدیثوں میں عمومی طور پر کاہن کی تصدیق کا بھی ذکر ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وعید صرف اس صورت میں ہے جبکہ کاہن کے پاس جانے والا کاہن کی تصدیق بھی کرے، جیسا کہ اس باب کی حدیث نمبر: ۸ میں حضرت ابوہریرۃؓ کی حدیث میں آرہا ہے، اس حدیث کی سند کا مدار حماد بن سلمہ پر ہے، حماد بن سلمہ سے یہ حدیث بے شمار حضرات نے روایت کی ہے، ان کی بڑی اکثریت نے تصدیق کی قید یعنی فصدقہ بمایقول کے الفاظ نقل کئے ہیں، اکادکا حضرات نے یہ الفاظ نقل نہیں کئے، اور یہ محدثین کا اصول ہے کہ حدیث میں کچھ اضافی لفظ نقل کرنے والا راوی ثقہ ہو اور وہ باقی روایت سے متعارض نہ ہوں تو وہ قابلِ قبول ہوتے ہیں ، اور یہاں تو تصدیق کی قید والے لفظ ایک آدھ ثقہ نہیں بلکہ بڑے بڑے ثقہ راویوں کی اکثریت نقل کررہی ہے۔ اس لئے اس حدیث کی رو سے یہ وعید اس صورت میں ہوگی جبکہ کاہن کے پاس جانے والا اس کی تصدیق بھی کرے۔ اسی مضمون کی روایات حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ سے موقوفاً بھی مروی ہیں، ان میں بھی یہ وعید اس شرط کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ کاہن کے پاس جانے والا اس پر یقین بھی کرے[1]۔ حضرت عمران بن حصینؓ[1] ابوالعشراء کی اپنے والد[2] حضرت جابرؓ[3] حضرت انسؓ[4] کی روایات میں بھی یہ وعید اسی شرط کے ساتھ مذکور ہے۔

---

[1] - مثلاً ملاحظہ ہو: مصنف عبدالرزاق ۱۱/۲۱۰ مصنف ابن أبی شیبہ ۵/۴۲۔

دوسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن کاہن کے پاس جانے والوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ چالیس روز تک ان کی نماز قبول نہیں ہوتی، یہ حدیثیں بھی دو طرح کی بلکہ تین طرح کی ہیں، ایک وہ ہیں جن میں یہ وعید بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ کاہن پر یقین کیا جائے، نافع روایت کرتے ہیں صفیہ بنت ابی عبید سے اور وہ بعض ازواج مطہرات سے، اس حدیث کی سند کا مدار یحیی بن سعید ہیں، ان سے یہ حدیث صحیح مسلم میں محمد المثنی کے کے حوالے سے مروی ہے لیکن اس میں تصدیق کرنے کی شرط کے بغیر یہ وعید بیان کی گئی ہے، جبکہ محمد بن المثنی سے زیادہ کئی ثقہ راوی یہ حدیث اس شرط کے ساتھ روایت کرتے ہیں، مثلاامام احمد اپنی مسند میں۔ زیادۃ ثقہ والے مذکورہ اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اس روایت کو لیا جائے جس میں یہ شرط مذکور ہے۔ البتہ یہاں تیسری قسم کی بعض حدیثیں ہیں جن میں تفصیل بیان کی گئی ہے، مثلاً طبرانی کی معجم اوسط[5] میں حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ جو شخص کاہن کے پاس آئے اور اس کی بات کی تصدیق کرے تو اس نے ان باتوں کا انکار کیا جنہیں نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں اور اگر اس نے اس کی تصدیق نہ کی تب بھی چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہو گی۔ اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ نماز قبول نہ ہونے کی وعید کا تعلق اس صورت کے ساتھ ہے جبکہ کاہن کی تصدیق نہ کرے، لیکن اس حدیث کے راوی رشدین بن سعد سمیت متعدد راوی ضعیف ہیں، حافظ ابن حجر نے بھی اس کی سند میں ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے[6]۔ حاصل یہ ہوا کہ

1۔ مسند البزار ۹/۵۳۔

2۔ معجم ابن المقرئ ص ۸۰۔

3۔ مجمع الزوائد ۵/۱۱۷۔

4۔ حوالہ بالا۔

5۔ ۶/۷۸/۳ حدیث نمبر: ۶۶۷۰۔

6۔ فتح الباری ۱۰/۲۱۷۔

اگر عام حدیثوں کو دیکھا جائے تو ان کے مطابق نماز قبول نہ ہونے والی وعید صرف اس صورت میں ہے جبکہ کاہن کی تصدیق کی جائے اور اس پر یقین کیا جائے، جبکہ بعض ضعیف روایات کے مطابق یہ وعید بغیر تصدیق کے بھی ہے۔

تیسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں جن میں کسی وعید کو بیان کئے بغیر کاہنوں کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے، مثلاً اسی باب کی پہلی حدیث میں ہے فلا تاتوا الکہان، کاہنوں کے پاس مت جاؤ، یہ ممانعت عام ہے خواہ ان کی تصدیق کرے یا نہ کرے۔ تاہم عربوں میں جو لوگ کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے وہ تصدیق کے طور پر ہی جاتے تھے۔

قسمت شناسی اور مستقبل بینی کے دیگر علوم کا حکم

اب تک جو گفتگو ہو رہی تھی وہ اس کہانت کی تھی جو اس زمانے میں عربوں میں مروّج تھی۔ اس کے علاوہ قسمت شناسی یا مستقبل بینی کے علوم کا کیا حکم ہے، اس کے بارے میں بات ہو جانا بھی مناسب ہے۔

بعض احادیث میں نجوم کا علم حاصل کرنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ مثلاً الفصل الثانی کے شروع میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی علم نجوم حاصل کرتا ہے گویا کہ وہ جادو گری کا ایک شعبہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہی بنتا ہے کہ جس طرح جادو گری حرام ہے اسی طرح علم النجوم میں مشغول ہونا بھی حرام ہے۔

اسی طرح الفصل الثالث میں حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد آرہا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو تین مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے ان کے علاوہ جو شخص کوئی اور کام ان سے لیتا ہے وہ غلطی کرتا ہے اور اپنی زندگی کو ضائع کر رہا ہے۔

جس علمِ نجوم سے منع کیا گیا ہے وہ کون سا ہے، تو علمِ نجوم کی علما نے دو قسمیں کی ہیں ایک ہے علم نجوم حسابی اور دوسرا ہے علم نجوم استدلالی۔ علم نجوم حسابی سے مراد یہ ہے کہ ستاروں کے طلوع و غروب کے اوقات وغیرہ یا جہات وغیرہ کی تعیین کا کام لیا جائے یا اسی طریقے کا کوئی اور مفید یا با مقصد کام لیا جائے جس میں واقعتا ستاروں کا سبب کے درجہ میں دخل ہے یا ستاروں کے علاوہ دیگر اجرام علویہ کا علم حاصل کرلے اس سے اس طرح کا کوئی مفید کام لیا جائے مثلاً موسمیات کا علم حاصل کیا جاتا ہے اس میں ہواؤں وغیرہ کے رخ اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر موسم کا پیشگی اندازہ لگالیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اگر موسمی اندازہ پیشگی ہو جائے تو آدمی اس کے مطابق بہت سے منصوبہ بندیاں کر سکتا ہے یہ سب کے سب علم نجوم حسابی میں داخل ہیں اور شریعت نے ان سے منع نہیں کیا اس لئے کہ اللہ جل جلالہ نے کائنات میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں وہ در حقیقت انسان کے لئے ہیں، انسان کے فائدے کے لئے ہیں، ان کو اگر انسان واقعی کسی صحیح مقصد کے اندر استعمال کرتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ یہ ان چیزوں کے مقصد تخلیق میں داخل ہیں۔ تو ستاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وعلامات و بالنجم ہم یہتدون اسی طرح سورج اور چاند کے بارے میں فرمایا لتعلموا عدد السنین والحساب تو پتا چلا کہ اس طرح کے کام ان سے لئے جا سکتے ہیں۔

علم نجوم اکتسابی یا استدلالی سے مراد ہے کہ ستاروں کی چال رفتار اور ان کے مواقع وغیرہ کو دیکھ کر قسمت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو منع کیا گیا ہے وہ در حقیقت اس دوسری قسم سے کیا گیا ہے جس کو آج کل آسٹرالوجی (Astrology) کہا جاتا ہے، جبکہ پہلی قسم کے لئے آسٹرانومی (Astronomy) یا علمِ فلکیات کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ دوسری قسم کے علمِ نجوم اسی طرح سے مستقبل بینی کے دیگر علوم میں متعدد پہلوؤں سے کہانت کے ساتھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ علمِ نجوم وغیرہ سے ممانعت کب اور کس حد تک ہے، اس کی طرف آنے سے پہلے ایک اور بحث کا تذکرہ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کیاان ذرائع کا حقیقت سے کوئی تعلق ہے؟

یہاں ایک بحث اور ہے وہ یہ کہ کہانہ یااس سے ملتے جلتے جتنے علوم ہیں یااس طرح کی جو کاروائیاں کی جاتی ہیں ان کی نفس الامر میں بھی کوئی حقیقت ہے یا تصور ہی تصور ہے۔اس میں دونقطۂ نظر ہیں۔ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان چیزوں کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یہ وہم اور خیالِ محض ہے۔ستاروں کاانسان کی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق ہواس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، انسان کی ہاتھ کی لکیروں کاانسان کی قسمت کے ساتھ کوئی تعلق ہواس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ یہ لکیریں بنتی ہیں اس وجہ سے کہ انسان کبھی ہاتھ کھولتا ہے کبھی بند کرتا ہے،اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔اسی طرح سے لکیریں کھینچ کر یااعداد میں جمع تفریق کر کے جو نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یااوراس طرح کے بیسیوں علوم ہیں اس بنیاد پر جو کہا جاتا ہے اس سے انسان کی زندگی کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے یہ محض خیال اور وہم ہیں ایک نقطہ نظر تو یہ ہے۔

لیکن اس کے برعکس ایک دوسرا نقطہ نظر اور ہے اور اس نقطہ نظر کو متأخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اختیار فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ ان میں سے بعض چیزوں کا نفس الامر کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہو، مثلاً ستارے یا دوسرے اجرامِ فلکیہ کا زمین پر پیش آنے والے واقعات سے کچھ تعلق ہو، لیکن شریعت نے بعض مفاسد کی وجہ سے ان میں اشتغال سے منع کیا ہے۔شریعت کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اصل میں جب کوئی کام ہونے والا ہوتا ہے تو اللہ جل جلالہ کی طرف سے فرشتوں کو احکامات جاری ہوتے ہیں اور فرشتے ان باتوں کا آپس میں مذاکرہ بھی کرتے ہوں گے۔اور اس کام کی تیاری وغیرہ بھی کرتے ہوں گے تو زمین پر کوئی کام یا واقعہ بعد میں رونما ہوتا ہے لیکن اوپر کی مخلوق میں تیاری پہلے شروع ہو جاتی ہے اور جب اوپر تیاری شروع ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات اجرامِ فلکیہ یا بعض انسانوں کی طبائع وغیرہ پر پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔اس کے اثرات اجرام فلکیہ پر پڑنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی

ہے کہ وہ ملأ اعلی کے نسبتاً قریب ہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ زیادہ شفاف ہیں چونکہ یہ زیادہ شفاف ہیں اس لئے یہ اثر کو قبول کر لیتے ہیں تو اس لئے ان کی حرکات دیکھ کر کسی نہ کسی درجے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ حکومت کوئی نئی پالیسی کا اعلان کرنے والی ہے کوئی نیا اہم فیصلہ کرنے والی ہے تو اس کا پتا تو تب ہی چلے گا جب باقاعدہ اس کا اعلان ہو جائے گا لیکن جو اسلام آباد میں رہنے والے لوگ ہیں جو مقتدر حلقوں میں رہتے ہیں ان کو پہلے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس طرح کا کوئی کام ہونے والا ہے اس لئے کہ آج کل وزیر اعظم فلاں فلاں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں، آج فلاں ملک سے فلاں آرہا ہے، تو یہ نقل و حرکت دیکھ کر کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ اسی طرح کا اثر اجرام فلکیہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری ہونے والے احکامات کا ہوتا ہو، اس لئے اس کو بالکل بے حقیقت نہیں کہا جاسکتا۔ نیز بقول شاہ صاحب کے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ ان اجرام مثلاً سیاروں وغیرہ کی اللہ کے پیدا کرنے سے خاص طبائع ہوں، اس لئے ان کے مخصوص حالات میں ہونے کے وقت زمین پر خاص حالات پیدا ہوتے ہوں، لیکن ایک تو یہ چیزیں بذاتِ خود مؤثر نہیں ہیں، بلکہ انہیں علامات کہا جاسکتا ہے، دوسرے ان سے بالاتر اللہ تعالیٰ کی قضا ہوتی ہے، اصل واقعات اسی کے مطابق رونما ہوتے ہیں، سیاروں کی خاص حالت کا علامت کے درجے میں بعض اوقات خاص تقاضا ہوتا ہے کہ ایسا ہونا چاہئے، لیکن اللہ کی قضا چونکہ کچھ اور ہوتی ہے جس کا کسی نجومی وغیرہ کو بھی علم نہیں ہوتا، اس لئے سیاروں کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ہونے کی بجائے واقعات اس کے برعکس قضا و قدر کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

اس کی تائید اس بات سے بھی ہو سکتی ہے کہ اس باب کی پہلی حدیث میں آرہا ہے کہ حضور اقدس ﷺ سے یہ پوچھا گیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ لکیریں کھینچ کر بعض باتیں معلوم کرتے ہیں تو کیا یہ ٹھیک ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کان نبی من الانبیاء یخط فمن وافق خطہ فذاک کہ اللہ کے ایک نبی لکیریں کھینچا کرتے تھے تو جس کا طریقہ اس نبی کے طریقہ کے موافق ہو جائے وہ درست ہوتا ہے لیکن یہ معلوم کرنا کہ کس کا طریقہ اس نبی کے طریقہ کے موافق ہے مشکل ہے اس لئے اس کام میں اشتغال فضول ہے۔ لیکن اس سے یہ پتا ضرور چلا کہ اس طریقے

سے ایک نبی یہ کام کیا کرتے تھے تو اس لئے کچھ نہ کچھ حقیقت تو ضرور ہے لیکن وہ حقیقت نبی کے علاوہ کسی کو حتمی طور پر معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح سے وہ کاہن جو شیاطین اور جنات کے ذریعے اپنی کہانت چلاتے تھے ان کے بارے میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ بات وہ اوپر سے اُچک لیتے ہیں اگرچہ وہ بات ادھوری ہوتی ہے اپنی طرف سے وہ اس میں سو جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں۔ لیکن اتنا پتا چلا کہ وہ بالکل بے حقیقت نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے لیکن جو کچھ ہوتا ہے وہ اتنا ادھورا ہوتا ہے کہ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طریقے سے حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا ارشاد الفصل الثالث میں آرہا ہے اس میں بھی انہوں نے یہ فرمایا کہ نجوم کو اللہ تعالٰی نے تین مقاصد کے لئے پیدا فرمایا جو اس کے علاوہ کوئی اور کام لیتا ہے وہ اپنی زندگی ضائع کرتا ہے وہ تکلف مالا یعلم کا ارتکاب کر رہا ہے یعنی ایسی چیز کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ جس کا اسے علم حاصل نہیں ہو سکتا اور دوسری روایت میں ہے تکلف مالا یعنیہ ومالا علم لہ بہ وما عجز عن علمہ الانبیاء والملائکۃ۔ اس میں قتادہ یہ نہیں کہہ رہے کہ ان ستاروں کا واقعات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں سرے سے سو فیصد نفی کر رہے ہوں۔ البتہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس تعلق کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے تھوڑا سا اشارہ ملتا ہے کہ کچھ نہ کچھ حقیقت ہو سکتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی رائے بھی یہ ہے کہ ان میں سے بعض چیزوں کا واقعتاً زمین پر اور انسانی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کے ساتھ کچھ تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تعلق کیسا ہے، عام طور پر کاہن اور نجومی قسم کے لوگوں کا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ تعلق سبب اور مسبب کا ہے مؤثر اور متأثر کا ہے۔ یہ ستارے اور اس طرح کی دوسری چیزیں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، جبکہ حقیقت میں یہ بات نہیں ہے یہ مؤثر نہیں ہیں بلکہ علامت ہیں۔ جیسے ایک آدمی کی سانس پھولی ہوئی ہے جسم گرم ہے نبض تیز چل رہی ہے تو آپ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کو بخار ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ جسم گرم ہونے کی وجہ سے نبض تیز ہونے کی وجہ سے اسے بخار ہو گیا ہے یہ بخار کے اسباب نہیں بلکہ اس کی علامات ہیں۔ اسلام آباد کے رہنے والوں نے دیکھا کہ فلاں باتیں ہو رہی ہیں فلاں کو بلایا جا رہا ہے فلاں ماہر کو بلایا جا رہا ہے اس سے اندازہ لگا لیا کہ اس طرح کی کوئی

پالیسی آنے والی ہے یہ نہیں کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے یہ اس فیصلہ میں موثر ہے یہ علامتیں ہیں جن سے ہم اندازہ سا لگا لیتے ہیں اور بسا اوقات یہ اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ تو یہ تعلق سبب اور موثر ہونے کا نہیں ہے بلکہ علامت ہونے کا ہے۔ متاخرین میں قاضی ثناءاللہ پانی پتیؒ نے بھی تفسیر مظہری میں تقریباً یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر اس طرح کا نظریہ ہو کہ جس طرح اللہ تعالی کی عادت اور ان کا بنایا ہوا نظامِ قدرت یہ ہے کہ دوا استعمال کریں تو وہ شفا پیدا کردیتے ہیں، زہر کھایا جائے تو اللہ تعالی موت واقع کردیتے ہیں، اسی طرح ستاروں اور سیاروں کی فلاں فلاں پوزیشن ہو تو اللہ تعالی اپنی قدرت سے ایسا کردیتے ہیں تو اس کے نظریے میں کوئی حرج نہیں ہے[1]۔

1- قال في التفسير المظهري تحت قوله تعالي : [فنظر نظرة في النجوم] [الصافات ٨٨]: وهذا يدل على أن النظر فی علم النجوم وتعليمه وتعلمه كان جائزا فی شريعته [أي في شريعة إبراهيم عليه السلام]، لكن صار منسوخا فی شريعتنا ؛ حيث قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : «من اقتبس شعبة من السحر زاد ما زاد» رواه احمد وابو داود وابن ماجه من حديث ابن عباس ، ورواه رزين وزاد : «المنجم كاهن ، والكاهن ساحر ، والساحر كافر» والمعنى أن ثلاثتهم فی الكفر بمنزلة واحدة. ويمكن أن يقال : إنما يحرم النظر فی علم النجوم إذا أسند الحوادث إلى الكواكب ، وأما إذا أسندها إلى الله سبحانه وجعل اتصالات النجوم علامات حسب جري عادة الله على خلق بعض الأشياء عند تلك الاتصالات كما أن الله تعالى يخلق الشفاء غالبا عند شرب الدواء ويخلق الموت عند شرب السم ويخلق أفعال العباد عند القصد المصمم منهم فلا بأس به. ولعل النبي صلى الله عليه وسلم إنما نهى عن اقتباس علم النجوم لئلّا يسند الناس الحوادث إلى الكواكب.

وقال العلامة ابن عابدين في رد المحتار (٤٣/١) نقلا عن مختارات النوازل لصاحب الهداية : "واستدلالي بسير النجوم وحركة الأفلاك على الحوادث بقضاء الله تعالى وقدره، وهو جائز كاستدلال الطبيب بالنبض من الصحة والمرض ولو لم يعتقد بقضاء الله تعالى أو ادعى الغيب بنفسه يكفر"

ان چیزوں سے منع کیوں کیا گیا ہے؟

اوپر دو نقطہ نظر مذکور ہوئے، ایک یہ کہ جن ذرائع کو مستقبل بینی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ان کا حقیقت اور امرِ واقعہ کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، دوسرا یہ کہ ان کا حقیقت کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہو سکتا ہے۔ اب پہلے نقطۂ نظر کے مطابق ان چیزوں سے منع کرنے کی وجہ بالکل واضح ہے کیونکہ ان چیزوں کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں انسانی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں اس لئے اس سے منع ہی کرنا چاہئے تھا۔ لیکن دوسرے نقطہ نظر کے مطابق جس کو شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں اشتغال سے منع کیوں کیا گیا ہے۔ تو منع کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انسان جب ان چیزوں میں مشغول ہوتا ہے تو ان کو مؤثر لذاتہ سمجھ لیتا ہے۔ جس سے شرک تک پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے شرکیہ خیال دل ودماغ میں پیدا ہونے کا بہت واضح امکان ہوتا ہے اس لئے سداً للذریعہ ان سے منع کر دیا گیا، شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ان چیزوں کی تاثیر ذہن میں ایسی بیٹھ جاتی ہے کہ واقعات کی اللہ کی طرف نسبت کرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے، جیسا کہ اسی باب کی حدیث میں آرہا ہے کہ بارش تو اللہ تعالی کرتے ہیں، اور کچھ یہ مانتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے بارش ہوئی، لیکن کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ فلاں برج کی وجہ سے بارش ہوئی، گویا ان چیزوں میں اشتغال کی وجہ سے اللہ کی قدرت کے استحضار اور توکل میں کمی واقع ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان چیزوں کی اگر کوئی حقیقت ہے بھی سہی تو وہ محض علامتیں ہے اور علامتیں بھی محض ادھوری ہیں ان کا پورا علم انسان آج تک حاصل نہیں کر سکا۔ بعض پیشگوئیاں ایسی عمومی قسم کی ہوتی ہیں کہ ایک صاحبِ فراست اور حالات سے واقف انسان علمِ نجوم جانے بغیر ہی اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس درجہ میں یہ ہونے والا ہے، اس لئے ان ذرائع سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انتہائی ادھورا ہے، اتنا ادھورا کہ اس پر کوئی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

آنحضرت ﷺ نے کہانہ کے بارے میں ایک بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ ان کو ایک تو بات ادھوری سی معلوم ہو جاتی ہے دوسرے اس کے ساتھ سو جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو پیشگوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں ان کی تشہیر نہیں ہوتی اس لئے کہ کسی کو ان کی تشہیر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اور اتفاق سے ایک آدھ پیش گوئی سچی بھی ہو گئی تو چونکہ اس کی تشہیر کرنا خود پیش گوئی کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ مختلف ذرائع سے اس کی خوب تشہیر کرتا ہے کہ دیکھو میری فلاں فلاں پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہو گئی۔

کچھ ہی دنوں کی بات ہے کہ نیپال کا سارا کا سارا شاہی خاندان نجومیوں کی غلط پیش گوئیوں کی بنا پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ نجومی نے یہ کہا تھا کہ شہزادے کی پینتیس سال کی عمر سے پہلے شادی نہیں کرنی اگر شادی کر دی تو تم سب قتل ہو جاؤ گے۔ وہ شہزادہ جہاں پر شادی کرنا چاہتا تھا وہاں پر بادشاہ اور ملکہ نے اس کی شادی کرنے سے انکار کر دیا ۔اس نے رد عمل میں آکر ایک دعوت میں پورے کے پورے خاندان کو اڑا دیا۔ کہہ تو نجومی یہ رہا تھا کہ پینتیس سال کے بعد شادی کرو گے تو بچ جاؤ گے اور پہلے کرنے سے مر جاؤ گے لیکن شادی نہ کرنے سے مر گئے۔ اب ظاہر ہے کہ شاہی خاندان نے جس نجومی سے مشورہ کیا ہو گا وہ معمولی اور فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا نجومی تو نہیں ہو گا، وہ اپنے فن کا ماہر آدمی ہو گا اس کی پیش گوئی کا یہ حال ہے تو عام نجومی کی پیش گوئی کا کیا حال ہو گا۔

تو حاصل یہ کہ ان ذرائع سے پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی بات علم الخط کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس نبی کے طریقہ کے مطابق جس کا طریقہ ہو گا وہ ٹھیک ہو گا اور جس کا اس کے مطابق نہیں ہو گا وہ ٹھیک نہیں ہو گا حقیقت ہے تو سہی لیکن اس کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی بات قتادہ نجوم کے بارے میں فرمارہے ہیں کہ وتکلف مالا علم لہ بہ اگر زندگی کے ساتھ تعلق ہو بھی سہی لیکن تعلق کیسا ہے کس نوعیت کا ہے کیا چیز کسی کی علامت ہے اس کا پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ علم نہ قطعی درجے کا ہے نہ ظنی درجے کا ہے نہ شک کے درجے کا ہے بلکہ وہم کے درجے کا ہے۔ جو چیزیں وہم کے درجے میں ہوتی ہیں ان میں اشتغال انسان کو بے کار کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاج معالجہ کا حکم دیا گیا ہے لیکن - جیسا کہ کتاب الطب میں تفصیل سے گذرا- علاج

معالجہ میں بھی اسبابِ وہمیہ کو اختیار کرنے کو توکل کے منافی قرار دیا گیا ہے اور فرمایا کہ جو ان چیزوں میں پڑے گا وہ انہی کا ہو کر رہ جائے۔ یہی معاملہ یہاں پر ہوتا ہے کہ انسان توہم پرست بن جاتا ہے اور اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ تو اس طرح کے مفاسد ہیں جن کی وجہ سے شریعت نے منع کیا ہے۔

ان علوم کے اندر اشتغال میں ایک اور بڑی قباحت یہ ہے کہ بعض اوقات ایسی چیزیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کا نہ معلوم ہونا اچھا ہوتا ہے، ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ الأولیاء میں امام شافعیؒ کے تذکرے میں ایک عجیب روایت لکھی ہے کہ امام شافعی بھی نو عمری میں علومِ نجوم کا اشتغال رکھتے تھے، ایک دفعہ ایک عورت کے ہاں ولادت ہونے والی تھی، امام شافعی نے نجوم کی روشنی میں حساب لگایا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ عورت ایک لڑکی جنے گی جس کے اندام نہانی پر کالا تِل ہو گا اور وہ اتنے عرصے میں وفات پا جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی مخفی حالت کا علم کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اس لئے امام شافعیؒ نے اسی وقت اس علم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور اس فن کی جو کتابیں ان کے پاس موجود تھیں انہیں دفن کروا دیا[1]۔

مستقبل بینی کے ذرائع کے بارے میں دو قسم کی باتیں ہو گئیں۔ ایک یہ کہ شریعت نے اس لئے منع کیا کہ سرے سے ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ اور دوسرا ان سے لئے منع کیا کہ کچھ نہ کچھ حقیقت ہو سکتی ہے لیکن ایک تو یہ ہے کہ شرکیہ خیالات میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے دوسرا ان کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے انسان توہم پرستی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

1۔ حلیۃ الأولیاء ۹/۷۷

علمِ نجوم وغیرہ سے ممانعت کب اور کس درجے میں ہے:

اب تک کی گفتگو سے ہمارے سامنے یہ بات آئی ہے کہ احادیث میں زیادہ شدت اور سختی کے ساتھ تو اُس کہانت سے منع کیا گیا ہے جس کی زمانۂ جاہلیت میں ایک خاص شکل مروّج تھی، تاہم بعض حدیثوں میں نجوم سے بھی منع کیا گیا ہے، مستقبل بینی کے دیگر علوم کو بھی نجوم پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ نجوم یا دست شناسی وغیرہ بالکل کہانت ہی کی طرح ہیں یا ان میں کچھ فرق بھی ہے۔ شروع میں جو ہم نے کہانت اور قسمت بینی کے دیگر علوم کا تعارف کرایا تھا اسے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نجوم یا دست شناسی وغیرہ بعض پہلوؤں سے جاہلیت کی کہانت سے مختلف بھی ہیں اور بعض پہلوؤں سے اس کے مشابہ بھی۔ مثلاً کہانت میں عالمِ بالا یا فوق الفطرۃ سے براہِ راست یا بالواسطہ رابطے کا دعوی ہوتا تھا، جبکہ ان مروّجہ علوم میں ایسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض علامات اور حسابات کے ذریعے نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کاہن کو بعض اوقات برگزیدہ ہستی سمجھا جاتا تھا، جبکہ مروّجہ علوم میں ایسا نہیں ہوتا، کہانت عموماً غیر اکتسابی سمجھی جاتی تھی جبکہ یہ علوم باقاعدہ حاصل کئے جاتے ہیں۔

لیکن متعدد پہلو ایسے بھی ہیں جن میں نجوم یا دست شناسی وغیرہ کہانت کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً کہانت میں بھی اندازے اور تخمینے کا بہت بڑا کردار ہوتا تھا، یہاں بھی اندازے اور تخمینے چلتے ہیں، جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ یہ علوم بھی ابھی تک سائنسی انداز سے ثابت نہیں کئے جاسکے اور نہ ہی ان میں تجربات کا سائنسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اس لئے ان کی مشابہت ٹوٹکوں کے ساتھ زیادہ ہے۔ کہانت کو ایک طرح سے نبوت سے مشابہ چیز کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، جبکہ علمِ نجوم وغیرہ میں بقول شاہ ولی اللہ کے ستاروں وغیرہ کو مؤثر لذاتہ سمجھے جانے کا خطرہ اور امکان موجود ہوتا ہے۔

اس لئے نہ تو نجوم یا دست شناسی کو بالکلیہ کہانت کی طرح قبیح قرار دے کر ان پر کہانت کے بارے میں ساری حدیثوں کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، اس لئے دونوں میں فرق موجود ہیں اور نہ ہی انہیں بالکلیہ قابلِ اعتماد اور درست قرار دیا

جاسکتا ہے، اس میں تفصیل یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر تو کوئی شخص ستاروں وغیرہ کو مؤثر لذاتہ سمجھتا ہے اور اس کی وجہ سے اللہ کی قدرت کا انکار لازم آتا ہے، یا نجومی وغیرہ کی بات قطعی اور حتمی سمجھتا ہے اور یہ ذہن رکھتا ہے کہ انہیں غیب کا علم حاصل ہوتا ہے تو ان کے پاس جانا اور ان سے قسمت معلوم کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ اور اگر اس طرح کی بات نہیں ہے تب بھی ان ذرائع علم کا درجہ چونکہ وہمیات کا ہے اس لئے ان میں اشتغال کو پسند نہیں کیا گیا، اس لئے کہ اس طرح کی چیزوں میں پڑنے سے عموماً تو ہم پرستی کا راستہ کھلتا اور آدمی انہیں چیزوں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کو فال اور طیرۃ (نیک شگونی اور بد شگونی) کا درجہ دیا جاسکتا ہے، جس کے بارے میں تفصیل سے بات پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔ لہذا اگر یہ لوگ مثبت پیش گوئی کریں تو اس کی وجہ سے پر امید ہونے میں کوئی حرج نہیں، اور اگر منفی پیش گوئی کریں تو اس کا اثر لینے کی بجائے اللہ پر توکل کیا جائے اور وہی الفاظ کہے جائیں جو پچھلے باب میں بد شگونی کے حوالے سے گذرے ہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک دفعہ کعب احبار اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے درمیان علمِ نجوم کے بارے میں مکالمہ ہوا اور علمِ نجوم کی ایک قباحت یہ سامنے آئی کہ بعض اوقات اس میں ناپسندیدہ پیش گوئی کا سامنا ہوتا ہے، تو اس موقعہ پر حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے اسی دعا کا ذکر کیا جو پچھلے باب میں طیرۃ (بد شگونی) کے حوالے سے گذر چکی ہے، یعنی اللهم لاخير إلا خيرك ولاطير إلا طيرك ولا إله غيرك۔

ان چیزوں میں دلچسپی کی وجہ اور ان کا صحیح متبادل:

لیکن سوال یہ ہے کہ پیش گوئیاں غلط بھی ثابت ہوتی ہیں لیکن لوگ پھر بھی ان کے پیچھے پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی انسان کے سامنے ہے اس نے دیکھا ہوا ہے، حال بھی انسان کے سامنے ہے، لیکن جب انسان مستقبل کے بارے میں منصوبہ بنانے لگتا ہے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے تو اس کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں ہوتا، اس لئے انسان مستقبل کے بارے میں فطری طور پر بہت حساس ہوتا ہے اور کسی نہ کسی طریقے سے کوشش کرتا ہے کہ مستقبل میں جھانک کر دیکھ لوں۔ یہ جو کچھ ہے یہ ساری کی ساری کوششیں ہیں مستقبل میں جھانکنے کی۔

پچھلے باب میں فال اور طیرہ کے بارے میں جو باتیں گذریں اور جو رواج تھے عربوں کے وہ بھی اسی قبیل سے ہیں کہ پہلے مستقبل کے بارے میں جھانک کر دیکھ لیں کہ یہ سفر مبارک ہوگا یا منحوس ہوگا۔ لیکن جتنی بھی کوششیں ہیں مستقبل میں جھانکنے کی وہ ساری کی ساری ادھوری اور ناکام ہیں۔ اول تو ان سے مستقبل کے بارے میں پتا چلتا ہی نہیں اگر پتا چل بھی جائے تو وہ اتنا ادھورا ہوتا ہے کہ اس پر انسان فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی فیصلہ کرتا بھی ہے تو وہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیں۔ مولانا روم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے ایک شخص کو شوق تھا کہ مجھے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جایا کرے چنانچہ وہ کسی نبی کے پاس یا اللہ والے کے پاس گیا اور ان کے سامنے اپنی یہ خواہش رکھی تو انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے لئے مفید نہیں ہے اس لئے یہ خواہش اپنے ذہن سے نکال دو۔ اس نے کہا نہیں، اس میں غیر مفید ہونے والی بات کون سی ہے۔ مجھے آج پتا چل جائے کہ کل کیا ہونے والا ہے تو اس کے اعتبار سے بہتر تیاری کروں گا۔ بزرگ نے فرمایا کہ بہر حال تیرے لئے مفید نہیں ہے نقصان ہوگا۔ جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے بس وہی ٹھیک ہے، لیکن وہ مصر ہوا۔ انہوں نے دعا کر دی کہ اس کو آئندہ آنے والے واقعات کا علم ہو جایا کرے۔ چنانچہ ایک دن اسے پتا چلا کہ میرا گھوڑا ایک دو دن کے بعد مرنے والا ہے۔ بڑا خوش ہوا کہ پہلے پتا چل گیا، بازار میں گھوڑا لے کر گیا اس وقت گھوڑا بڑی اچھی حالت کا تھا جتنے میں خریدا تھا اس سے بھی مہنگا بیچ آیا اور بہت خوش ہوا کہ یہ طریقہ تو کامیاب رہا۔ اگر مجھے پتا نہ چلتا تو یہ گھوڑا میرے پاس مر جاتا اور میرا نقصان ہوتا۔ چند دن کے بعد اسے پتا چلا کہ میرا غلام مرنے والا ہے اسے بھی جا کر بیچ آیا اور ٹھیک ٹھاک پیسے کما لئے۔ پھر پتا چلا کہ فلاں جانور مرنے والا ہے اسے بھی بیچ آیا اور بڑا مطمئن کہ کام ٹھیک چل رہا ہے، اگر مجھے پیشگی علم کی صلاحیت حاصل نہ ہوتی تو پتا نہیں کتنا بڑا نقصان اٹھا چکا ہوتا۔ اب پتا چلا کہ چند دن کے بعد گھر گرنے والا ہے اس نے اپنا گھر بھی منتقل کر لیا۔ اب کچھ دن کے بعد پتا چلا کہ اس کی اپنی باری ہے کہ یہ مرنے والا ہے۔ اب کیا کرے اپنے آپ کو کہاں بیچے؟ اب بھاگا ہوا اس نبی یا اللہ والے کے پاس گیا اور کہا کہ اب میں کیا کروں، میں مرنے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا کہ اصل میں ہوا یوں کہ اللہ کی جانب سے اوپر سے ایک بلا آرہی تھی اور وہ تیرے گھر میں کہیں نہ کہیں پڑنی تھی سب سے پہلے وہ متوجہ ہوئی تیرے گھوڑے کی طرف تیرا گھوڑا مر جاتا تو بات ختم

ہو جاتی لیکن وہ تونے اپنے گھر سے نکال دیا۔اب وہ متوجہ ہوئی تمہارے جانور کی طرف وہ بھی تونے گھر سے نکال دیا۔اب وہ غلام کی طرف متوجہ ہوئی وہ بھی تونے نکال دیا۔گھر کی طرف متوجہ ہوئی وہ بھی تم نے اپنی ملکیت سے نکال دیا۔ اس بلا کے لئے اب تو ہی بچا ہے اب بچاؤ کا کوئی اور راستہ نہیں۔ تو اب دیکھئے کہ اس کو واقعتاً پیشگی علم حاصل ہو گیا لیکن یہ علم ادھورا تھا وہی بات کہ پورا علم حاصل نہیں ہو سکتا ادھورے علم سے آدمی ایسا منصوبہ بناتا ہے کہ جس سے فائدہ کی بجائے نقصان بھی ہو سکتا ہے۔

اس لئے شریعت نے کہا اس انداز سے اور مافوق الطبیعہ طریقے سے اور اسباب کے دائرے سے ہٹ کر مستقبل میں جھانکنے کی کوشش ہی چھوڑ دو اگر اس طرح کی کوشش میں پڑو گے تو وہی حشر ہو گا جو نیپال کے شاہی خاندان کا ہوا یا جیسے اس آدمی کا ہوا۔ مستقبل میں جھانکنے کی بجائے اپنا معاملہ اس ذات کے سپرد کر دو جسے مستقبل کی ایک ایک جزئی کا علم ہے اور کوئی منصوبہ بنانے سے پہلے اس کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دو، اس کے سامنے اپنی چالاکیاں دکھانے کی بجائے اپنی بے علمی اور بے بسی تسلیم کر لو، کہ میں نہ تو کچھ جانتا ہوں نہ ہی میرے بس میں کچھ ہے، تو ہی سب کچھ جانتا ہے اور تیری ہی قدرت چلتی ہے، فانک تقدر ولا اقدر و تعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب۔ علام الغیوب کے سامنے ایک دفعہ ہتھیار ڈال دو اور اسی سے خیر کے طلب گار بن جاؤ۔ اسی کا نام استخارہ ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں گذرا کہ توہم پرستی اور بدشگونی کا توڑ اللہ پر توکل ہے اور استخارہ کی دعا کو دیکھا جائے تو یہ توکل کی بہت اچھی اور خوبصورت شکل ہے۔

حاصل یہ کہ مستقبل میں جھانکنے کی اس طرح کی غیر طبعی کوششوں کی بجائے شریعت نے ہمیں دو کاموں کا حکم دیا ہے۔ انسان کا مستقبل کے بارے میں جو حساس پن ہے یہ چونکہ بالکل فطری ہے اس لئے شریعت نے اس کو بالکل نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس طبعی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے دو متبادل طریقے بتائے۔ ایک تو یہ کہ اسباب کے

درجے میں نتائج پر غور کرلے کہ میں یہ کام کرنے لگا ہوں اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ لا عقل کالتدبیر[1] کہ سب سے بڑی عقل مندی تدبیر ہے۔ تدبیر کے معنی ہیں النظر فی دبر الامور، یعنی ہر معاملے کی ایک سائیڈ وہ ہوتی ہے جو ہماری طرف ہوتی ہے، اور یہ معاملے کا آغاز ہوتا ہے، دوسری سائیڈ دوسری طرف ہوتی ہے اور یہ معاملے کا اختتام ہوتا ہے، عام طور پر انسان معاملے کی پہلی اور اپنی طرف والی سائیڈ کو دیکھ کر قدم اٹھالیتا ہے، تو ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے اس کے ممکنہ نتائج پر بھی غور کرلو، تو تدبیر کے معنی ہوئے کسی کام کے انجام کو سوچنا۔ اور اس کام میں تعاون کے لئے حکم دیا کہ کسی سمجھ دار اور خیر خواہ انسان سے مشورہ بھی لے لو۔

ایک کام تو یہ کرو اور دوسرا کام استخارہ کہ اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ مجھے تو صرف اتنا پتا ہے ظاہری اسباب کے درجہ میں۔ باقی پورا پتا مجھے لگ سکتا ہی نہیں ہے۔ اور لگ بھی جائے لیکن میرے چاہنے سے کچھ ہوگا نہیں اس لئے کہ میں بے بس ہوں آپ کے پاس علم بھی ہے قدرت بھی ہے اس لئے انی استخیرک بعلمک واستقدرک بقدرتک آپ کے علم کا اور آپ کی قدرت کا سہارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ بس یہ دو کام کرلو اور تیسری چیز ہے فیصلہ کرنے کے بعد اللہ پر بھروسہ اور توکل کرو فإذا عزمت فتوکل علی اللہ انشاءاللہ کام ٹھیک بھی ہو جائیں گے اور یہ جو انسان کا فطری حساس پن ہے مستقبل کے بارے میں اس کا تقاضا بھی پورا ہو جائے گا۔ یہ طریقہ اور استخارہ اس طرح کی توہم پرستوں کا صحیح متبادل ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ کتاب الزہد: باب الورع والتقوی حدیث نمبر: ۴۲۱۸، مشکوۃ المصابیح باب الحذر والتأنی فی الأمور۔

شرح احادیث باب الکہانۃ

ایک نبی لکیریں کھینچا کرتے تھے

(۱) عَن مُعَاوِيَة بنِ الحَكَمِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أُمُورًا كُنَّا نَصْنَعُهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ: كُنَّا نَأْتِي الْكُهَّانَ، قَالَ: «فَلَا تَأْتُوا الْكُهَّانَ». قَالَ: قُلْتُ: كُنَّا نَتَطَيَّرُ، قَالَ: «ذَلِكَ شَيْءٌ يَجِدُهُ أَحَدُكُمْ فِي نَفْسِهِ؛ فَلَا يَصُدَّنَّكُمْ». قَالَ: قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّونَ، قَالَ: «كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاك». رَوَاهُ مُسْلِم.

حضرت معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ کہ کچھ ایسے کام ہیں جو ہم زمانۂ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔ ہم زمانۂ جاہلیت میں کاہنوں کے پاس آیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اب کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ معاویہ بن حکم کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ہم بدفالی لیا کرتے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایسی چیز ہے جسے تم میں سے کوئی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے لیکن یہ چیز تمہیں کسی کام سے روکے نہیں (یعنی اس کے تقاضے پر عمل نہ کرو)۔ معاویہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ہم سے کچھ لوگ ہیں جو لکیریں کھینچتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ نبیوں میں سے ایک نبی بھی لکیریں کھینچا کرتے تھے تو جس کی لکیریں ان کے مطابق ہوں وہ درست ہے۔

یہ حضرت معاویہ بن حکم سلیمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہی صحابی ہیں کہ ایک دفعہ مسجد میں آئے اور آکر لوگوں سے کچھ پوچھا لیکن نماز کے دوران بات کرنے کی ممانعت نازل ہوچکی تھی اس لئے کسی نے جواب نہیں دیا تو یہ کہتے

ہیں کہ جواب کیوں نہیں دیتے بولتے کیوں نہیں ہو لوگوں نے اشارے سے چپ کرایا اور کہتے کہ مجھے چپ کیوں کراتے ہو۔ کہتے ہیں بہر حال میں چپ کر گیا لیکن فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جیسا معلم میں نے نہیں دیکھا میں آپ کے پاس گیا تو آپ نے بڑے پیار سے مجھے ساری باتیں سمجھائیں۔

اس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک نبی ایسے تھے جو لکیریں کھینچا کرتے تھے، یعنی لکیروں کے ذریعے بعض احوال معلوم کیا کرتے تھے۔ یہ نبی کون تھے، بعض نے کہا کہ یہ حضرت دانیال علیہ السلام تھے اور بعض نے کہا کہ یہ حضرت ادریس علیہ السلام تھے اور بعض نے اور نبیوں کا ذکر کیا ہے۔

بعض حضرات نے کہا ان کے پاس باقاعدہ کوئی علم نہیں تھا بلکہ ان کا ایک معجزہ تھا کہ جب وہ لکیریں کھینچتے تو اللہ تعالی وحی کے ذریعے انہیں احوال پر مطلع فرمادیتے، لیکن یہ بات حدیث کے سیاق کے مطابق معلوم نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس حدیث میں صراحتاً یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی کا طریقہ اس نبی کے مطابق ہو جائے تو وہ درست نتیجے تک پہنچ جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ غیر نبی کو بھی یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے، جبکہ معجزہ اور وحی نبی کے ساتھ خاص ہیں۔

کاہن کچھ نہیں ہیں

(۲) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: سَأَلَ أُنَاسٌ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْكُهَّانِ ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّهُمْ لَيْسُوا بِشَيْءٍ». قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ فَإِنَّهُمْ يُحَدِّثُونَ أَحْيَانًا بِالشَّيْءِ يَكُونُ حَقًّا ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تِلْكَ الْكَلِمَةُ مِنَ الْحَقِّ يَخْطِفُهَا الْجِنِّيُّ فَيَقُرُّهَا فِي أُذُنِ وَلِيِّهِ قَرَّ الدَّجَاجَةِ فَيَخْلِطُونَ فِيهَا أَكْثَرَ مِنْ مِائَةِ كَذْبَةٍ» متفق عليه.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہنوں کے بارے میں سوال کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ بعض دفعہ یہ کچھ باتیں بیان کرتے ہیں جو درست ثابت ہوتی ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ درست بات اصل میں جن نے اُچکی ہوتی ہے اور وہ اسے اپنے دوست (یا اپنے کاہن) کے کان میں بجاتا ہے جس طرح کہ مرغی کڑکڑ کرتی ہے اور یہ لوگ اس میں سو سے زیادہ جھوٹ ملا لیتے ہیں۔

کاہن اپنے پاس سے جھوٹ ملاتے ہیں

(۳) وَعَنْهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَانِ - وَهُوَ السَّحَابُ - فَتَذْكُرُ الْأَمْرَ قُضِيَ فِي السَّمَاءِ، فَتَسْتَرِقُ الشَّيَاطِيْنُ السَّمْعَ فَتُوحِيهِ إِلَى الْكُهَّانِ فَيَكْذِبُونَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ من عِنْد أنفسهم». رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں اور اس امر کا آپس میں تذکرہ کرتے ہیں جس کا آسمانوں میں فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، تو شیاطین سنی جانے والی بات کو اچک لیتے ہیں اور اس کا اپنے کاہنوں کی طرف القا کرتے ہیں۔ اور وہ (کاہن) اس میں اپنے پاس سے سو جھوٹ اس میں ملا لیتے ہیں۔

کاہنوں کا طریقہ کار

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ان دو حدیثوں میں کہانہ کی جو سب سے زیادہ مروج شکل تھی اس کی کیفیت اور ان کے طریقہ کار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہنوں کے بارے میں یہ فرمایا کہ انہم لیسوا بشئ کہ ان کی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ اس کا مطلب شارحین حدیث نے یہ بیان کیا ہے کہ ان کے اندر اتنی حقیقت نہیں ہے کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے۔ اس پر بعض صحابہ کرام نے یہ اشکال کیا کہ بعض اوقات کاہن کوئی پیش گوئی کرتے ہیں اور جو واقعہ بتلاتے ہیں وہ درست ثابت ہوتا ہے۔ خاص طور پر زمانۂ جاہلیت میں ان کی پیش گوئیاں ذرا زیادہ صحیح ثابت ہوتی تھیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ اس اشکال کا جواب دینے کے لئے حضور اقدس ﷺ نے ان کا پورا طریقہ کار بیان کیا اور پورا طریقہ کار بیان کر کے اس پر نقد کی۔ ان کا پورا طریقہ کار اگر مد نظر رکھا جائے تو اس سے پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک آدھ بات درست ہوسکتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کا قول قابل اعتبار نہیں۔ پورا طریقۂ کار یہ ہے کہ یہ لوگ جنات کو اپنے تابع کر لیتے ہیں یا وہ ان کے تابع ہو جاتے ہیں اور یہ جنات اس کاہن سے لے کر آسمان تک اوپر نیچے ایک لائن بنا لیتے ہیں۔ جب اللہ جل جلالہ کی طرف سے کوئی حکم دیا جاتا ہے تو فرشتے آپس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں کہ میری یہ ڈیوٹی لگی تمہاری یہ ڈیوٹی لگی اور اللہ تعالیٰ نے یہ یہ حکم صادر فرمایا ہے۔ سب سے اوپر والا جن یا شیطان اس بات کو سننے کی کوشش کرتا ہے۔ پوری بات تو نہیں سن پاتا البتہ بات کا کچھ حصہ وہ اچک لیتا ہے۔ جیسے کسی جگہ پر کوئی میٹنگ ہو رہی ہے کسی خاص معاملہ میں کوئی پالیسی طے ہو رہی ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اس میٹنگ میں کسی کو شرکت کی اجازت دے دی جائے تو ظاہر ہے کہ اسے اس معاملہ کے پورے مالہ اور ماعلیہ اور پوری بحث کا علم ہوگا۔ لیکن ایک شخص وہ ہے جسے میٹنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی لیکن جس کمرے میں میٹنگ ہو رہی تھی مشورہ ہو رہا تھا اس کی کھڑکی کے پاس کان لگا کر کھڑا ہو گیا، تو پوری بات کا تو اسے پتا نہیں چلے گا لیکن گفتگو کے دوران بعض لوگوں کی آواز ذرا بلند ہو جاتی ہے اس کی وجہ سے دو چار جملے یہ سن لے گا۔ اسی طریقے سے اوپر والے شیطان کو پوری بات سننے کا موقع تو نہیں ملتا البتہ بات کا کچھ حصہ سننے یا اچکنے میں

وہ کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ بات اپنے سے نیچے والے کو بتاتا ہے اور وہ اس سے نیچے والے کو اور وہ اس نیچے والے کو، یوں کئی وسائط کے بعد یہ بات کاہن تک پہنچتی ہے۔ پھر کاہن وہ بات اپنے گاہک یا کلائنٹ کو بتلاتا ہے۔

تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طریقہ کار سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بات قابل اعتبار نہیں ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ سننے والے نے پوری بات نہیں سنی بلکہ کچھ حصہ اچکا ہے، ہو سکتا ہے کہ اصل بات کچھ اور ہو اور یہ سمجھا کچھ اور ہو۔ اور پھر اس کاہن نے یہ بات براہِ راست نہیں سنی بلکہ سننے والا کوئی اور ہے اور اس سننے والے نے اسے یہ بتائی ہے۔ اور درمیان میں کئی واسطے ہیں اور درمیان میں یہ راوی بھی ثقہ نہیں ہے اس قدر ضعیف ہیں کہ سارے کے سارے شیاطین ہیں تو ان کی روایت پر کیا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اصل سنی ہوئی بات کے نامکمل ہونے کی وجہ سے اور اپنی شیطانی فطرت کی وجہ سے وہ اپنے پاس سے اس میں کچھ جھوٹ بھی ملا لیتے ہیں۔ اور جب کاہن تک وہ بات پہنچتی ہے چونکہ اب بھی وہ کچھ ادھوری ہوتی ہے اس لئے اسے بھی کچھ حاشیہ آرائی اور قیاس آرائی کرنی پڑتی ہے۔ اصل بات جہاں سے چلی اس کی تو کچھ نہ کچھ حقیقت ہوتی ہے کہ بات کچھ سنی ہوئی ہوتی ہے لیکن ایک تو وہ ادھوری ہوتی ہے اور دوسرے اس میں جھوٹ کی کافی آمیزش ہوتی ہے اس لئے اس پر کوئی اعتماد اور اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

کہانت اور شہاب ثاقب

کہانہ کی یہ کیفیت تو زمانہ جاہلیت میں تھی اور اس حالت میں بھی یہ زیادہ قابل اعتبار نہیں تھی۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعثت کے بعد اس میں ایک اور بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور اس کی وجہ سے جو تھوڑا بہت اعتماد ہو سکتا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آسمان پر پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اب یہ شیاطین بات اچکنے کی کوشش کرتے ہیں یا کوئی بات اچک لیتے ہیں تو ان پر فرشتے شہابِ ثاقب پھینکتے ہیں اور اس کو مار ڈالتے ہیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب ان کو پتا نہیں چلا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں اس وقت بھی انہوں نے ان پہروں کو واضح طور پر محسوس کیا اور آپس میں یہ

کہا کہ وأنالمسنا السماء فوجدناھاملئت حرساشدیداوشھبا[الجن:] کہ اب ہم آسمان میں یہ تبدیلی محسوس کرتے ہیں کہ وہ چوکیداروں اور شہاب ثاقب سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ ایک نئی تبدیلی ہوئی اس تبدیلی کے مطابق یہ تو ضروری نہیں کہ یہ شیاطین بات سن ہی نہ سکیں بلکہ سننے میں اب بھی کامیاب ہو سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ پہلے سننے کا موقع ان کو نسبتاً زیادہ ملتا تھا لیکن اب سننے کا موقع کم ملتا ہے۔ بسااوقات تو بات سننے سے پہلے ہی فرشتے شہابِ ثاقب مار دیتے ہیں اور یہ مر جاتے ہیں سننے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اور اگر سننے کا موقع ملا لیکن اسے ڈر ہے شہاب ثاقب لگنے کا اس لئے اطمینان اور تسلی سے بات سن نہیں پاتے۔ پھر یہ جو ادھوری کی ادھوری بات سنی ہے تو یہ سننے کے بعد بعض اوقات شہابِ ثاقب نچلے شیطان کی طرف بات منتقل کرنے سے پہلے ہی آکر لگ جاتا ہے اور وہ بات وہیں ختم ہو جاتی ہے، اس لئے کہ شہابِ ثاقب سے اس شیطان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے اوپر والا شیطان یا جن نیچے والے شیطان کی طرف بات منتقل کر دیتا ہے، بعد میں اسے شہاب ثاقب لگتا ہے۔ اس صورت میں وہ بات آگے منتقل تو ہو جاتی ہے لیکن یہ بات بالکل ہی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے، اس لئے کہ ایک تو اس نے سنی خوف، ڈر اور دباؤ کی حالت میں ہوتی ہے کہ شہابِ ثاقب نہ لگ جائے، اس لئے سننا زیادہ ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ پھر سننے کے بعد جب وہ آگے نقل کرتا ہے تو بہت جلد بازی میں نقل کرنی پڑتی ہے کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے کہ ابھی شہاب ثاقب آ جائے گا۔ جیسا کہ محدثین کے ہاں ہوتا ہے کہ ایک ہوتا ہے تحمل حدیث اور ایک ہوتا ہے روایت حدیث۔ یہاں اس بات کا تحمل بھی دباؤ کی حالت میں ہوتا ہے کہ شہاب ثاقب نہ لگ جائے اور آگے نقل کرنا بھی دباؤ کی حالت میں ہوتا ہے اس لئے پہلے بھی کہانہ کوئی زیادہ قابل اعتبار نہیں تھی اب یہ چوکیداری نظام آجانے کے بعد اور زیادہ ناقابلِ اعتبار ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ خطابی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کہانہ نسبتاً سچی ہوتی تھی اور اب اتنا سچ اس کے اندر نہیں ہے۔

اشکال یہ تھا کہ بعض اوقات کاہنوں کی کوئی بات سچی ہو جاتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ زیادہ تر باتیں جھوٹ

اور ناقابل اعتبار حاشیہ کے قبیل سے ہوتی ہیں۔ لیکن اکا دکا کوئی بات سچی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن شاذ و نادر کوئی بات سچی ثابت ہو جائے اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ یہ قابل اعتبار ذریعۂ علم ہے۔ یہ حاصل ہے اس موضوع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا۔

اب کہانہ کی حقیقت تو اس سے واضح ہو گئی البتہ شہابِ ثاقب اور رجمِ شیاطین کے بارے میں ایک دو باتیں قابل غور ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہابِ ثاقب جو نظر آتا ہے جس کو ہمارے عرف اور محاورے میں ستارہ ٹوٹنا کہا جاتا ہے اور عربی زبان میں بھی اسے انقضاض الکوکب کہا جاتا تھا، انقض الکوکب یعنی ستارہ ٹوٹا۔ ستارے کے ٹوٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اوپر ایک چمک سی نظر آتی ہے تھوڑی دیر نظر آنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً سچ مچ کوئی چیز ٹوٹتی نہیں ہے۔ بس یہ ایک محاورہ ہے کہ ستارہ ٹوٹا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شہابِ ثاقب اور ستارے ٹوٹنے کا یہ سلسلہ حضور اقدس ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی موجود تھا، چنانچہ اس باب کی دسویں حدیث میں آرہا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اسی طریقے سے شہابِ ثاقب رونما ہوا، یعنی ستارہ ٹوٹا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم زمانۂ جاہلیت میں اس کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہم یہ کہتے تھے کہ آج کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوا ہے یا کوئی بڑی شخصیت پیدا ہوئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا کسی کی موت و حیات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی شہاب ثاقب نظر آتا تھا اور یہ اتنا پرانا سلسلہ ہے کہ عرب اس کے بارے میں اپنا ایک نظریہ بھی قائم کر چکے تھے۔ جبکہ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد شروع ہوا اور نیا ہے جیسا کہ جنات کا آپس میں یہ تذکرہ قرآن کریم نے نقل کیا وانا لمسنا السماء فوجدناھا ملئت حرسا شدیدا وشھبا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں ایک ہے شہاب ثاقب کا وجود، اور ایک ہے اس کا رجمِ شیاطین کے لئے استعمال ہونا۔ جہاں تک تو شہاب ثاقب کے وجود کا تعلق ہے تو یہ ایک قدیم کائناتی مظہر ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اس کا آغاز نہیں ہوا۔ البتہ پہلے یہ ایک عام طبعی ظاہرہ تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جب حفاظتی انتظامات کئے گئے تو اسی طبعی اور کائناتی مظہر کا اس مقصد کے لئے استعمال کر لیا گیا کہ فرشتوں کے پہرے بٹھادیئے گئے اور یہ پہرے دار اسی شہابِ ثاقب کو رجم شیاطین کے لئے استعمال کرنے لگ گئے۔ جیسے کہ ایک جگہ پر پتھر توصدیوں سے پڑے ہوئے ہیں لیکن پہرے دار آپ نے وہاں کھڑا نہیں کیا۔ آج آپ نے وہاں کوئی پہرے دار کھڑا کر دیا لیکن پہرے دار کو آپ نے کوئی بندوق نہیں دی کوئی رائفل نہیں دی کوئی ہتھیار نہیں دیئے اور کہا کہ کوئی آئے تو یہی پتھر اسے اٹھا کر مار دینا، تو یہ ان پتھروں کی وہاں موجودگی تو پرانی ہے البتہ ان کا یہ مخصوص استعمال نیا ہے۔ تو شہاب ثاقب اصل میں عالمِ بالا کے پتھر ہیں، روڑے ہیں، یہ موجود تو پہلے بھی تھے اور یہ گھومتے پھرتے بھی تھے، آج بھی گھومتے پھرتے ہیں۔ انہی سے رجمِ شیاطین کا کام بھی فرشتے لینے لگ گئے کہ جب کسی شیطان کو مارنا ہوتا تو انہی میں سے کوئی چیز اٹھا کر مار دیتے۔

شہاب ثاقب کی حقیقت:

ایک بات اور یہاں قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ کہ شہابِ ثاقب کی حقیقت کیا ہے۔ قدیم فلاسفۂ یونان کا یہ تصور تھا کہ یہ اصل میں کچھ ارضی مواد ہوتے ہیں زمین کے غبارات وغیرہ اس طرح کی چیزیں اڑ کر اوپر جاتی ہیں ۔ زمین کے اوپر کرۂ ہوا ہے اس کے اوپر کرۂ زمہریر ہے اور اس کے اوپر کرۂ نار ہے۔ تو یہ چیزیں اڑتی ہوئی اوپر جاتی ہیں یہاں تک کہ کرہ نار میں پہنچتی ہیں تو جب یہ مجموعہ کرۂ نار میں پہنچتا ہے تو یک دم ان کو آگ لگ جاتی ہے تو جب آگ لگتی ہے تو ہمیں ایک شعلہ سا نظر آتا ہے تو یہ حقیقت ہے شہاب ثاقب کی۔ لیکن قرآن وسنت میں جو شہاب ثاقب کی حقیت بیان کی گئی ہے بظاہر فلاسفہ کے اس قول کے خلاف ہے۔ اس لئے علماءِ اسلام نے اس توجیہ کو درست تسلیم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ یہ کہا کہ قرآن وسنت نے جو کہا وہ ٹھیک ہے اور فلاسفہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک وقت

ایسا تھا جس میں عقل پرست لوگ ان فلاسفہ کی بات پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لاتے تھے لیکن محدثین اور مفسرین نے یہ کہا کہ قرآن وسنت نے جو کچھ کہا ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور فلاسفہ کی بات کو ہم نہیں مانتے۔ چنانچہ فلاسفہ کے ہاں یہ جو کرے ہیں، کرہ زمہریر ہے، کرۂ نار ہے انہی پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاسکتی۔ دلیلیں جو دی ہیں میبذی وغیرہ میں بھی موجود ہیں لیکن یہ سارے ڈھکوسلے ہیں اور علماء اسلام ہمیشہ ان کی تردید کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آج خود ان کے خلفانے یعنی جدید سائنس دانوں نے بھی ان کے نظریات کا باطل ہونا ثابت کر دیا ہے۔ جدید تجربات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ان کے مذکورہ نظریات بالکل غلط تھے۔ چنانچہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر سیارے کے اندر ایک کششِ ثقل ہوتی ہے زمین کے اندر بھی ایک کشش ثقل ہے اس کی وجہ سے جو زمین کی چیزیں ہیں وہ زمین کی کششِ ثقل کے دائرے سے باہر نہیں نکلتیں اگر نکالنی ہوں تو آلات کے ذریعے انہیں نکالنا پڑتا ہے، وگرنہ وہ اسی دائرے کے اندر ہی رہتی ہیں اس سے نکلتی ہی نہیں ہیں۔ تو کسی اور کرہ میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر یہ جو کرے ہیں ان کا کہیں کوئی وجود ثابت نہیں ہو سکا۔ بلکہ عملی تجربات نے بتادیا کہ یہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ بات تجربات سے تو اب ثابت ہوئی لیکن علماء اسلام نے اپنے ایمان کی بنیاد پر یہ کہا تھا کہ فلاسفۂ یونان جو کہتے ہیں وہ باطل ہے ۔جدید سائنس شہاب ثاقب نظر آنے کی جو وجہ بیان کرتی ہے وہ قرآن وسنت کے نسبتاً زیادہ قریب ہے وہ وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں اجرام علویہ ہوتے ہیں جو اوپر کی فضا میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور جدید اصطلاح میں اس کو شہابیہ کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ تیز رفتاری سے ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان میں احتکاک ہوتا ہے اور اس احتکاک کی وجہ سے روشنی سی نظر آتی ہے یہ شہاب ثاقب کی حقیقت ہے۔ تو اصل یہی ہے کہ یہ فضا میں گھومنے والے اجسام ہیں اور ان کی تیز رفتاری اور احتکاک کی وجہ سے چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ تیز رفتاری کیوں ہوتی ہے تو عام حالات میں یہ طبعی اسباب کے ماتحت ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ آسمان کے روڑے ہیں یا کہئے کہ فضا کے روڑے ہیں جنہیں فرشتے اٹھا کر مارتے ہیں۔ جب زور سے مارتے ہیں تو مزید تیز رفتاری پیدا ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے بھی چمک پیدا ہوتی ہوگی۔ حاصل یہ کہ یہ چمک پیدا ہوتی ہے تیز رفتاری اور احتکاک کی

وجہ سے اور یہ تیز رفتاری اوراحتکاک کبھی طبعی اسباب کے ماتحت ہوتا ہے جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بھی ہوا کرتا تھا اور بعد میں بھی ہوتا ہے، اور کبھی فرشتوں کے ان کو شیاطین پر مارنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

عراف کے پاس جانے کا حکم

(٤) وَعَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ له صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ لَيْلَة» . رواه مسلم.

حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کسی عراف کے پاس آئے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں سوال کرے تو اس کی چالیس راتوں تک نماز قبول نہیں ہوتی۔

یہ حدیث نافع روایت کرتے ہیں صفیہ (بنت أبی عبید) سے اور وہ روایت کرتی ہیں ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک سے، لیکن ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کی صفیہ نے تعیین نہیں کی، البتہ بعض راویوں کا اندازہ ہے کہ مراد ام المؤمنین حضرت حفصہؓ ہیں، اس لئے یہاں صاحبِ مشکوۃ نے عن حفصۃ کہہ کر حدیث نقل کی ہے۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ اس حدیث کی روایتیں دو طرح کی ہیں، بعض میں کاہن کی تصدیق کرنے کی قید کا اضافہ ہے، یعنی یہ وعید تب ہے جبکہ وہ کاہن کی یا عراف کی تصدیق بھی کرے، جیسا کہ امام احمد نے یحیی سے یہ روایت اسی اضافے کے ساتھ نقل کی ہے، دوسری روایت وہ ہے جس میں تصدیق کرنے کی قید نہیں، جیسا کہ یہاں صحیح مسلم کے حوالے سے روایت میں ہے، امام مسلم نے یہی روایت محمد بن المثنی کے واسطے سے یحیی سے نقل کی ہے، اور محدثین کا اصول ہے کہ زیادتِ ثقہ مقبول ہوتی ہے اس لئے امام احمد وغیرہ کی روایت میں جو شرط ہے وہ قابلِ قبول ہوگی، اس کے مطابق عراف کے پاس آنے سے مراد اس کی تصدیق کرنا ہے، اگر اس کی تصدیق نہیں کی ویسے کوئی

بات صرف پوچھ لی تو اس پر اتنی شدید وعید تو نہیں ہے لیکن ایک لایعنی، فضول اور مفاسد پر مشتمل کام پھر بھی ہے اور جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا۔

بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کرنا ناشکری ہے

(٥) وَعَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ الْجُهَنِيِّ قَالَ: صَلَّى لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاةَ الصُّبْحِ بِالْحُدَيْبِيَةِ عَلَى أَثَرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ ، فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ: «هَلْ تَدْرُونَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُم؟» قَالُوا: اللّٰهُ وَرَسُولُه أَعْلَمُ. قَالَ: «أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِيْ وَكَافِرٌ ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذَلِكَ مُؤْمِنٌ بِي كَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذَلِكَ كَافِرٌ بِيْ وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ». متفق عليه

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ میں فجر کی نماز پڑھائی ایک بارش کے بعد جو کہ رات کے وقت ہوئی تھی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ میرے بندوں میں سے بعض مجھ پر ایمان لانے والے ہو گئے اور بعض کفر کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہم پر بارش ہوئی ہے اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کی وجہ سے تو یہ مجھ پر ایمان لانے والے اور ستارے کا انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہم پر فلاں برج کی وجہ سے بارش ہوئی ہے تو یہ میرے ساتھ کفر کرنے والے اور ستارے پر ایمان لانے والے ہیں۔

نوء کی جمع انواء آتی ہے، یہ اصل میں منازلِ قمر یعنی چاند کی منازل کو کہتے ہیں۔ عربوں میں یہ تصورات پائے جاتے تھے کہ جب فلاں ستارہ فلاں منزل پر پہنچے گا تو بارش ہو جائے گی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید فرمائی اور یہ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح کہتے ہیں وہ اللہ کا انکار کرتے ہیں اور ستارے پر ایمان لاتے ہیں اور جو یہ کہتے ہیں کہ بارش اللہ کے فضل اور رحمت سے ہوئی وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور ستارے کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

اس حدیث میں بارش کی نسبت ستاروں کی طرف کرنے والوں کے لئے کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا کیا مطلب ہے۔ اس میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ یہاں کفر سے مراد کفرانِ نعمت یعنی ناشکری ہے، کہ بارش تو اللہ تعالی عطا فرماتے ہیں لیکن یہ لوگ اللہ کا شکر بجالانے کی بجائے اور چیزوں کا نام لینا شروع کر دیتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہاں کفر کے معروف مراد لئے ہیں، اس صورت میں اس حدیث کے اطلاق میں یہ تفصیل ہو گی کہ یہ بات کہنا کہ ہمیں ستاروں سے بارش ملی ہے دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ کہ اس ستارے کو بارش ہونے میں مؤثر بالذات سمجھا جائے اور یہ مطلب ہو کہ بارش برساتا ہی خاص ستارہ یا خاص برج ہے تو یہ واقعتاً کفر اور شرک ہے، اور اگر اسے مؤثر بالذات نہ سمجھا جائے بلکہ صرف علامت کے طور پر سمجھا جائے تو یہ شرک تو نہیں ہے لیکن یہ چونکہ عام اسباب طبعیہ کے اندر داخل نہیں ہے اس لئے توہم پرستی ضرور ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے، نیز اس زمانے میں اس باب کے کہنے میں مشرکین کے ساتھ تشبہ بھی تھا، اس لئے یہ حقیقی معنی میں کفر تو نہیں ہو گا لیکن کافروں والی بات ضرور ہو گی۔ اس کے علاوہ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ نوء در حقیقت خاص وقت ہی ہوتا ہے جب چاند خاص منزل میں ہوتا ہے، اس لئے اس نوء کا حوالہ دینے کی بجائے اگر یوں کہا جائے کہ فلاں وقت بارش ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

بارش کی نعمت اور لوگوں کی ناشکری

(٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَا أَنْزَلَ اللهُ

مِنَ السَّمَاءِ مِنْ بَرَكَةٍ إِلَّا أَصْبَحَ فَرِيقٌ مِنَ النَّاسِ بِهَا كَافِرِينَ يُنْزِلُ اللهُ الْغَيْثَ فَيَقُولُونَ: بِكَوْكَبِ كَذَا وَكَذَا». رواه مسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے جو برکت یعنی بارش بھی نازل فرماتے ہیں تو اس کے بارے میں لوگوں کا ایک گروہ کفر اختیار کرنے والا ہو جاتا ہے کہ بارش تو اللہ تعالیٰ اتارتے ہیں اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔

الفصل الثانی

(۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنِ اقْتَبَسَ عِلْمًا مِنَ النُّجُومِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ، زَادَ مَا زَادَ» . رواه أحمد وأبو داود وابن ماجه.

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے علم نجوم کا ایک حصہ حاصل کیا اس نے جادو کا ایک شعبہ حاصل کیا، جتنا اس میں اضافہ ہو گا جادو میں اضافہ ہو گا۔

نجوم کا علم الگ چیز ہے اور جادو گری بالکل الگ چیز ہے۔ یہاں یہ مقصود نہیں کہ علم نجوم علم سحر ہے، بلکہ فرمانے کا مقصد علمِ نجوم کو جادو کے علم کے ساتھ تشبیہ دینا ہے، یہ تشبیہ کس بات میں ہے، اس میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ ان کے حکمِ شرعی میں تشبیہ دینا مقصود ہے یعنی حکم کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ جس طرح جادو ناجائز ہے اس میں اشتغال ناجائز ہے، اسی طریقے سے ستاروں میں اشتغال بھی ناجائز ہے۔ لیکن حکم میں مشارکت کی وجہ بھی کسی

وصف میں مشابہت ہی ہو گی، نجوم اور سحر میں وہ مشترکہ وصف کیا ہے، اس کے بارے میں شارحین کے ہاں کوئی واضح بات نہیں مل سکی، اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں علمِ نجوم کا دعوی کرنے والے بھی کاہنوں کی طرح غیر مرئی طاقتوں سے رابطے کے دعوے دار ہوتے ہوں گے، اس طرح سے اس وقت کا علمِ نجوم کہانت کی طرح ہو گیا، اور یہ بات تمہیدی گفتگو میں گذر چکی ہے کہ کاہن، ساحر اور شاعر میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں ان تینوں کے بارے میں تصور یہ تھا کہ انہیں غیبی طاقتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس زمانے کا نجوم کہانت کے مشابہ تھا اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اگلی فصل میں رزین کے حوالے سے اسی مضمون کی جو حدیث ابن عباسؓ سے آرہی ہے اس میں یہ لفظ بھی ہیں المنجم کاهن والكاهن ساحر، اسی طرح سے قتادہ کے قول میں یہ بات آرہی ہے کہ یہ اصل میں تو اللہ پر افترا باندھتے ہیں اور ستاروں کو بہانہ بناتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ستاروں کو مستقبل کے حالات جاننے کے لئے محض علامت کے طور پر استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ ان کا اصل مقصود غیب دانی کا دعوی کرنا ہوتا تھا، اس بات میں کاہنوں کے ساتھ ان کی مشابہت واضح ہے۔

اس صورت میں اس حدیث کی وعید میں وہ صورت براہِ راست شامل نہیں ہو گی جس میں ستاروں اور سیاروں کے حالات کو محض علامت کے طور مانا جائے، تمہیدی مباحث کے دوران حاشیے میں تفسیر مظہری اور علامہ شامی کے اقتباس گذر چکے ہیں انہیں بھی دوبارہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

(٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ أَتَى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ أَوْ أَتَى امْرَأَتَهُ حَائِضًا أَو أَتَى امْرَأَته من دُبُرِهَا فَقَدْ بَرِئَ مِمَّا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ» . رواه أحمد وأبو داود

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اس بات کی تصدیق کی جو وہ کہتا ہے یا اپنی بیوی سے حالتِ حیض میں جماع کیا یا اپنی

بیوی سے پیچھے کے مقام میں ہمبستری کی تو وہ گویا بری ہو گیا ان تعلیمات سے جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہیں۔

الفصل الثالث

(٩) عَن أبي هُرَيْرَة أَنَّ نَبِيَّ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِذَا قَضَى اللهُّ الْأَمْرَ فِي السَّمَاءِ ضَرَبَتِ الْمَلَائِكَةُ بِأَجْنِحَتِهَا خُضْعَانًا لِقَوْلِهِ كَأَنَّهُ سِلْسِلَةٌ عَلَى صَفْوَانٍ ، فَإِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قَالُوا: مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟ قَالُوا لِلَّذِي قَالَ : الْحَقَّ وهوَ العليُّ الْكَبِيْرُ ، فَسَمِعَهَا مُسْتَرِقُوا السَّمْعِ ، وَمُسْتَرِقُوا السَّمْعِ هَكَذَا : بَعْضُهُ فَوْقَ بَعْضٍ ـ وَوَصَفَ سُفْيَانُ بِكَفِّهِ فَحَرَّفَهَا وَبَدَّدَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ـ فَيَسْمَعُ الْكَلِمَةَ فَيُلْقِيهَا إِلَى مَنْ تَحْتَهُ ، ثُمَّ يُلْقِيهَا الْآخَرُ إِلَى مَنْ تَحْتَهُ ، حَتَّى يُلْقِيَهَا عَلَى لِسَانِ السَّاحِرِ أَوِ الْكَاهِنِ. فَرُبَّمَا أَدْرَكَ الشِّهَابُ قَبْلَ أَنْ يُلْقِيَهَا، وَرُبَّمَا أَلْقَاهَا قَبْلَ أَنْ يُدْرِكَهُ ، فَكَذَبَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ ، فَيُقَالُ: أَلَيْسَ قَدْ قَالَ لَنَا يَوْمَ كَذَا وَكَذَا: كَذَا وَكَذَا؟ فَيُصَدَّقُ بِتِلْكَ الْكَلِمَةِ الَّتِي سُمِعَتْ مِنَ السَّمَاءِ». رواه البخاري

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کوئی فیصلہ صادر فرماتے ہیں تو فرشتے اپنے پر مارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے سامنے تواضع ظاہر کرنے کے لئے۔ اور ان پروں کی آواز ہوتی ہے جیسا کہ کسی صاف پتھر پر کوئی زنجیر کھینچی جائے ۔ اور جب ان (فرشتوں) کے دلوں سے ہیبت کی خاص کیفیت دور ہوتی ہے تو یہ آپس میں کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا، تو وہ فرشتے دوسرے فرشتوں سے اس چیز کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے کہی

ہوتی ہے یہ کہتے ہیں کہ وہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بڑے ہیں۔ تو اس بات کے اچکنے والے سن لیتے ہیں اور بات کو اچکنے والے اس طرح سے ہوتے ہیں کہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہوتے ہیں ۔اور سفیان نے اس منظر کو اپنی ہتھیلی کے ذریعے بیان کیا اس طریقے سے کہ ہتھیلی کو ٹیڑھا کیا اور اپنی انگلیوں کے درمیان فاصلہ کیا (کہ جس طرح ان انگلیوں کے درمیان فاصلہ ہے اور یہ اوپر نیچے ہیں اس طریقے سے یہ ذرا فاصلے فاصلے سے یہ شیاطین بھی اوپر نیچے ہوتے ہیں)۔ اوپر والا کسی بات کو سنتا ہے اور اس کا القا اپنے نیچے والے کی طرف کرتا ہے اور پھر یہ دوسرا اپنے نیچے والے کو یہ بات بتاتا ہے یہاں تک کہ آخری شیطان وہ بات جادو گر یا کاہن کی زبان پر القا کرتا ہے۔ تو بعض اوقات تو شہاب ثاقب لگ جاتا ہے قبل اس کے کہ وہ اپنے سے نیچے والے کو بات بتائے، اور کبھی وہ نیچے والے کو بات بتا چکا ہوتا ہے قبل اس کے کہ اس کو شہاب ثاقب لگے۔ تو وہ ان کے ساتھ سو جھوٹ اپنے پاس سے ملا لیتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کیا اس نے ہمیں فلاں فلاں دن فلاں فلاں بات نہیں کہی تھی۔ تو اس ایک آدھ بات کی وجہ سے اس کی تصدیق کی جاتی ہے جو کہ آسمان سے سنی گئی ہوتی ہے۔

اس میں جو فرمایا کہ سو جھوٹ ملا دیتا ہے یہاں سو کا عدد تحدید کے لئے نہیں، بلکہ تکثیر کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ جھوٹ ملا لیتا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ کیا اس نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں بات نہیں کہی تھی مطلب یہ کہ اِکا دُکا بات سچ ہوتی ہے تو اس کی تشہیر ہو جاتی ہے اور جو باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں ان کی تشہیر نہیں ہوتی۔

(۱۰) وَعَنِ ابْنِ عبَّاسٍ قَالَ: أَخْبَرَنِي رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْأَنْصَارِ: أَنَّهُمْ بَيْنَا جُلُوسٌ لَيْلَةً مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُمِيَ بِنَجْمٍ وَاسْتَنَارَ ، فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا كُنْتُمْ تَقُولُونَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ إِذَا رُمِيَ بِمِثْلِ هَذَا؟» قَالُوا: ـ اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ ـ كُنَّا

نَقُولُ: وُلِدَ اللَّيْلَةَ رَجُلٌ عَظِيمٌ وَمَاتَ رَجُلٌ عَظِيمٌ ، فَقَالَ رَسُولُ اللهَّ صَلَّى اللهَّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَإِنَّهَا لَا يُرْمَى بِهَا لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ ، وَلَكِنَّ رَبَّنَا تَبَارَكَ اسْمُهُ إِذَا قَضَى أَمْراً سَبَّحَ حَمَلَةُ الْعَرْشِ ، ثُمَّ سَبَّحَ أَهْلُ السَّمَاءِ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ، حَتَّى يَبْلُغَ التَّسْبِيحُ أَهْلَ هَذِهِ السَّمَاء الدُّنْيَا ، ثمَّ قَالَ الَّذِيْنَ يَلُوْنَ حَمَلَةَ الْعَرْشِ لِحَمَلَةِ الْعَرْشِ: مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟، فَيُخْبِرُونَهُمْ مَا قَالَ، فَيَسْتَخْبِرُ بَعْضُ أَهْلِ السَّمَاوَاتِ بَعْضًا حَتَّى يَبْلُغَ هَذِهِ السَّمَاءَ الدُّنْيَا ، فَيَخْطَفُ الْجِنُّ السَّمْعَ فَيَقْذِفُونَ إِلَى أَوْلِيَائِهِمْ وَيُرْمَوْنَ ، فَمَا جاؤوا بِهِ عَلَى وَجْهِهِ فَهُوَ حَقٌّ ، وَلَكِنَّهُمْ يَقرِفُونَ فِيهِ وَيزِيدُونَ». رواه مسلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ انصار میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مجھے بتایا کہ وہ ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ستارہ ٹوٹا اور وہ چمکا تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جب اس طرح کا ستارہ ٹوٹتا تھا تو تم زمانۂ جاہلیت میں کیا کہا کرتے تھے۔انہوں نے عرض کیا کہ - اصل حقیقت تو اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں -ہم یہ کہا کرتے تھے کہ آج رات کسی بڑے آدمی کی ولادت ہوئی ہے اور کوئی بڑا آدمی فوت ہوا ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ستارہ نہ تو کسی کی موت کی وجہ سے ٹوٹتا ہے اور نہ ہی کسی کی پیدائش کی وجہ سے، بلکہ ہمارے رب تبارک وتعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ صادر فرماتے ہیں تو عرش کو اٹھانے والے فرشتے تسبیح کہتے ہیں پھر اس آسمان والے تسبیح کہتے ہیں جو کہ عرش کے نیچے ہے یہاں تک کہ یہ تسبیح اس آسمانِ دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔پھر وہ فرشتے جو کہ عرش اٹھانے والے فرشتوں کے قریب ہوتے ہیں وہ عرش اٹھانے والے فرشتوں سے کہتے ہیں کہ تمہارے رب نے کیا کہا؟تو وہ عرش والے فرشتے ان کو بتاتے ہیں جو بات اللہ تعالیٰ نے کہی ہوتی ہے تو بعض آسمانوں والے بعض سے ان کے بارے پوچھتے ہیں

یہاں تک یہ خبر اس آسمانِ دنیا تک پہنچ جاتی ہے تو جن اس سنی ہوئی بات کو اچک لیتے ہیں اور وہ اپنے اولیا کی طرف پہنچا دیتے ہیں ان شیاطین کو رجم کر دیا جاتا ہے۔ تو (یہ کاہن) جو بات سنی ہوئی کے مطابق لے آئیں وہ تو درست ثابت ہوتی ہے لیکن عموماً یہ اس میں جھوٹ ملا دیتے ہیں اور اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے ہیں ۔

(۱۱) وَعَن قتادةَ قَالَ: خلقَ اللهُّ تَعَالَى هَذِه النجومَ لثلاثٍ جَعَلَهَا زِينَةً لِلسَّمَاءِ وَرُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ وَعَلَامَاتٍ يُهْتَدَى بِهَا ، فَمن تأوَّلَ فِيهَا بِغَيْرِ ذَلِكَ أَخطَأَ وَأَضَاعَ نَصِيبَهُ وَتَكَلَّفَ مَالا يَعْلَمُ. رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ تَعْلِيقًا ، وَفِي رِوَايَةِ رَزِينٍ: «تكلّف مَالا يعنيه ومالا عِلْمَ لَهُ بِهِ وَمَا عَجَزَ عَنْ عِلْمِهِ الْأَنْبِيَاء وَالْمَلَائِكَة» وَعَن الربيعِ مِثْلُهُ وَزَادَ: وَاللهِّ مَا جَعَلَ اللهُّ فِي نَجْمٍ حَيَاةَ أَحَدٍ وَلَا رِزْقَهُ وَلَا مَوْتَهُ وَإِنَّمَا يَفْتَرُونَ عَلَى اللهِّ الْكَذِبَ وَيَتَعَلَّلُونَ بِالنُّجُومِ.

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو تین مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے ایک تو انہیں آسمان کے لئے باعث زینت بنایا ہے، دوسرے شیاطین کو رجم کرنے کا ذریعہ بنایا ہے اور تیسرے انہیں ایسی علامتیں بنایا ہے جن سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ تو جو آدمی ان کا مقصد ان کے علاوہ کوئی اور بیان کرے تو اس نے غلطی کی اور (زندگی میں سے) اس نے اپنا یہ حصہ ضائع کر دیا، اور وہ ایسی چیز کے پیچھے پڑ گیا جس کو وہ جان نہیں سکتا۔ اتنی بات تو بخاری نے تعلیقاً (بغیر سند) نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ رزین کی روایت میں کچھ اور الفاظ بھی ہیں کہ قتادہ نے کہا کہ یہ شخص ایسی چیز کے پیچھے پڑ گیا جو اس کے کسی کام کی نہیں ہے اور جس کا علم اسے حاصل نہیں ہو سکتا اور جس کو جاننے سے انبیا اور فرشتے بھی عاجز ہیں۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اللہ کی

قسم اللہ تعالیٰ نے کسی ستارے کے اندر نہ تو کسی کی زندگی رکھی ہے نہ ہی اس کا رزق اور نہ ہی اس کی موت بلکہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ گڑھتے ہیں اور ستاروں کو بہانہ بناتے ہیں۔

(۱۲) وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنِ اقْتَبَسَ بَابًا مِنْ عِلْمِ النُّجُومِ لِغَيْرِ مَا ذَكَرَ اللّٰهُ فَقَدِ اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحْرِ الْمُنَجِّمُ كَاهِنٌ والكاهنُ ساحرٌ والساحرُ كافرٌ» . رَوَاهُ رزين

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو علمِ نجوم کا کوئی باب حاصل کرے اس مقصد کے علاوہ کے لئے جس کا اللہ نے ذکر فرمایا ہے تو اس نے جادو کا ایک شعبہ حاصل کیا۔ نجومی کاہن ہوتا ہے اور کاہن جادوگر کے حکم میں ہوتا ہے اور جادوگر کافر ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ ہی کی اس مضمون کی ایک حدیث نمبر ۸ پر گذر چکی ہے، اس کی تشریح وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

(۱۳) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَوْ أَمْسَكَ اللّٰهُ الْقَطْرَ عَنْ عِبَادِهِ خَمْسَ سِنِينَ ثُمَّ أَرْسَلَهُ لَأَصْبَحَتْ طَائِفَةٌ مِنَ النَّاسِ كَافِرِينَ يَقُولُونَ: سُقِينَا بِنَوْءِ الْمِجْدَحِ». رواه النّسائي

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پانچ سال تک بارش روک رکھیں پھر بارش نازل کریں تب

بھی لوگوں کی ایک جماعت ناشکری کرنے والی ہوگی اور یہ کہیں گے کہ ہمیں مجدح ستارے کی وجہ سے بارش ملی ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ آدمی جب تکلیف اور تنگی میں دیر تک مبتلا رہتا ہے تو اس کا دماغ ٹھکانے آجاتا ہے اور کفر و شرک کو بھول جاتا ہے، لیکن بعض لوگ کفریہ یا ناشکری کی باتوں پر اتنے پکے ہوتے ہیں کہ اگر پانچ سال تک بھی بارش نہ ہو اور پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل کریں تو بھی یہی کہیں گے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔ حالانکہ وہ ستارہ پانچ سال تک کہاں رہا تھا۔ اگر وہ مؤثر ہے تو پہلے بھی بارش ہونی چاہئے تھی۔ پتہ چلا کہ اصل میں بارش اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ پانچ سال تک اللہ کی مشیت بارش کی نہیں ہوئی تھی اس لئے بارش نہیں ہوئی اب اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ بارش ہو اس لئے بارش ہو گئی۔

کتاب الرؤیا

کتاب الرؤیا

مقدمہ

اس باب کی احادیث دیکھنے سے پہلے خوابوں کے بارے میں چند اصولی باتیں ذہن میں رکھ لینا مناسب ہے۔

خواب کی حقیقت:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خواب کی حقیقت کیا ہے اس کے بارے میں فلاسفہ ہر دور میں حیران اور سر گرداں رہے ہیں اور کوئی ایسی واضح بات نہیں کہی جا سکی جس کا ہر قسم کے خواب پر انطباق ہو سکے مثلاً بعض نے یہ کہا کہ اصل میں نیند کی حالت میں عالم بالا اور اجرام علویہ کا انسان کے دماغ پر عکس وارد ہو جاتا ہے اور اس عکس کی وجہ سے انسان بہت ساری ایسی چیزیں معلوم کر لیتا ہے اور بعض مستقبل کے واقعات کو جان جاتا ہے جنہیں جاگتے ہوئے نہیں جان سکتا لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اولاً تو کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے دوسرے یہ کہ یہ صرف ان خوابوں پر منطبق ہوتی ہے جن میں بعض واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہوتا ہے لیکن سارے خواب ایسے نہیں ہوتے۔

بعض نے یہ کہا کہ اصل میں انسان کے دماغ میں اور لاشعور یا تحت الشعور میں بہت ساری خواہشات اور خیالات دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن کا جاگتے ہوئے آدمی اظہار مناسب نہیں سمجھتا یا کسی وجہ سے اظہار کرنا نہیں چاہتا۔ کوئی چیز کھانے کو دل چاہ رہا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا اس لئے کہ اظہار کرنا مناسب نہیں لگتا۔ یا اس طرح کی اور بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں کہ خلافِ عقل ہونے کی وجہ سے انسان ان کا اظہار نہیں کرتا تو عقل کی وجہ سے یہ خواہشات اور یہ خیالات دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن جب آدمی سوتا ہے تو دماغ کا کنٹرول اور شعور کی گرفت انسان کے دماغ پر ذرا کمزور ہو جاتی ہے اس لئے وہی خیالات اور خواہشات بروئے کار آ جاتے ہیں اور انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ

یہ واقعات پیش آرہے ہیں میں فلاں چیز کھارہاہوں یافلاں کام کررہاہوں یافلاں جگہ جارہاہوں یافلاں سے مل رہاہوں وغیرہ وغیرہ۔

ایک احتمال یہ ہے کہ جس طریقے سے بعض جانوروں کے اندر واقعات کے پیشگی ادراک کی اللہ تعالیٰ نے صلاحیت رکھی ہوتی ہے، خاص حس ان کے اندر ہوتی ہے، مثلاًبعض جانوروں کوزلزلہ آنے سے پہلے اندازہ ہوجاتاہے، بعض جانوروں کو بارش سے پہلے پتا چل جاتاہے کہ بارش ہونے والی ہے۔ہوسکتاہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بھی اس طرح کی کوئی حس رکھی ہولیکن وہ حس جاگتے ہوئے کام نہیں کرتی نیند کی حالت میں کام کرتی ہے۔جاگتے ہوئے دوسرے حواس اوران کے آثار کاانسان کے دماغ پر غلبہ ہوتاہے اس لئے یہ حس دب کررہ جاتی ہے۔لیکن نیند کی حالت میں باقی حواس سارے کے سارے چونکہ معطل ہوتے ہیں اس لئے یہ حس بروئے کارآجاتی ہے اوراس کی وجہ سے بہت سارے واقعات کاپیشگی پتہ چل جاتاہے۔بعض لوگوں کی یہ حس تیزہوتی ہے اور بعض کی اتنی تیز نہیں ہوتی اس لئے بعض لوگوں کے خواب سچے ہوتے ہیں اور بعض کے خواب اتنے سچے نہیں ہوتے۔بہرحال خواب کی جوبھی حقیقت ہو یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک فلسفی بحث ہے جس کاعمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے،اس لئےاس بحث کی زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

خواب اور جدید سائنس:

جدید سائنس نے بھی خوابوں پر کافی تحقیق کی ہے، لیکن بہت سے سوالات کاابھی تک حتمی جواب دریافت نہیں ہوا۔اتنی بات پر عموماًسائنس دانوں میں اتفاق پایاجاتاہے کہ زیادہ خواب نیند کےایک خاص مرحلے میں آتے ہیں ۔نیند کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ،ایک مرحلہ کہلاتا ہے synchronized sleep, or NREM-sleep (non-rapid-eye-movement sleep) نیند کا زیادہ تر حصہ اسی نوع پر مشتمل ہوتاہے،اس مرحلے میں اعصابی نظام غیرفعال ہوتاہے،اس مرحلے میں خواب بہت کم نظرآتے

ہیں۔ دوسرا مرحلہ کہلاتا ہے desynchronized, sleep), or REM-sleep (rapid-eye-movement sleep) یعنی وہ مرحلہ جس میں آنکھ کی حرکت کی رفتار ذرا تیز ہوتی ہے۔اس مرحلے میں خود کار اعصابی نظام فعال ہوتا ہے اور زیادہ تر خواب اسی مرحلے میں آتے ہیں۔ خواب کا دورانیہ چند سیکنڈز سے لے کر بیس منٹ تک ہوتا ہے۔خوابوں کے بارے میں یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ان میں حواسِ خمسہ میں سے سب سے زیادہ استعمال قوتِ باصرہ یعنی دیکھنے کی حس کا ہوتا ہے۔اس سے بہت کم خواب خالی ہوتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر سننے کے حاسہ کا استعمال ہوتا ہے۔ دیگر حواس کا استعمال بہت نادر ہوتا ہے۔ یعنی خواب میں زیادہ تر چیزیں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں، سونگھی، چکھی یا چھوئی نہیں جاتیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربی زبان میں جو خواب کے لئے لفظ استعمال ہوتا ہے وہ 'رُؤیا' کا ہے جو رؤیت سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہوتے ہیں یہ نام کتنا درست اور واقعہ کے مطابق ہے۔

خواب کے کوئی معنی اور اس کی تعبیر بھی ہوتی ہے یا نہیں؟اس بارے میں سائنس دانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سائنس دانوں کی ایک رائے یہ ہے کہ خواب کا معنی یا اس کی تعبیر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ نقطۂ نظر نہ صرف یہ کہ اسلام سمیت تمام مذاہب کی تصریحات کے خلاف ہے بلکہ واضح انسانی مشاہدے اور تجربے کے بھی خلاف ہے۔اس لئے کہ تقریباً ہر انسان کو اس طرح کی صورتِ حال سے واسطہ پڑتا ہے کہ وہ خواب میں کوئی چیز ہوتے دیکھتا ہے اور واقعہ میں بھی وہ کام ویسے ہی ہو جاتا ہے جیسے اس نے خواب میں دیکھا ہوتا ہے۔ یہ بات ضرور درست ہے کہ سائنس خواب کی تعبیر کے اصول دریافت نہیں کر سکی۔ لیکن جس چیز کو سائنس دریافت نہ کر سکی ہو اس کے وجود ہی کا انکار کر دینا یقیناً غلط ہے۔ وگرنہ یہ کہنا پڑے گا کہ جو سیارے آج کے سائنس دانوں نے دریافت کئے ہیں وہ ان کی دریافت سے پہلے موجود ہی نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بالکل خلافِ واقعہ ہے۔اس لئے سائنس کی دریافت سے پہلے بھی یہ سیارے موجود تھے۔اس سے ثابت ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ کوئی حقیقت موجود تو ہو لیکن سائنس اسے دریافت نہ کر سکی ہو۔

خواب کی شرعی حیثیت:

خواب کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟اس کے بارے میں لوگ عموماًافراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ بعض لوگ توایسے ہیں جو خوابوں کے سرے سے منکر ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ توہم پرستی کی ایک دنیاہے جس کا حقیقت اور واقعہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور بعض لوگ اس کے برعکس خواب ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور خوابوں کی دنیاکواپنی جیتی جاگتی دنیاسے بھی زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ایک آدمی کے بارے میں واضح طور پر پتاہے کہ یہ بہت نیک اور شریف انسان ہے، جیتے جاگتے قرائن اور شواہداس کی نیکی اوراس کی شرافت کے موجود ہیں، لیکن ایک خواب دیکھ لیا جس میں اس کی کوئی غلط حالت نظر آرہی تھی تو جیتی جاگتی دنیاکے یہ سارے شواہداس کی نظر میں کالعدم ہو جائیں گے اور وہ خواب ان سب پر بھاری ہو گا۔ تو بعض لوگ خواب کواتنی زیادہ اہمیت بھی دیتے ہیں۔ یہ دونوں طرزِ فکرانتہاپسندی میں داخل ہیں اور اصل حقیقت ان دونوں کے درمیان میں ہے۔ یہ کہنا کہ خوابوں کی سرے سے کوئی حقیقت ہی نہیں ہے یہ تجربے کے بھی خلاف ہے اور نصوصِ شرعیہ کے بھی خلاف ہے ۔اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا پوری انسانیت کا تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ بہت سارے انسانوں کو بہت ساری ایسی باتوں کا خوابوں کے ذریعے سے پتا چل جاتاہے جن کا جاگتے ہوئے انسان کو پتا نہیں چلتا۔اس طرح کے خواب تقریباًہر انسان کو آتے ہیں ،ہر قوم کے اور ہر مذہب کے لوگوں کو آتے ہیں ۔اس لئے یہ کہنا کہ خواب بالکل بے حقیقت چیز ہے اور انسان کے تخیلات ہی کا نتیجہ ہے یہ ایک بہت بڑے عمومی انسانی تجربے کو جھٹلانے کے مترادف ہے ۔اسی طرح یہ نقطۂ نظر نصوص کے بھی خلاف ہے کیونکہ نصوص سے پتا چلتاہے کہ خوابوں کی کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھااور بڑی عمر میں اس کی تعبیر ظاہر ہوئی اور یہ بات قرآن کریم نے نقل کی ہے۔ ھذاتاویل رؤیای من قبل توپتا چلا کہ خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے۔اسی طرح قرآن کریم نے یہ بھی بتلایا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو خوابوں کی تعبیر کا خصوصی علم دیا گیا تھاولنعلمه من تاویل الاحادیث۔قرآن کریم ہی میں یہ بھی ہے کہ حضرت یوسف

علیہ السلام نے جیل کے دو ساتھیوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتائی تھی۔احادیث تو اس کے بارے میں بہت زیادہ ہیں۔ مثلاً حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت میں سے صرف مبشرات باقی ہیں اور مبشرات کی تشریح آپ نے رؤیا صالحہ سے فرمائی۔اسی طرح حضور اقدس ﷺ نے خوابوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے اور ایسی احادیث تو بہت زیادہ ہیں جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف خوابوں کی تعبیریں بیان فرمائیں یا اپنے خواب صحابہ کے سامنے ذکر کئے۔ان سے پتا چلتا ہے کہ خوابوں کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔

خواب جزو نبوت ہے:

یہاں یہ بحث قابل ذکر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خوابوں کو جزو نبوت قرار دیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ تو اس کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں، مثلاً ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو جن ذرائع سے علم حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک خواب بھی ہے۔انبیا کو اور بھی مختلف ذرائع سے علم حاصل ہوتا ہے لیکن خواب کے ذریعے سے بھی ان کو علم حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی قطعی ہوتا ہے جبکہ عام آدمی کو خواب کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ خوابوں کو نبوت کے ساتھ ایک خاص اور گہری مناسبت ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ نبوت کی حقیقت اطلاع علی المغیبات ہے یعنی جن باتوں کا حواس سے اور عام بداہتِ عقل سے ادراک نہیں ہوتا نبی کو اور نبی کے ذریعے دوسرے لوگوں کو ان کا پتا چل جاتا ہے۔ نبی نے بتایا جنت ہے، نبی نے بتایا دوزخ ہے، نبی نے بتایا کہ جنت میں یہ کچھ ہے، نبی نے بتایا کہ دوزخ میں یہ کچھ ہے، نبی نے بتایا کہ پل صراط ہے، میدانِ محشر ہے، فلاں کاموں سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، فلاں سے ناراض ہوتے ہیں یہ ساری کی ساری چیزیں مغیبات میں داخل ہیں۔ باقی بہت سارے انسانی خصائص میں نبی اور غیر نبی میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہوتا نبی بھی کھاتا پیتا ہے عام انسان بھی کھاتا پیتا ہے نبی کو بھی نیند آتی ہے عام انسان کو بھی نیند آتی ہے۔عام انسان بھی تھک جاتا ہے نبی بھی تھک جاتا ہے ان چیزوں میں بھی

نبی میں اور عام انسانوں میں بعض فرق ہوتے ہیں لیکن بنیادی فرق نہیں۔بنیادی فرق یہ ہے کہ اللہ ل جلالہ نبی کو جو اطلاع علی المغیبات دیتے ہیں وہ عام انسان کو حاصل نہیں ہوتی تو نبوت کی بنیادی خصوصیات اطلاع علی المغیبات ہے۔اور یہ چیز کسی نہ کسی درجے میں خوابوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ خواب کے ذریعے بھی انسان کو بعض مغیبات کا پتا چل جاتاہے بعض مغیبات پر اطلاع حاصل ہو جاتی ہے۔کل کو کیا ہو گا؟ بعض اوقات خواب کے ذریعے پتا چل جاتاہے۔فلاں شخص آپ کے بارے میں کیا نیتیں اور کیا ارادے رکھتاہے ویسے پتا نہیں چلتا لیکن بعض اوقات خواب کے ذریعے پتا چل جاتاہے۔فلاں آدمی آج کل کہاں ہے اور کیا کر رہاہے ویسے بعض اوقات پتا نہیں چلتا لیکن خواب کے ذریعے پتا چل جاتاہے تو اس اعتبار سے خوابوں کو نبوت کے ساتھ ایک خاص مناسبت حاصل ہے۔البتہ یہ بات ضرور ہے کہ نبی کی اطلاع علی المغیبات میں اور عام انسان کو خواب کے ذریعے جو اطلاع علی المغیب ہوتی ہے اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہ نبی کو جو اطلاع ہوتی ہے وہ قطعی ہوتی ہے اور خواب کے ذریعے عام آدمی کو جو اطلاع ہوتی ہے وہ ظنی اور بعض اوقات وہمی ہوتی ہے۔اس میں شکوک وشبہات کے بہت سارے پہلو ہوتے ہیں جو آگے ہم بیان کریں گے۔اسی وجہ سے نبی کو جو اطلاع علی المغیب ہوتی ہے وہ حجت شرعیہ ہوتی ہے اور عام انسان کو خواب کے ذریعے جو اطلاع علی المغیب ہوتی ہے وہ حجت شرعیہ نہیں ہوتی۔تو اگرچہ نبوت اور اس اطلاع علی المغیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن بذاتِ خود اطلاع علی المغیب میں دونوں مشترک ہیں اس لئے خوابوں کو جزوِ نبوت قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ انبیا کو جو علوم دیئے جاتے ہیں ان میں سے ایک علم خوابوں کی تعبیر کا بھی ہے۔اگرچہ یہ شرعی علم نہیں بلکہ تکوینی علم ہے لیکن بہر حال انبیا کو یہ علم بھی عطا کیا جاتاہے تو اس لحاظ سے یہ علومِ نبوت کا ایک جزء ہے۔نبوت کا جز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علومِ نبوت کا ایک جز ہے جیسے نماز کے احکام علومِ نبوت کا ایک جز ہے۔زکوٰۃ کے احکام علومِ نبوت کا ایک جز ہیں۔اسی طرح خوابوں کی تعبیر کا علم بھی علومِ نبوت کا ایک جز ہے۔تو اس سے یہ پتا چلا کہ خوابوں کی شریعت کی نظر میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے۔خوابوں کو بالکل بے حقیقت قرار دینا ایک انتہا ہے اور خوابوں کو سب کچھ سمجھنا یہ دوسری انتہا ہے۔

خوابوں کی اقسام:

اس لئے کہ بعض خواب اگرچہ تعبیر والے ہوتے ہیں اور انسان کے لئے ذریعۂ علم بنتے ہیں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ سارے خواب قابلِ تعبیر نہیں ہوتے بعض خواب تعبیر والے ہوتے ہیں اور بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی اس لئے وہ ذریعۂ علم بھی نہیں ہوتے۔ امام بخاریؒ نے محمد بن سیرینؒ کا ارشاد نقل کیا ہے اور یہاں مشکوٰۃ کے اس باب کی آٹھویں حدیث میں بھی آگے آرہا ہے۔ مشکوٰۃ کی اس روایت سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ خوابوں کی یہ تقسیم محمد بن سیرین یا حضرت ابوہریرۃؓ سے منقول ہے۔ بخاری میں بھی اسی طرح ہے۔ لیکن دیگر محدثین نے اسے جس انداز سے روایت کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے[1]۔ اس ارشاد کی روشنی میں خوابوں کی تین قسمیں معلوم ہوتی ہیں۔

پہلی قسم وہ خواب ہیں جو اسبابِ طبعیہ کے ماتحت ہوتے ہیں جن کی سب سے عمومی صورت یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں جو خواہشات اور جو خیالات دبے ہوتے ہیں وہ نیند کی حالت میں ظاہر ہو جاتے ہیں، انسانی تخیلات نیند کے اندر ایک مجسد شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک پوری چلتی پھرتی کہانی کی صورت میں انسان کے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن ہوتے وہ انسان کے خیالات ہی ہیں۔ اسی کو محمد بن سیرین نے حدیث النفس قرار دیا ہے، اور اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جو بعض اطبا نے ذکر کیا ہے کہ اگر انسان کی طبیعت پر صفرا کا غلبہ ہو تو اس طرح خواب آتے ہیں اور فلاں خِلط کا غلبہ ہو تو اس طرح کے خواب آتے ہیں۔ اگر غذا اس طرح کی ہو تو خواب اس طرح کے آتے ہیں اور اگر غذا اس نوعیت کی ہو تو خواب اس طرح کے آتے ہیں۔ ان سب کو ہم پہلی قسم میں داخل کر سکتے ہیں تو پہلی قسم وہ خواب جو اسباب طبعیہ

---

[1] - ان روایات کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فتح الباری ۱۲/۴۰۸ کتاب الرؤیا: باب القید فی المنام۔

کے ماتحت ہیں ان میں زیادہ تر چونکہ انسانی خیالات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے اس قسم کا نام محمد بن سیرین نے حدیث النفس رکھ دیا ہے۔

دوسری قسم وہ خواب ہیں جو شیطانی اثرات اور شیطانی وساوس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ شیطان مختلف قسم کے وساوس اور خیالات انسان کے ذہن میں ڈالتا ہے اور وہ نیند کی حالت میں ایک کہانی بن جاتے ہیں۔ شیطانی اثرات والے خوابوں میں زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن سے شیطان کا مقصد انسان کو اور خاص طور پر ایک مؤمن کو خوف وہراس میں مبتلا کرنا ہوتا ہے اس لئے محمد بن سیرین نے اس قسم کا نام تخویف الشیطان رکھا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ ڈراؤنے ہی ہوں بلکہ ایسے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ڈراؤنے نہ ہوں لیکن ہوں وہ شیطانی اثرات کے ماتحت۔ لیکن زیادہ تر یہ ڈراؤنے خواب ہوتے ہیں۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ ہر ڈراؤنا خواب شیطانی اثرات کی وجہ سے ہو بلکہ کوئی ڈراؤنا خواب انسانی خیالات کا بھی اثر ہو سکتا ہے، لیکن بہر حال شیطان کی طرف سے بھی ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔

اور تیسری قسم کے خواب وہ ہیں جن میں کسی حقیقت یا کسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہوتا ہے۔ یہ خواب بعض اوقات تو بالکل واضح اور کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کا مطلب جاننے کے لئے کسی علم کی ضرورت نہیں ہوتی اور بعض میں کسی حقیقت یا واقعہ کو کھول کر بیان نہیں کیا گیا ہوتا بلکہ اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس اشارے کو سمجھنے کے لئے بعض اوقات علم اور تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جس کو اس میدان کا علم اور تجربہ ہوتا ہے وہ اس اشارے کو سمجھ لیتے ہیں اور جن کو تجربہ اور علم نہیں ہوتا وہ اس اشارے کو سمجھ نہیں پاتے۔ اور یہ اشارہ سمجھنا عام عرف میں علم التعبیر کہلاتا ہے۔ اس طرح کے خواب کئی طرح کے ہوتے ہیں بعض خوابوں میں بعض حقائقِ شرعیہ یا بعض حقائق کونیہ بیان کئے گئے ہوتے ہیں مثلاً اسی باب میں ایک لمبی حدیث آرہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خواب بیان فرمایا کہ دو فرشتے آئے خواب کے اندر۔ اور مجھے اٹھا کر کہیں لے گئے اس خواب میں آپ ﷺ نے بہت ساری چیزیں دیکھیں مثلاً ایک آدمی خون کے دریا میں ہے وہ دریا سے باہر نکلنا چاہتا ہے لیکن جب کنارے پر پہنچتا ہے تو ایک فرشتہ ایک بڑا پتھر اس کے سر پر مارتا ہے اور دوبارہ دریا کے میان میں چلا جاتا ہے تو پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ سود

خور ہے۔اسی طریقے سے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کی دونوں باچھوں کو پیچھے تک چیرا جاتا ہے،دوبارہ پھر وہ اپنی جگہ پر آجاتی ہیں دوبارہ پھر چیرا جاتا ہے تو اس کے بارے میں یہ بتایا گیا کہ یہ جھوٹا آدمی ہے وغیرہ وغیرہ۔اس طرح کے بہت سے خواب حضور اقدس ﷺ نے متعدد مواقع پر صحابہ کے سامنے بیان کئے۔

تیسری قسم کے خوابوں میں سے بعض کا مقصد تو حقائق کونیہ یا حقائق شرعیہ بیان کرنا ہوتا ہے ایسے خواب نبی کو بھی آتے ہیں غیر نبی کو بھی آسکتے ہیں۔لیکن نبی کا خواب قطعی اور حجت شرعیہ ہے اور غیر نبی کا خواب قطعی اور حجت شرعیہ نہیں ہے۔لیکن اس سے کسی خاص مسئلے پر یا کسی خاص موضوع پر اطمینان ضرور حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے طالب علمی کے زمانے میں یہ ارادہ فرمایا تھا کہ چلو دہلی میں جا کر فلاں مشہور عالم سے بھی علمِ حدیث حاصل کرلیں جو ظاہر حدیث پر عمل کرنے میں مشہور تھے۔تو خواب دیکھا کہ ان کے گھر کے باہر چھاچھ (وہ لسی جس میں سے مکھن نکال لیا گیا ہو) تقسیم ہو رہی ہے۔حدیث میں دودھ کی تعبیر علمِ دین سے بیان کی گئی ہے۔اور چھاچھ بھی دودھ ہی ہے لیکن ایسا دودھ جس کے اندر سے مکھن نکال لیا گیا ہوتا ہے تو مطلب یہ کہ ان کے پاس حدیث کا ظاہر ظاہر چھلکا کا چھلکا تو ہے لیکن مغز روح اور حقیقت نہیں ہے۔اوپر اوپر سے تو عامل بالحدیث اور عالم حدیث ہیں لیکن فہم کی گہرائی ان کو حاصل نہیں ہے۔اس طرح بعض حقائق کی طرف اشارہ یا واضح طور پر بعض حقیقتیں بیان کردی جاتی ہیں۔

دوسرا مقصد اس طرح کے خوابوں کا ہوتا ہے مومن کا دل خوش کرنا کہ خواب دیکھا کہ میں جنت جا رہا ہوں یا کسی اور نے اس کے بارے میں اچھا خواب دیکھا ایسے خوابوں کو محمد بن سیرین نے بشری من اللہ قرار دیا ہے اور اسی کو احادیث میں المبشرات سے تعبیر کیا ہے اسی طرح کے خواب مومن کے ساتھ خاص ہیں غیر مومن کو اس طرح کے خواب نہیں آتے۔

اور تیسرا مقصد ہوتا ہے بعض ایسے واقعات کی اطلاع جس کا عام جاگتے ہوئے آدمی کو بعض اوقات پتا نہیں چلتا۔ بہت سارے تعبیر والے خواب اسی نوعیت کے ہوتے ہیں کہ خواب میں دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ بہت بڑی دولت حاصل ہونے والی ہے، خواب دیکھا جس کی تعبیر یہ تھی کہ فلاں رشتہ دار کا انتقال ہونے والا ہے، فلاں کام یوں ہونے والا ہے۔ یہ خواب بھی ذریعۂ علم ہے لیکن یہ مومن کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ غیر مومن کو بھی آسکتا چنانچہ غزوۂ بدر سے پہلے بعض اہل مکہ نے جن میں ایسے لوگ بھی تھے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ایسے خواب دیکھے جن میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ بدر کی طرف گئے تو وہاں زبردست پٹائی ہوگی اوران خوابوں کی وجہ سے بہت سارے لوگوں نے ابوجہل کو یہ مشورہ بھی دیا کہ لشکر لے کر نہ جائیں، لیکن چونکہ دماغ کے اندر فرعونیت بھری ہوئی تھی اوراپنی طاقت کا ایک نشہ سمایاہوا تھا اس لئے کسی کا مشورہ نہیں مانا اور وہی کچھ ہوا جو بعض لوگوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ خود ابوجہل کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا معبر تھا اور خوابوں کے ساتھ اس کو اچھی خاصی مناسبت تھی۔

توخوابوں کی تیسری قسم وہ ہے جو ذریعۂ علم ہوتی ہے اس کا مقصد کبھی تو حقائق کونیہ یا حقائق شرعیہ پر اطلاع ہوتا ہے، یادل خوش کرنا خوشخبری دینا مقصود ہوتا ہے یا بعض واقعات کی اطلاع مقصود ہوتی ہے۔اور یہ تیسری قسم میں نے عرض کیا کہ مومن کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ محمد بن سیرین نے تیسری قسم کا نام رکھا ہے بشریٰ من اللہ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تعبیر والے خواب یا ذریعۂ علم بننے والے خواب ہمیشہ بشارت ہی ہوتے ہیں، بشارت بھی ہوسکتے ہیں اور بعض اوقات کسی ناپسندیدہ واقعہ کی اطلاع بھی ان میں ہوسکتی ہے لیکن مومن کے لئے چونکہ بڑا مقصد ان کا تبشیر ہے اس لئے اس قسم کا نام محمد بن سیرین نے بشریٰ من اللہ رکھ دیا ہے، لیکن خوابوں کی تیسری قسم بشارت میں منحصر نہیں ہے۔ مشرکین مکہ نے بدر سے پہلے جو خواب دیکھے تھے ان میں کوئی بشارت نہیں تھی لیکن وہ ذریعۂ علم تھا تواس ساری بحث سے یہ پتہ چلا کہ خوابوں کی بنیادی قسمیں تین ہیں ان میں سے صرف تیسری قسم ہی ذریعۂ علم ہے پہلی دو قسمیں ذریعۂ علم ہے ہی نہیں اور ان کی کوئی تعبیر بھی نہیں ہوتی۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ بعض لوگ خوابوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں یہ ٹھیک نہیں ہے اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر خواب ذریعۂ علم نہیں ہوتا بلکہ خوابوں کی دو مستقل قسمیں ایسی ہیں جن کا علم کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور ایسے خواب بھی لوگوں کو بکثرت آتے ہیں۔ پھر جو خواب قابل تعبیر اور ذریعۂ علم ہیں ان میں بعض اوقات تو کوئی حقیقت واضح طور پر ظاہر کر دی جاتی ہے لیکن بعض اوقات حقیقت واضح طور پر ظاہر نہیں کی جاتی بلکہ ان کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس اشارے کو سمجھنے میں بعض اوقات معبر سے غلطی بھی ہو جاتی ہے خواب کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے لیکن سمجھنے والا سمجھتا کچھ اور ہے، جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خواب کی تعبیر بیان کی، حضرت صدیق اکبر بھی بہت بڑے معبر تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں لیکن حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری تعبیر کچھ درست ہے کچھ غلط ہے، تو پتا چلا کہ کسی بھی معبر سے تعبیر سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے اس لئے خوابوں کو کوئی حتمی ذریعۂ علم نہیں کہا جا سکتا۔ پھر خواب ایک ذریعۂ علم ہے جس میں دماغ بطور آلے کے استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی چیز کے ادراک میں آلے کی وجہ سے فرق پڑ جاتا چیز جو بھی دیکھی ہوتی ہے وہی دیکھی ہوتی ہے لیکن جس آلے کے ساتھ دیکھی ہوتی ہے اس کی وجہ سے نظر کچھ اور طرح سے آ رہی ہوتی ہے۔ جیسے پیلی عینک لگا کر آپ کوئی سفید کپڑا دیکھیں تو پیلا نظر آئے۔ دیکھا تو آپ نے وہ کپڑا ہی ہے لیکن ادراک میں آلے کے دخل کی وجہ سے غلطی ہو گئی۔ اس طرح بعض شیشے یا بعض آئینے ہوتے ہیں ان کے اندر سے کسی کو دیکھیں تو بعض اوقات چہرہ بہت لمبا سا نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بعض اوقات چہرہ چوڑا سا نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، بعض اوقات چہرہ گول مٹول سا نظر آتا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا، چیز چھوٹی ہوتی ہے لیکن آلے کی وجہ سے بڑی نظر آتی ہے، بڑی ہوتی لیکن آلے کی دخل اندازی کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہے، دور ہوتی ہے لیکن آلے کی وجہ سے قریب محسوس ہوتی ہے، جیسا دوربین کے ذریعے دیکھیں تو ایک چیز آپ سے میلوں دور ہو گی، نظر ایسا آئے گا جیسا کہ چند گز کے فاصلے پر ہے۔ تو صحیح خواب ہو تو بھی دماغ چونکہ اس میں آلۂ ادراک بن رہا ہے اس لئے آلے کی مداخلت کی وجہ سے غلطی کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے زمانے میں بعض لوگوں نے اپنا کشف ظاہر کیا کہ امام مہدی کا زمانہ قریب ہے، تو حضرت نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اول تو کشف میں غلطی کا امکان ہوتا ہے کہ دیکھا کچھ اور ہوتا ہے سمجھتا کچھ اور ہے اور بعض اوقات اس معنی میں تو کشف صحیح ہوتا ہے کہ حقیقت ہی کو دیکھا ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کے بعض اوصاف میں ادراک میں تغیر ہو جاتا ہے اس کی مثال حضرت نے یہی دوربین سے دی کہ چیز دور ہوتی ہے لیکن دوربین سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قریب ہے۔ دیکھی وہی چیز ہے لیکن قرب وبعد کا اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی اسی طرح ان اہلِ کشف نے دیکھا تو مہدی ہی کو ہو گا لیکن قرب وبعد میں فرق پڑ گیا ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی کافی دور ہوں لیکن ان کو محسوس ہوا کہ یہ بالکل قریب ہیں۔ تو جو حال کشف کا ہے وہی حال خواب کا ہے۔اس میں بھی اس طرح کی غلطی ہو سکتی ہے اس لئے خواب کو کوئی حتمی اور قطعی ذریعۂ علم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ خوابوں کا بالکل انکار کرنا بھی غلط ہے اور ان کو زیادہ اہمیت دینا بھی غلط ہے۔ بس یہ ہے کہ اگر کوئی خواب کسی کو نظر آئے اور وہ اول تو ضروری نہیں ہے کہ وہ قابلِ تعبیر ہو لیکن اگر اندازہ ہو کہ یہ تعبیر والا خواب ہے تو اس کی تعبیر اگر شریعت کے خلاف ہے تو اس کو بالکل نظرانداز کرنا ضروری ہے اور اگر وہ خلافِ شریعت نہیں ہے تو ایک دنیوی احتیاط کے طور پر اس کو اپنے مد نظر رکھ لے اور اس کے تقاضوں پر عمل کرلے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی کئے بغیر، مثلاً ایک شخص کو آپ اپنا بہت بڑا خیر خواہ سمجھ رہے ہیں لیکن کسی خواب سے اندازہ ہوا کہ وہ تو آپ کی جڑیں کاٹ رہا ہے تو حتمی بدگمانی تو اس کے بارے میں نہ کی جائے لیکن اس کے بارے میں آدمی ذرا محتاط ہو جائے اور اس پر زیادہ اعتماد بھی نہ کرے اس کو اپنے راز نہ بتائے اس کو اپنے منصوبے نہ بتائے جن باتوں کے علم سے اس کو نقصان پہنچانے کا موقع مل سکتا ہے وہ باتیں نہ بتائے۔

کیاخواب تعبیر کے تابع ہوتا ہے؟:

خواب کے بارے علما میں ایک بحث اور چلی ہے وہ یہ ہے کہ کیاخواب کی اپنی کوئی ذاتی حقیقت ہوتی ہے یا محض تعبیرِ معبر کے تابع ہوتاہے۔ اس پر معروف نقطہٗ نظر دو ہیں۔ ایک نقطہٗ نظر یہ ہے کہ ہر خواب کی اپنی ایک حقیقت اورایک تعبیر ہوتی ہے خواب کی تعبیر بیان کرنے والاوہی تعبیر بیان کرے تب بھی اس کا نتیجہ ویساہی ہوگا اوراگر تعبیر بیان کرنے والے نے تعبیر کچھ اور بیان کردی تب بھی حقیقت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا، خواب اسی صورت میں ظاہر ہوگاجو کہ اس کی اصل حقیقت اوراصل تعبیر ہے۔ تو تعبیر معبر سے خواب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

دوسرانقطہٗ نظریہ ہے کہ خواب تعبیرِ معبر کے تابع ہوتاہے۔ اگرخواب کی تعبیر سرے سے بیان ہی نہ کی گئی ہو تواس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اوراگراس کی تعبیر اچھی کسی نے بیان کردی تواچھااثر ہوگااوراگر بری تعبیر بیان کردی توبرانتیجہ ظاہر ہوگا۔ اس کی جیسی تعبیر کسی نے بیان کی ویساہی اس کااثر ہوگا۔ یہ حضرات استدلال کرتے ہیں ایک حدیث سے جو آگے مشکوۃ کے اسی باب کی دوسری فصل میں بھی آرہی ہے ابوداؤداور ترمذی وغیرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ الرؤیا علی رجل طائر مالم تعبر فاذاعبرت وقعت۔ کہ خواب ایساہوتاہے جیساکہ پرندے کے پاؤں پر کوئی چیز ہوجب تک اس کی تعبیر بیان نہ کی جائے۔ پرندے پاؤں پر ہوناکنایہ ہے عدمِ استقرار سے اوراس کی تعبیر متعین نہ ہونے سے۔ اس لئے کہ پرندے کے پاؤں پر جو چیز ہے وہ گرے گی توصحیح لیکن کس طرف کو گرے گی یہ کچھ نہیں بتایاجاسکتا۔ توپرندے کے پاؤں پر ہونے کا مطلب یہ کہ خواب کا کوئی اپنامطلب نہیں ہے۔ کوئی نہیں کہاجاسکتاکہ اس کی تعبیر کدھر کو جائے گی۔ پرندے کے پاؤں پر ہوناایساہی ہے جیساکہ اردو کا محاورہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ جب اونٹ بیٹھنے لگتاہے توکئی پلٹے کھاتاہے اب آخری پلٹااس کاکسی طرف کو ہوگاپہلے بتانا مشکل ہوتاہے۔ توجو مطلب اس محاورے کاہے وہی مطلب علی رجل طائر کاہے۔ تواس کامطلب یہ ہواکہ خواب کی کوئی اپنی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ وہ تعبیر معبر کے تابع ہوتاہے۔ امام بخاری رحمۃاللہ علیہ نے ان دونوں قولوں کے درمیان

میں ایک راہ اختیار فرمائی ہے یایوں کہئے کہ دونوں قولوں میں محاکمہ بیان فرمایاہے اور باب کا عنوان قائم کیاہے: من لم یرالرؤیالأول عابرذالم یصب۔ جس میں امام بخاریؒ بتانایہ چاہتے ہیں کہ اگر تو معبرنے خواب کی تعبیر صحیح دی ہے تو وہ تعبیر معبر کے تابع ہے اور خواب کا نتیجہ ظاہر ہونے میں تعبیر کا بھی اثر پڑتاہے۔ اور اگر معبر نے تعبیر غلط دی ہے تو اس کی تعبیر کا خواب کے نتیجے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس پر آپ یہ سوال کریں گے کہ جب تعبیر درست ہے تو پھر خواب تو اپنی اصل حقیقت کے مطابق واقع ہواہے تعبیر سے کیافرق پڑا۔ تو بات اصل میں یہ ہے کہ بعض اوقات اصولِ تعبیر کے اعتبار سے ایک خواب میں کئی تعبیروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہو سکتاہے کہ کوئی معبر ایسی تعبیر بیان کردے جو اصولِ تعبیر کی روسے کسی احتمال میں داخل نہیں ہے تو ایسی تعبیر کا کوئی اثر نہیں پڑے گا اور دوسرا معبر ان محتمل تعبیروں میں سے کوئی تعبیر بیان کرتاہے وہ ہوجائے گی۔ اگر پہلی تعبیر بیان کی تو خواب اس کے مطابق ہو اور اگر دوسری تعبیر بیان کی تو خواب اس کے مطابق ہوگا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے متعلقین میں سے کسی شخص نے ایک خواب دیکھا کہ بریلی کی طرف سے بطخیں اڑ کر آرہی ہیں اور اس نے اس خواب کی تعبیر حضرت نانوتویؒ سے پوچھی تو حضرت نے یہ فرمایا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ مٹھائی کھلاؤ گے یا نہیں اگر مٹھائی کھلاؤ گے تو بائیس روپے والی تعبیر ہوگی اور اگر مٹھائی نہیں کھلاتے تو گیارہ روپے والی۔ تو اس نے کہا کہ میں مٹھائی کھلاؤں گا تو حضرت نے فرمایا کہ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ بریلی میں تمہیں بائیس روپے تنخواہ پر ملازمت مل جائے گی۔ اس زمانے میں بائیس روپے بھی بہت ہوتے تھے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تو کسی نے پوچھا کہ حضرت باقی بات تو سمجھ میں آگئی لیکن یہ گیارہ اور بائیس والی بات سمجھ نہیں آئی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ اہلِ تعبیر نے بطخ کی تعبیر رزق سے لکھی ہے۔ اب لفظ بط اصل میں عربی میں بھی استعمال ہوتاہے اور فارسی میں بھی استعمال ہوتاہے۔ اس زمانے میں یہی دو علمی زبانیں ہوتی تھیں عربی، فارسی اور اردو ذرا کم استعمال ہوتی تھی۔ عربی میں بط میں "طا" مشدد ہے گویا دو مرتبہ ہے۔ تو اس اعتبار سے اس کا عدد بائیس بنتاہے اور فارسی میں بط مخفف ہے یعنی طا اس میں ایک مرتبہ ہے اس اعتبار سے اس کا عدد گیارہ بنتاہے۔ چونکہ خواب دیکھنے والے صاحبِ علم آدمی ہیں اس لئے یہ بھی ہو سکتاہے ان کی بط عربی والی مراد لی جائے اور یہ بھی ہو سکتاہے کہ فارسی والی بط مراد لی جائے۔ دونوں احتمال تھے

تو یہاں دیکھئے کہ اصولِ تعبیر کے مطابق اتنی بات تو طے تھی کہ ملازمت ملے گی، اور چونکہ بطخیں بریلی کی طرف سے آرہی ہیں اس لئے وہاں ملازمت ملے گی۔ لیکن گیارہ روپے تنخواہ پر یا بائیس روپے پر اس میں اصولِ تعبیر کے اعتبار سے دونوں احتمال تھے۔ اب جس کے مطابق معبر نے تعبیر بیان کی وہی واقع ہو گئی۔ یہ مطلب ہے امام بخاریؒ کی اس بات کا کہ اگر تعبیر اصولِ تعبیر کے دائرے کے اندر ہو تو اس کا خواب پر اثر پڑتا ہے اور خواب اس کے مطابق واقع ہوتا ہے اور اگر اصولِ تعبیر کے دائرے سے خارج ہو تو پھر اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب اگر اس خواب کی تعبیر یہ بیان کرتے کہ تمہیں گیارہ یا بائیس کوڑے لگیں گے تو اس تعبیر سے کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ اصولِ تعبیر کی رو سے یہ مطلب محتمل ہی نہیں ہے۔

خواب تعبیرِ معبر سے بھی متأثر ہوتا ہے اس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے دارمی نے روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو فتح الباری میں حسن قرار دیا ہے کہ ایک عورت نے خواب دیکھا کہ اس کا خاوند کہیں سفر پر گیا ہوا تھا اور یہ عورت خود حاملہ تھی خواب یہ دیکھا کہ اس کے گھر کا ایک ستون گر گیا اور اس نے کانا بیٹا جنا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نے اپنا خواب ذکر کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس وقت موجود نہیں تھیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا خاوند انشاءاللہ سفر سے بخیریت واپس آجائے گا اور تم ایک نیک بچہ جنو گی۔ اس کے بعد اس عورت نے یہی خواب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے ذکر کیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی تعبیر ابھی معلوم نہیں تھی تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر تو نے واقعتاً یہ خواب دیکھا ہے تو تمہارا خاوند اس سفر میں ہلاک ہو جائے گا اور تم ایک فاجر بچہ جنو گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کا پتا چلا تو آپ نے فرمایا کہ جب مسلمان کے خواب کی تعبیر بیان کرو تو اچھی تعبیر بیان کرو اس لئے کہ جیسی تعبیر بتائی جاتی ہے خواب اسی کے

مطابق ہوتا ہے[1]۔یعنی اصولِ تعبیر کے اندر رہتے ہوئے حتی الامکان کوشش کرو اچھی تعبیر بیان کرنے کی۔اگر ایک خواب کی اچھی تعبیر بھی ہوسکتی ہے بری بھی تو اچھی تعبیر ہی بتاؤ اور اس کی وجہ حضور اقدس ﷺ نے یہ بیان فرمائی کہ جس طرح خواب کی تعبیر بیان کی جائے اسی طریقے سے واقع ہوتا ہے تو اس میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خواب کو تعبیر معبر کے تابع قرار دے رہے ہیں لیکن امام بخاریؒ نے اس طرح کی احادیث میں تخصیص کردی ہے کہ یہ بات اس صورت میں ہے جب کہ خواب کی تعبیر بیان کرنے والا صحیح تعبیر بیان کرے یعنی علم التعبیر کے اصولوں میں اس تعبیر کی گنجائش ہو تو پھر تعبیر معبر تعبیر معبر کے تابع ہے وگرنہ تابع نہیں ہے۔امام بخاری نے اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا اور آپ نے مجلس میں اس کا ذکر کیا تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یارسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں اس کی تعبیر بیان کردوں۔خواب یہ تھا کہ بادل ہیں جن سے گھی اور شہد ٹپک رہا ہے اور اس کے بعد ان بادلوں سے ایک رسی لٹکی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسی کو پکڑا اور اوپر چڑھ گئے، پھر ایک اور شخص نے اس رسی کو پکڑا اور وہ بھی اوپر چڑھ گیا، پھر ایک اور شخص نے رسی کو پکڑا وہ بھی اوپر چڑھ گیا، پھر ایک اور شخص نے اس رسی کو پکڑا لیکن رسی کٹ گئی لیکن بعد میں وہ رسی دوبارہ جڑ گئی اور وہ بھی چڑھ گیا۔حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس کی تعبیر بیان فرمائی کہ گھی اور شہد کے بادلوں سے مراد تو قرآن ہے

---

[1]- في فتح الباري (٤٣٢/١٢) : وعند الدارمي بسند حسن عن سليمان بن يسار عن عائشة قالت كانت امرأة من أهل المدينة لها زوج تاجر يختلف يعني في التجارة فأتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت إن زوجي غائب وتركني حاملا فرأيت في المنام أن سارية بيتي انكسرت وأني ولدت غلاما أعور فقال خير يرجع زوجك إن شاء الله صالحا وتلدين غلاما برا فذكرت ذلك ثلاثا فجاءت ورسول الله صلى الله عليه وسلم غائب فسألتها فأخبرتني بالمنام فقلت لئن صدقت رؤياك ليموتن زوجك وتلدين غلاما فاجرا فقعدت تبكي فجاء رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال مه يا عائشة إذا عبرتم للمسلم الرؤيا فاعبروها على خير فإن الرؤيا تكون على ما يعبرها صاحبها.

اور گھی میں اس کے لین اور نرم ہونے کی طرف اشارہ ہے اور شہد سے اس کی مٹھاس کی طرف اشارہ ہے۔ اور رسی میں اشارہ ہے ولاۃ الأمر کی طرف۔ یہ تعبیر بیان کرکے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ بتائیے کہ میں نے صحیح تعبیر بیان کی ہے یا غلط۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ أصبت بعضا وأخطات بعضاً کہ تعبیر کچھ غلط ہے اور کچھ صحیح ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ مجھے یہ بتائیے کہ غلطی کیا ہے اور یہ بات قسم دے کر پوچھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسمیں نہ دو لیکن غلطی نہیں بتائی اس لئے کہ اس وقت بتانا مناسب نہیں تھا۔ یہاں خواب کی تعبیر میں غلطی کیا تھی صحیح تعبیر کیا بنتی ہے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اس سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آئی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعبیر میں کچھ غلطی تھی لیکن واقعات حضرت صدیق اکبر کی تعبیر کے مطابق رونما نہیں ہوئے بلکہ جو اصل خواب کا مطلب تھا اس کے مطابق رونما ہوئے تو پتا چلا کہ اگر معبر غلط تعبیر بیان کرے تو اس کا خواب پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا۔

خواب ہر ایک کے سامنے کیوں بیان نہیں کرنا چاہئے؟

یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے اس باب کی احادیث میں آئے گا کہ اگر اچھا اور قابل تعبیر خواب ہو تو وہ بھی ہر ایک کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہئے بلکہ کسی سمجھ دار یا خیر خواہ کے سامنے بیان کرنا چاہئے۔ بے وقوف شخص یا بدخواہ آدمی کے سامنے خواب کو بیان نہ کرے اس لئے کہ بے وقوف بے وقوفی میں کوئی غلط الٹی سیدھی بات بیان کردے گا اور بدخواہ آدمی بدخواہی اور حسد وغیرہ کی وجہ سے غلط تعبیر بیان کردے گا۔ سوال یہ ہے کہ جس قول کے مطابق خواب تعبیر معبر کے تابع ہوتا ہے اس کے مطابق تو اس کی وجہ بہت واضح ہی ہے کہ اگر بے وقوف یا بدخواہ کو خواب بتایا تو وہ نامناسب تعبیر ذکر کردے گا اور اسی کے مطابق وہ واقع بھی ہو جائے گا۔ لیکن جس قول کے مطابق تعبیر کا خواب پر کوئی اثر نہیں ہوتا یا غلط تعبیر کا خواب پر اثر نہیں ہوتا اس کے مطابق سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو بتانے نہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرق کئی طریقے سے پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہو سکتا ہے کہ اس خواب

کی تعبیر میں کئی احتمال ہوں اچھی تعبیر بھی ممکن ہو، بری تعبیر بھی تو جو خیر خواہ ہوگا وہ اچھی تعبیر ذکر کرے گا اور جو بدخواہ ہوگا وہ بری تعبیر ذکر کرے گا۔

دوسرا یہ کہ اثر نہ بھی ہو تب بھی بری تعبیر کے ذکر کرنے کی وجہ سے خواب دیکھنے والا پریشان ضرور ہو جائے گا۔ اور پریشانی کا بعض اوقات زندگی پر اور واقعات پر اثر پڑ جاتا ہے۔ آدمی سوچتا ہے کہ یہ کام خراب ہوگا تو بعض اوقات نہ ہونا ہو تب بھی خراب ہو جاتا ہے۔

اور تیسری وجہ وہ ہو سکتی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے سے سمجھ میں آتی ہے کہ خواب کی تعبیر تو اچھی ہے لیکن بدخواہ کے سامنے خواب کو ذکر کیا اور وہ تعبیر سمجھ گیا تو وہ حسد میں مبتلا ہو کر تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ خواب تو اپنی تعبیر کے مطابق پورا ہو جائے گا، لیکن حسد کی وجہ سے اس سے پہلے تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر پوری ہو گئی تھی۔ لیکن نہ بتانے کے باوجود چونکہ ان کے بھائی حسد میں ویسے ہی مبتلا ہو گئے تھے اس لئے اس سے پہلے بہر حال تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اسی طرح کے خطرات کے پیشِ نظر حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے ذکر نہ کرنا۔ تو حاسد کو جب اچھے خواب کا پتا چلے گا تو اس کے حسد کی وجہ سے تعبیر تو نہیں رکے گی لیکن ویسے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

خوابوں کی سچائی کے کچھ عوامل:

کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا خوابوں کے قابل تعبیر اور سچا ہونے میں خاص دخل ہے ان میں سے سب سے اہم چیز انسان کا جاگتی ہوئی زندگی میں سچ بولنے کا عادی ہونا ہے جتنا آدمی عام زندگی میں سچ بولنے کا عادی ہوتا ہے اس کے خواب میں سچا ہونے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے عام زندگی میں جھوٹ بولنے کا عادی ہو یا مبالغہ آرائی اور گپ بازی

کاعادی ہوتواس کے خواب بھی اسی طریقے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کاارشاد ہےأصدقکم رؤیا أصدقکم حدیثاً[1] کہ جوتم میں سے زیادہ سچ بولنے کاعادی ہوتاہےاس کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ اوقات کا بھی اثرپڑتاہے مثال کے طورپر آخرشب کے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں، جس طرح کہ اس باب کی آخری حدیث میں آرہاہے۔اوراسی طرح بعض اہل فن نے یہ بھی کہاہے کہ قیلولے کے وقت خواب بھی سچے ہوتے ہیں موسموں کا بھی بعض اوقات اثرپڑ جاتاہے۔بہت بڑادخل اس میں طبعی مناسبت کاہوناہے کہ بعض لوگوں کوخوابوں کے ساتھ فطری طورپر مناسبت ہوتی ہےاور بعض کو کوئی خاص مناسبت نہیں ہوتی۔

اچھے یابرے خوابوں کازیادہ اثر نہیں لیناچاہئے:

ہم چونکہ جھوٹ نہ بھی بولیں توبہت ساری باتوں میں مبالغہ آرائی کے عادی ضرور ہوتے ہیں اس لئے ہمارے بہت سارے خواب بھی مبالغے پر مبنی ہوتے ہیں اس لئے کوئی اچھاخواب دیکھ کر کبھی اپنی بزرگی کامعتقد نہیں ہوناچاہئے،ایک توویسے ہی خواب کوئی یقینی طورپر برزگی کی دلیل نہیں ہےاوردوسرایہ کہ ہمارے خوابوں میں مبالغہ بہت ہوتاہے۔اسی طرح کوئی پریشان خواب دیکھ کرپریشان نہیں ہوناچاہئےاس لئے کہ جوواقعہ اگرہوگا بھی تووہ معمولی ساہوگالیکن خواب میں بہت بڑانظر آئے گا۔اگراس کوچیونٹی نے کاٹاہے توخواب میں نظرآئے گاکہ مجھے سانپ نے ڈس لیاہے۔خواب میں مبالغہ ایک مثال سے بآسانی سمجھ میں آسکتاہے۔ایک بزرگ گزرے ہیں علامہ نابلسی،۔ خوابوں کی تعبیرپران کی ایک مستقل کتاب ہے تعطیرالأنام فی تعبیرالمنام۔اس میں ایک واقعہ لکھاہے کہ دو شخص اکٹھے سفرپر جارہے تھے راستے میں انہوں نے ایک جگہ پڑاؤڈالا۔ان میں سے ایک شخص نے کہاکہ میں ذراتھوڑی دیرآرام کرلوں اوروہ سوگیا،جوجاگ رہاتھااس نے سوچاکہ میں اتنی دیر میں کھانے پینے کی تیاری کرلوں۔توآم یاکوئی اور پھل

---

[1]۔ صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۲۶۳ کتاب الرؤیا

لے کر دھو کر رکھے۔ دودھ ایک برتن کے اندر ڈالا اور ایک چھری دھو کر تیار کی اور وہ دودھ والے برتن پر عرضاً رکھ دی۔ وہ شخص کہتا ہے کہ مجھے ایسے لگا جیسا سونے والے کی ناک سے کوئی چیز نکلی ہے اور اس چھری پر آئی اور واپس ناک میں چلی گئی۔ جب یہ آدمی سو کر اٹھا تو اس نے کہا میں نے آج ایک عجیب خواب دیکھا ہے وہ یہ کہ دودھ کا ایک دریا ہے اور اس کے اوپر لوہے کا پل ہے۔ تو اس نے کہا کہ خواب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو برتن ہے جس میں دودھ ہے یہ تمہیں دودھ کا دریا نظر آیا اور جو چھری اوپر رکھی ہوئی تھی وہ پل ہے۔ تو اگر یہ حقیقت اس کے سامنے نہ ہوتی تو وہ پتا نہیں کیا اس کی تعبیریں سوچتا رہتا کہ دودھ کی تعبیر علم ہے اور میں علم کا دریا بن گیا ہوں اور بڑا متبحر عالم بن گیا ہوں۔ لیکن یہ ایک مبالغہ تھا۔ چیز معمولی تھی جو اس نے خواب میں دیکھی لیکن نظر بہت بڑی آئی۔ تو اس طرح کی گپیں ہم چونکہ جاگتے ہوئے بھی لگا لیتے ہیں اس لئے ہمارے خوابوں کے اندر بھی مبالغہ ہوتا ہے۔ اس لئے کوئی پریشان کن خواب دیکھ کر پریشان نہیں ہونا چاہئے بعض اوقات اس کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بلکہ حدیث النفس یا تخویف الشیطان کے قبیل سے ہوتا ہے۔ اور اگر اس کی کوئی حقیقت اور تعبیر ہو بھی تو بات بہت معمولی سی ہوتی ہے جو خواب میں بہت بڑی ہو کر نظر آتی ہے۔ اور خواب بالکل سچا ہو اور یہ مان لیا جائے کہ اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں ہے تب بھی خواب کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہی ہے کہ کوئی آفت اس کی طرف متوجہ ہے، اسے آتے ہوئے اس نے دیکھا ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ انسان کی طرف متوجہ ہونے والی ہر آفت اس پر لازماً آ بھی جائے، نہ معلوم انسان کی طرف کتنی آفات متوجہ ہوتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں راستے ہی ٹال دیتے ہیں، یا تو انسان کی کسی نیکی وجہ سے، اس کی دعا کی وجہ سے یا اللہ کے فضل کی وجہ سے۔ احادیث میں صدقہ وغیرہ کئی نیکیوں کے بارے میں آتا ہے کہ ان سے بلائیں اور آفات ٹلتی ہیں۔ اسی طرح دعا کے بارے میں آتا ہے کہ وہ تقدیر کو ٹال دیتی ہے۔ اس لئے پریشان کن خواب کے بعد اللہ کی طرف متوجہ ہوگا اور توکل کا اظہار کرے گا تو (جیسا کہ حدیث نمبر ۶ میں آرہا ہے) اس خواب سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اسی حدیث کی صحیحین کی بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حدیث کے روای ابو سلمہ بن عبد الرحمان کہتے ہیں کہ میں بعض اوقات ایسے پریشان کن خواب دیکھتا تھا جو مجھ پر پہاڑ سے زیادہ گراں ہوتے تھے، اور میں

ان کی وجہ سے بیمار پڑ جاتا تھا، یہاں تک مجھے حضرت ابو قتادہؓ نے یہ حدیث سنائی، اس کے بعد میں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا[1]۔

تعبیر بتانے کا ایک ادب:

جس شخص کے سامنے کوئی اپنا خواب بیان کرے اس کے لئے ادب یہ ہے کہ وہ یوں کہے اور حضور اقدس ﷺ بھی یہ کہا کرتے تھے کہ خیر اتلقاہ وشر اہ تتو قاہ خیر لنا وشر لاَعدائنا والحمد للہ رب العالمین کہ اس خواب کی وجہ سے تمہیں خیر حاصل ہو اور شر سے بچے رہو خیر ہمارے لئے ہو اور شر ہمارے دشمن کے لئے ہو۔ یہ کہہ کر پھر اسے کہے کہ خواب بیان کرو۔ کیونکہ آدمی پہلے تمہید کے طور پر کہتا ہے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تو جب وہ یہ کہے تو یہ الفاظ کہو اور پھر کہو کہ خواب بتاؤ کیا خواب تم نے دیکھا ہے۔

عالمِ دین کے لئے تعبیر سے واقف ہونا ضروری نہیں:

یاد رکھیں کہ خواب کو اگرچہ جزو نبوت قرار دیا گیا ہے اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی بہت سارے انبیا کو دیا گیا ہے لیکن یہ تکوینی علم ہے تشریعی علم نہیں ہے، لہٰذا کسی مسئلہ شرعیہ کے ساتھ اس کا تعلق نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو عالم دین ہے اس کو خوابوں کی تعبیر سے بھی واقف ہونا چاہئے اور اگر کوئی یہ کہہ دے کہ مجھے تعبیر نہیں آتی تو کہتے ہیں کہ عجیب مولوی ہے اس کو خوابوں کی تعبیر بھی نہیں آتی تو یہ بات اصل میں اسی غلط تصور پر مبنی ہے کہ خواب کی تعبیر بھی شریعت کا مسئلہ ہے۔ تو یہ غلط فہمی دور کرنی چاہئے۔ و گرنہ یہ ہو گا کہ اگر خواب کی

---

[1]- صحیح بخاری، حدیث نمبر ۵۷۴۷ کتاب الطب: باب النفث فی الرؤیا و حدیث نمبر: ۷۰۴۴ کتاب التعبیر: باب اذا رأى ما یکرہ الخ۔

تعبیر غلط نکلی تو یہ سمجھے گا کہ شریعت غلط ہو گئی ہے۔لہٰذا کسی کو اگر خواب کی تعبیر بتانی بھی ہو تو پہلے اس کی یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے۔ایک تو جب کوئی کہے کہ مجھے خواب آیا ہے میں اس کی تعبیر پوچھنا چاہتا ہوں تو اگر تو وہ سلیم الفطرت شخص ہے اور دین کا صحیح فہم رکھتا ہے پھر تو ضرورت نہیں و گرنہ اس کو پہلے تو یہ بتادینا چاہئے کہ ہر خواب کی تعبیر ہونا کوئی ضروری نہیں ہوتا۔اور اگر تعبیر ہو بھی ہر وقت ہر ایک کے ذہن میں اس کا آنا ضروری نہیں، لہذا تمہارے خواب کی اگر تعبیر سمجھ میں آگئی تو بتادوں گا و گرنہ نہیں ہے۔اور یہ بھی بتادے کہ یہ کوئی شریعت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک تجربے کی چیز ہوتی ہے تاکہ اگر آپ خواب کی تعبیر ذکر کرتے بھی ہیں تو وہ اس کو شریعت کا جز نہ سمجھے۔اسی طرح سے یہ بات ضرور ہے کہ بہت سارے نیک لوگوں کو علمِ تعبیر کے ساتھ مناسبت ہو جاتی ہے لیکن علمِ تعبیر کے ساتھ مناسبت بزرگی اور ولایت کے لوازم میں سے نہیں ہے۔کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس کو خوابوں کی تعبیر آتی ہے وہ بزرگ اور ولی ہے اور جس کو خوابوں کی تعبیر نہیں آتی وہ بزرگ اور ولی ہی نہیں ہے۔ولایت نام ہے احکام شریعت پر عمل کرنے اور اس عمل میں رسوخ حاصل ہو جانے کا۔

شرح احادیث کتاب الرؤیا

الفصل الأول

مبشرات باقی ہیں

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ» قَالُوا: وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: «الرُّؤْيَا الصالحةُ» . رَوَاهُ الْبُخَارِيّ. وَزَادَ مَالِكٌ بِرِوَايَةِ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ: «يَرَاهَا الرجل الْمُسلم أَو تُرى لَهُ».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت میں سے باقی نہیں بچے مگر مبشرات۔ صحابہ نے عرض کیا کہ مبشرات کیا ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ایسا اچھا خواب جسے کوئی مسلمان آدمی دیکھے یا اس کے بارے میں دیکھا جائے۔

مسلمان آدمی کے دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنے بارے میں کوئی اچھا خواب دیکھے جس سے دل خوش ہو جائے۔ اس کے لئے دیکھا جائے، مطلب یہ ہے کہ اس کے بارے میں کوئی دوسرا خواب دیکھے اور وہ اس کو بتادے اور اس کی وجہ سے اس کا دل خوش ہو جائے۔ یہ مبشرات میں داخل ہے قرآن کریم میں آتا ہے [أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ . الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ . لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمِ] [1] کہ اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف اور پریشانی نہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور پارسائی اختیار کرتے تھے، ان کے لئے آخرت میں بھی بشریٰ یعنی بشارت ہے اور دنیا میں بھی بشریٰ ہے۔ بعض مفسرین نے بشریٰ فی الدنیا کی تفسیر بھی اچھے خوابوں سے کی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ بشریٰ فی الدنیا اچھے خوابوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے قرب کی وجہ سے دنیا میں بھی بندے کو بعض اوقات ایک خاص قسم کی بشاشت عطا فرماتے ہیں وہ مراد ہے اور اس کے اسباب میں خواب بھی داخل ہے۔ تو بشریٰ فی الدنیا اچھے خوابوں میں منحصر تو نہیں ہے لیکن اچھے خواب بھی اس کا ایک حصہ ضرور ہیں۔

خواب نبوت کا جزہیں

(۲) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ» متفق عليه.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔

1۔ یونس ۶۲-۶۴۔

جزوِ نبوت ہونا ختمِ نبوت کے منافی نہیں:

یعنی اچھا خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔ جزوِ نبوت ہونے کا مطلب تو پہلے تمہیدی باتوں کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں دو باتیں مزید قابل ذکر ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ آج کل قادیانی اس طرح کی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں اس بات پر کہ نبوت ختم نہیں ہوئی بلکہ باقی ہے۔ اس لئے کہ خواب نبوت کا جز ہے اور اچھے خواب اب بھی لوگوں کو آتے ہیں پتا چلا کہ نبوت اب بھی باقی ہے۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ جز ہونے سے مراد جزء حقیقی نہیں ہے، بلکہ جز ہونے کے اور معانی ہیں جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ مثلاً جز ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو علومِ نبوت کے ساتھ خاص مناسبت ہے یا یہ کہ نبوت کا جز ہے یعنی علمِ نبوت کا جز ہے اور ہم نبوت ختم ہونے کے قائل ہیں علمِ نبوت ختم ہونے کے قائل نہیں ہیں بلکہ علم نبوت تو اب بھی باقی ہے۔ اور اگر جزو حقیقی مراد ہو تو پھر خواب بھی انبیا کا ہی مراد ہو گا کہ انبیا کے خواب نبوت کا ایک جز ہیں اس لئے کہ یہ بھی وحی کی ایک صورت ہیں۔ جس طرح وحی فرشتے کے ذریعے سے آتی ہے اور براہِ راست اللہ تعالی بھی خطاب فرماتے ہیں کبھی من وراء حجاب وحی ہوتی ہے اسی طرح وحی کی ایک صورت خواب بھی ہے تو نبی کے خواب جزو نبوت ہیں۔

البتہ اس پر یہ سوال پیدا ہو گا کہ پھر عام لوگوں کے خوابوں کی کوئی اہمیت تو اس سے سمجھ میں نہیں آئی حالانکہ یہاں مقصود بظاہر عام مسلمانوں کے خوابوں کی اہمیت بیان کرنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر نبی کا خواب مراد ہو تب بھی عام لوگوں کے خوابوں کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، وہ اس طریقے سے کہ عام آدمی کا خواب اگرچہ اس معنی میں جزو نبوت نہیں ہے لیکن بہر حال یہ اس نوع میں سے ہے جس کا ایک فرد جزوِ نبوت تھا۔ مثال کے طور پر وحی کی ایک صورت یہ ہے کہ نبی کے پاس فرشتہ آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا حکم اسے پہنچاتا ہے اب نبی کے پاس فرشتے کا آنا یہ تو وحی کی ایک صورت اور جزوِ نبوت ہے لیکن ویسے فرشتہ کسی اور انسان کے پاس بھی آسکتا ہے۔ کسی اور انسان کے پاس فرشتہ آئے تو یہ اس کے لئے ایک اعزاز کی بات ہے، اس کی اہمیت ہے۔ اس کی اہمیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ

وہ برتاؤ ہوا جو کہ انبیا کے ساتھ ہوتا تھا۔ لیکن یہ مطلب نہیں کہ اس کے پاس چونکہ فرشتہ آگیا ہے لہٰذا یہ نبی بھی بن گیا ہے۔اسی طریقے سے ایک ادارہ جس میں فرض کریں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے لوگ پڑھے ہوئے ہیں یا دوسری بہت بڑی بڑی شخصیات پڑھی ہوئی ہیں آپ بھی اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو آپ نے اس میں تعلیم حاصل کی اس سے آپ وہ شخصیت تو نہیں بنے، آپ حافظ ابن حجر تو نہیں بن گئے، بلکہ اس کے قریب بھی نہیں پہنچے لیکن پھر بھی آپ اس چیز کو اپنے لئے ایک قسم کا اعزاز ضرور سمجھیں گے کہ جہاں فلاں شخصیت نے تعلیم حاصل کی تھی میں نے بھی وہیں تعلیم حاصل کی ہے۔اس طریقے سے عام آدمی کے لئے خواب ذریعۂ علم ہے اگرچہ جزو نبوت نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ اسی طرح کی ایک چیز نبیوں کے لئے جزو نبوت ہے۔

یہ ساری بات اس صورت میں ہے جبکہ خواب کو نبوت کا جزو حقیقی مان لیں، و گرنہ اصل بات یہی ہے کہ جزو ہونے سے مراد جزو حقیقی نہیں ہے بلکہ دوسرے معانی ہیں جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ اور پھر عام آدمی کا خواب بھی اگر مان لیں کہ وہ جزو نبوت ہے اور جزوِ حقیقی ہے تو بھی اس سے بقاءِ نبوت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے کہ جز کے باقی ہونے سے یا جز کے پائے جانے سے کل کا پایا جانا لازم نہیں آتا۔ اگر ایک ستون کھڑا کر دیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں بلڈنگ موجود ہے۔ ستون اگرچہ بلڈنگ کا جز ہے لیکن یہاں پر یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ بلڈنگ ہے۔ چارپائی کا ایک پایہ آپ کسی جگہ کھڑا کر دیں تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ چارپائی ہے۔ایک آدمی سے آپ نے چھیالیس روپے لینے ہیں، آپ کا اس کی طرف ادھار ہے۔ اس نے آپ کو ایک روپیہ دے دیا گویا قرض کا چھیالیسواں جز دے دیا تو کیا یہ کہہ سکتے ہیں کہ پورا قرض دے دیا۔ حاصل یہ کہ جز کے پائے جانے سے کل کا پایا جانا لازم نہیں آتا۔ و گرنہ تو پھر اگر خواب دیکھ کر مرزا غلام احمد قادیانی نبی بن سکتا ہے تو ہم سب نعوذ باللہ نبی ہیں۔ کیونکہ خواب تو سب دیکھتے ہیں پھر اس کی کیا تخصیص ہوئی پھر تو سارے ہی نبی بن جائیں گے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ نے فیض الباری میں یہ بات ایک اور منطقی انداز سے سمجھائی ہے کہ دیکھئے انسان کی ماہیت ہے حیوان ناطق۔ تو مرزا غلام احمد قادیانی اپنے آپ کو انسان کہتا ہے تو گویا وہ حیوان ناطق کہتا ہے۔ حیوان اس کی ماہیت کا جز ہے۔اور یہی حیوان، حمار کی ماہیت کا بھی جز ہے

تو حمار کا ایک جز اس کے اندر پایا جا رہا ہے تو کیا یہ ماننے کے لئے تیار ہو گا کہ میں حمار بن گیا ہوں۔ اگر واقعتا جز کے پائے جانے سے کل بھی وہاں پر موجود ہوتا ہے تو پھر تو یہی کہنا چاہئے کہ یہ حمار بن گیا ہے۔

خواب نبوت کا کتنواں جزو ہے؟:

یہاں پر قابل ذکر یہ بات ہے کہ اچھا خواب نبوت کا کتنواں جز ہے اس کے بارے میں احادیث مختلف ہیں۔ زیادہ تر حدیثوں میں تو چھیالیسواں جز آتا ہے، بعض میں چھتیسواں جز آتا ہے، بعض میں اور اعداد بھی آتے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے بتایا ہے کہ کم سے کم چوبیسواں جز ہے اور زیادہ سے زیادہ عدد ساٹھ ہے۔ تو چوبیس سے لے کر ساٹھ تک مختلف اجزا کا ذکر آتا ہے۔ بظاہر یہ روایات متعارض ہیں۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ زیادہ روایتوں میں چھیالیس کا ذکر آتا ہے اس لئے اس کو تو تحدید پر محمول کریں گے یعنی یہی خاص عدد مراد ہے اور باقی اعداد کے بارے میں یہ کہیں گے کہ یہ تحدید کے لئے نہیں بلکہ یہ تکثیر کے لئے ہے۔ یعنی خواب نبوت کے کئی اجزا میں سے ایک جز ہے۔

دوسری تطبیق یہ ہے کہ اصل میں جزوِ نبوت ہونا اس بات سے مختلف ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو خوابوں کے ساتھ مناسبت کتنی ہے، کسی کو زیادہ مناسبت ہوتی ہے، کسی کو کم اور کسی کو درمیانے درجے کی۔ جس کو بہت زیادہ مناسبت ہے اس کے لئے یہ چوبیسواں جز ہے۔ اور جسے بہت تھوڑی مناسبت ہے اس کے لئے ساٹھواں جز ہے۔ زیادہ تر لوگ چونکہ اس معاملے میں متوسط درجے کے ہوتے ہیں ان کے لئے چھیالیسواں جز ہے اس لئے اکثر حدیثوں میں ذکر بھی چھیالیس کے عدد کا ہے۔ تو مختلف حدیثیں مختلف قسم کے لوگوں کے لئے ہیں۔

بعض حضرات نے یہاں چھیالیس کے عدد میں ایک نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت یعنی دور وحی تئیس سال کا ہے۔ اور نبوت ملنے سے پہلے بطور مقدمے اور تمہید کے آپ پر ایک

دور ایسا گزرا ہے جس میں آپ کو بہت واضح اور بہت سچے خواب نظر آتے تھے۔ جو بھی خواب دیکھتے تھے وہ اس طرح سے سچا اور واضح ہوتا تھا جیسا کہ صبح کی روشنی۔ یہ دور حضور اقدس ﷺ کا چھ مہینے کا رہا ہے۔ تو تئیس سال آپ کا دورِ نبوت ہے اور چھ مہینے خوابوں کا دور ہے، اور چھ مہینے کی جو نسبت ہے تئیس سال کے ساتھ وہ ایک بٹہ چھیالیس ۱/۴۶ ہے یعنی چھ مہینے تئیس سال کا چھیالیسواں جز بنتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوابوں کا دور آپ دورِ نبوت کے مقابلے میں 1/46 کی نسبت رکھتا ہے۔ اس نکتے سے اس بات کی بھی کسی درجے میں تائید ہوتی ہے جو پہلے ہم نے کہی کہ اگر نبوت کا حقیقی جز مراد ہے تو خواب بھی نبی ہی کے مراد ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کو خواب میں دیکھنا

(٣) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم قَالَ: «من رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي ؛ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ فِي صُورَتِي» متفق عليه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا اس لئے کہ شیطان میری شکل میں متشکل نہیں ہو سکتا۔

(٤) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ رَآنِي فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ» متفق عليه.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے حقیقت کو دیکھا۔

ان احادیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جس شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو اس نے واقعۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھا ہے۔ یہ امکان نہیں کہ کوئی شیطان یا کوئی اور مخلوق آپ کی شکل میں متشکل ہو گئی ہو۔ اس لئے کہ کوئی اور مخلوق حتیٰ کہ جنات اور شیاطین جنہیں مختلف شکلیں بنانے کی قدرت دی جاتی ہے وہ بھی آنحضرت ﷺ کی شکل میں متشکل نہیں ہو سکتے، یہ بات نبی کریم ﷺ سے بڑی تعداد میں صحابہ نے روایت کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ سلم کا جو حقیقی حلیہ تھا اور جو حدیث کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے اسی حلیے کے مطابق آپ کو دیکھے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس حلیے سے ہٹ کر کسی اور حلیے میں دیکھے۔ پہلی صورت میں تو اتفاق ہے کہ اس شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھا کسی اور کو نہیں دیکھا۔ لیکن دوسری صورت میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا اب بھی یہی کہیں گے کہ اس شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے۔ اس میں علما کی دو آرا ہیں، ایک رائے تو یہ ہے کہ مذکورہ احادیث اس صورت کے بارے میں نہیں ہیں، یہ حدیثیں صرف اسی صورت سے متعلق ہیں جبکہ آنحضرت ﷺ کو اپنے اصلی حلیے میں دیکھے، چنانچہ امام بخاریؒ نے محمد بن سیرین سے یہی قول نقل کیا ہے[1]۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حدیث دونوں صورتوں میں ہے، خواہ آپ کو آپ کے اصلی حلیے میں دیکھا ہو یا اس سے مختلف حلیے میں، امام نووی نے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے[2]۔ احادیث کے عموم کا بظاہر تقاضا یہی ہے کہ اب بھی اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے، بشرطیکہ خواب کے اندر اس بات کا یقین ہو کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھا ہے تو حلیے میں تبدیلی کیسے آگئی تو حلیے میں تبدیلی دیگر عوارض کی بنا پر آسکتی ہے۔ بعض اوقات یہ بات تو ہوتی ہے کہ آدمی نے دیکھا اس کو ہوتا ہے جس کو سمجھ

1۔ صحیح بخاری حدیث نمبر: ۶۹۹۳ کتاب التعبیر: باب من رأی النبی ﷺ فی المنام۔

2۔ شرح النووی علی صحیح مسلم: کتاب التعبیر حدیث نمبر: ۲۲۶۸۔

رہا ہے لیکن آلہ رُؤیت کی وجہ سے حقیقت میں حلیہ کچھ اور ہوتا ہے نظر کچھ اور آرہا ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی مثال دے چکا ہوں کہ بعض شیشوں میں سے شکل بڑی نظر آتی ہے، بعض سے چھوٹی نظر آتی ہے، بعض سے چہرہ لمبا نظر آتا ہے، بعض سے چوڑا نظر آتا ہے۔ اگر لال عینک سے دیکھیں گے تو چیز لال نظر آئے گی اور اگر کالی عینک سے دیکھیں گے تو کالی نظر آئے گی تو دیکھنے کے آلے سے فرق پڑ جاتا ہے۔ آپ نے اپنا چہرہ ایک ایسے آئینے میں سے دیکھا جس سے چہرہ بہت لمبوترا سا بن جاتا ہے تو جس طرح کا حلیہ آپ کو نظر آرہا ہے وہ آپ کے حقیقی حلیے کے اگرچہ مطابق نہیں ہے پھر بھی کہیں گے یہی کہ آپ نے اپنے آپ کو دیکھا ہے، لیکن آلے کی وجہ سے فرق پڑ گیا ہے۔ اسی طرح دیکھا اگرچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن دماغی تخیّلات یا زندگی کی عام حالت یا دوسرے عام عوارض کی وجہ سے حلیے میں فرق نظر آیا ہے۔ تو یہ غلطی دیکھنے کی ہے مرئی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ اثر رائی کا ہے مرئی کا نہیں ہے مرئی تو جیسا ہے وہ ویسا ہی ہے۔

اگر کوئی شخص خواب میں حضور اقدس ﷺ کو دیکھتا ہے تو یہ دیکھنا اگرچہ بہت بڑی سعادت ہے لیکن یہ کوئی حجت شرعیہ نہیں ہے۔ حجتِ شرعیہ قرآن وسنت اور ان کے تابع دوسرے دلائل ہیں۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے کام کا حکم دیتے ہوئے سنا جو خلاف شریعت ہے تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نعوذ باللہ فلاں کو قتل کردو، فلاں شخص سے سود لے لو، فلاں شخص سے رشوت لے لو اس طرح کی بات اگر سنی تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہوگا۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ خواب حجتِ شرعیہ نہیں ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے وہ زیادہ اہم ہیں بہ نسبت ان باتوں کے جو ہماری نیند میں ہمیں لگتا ہے کہ آپ فرما رہے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں جس میں آپ نے قتل سے، رشوت سے، سود سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے نبی ہی کی باتیں ہیں وہ زیادہ اہم ہیں اس لئے کہ وہ زیادہ قابلِ وثوق ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں۔ خواب ایک تو حجت شرعیہ نہیں اور پھر اس میں خواب دیکھنے والے کی طرف سے بہت ساری غلطیوں کا امکان ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور ہو

اوراس نے سمجھا کچھ اور ہو۔ یہ تو جاگتے ہوئے ہوجاتاہے کہ بعض اوقات آدمی کہتا کچھ اور ہے لیکن سننے والا سمجھتا کچھ اور ہے۔ نیند کے اندر تو دماغی قویٰ اور بھی زیادہ معطل ہوتے ہیں اس لئے اس میں غلطی کا امکان زیادہ ہے۔ اور پھر اگر سنا صحیح بھی ہے تو جاگنے کے بعد یاد رکھنے میں غلطی ہوسکتی ہے کہ خواب میں سنا اور سمجھا کچھ اور تھا لیکن یاد کچھ اور رہ گیا۔ جیساکہ ایک طالب علم استاد سے بات سنتاہے بعض اوقات تو اسی وقت غلط سمجھتاہے اور بعض اوقات اس وقت تو صحیح سمجھا ہوتاہے لیکن بعد میں یاد صحیح نہیں رہتا تو اسی طرح یہاں پر بھی ہوسکتاہے۔اور پھر اگر صحیح بھی یاد رہ گئی بات تو بعض اوقات اس کا ظاہری مطلب مراد نہیں بلکہ اس میں کسی اور بات کی طرف اشارہ ہوتاہے۔ مثال کے طور پر کسی کو حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں یہ فرمارہے ہیں کہ شراب پیو تو ہوسکتاہے کہ یہاں شراب سے مراد عام خمر نہ ہو بلکہ شراب سے مراد شرابِ محبت ہو کہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرو۔ تو الفاظ کا ظاہری مطلب مراد نہ ہو کوئی اور مطلب مراد ہوا یسا بھی بہت احتمال ہوتاہے۔ ایک تو ویسے محاورات میں مجازی معنی مراد ہوتاہے اور دوسرے خوابوں کی دنیا تو خاص طور پر اشارات وکنایات کی دنیاہے، تبھی تو علمِ تعبیر ایک مستقل علم ہے۔ علم تعبیر کا کام یہی اشاروں کنایوں کو سمجھناہے۔اس لئے اس طرح کے خواب پر اعتماد کرکے اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے

-

خواب میں مجھے دیکھنے والا بیداری میں بھی دیکھے گا

(۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِّ صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: «مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَام فيسراني فِي الْيَقَظَةِ وَلَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي» متفق عليه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس آدمی نے خواب میں مجھے دیکھا، وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھ لے گا، اور شیطان میری شکل میں متشکل نہیں ہوسکتا۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں ایک نئی بات آئی کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھے گا۔اس کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ بات آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے بارے میں فرمائی ہے کہ میری زندگی میں جو خواب میں مجھے دیکھے گا اسے جاگتے ہوئے بھی میری زیارت کی توفیق ہوگی۔ بعض نے اس حدیث کو عموم پر محمول کیا ہے کہ کوئی بھی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھے تو وہ آپ کو بیداری میں بھی دیکھے گا لیکن فرق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے جو لوگ تھے ان کے لئے تو وعدہ ہے زندگی میں آپ کو دیکھنے کا اور آپ کے بعد جو لوگ ہیں ان کے لئے وعدہ ہے قیامت کے دن دیکھنے کا۔

خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کے بارے میں بزرگوں کے ذوق بھی مختلف رہے ہیں۔ بعض بزرگوں نے تو باقاعدہ ایسے وظائف لکھے ہیں جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے بعض بزرگوں کا یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ یہ خواہش کرنا بہت بڑی جرأت ہے کہ ہم اس قابل ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ سکیں، چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے کسی نے یہ عرض کیا کہ کوئی ایسا وظیفہ بتا دیجئے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت نصیب ہو جائے تو آپ نے فرمایا کہ آپ تو ماشاء اللہ بڑی ہمت والے ہیں، ہم تو حضور اقدس کے گنبد کو دیکھ لینے کو بھی اپنی حیثیت سے بہت بڑھ کر پاتے ہیں یہ بھی حیثیت سے زیادہ ہے۔

اچھے اور برے خوابوں کے آداب

(٦) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللهِ وَالْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ ؛ فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ مَا يُحِبُّ فَلَا يُحَدِّثُ بِهِ إِلَّا مَنْ يُحِبُّ. وَإِذَا رَأَى مَا يَكْرَهُ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْ شَرِّهَا وَمِنْ شَرِّ الشَّيْطَانِ

وَلْيَتْفُلْ ثَلَاثًا وَلَا يُحَدِّثْ بِهَا أَحَداً فَإِنَّهَا لَنْ تَضُرَّه» متفق عليه.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کوئی آدمی ایسا خواب دیکھے جو اسے اچھا لگے تو اسی شخص کے سامنے اسے ذکر کرے جو اس سے محبت رکھتا ہو اور جب ایسا خواب دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس کو چاہئے کہ اس خواب کے شر سے اور شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ مانگے اور تین مرتبہ تھوک دے اور کسی سے بیان نہ کرے وہ اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔

(۷) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذَا رَأَى أَحَدُكُمُ الرُّؤْيَا يَكْرَهُهَا فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثًا ، وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّيْطَانِ ثَلَاثًا ، وَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِي كانَ عَلَيْهِ» . رَوَاهُ مُسلم.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اسے چاہئے کہ بائیں جانب تین دفعہ تھوکے اور تین دفعہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور اپنی اس کروٹ کو تبدیل کرلے جس پر وہ پہلے تھا۔

یہاں یہ فرمایا گیا کہ رؤیا اللہ کی طرف سے ہے اور حُلم شیطان کی طرف سے ہے۔ اس پر یہ بحث چلی ہے کہ رؤیا اور حُلم میں کیا فرق ہے۔ اس حدیث کے سیاق کے لحاظ سے آسان سی بات یہ ہے کہ رؤیا سے مراد اچھا خواب ہے اور حُلم سے مراد برا خواب ہے۔ یہ فرمایا کہ اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ برے خواب کے خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اس کی شیطان کی طرف نسبت کے کیا معنیٰ ہیں۔ تو اس میں

ایک بات تو یہ ہے بعض برے خوابوں میں شیطان کی وسوسہ اندازی کا اسباب کے درجے میں دخل ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حدیث کا اسلوب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے شیطان خوش ہوتا ہو یا اس سے شیطان کو اپنے مقاصد کے حصول کی توقع پیدا ہوتی ہو اس کو شیطان کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ برے خواب سے بھی شیطان خوش ہوتا ہے ایک تو اس لئے کہ اس سے انسان کو پریشانی لاحق ہوتی ہے اور قرآنِ کریم کے مطابق شیطان بھی مؤمن کو پریشان دیکھنا چاہتا ہے۔ لیحزن الذین آمنوا ولیس بضارھم شیئا إلا بإذن الله (المجادلة : ١٠)۔

اچھے خواب کے آداب:

اچھے خواب کے بارے میں ایک بات تو بعض روایات میں یہ آتی ہے کہ مؤمن کو اس سے خوشی حاصل کرنی چاہئے۔ چنانچہ مسلم کی ایک روایت کے لفظ ہیں فإن رأی رویا حسنۃ فلیبشرہ۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اسے اللہ کا شکر بجالانا چاہئے یعنی الحمد للہ کہنا چاہئے۔

اچھے خواب کے بارے میں یہ بھی متعدد روایات میں آتا ہے کہ یہ خواب دوسروں کے سامنے بیان بھی کیا جا سکتا ہے، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں لفظ ہیں: ولیحدث بھا۔ اچھا خواب بیان کرنا ہو تو کس کے سامنے کرنا چاہئے اور کس کے سامنے نہیں، اس کے بارے میں زیرِ بحث حضرت ابو قتادہؓ کی روایت میں یہ ہے کہ ایسا خواب کسی محبت کرنے والے کے سامنے ہی ذکر کرنا چاہئے۔ جو خواب واضح طور پر ڈراؤنا ہو اس کے بارے میں تو احادیث میں صراحتاً آگیا کہ اسے کسی کے سامنے بیان نہ کرو۔ جو خواب بظاہر اچھا لگ رہا ہے یا وہ واضح طور پر اچھا لگ رہا ہے نہ برا وہ اگر بیان کرنا ہو تو کس کے سامنے بیان کیا جائے، اس کے بارے میں بعض احادیث میں لفظ یہ آتے ہیں لا تقصه إلا علی وادّ أو ذي رأي بعض میں ہے: حبیبا أو لبیبا جیسا کہ دوسری فصل کے شروع میں آرہا ہے۔ بعض میں ہے لا

تقص الرؤیا إلا علی عالم أو ناصح [1]۔ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ خواب ہر ایک کے سامنے بیان نہیں کرنا چاہئے، بلکہ جس کے سامنے خواب بیان کررہے ہو اس میں دو چیزیں دیکھنی چاہئیں، ایک یہ کہ وہ سمجھ دار اور عقل مند ہو، اس کو روایات میں ذی رائی، لبیب اور عالم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ تمہارا خیر خواہ اور ہمدرد ہو بدخواہ نہ ہو۔ اس کو وادّ، حبیب اور ناصح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بدخواہ یا بے کم فہم شخص کے سامنے خواب کیوں بیان نہیں کرنا چاہئے اس کی وجہ باب کے شروع میں تمہیدی امور کے دوران گذر چکی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کے قول کے مطابق تو خواب معبر کی تعبیر کے تابع ہوتی ہے اس کے مطابق تو یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ الٹی سیدھی تعبیر بتادے گا اور پھر اسی کے مطابق رونما ہوگا۔ اور اگر خواب تعبیرِ معبر کے تابع نہ بھی ہو تب بھی کم عقل آدمی الٹی سیدھی تعبیر بیان کردے گا جس کی وجہ سے یہ شخص خواہ مخواہ پریشان رہے گا۔ بدشگونی اور نیک شگونی پر گفتگو کرتے ہوئے پچھلے باب میں یہ بات تفصیل سے عرض کی ہے کہ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ مؤمن کو ہمیشہ پر امید، رجائیت پسند اور optimist ہونا چاہئے۔ اس لئے ہر وہ چیز ممنوع قرار پائی جو مؤمن سے امید کے پھول چھین کر ان کی جگہ ناامیدی کے کانٹے کاشت کرے۔ اس کے علاوہ یہ حکمت بھی گذر چکی ہے کہ بدخواہ شخص کو اچھے خواب کی جب اچھی تعبیر معلوم ہوگی تو وہ تمہارے خلاف حسد کا شکار ہو جائے گا۔

حدیث میں ان دو اوصاف کے درمیان لفظ 'أو' کا استعمال ہوا ہے، جس کے معنی 'یا' کے ہیں، یعنی اس میں یا سمجھداری کا وصف ہو یا خیر خواہی کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دونوں میں سے صرف ایک وصف ہونا چاہئے، بلکہ اصطلاحی لفظوں میں یوں کہئے کہ 'أو' مانعۃ الخلو کے لئے ہے، یعنی دونوں وصفوں میں سے کم از کم ایک تو ہونا چاہئے، اگر دونوں جمع ہو جائیں تو سونے پر سہاگا۔

1۔ مجمع الزوائد ۷/۱۸۲۔

برے خواب کے آداب:

اگر کوئی شخص ایسا خواب دیکھے جو برا اور ڈراؤنا محسوس ہو رہا ہو اس کے بارے میں روایات سے مجموعی طور پر چند آداب سمجھ میں آتے ہیں:

1. جب اس طرح کا خواب نظر آئے تو اللہ تعالی کی پناہ طلب کرے اس خواب کے شر سے۔ یعنی اللہ تعالی سے یہ دعا کرے کہ اس کو اس خواب کے شر سے محفوظ رکھیں۔ اس لئے کہ دعا تو وہ چیز ہے جس سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے لہذا اس خواب میں اگر کوئی شر کا پہلو ہوا بھی تو دعا کی برکت سے وہ ختم ہو جائے گا۔ نیز اس طرح کا خواب دیکھ کر جو پریشانی ذہن میں پیدا ہوئی ہے یہ بھی ایک طرح کی بد شگونی ہے۔ اور پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ بد شگونی کا علاج اللہ پر توکل ہے۔ اللہ کی طرف دعا اور استعاذہ کے ساتھ متوجہ ہونا بھی توکل کی ایک عملی شکل ہے۔ امام بیہقی نے ابراہیم نخعیؒ سے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں: أَعُوذُ بِمَا عَاذَتْ بِهِ مَلَائِكَةُ اللهِ وَرُسُلُهُ مِنْ شَرِّ رُؤْيَايَ اللَّيْلَةَ أَنْ تَضُرَّنِي فِي دِينِي أَوْ دُنْيَايَ يَا رَحْمٰنُ یعنی اے رحمان میں اس ذات کی پناہ طلب کرتا ہو جس کی پناہ فرشتے اور رسول طلب کرتے ہیں اس بات سے کہ یہ خواب مجھے میرے دین یا دنیا میں کوئی نقصان پہنچائے[1]۔
2. اللہ تعالی کی پناہ طلب کرے شیطان کے شر سے۔ اس لئے کہ ایک تو یہ امکان ہے کہ یہ خواب تحزین الشیطان کے قبیل سے ہو، یعنی شیطانی اثرات کا نتیجہ ہو۔ اگر یہ خواب شیطانی تصرف کا نتیجہ نہ بھی ہو بلکہ حدیث النفس کے قبیل سے ہو تب بھی چونکہ مؤمن کی پریشانی اور ناامیدی پر شیطان خوش ہوتا ہے اور اسے امید بندھتی ہے کہ میں اس ناامیدی اور ذہنی الجھاؤ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتا ہوں تو وہ ایسی موقع آ

1۔ شعب الایمان ۶/۴۲۷

دھمکتا ہے تاکہ اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کی کوشش کرے۔اس لئے فرمایا کہ شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔ اگر بالفرض ان باتوں میں کوئی بھی نہ ہو تو تب بھی اَعوذ باللہ پڑھنے میں کوئی نقصان نہیں فائدہ ہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہلے ایک حدیث گذری کہ جب کتے کے بھونکنے اور گدھے کے ہنہنانے کی آواز سنو تو شیطان سے پناہ طلب کرو۔ وہاں یہ عرض کیا تھا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جانور کبھی شیاطین وغیرہ کو دیکھنے کی وجہ سے نہ بول رہے ہوں بلکہ کسی طبعی تقاضے کی وجہ سے بول رہے ہوں، لیکن ہمیں علم نہیں کہ اصل صورتِ حال کیا ہے اس لئے اگر انہوں نے شیطان کو دیکھا ہو گا تو تعوذ کا فائدہ ہو گا اور اگر طبعی تقاضے سے بولے ہوں گے تب بھی تعوذ بے فائدہ نہیں ہو گا۔

3. اس باب کی آٹھویں حدیث میں محمد بن سیرین کے حوالے آرہا ہے اور بعض حضرات نے اسے مرفوع یعنی نبی کریم ﷺ کا ارشاد قرار دیا ہے کہ اسے چاہئے کہ اٹھ کر نماز پڑھ لے، یعنی دو نفل پڑھ لے۔ جو شخص ایسا کر سکے یقیناً اس کے لئے ایسا کرنا اچھا ہے۔ یہ بھی در حقیقت توجہ الی اللہ کی تکمیل ہے۔

4. ایسا خواب دیکھ کر بائیں جانب تین دفعہ تھوکے۔ یہاں روایات میں مختلف الفاظ آتے ہیں مثلا: فلیتفل (ہلکا سا تھوکے)، ولیبصق (تھوکے) ولینفخ یا ولینفث (پھونک مارے)، ان تمام روایات کا مقصد ایک ہے کہ بائیں جانب تھو تھو کر دے، سچ مچ تھوک پھینکنا مراد نہیں ہے۔ تھو تھو کر کے در حقیقت شیطان کو دھتکارنا اور اس سے نفرت کا اظہار کرنا مقصود ہے۔

5. جس کروٹ پر لیٹا ہوا ہے اسے بدل لے۔ اگر پہلے بائیں کروٹ پر لیٹا ہوا تھا تو اب دائیں کروٹ پر ہو جائے، اگر پہلے دائیں کروٹ پر تھا تو اب بائیں کروٹ پر ہو جائے۔ کروٹ تبدیل کرنے میں کیا حکمت ہے، ظاہر ہے کہ یہ اللہ اور رسول ﷺ ہی زیادہ جانتے ہیں۔ ہم نے کسی حکمت کو جان کر عمل نہیں کرنا بلکہ حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے، ہم نے حضور اقدس ﷺ کے تعمیلِ ارشاد کی سعادت حاصل کرنے کے لئے عمل کرنا ہے۔ تاہم یہ حکمت ذہن میں آتی ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی ڈراؤنے خواب کی وجہ آدمی آنکھ کھل جاتی ہے، لیکن اسی کچی پکی نیند کی حالت میں دوبارہ سو جاتا ہے تو اسی پریشان کن خواب کا سلسلہ وہیں

سے شروع ہو جاتا ہے جہاں سے چھوڑا تھا، گویا کیسٹ وہیں سی چل پڑتی ہے جہاں رکی تھی۔ کروٹ بدلنے سے پہلی نیند اچھی طرح منقطع ہو کر نئے سرے سے نیند آتی ہے، اس لئے اس سلسلے کے دوبارہ شروع ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

6. ایسا خواب کسی کے سامنے بیان نہ کرے بلکہ اسے نظر انداز کرے۔ بیان نہ کرنے میں کیا حکمت ہے یہ بات پہلے گذر چکی ہے۔

7. اس خواب سے کسی قسم کی پریشانی نہ لے اور اسے اپنے ذہن پر سوار نہ کرے۔ آں حضرت ﷺ نے واضح طور پر فرمادیا فإنہا لن تضرہ یعنی یہ خواب اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ نقصان کیوں نہیں پہنچے گا اس کی تفصیل تمہیدی امور میں "اچھے یا برے خواب کا زیادہ اثر نہیں لینا چاہئے" کے عنوان سے گذر چکی ہے، اسے ایک دفعہ دوبارہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

آخری زمانے میں زیادہ خواب سچے ہوں گے

(٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ يَكَدْ يَكْذِبُ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ ، وَرُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ ، وَمَا كَانَ مِنَ النُّبُوَّةِ فَإِنَّهُ لَا يَكْذِبُ» . قَالَ مُحَمَّدُ ابْنُ سِيرِينَ: وَأَنَا أَقُولُ: الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: حَدِيثُ النَّفْسِ وَتَخْوِيفُ الشَّيْطَانِ وَبُشْرَى مِنَ اللهِ. فَمَنْ رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلَا يَقُصَّهُ عَلَى أَحَدٍ وَلْيَقُمْ فَلْيُصَلِّ. قَالَ: وَكَانَ يُكْرَهُ الْغُلُّ فِي النَّوْمِ وَيُعْجِبُهُمُ الْقَيْدُ وَيُقَال: الْقَيْد ثبات فِي الدّين. متفق عليه.

قال البخاري: رواه قتادة ويونس وهشام وأبو هلال عن ابن سيرين عن أبي

هريرة. وقال يونس: لا أحسبه إلا عن النبي صلى الله عليه وسلم في القيد.
وقال مسلم: لا أدري هو في الحديث أم قاله ابن سيرين؟ وفي رواية نحوه
وأدرج في الحديث قوله: «وأكره الغل. . .» إلى تمام الكلام.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے ارشاد فرمایا کہ جب زمانہ قریب ہو جائے تو مؤمن کا خواب بہت کم جھوٹا ہوتا ہے۔ اور مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے اور جو چیز نبوت میں سے ہو وہ جھوٹی نہیں ہوتی۔ محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ خواب تین طرح کے ہوتے ہیں حدیث النفس یعنی خیالات کا نتیجہ اور وہ خواب جو شیطان کے ڈرانے سے ہوتے ہیں اور وہ خواب جو اللہ کی طرف سے خوش خبری ہوتے ہیں۔ تم میں سے جو آدمی ایسی چیز دیکھے جو اسے ناپسند ہو تو اس خواب کو کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور اٹھے اور نماز پڑھ لے۔ محمد بن سیرین نے یہ بھی کہا کہ ہم سے پہلے لوگوں میں (یعنی صحابہ میں یا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں) نیند یا خواب میں طوق کو ناپسند کیا جاتا تھا اور انہیں (صحابہ کرام یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو) بیڑی پسند تھی اور کہا جاتا تھا کہ بیڑی دین میں ثابت قدمی کی علامت ہے۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں ارشاد فرمایا کہ اذا اقترب الزمان لم یکد یکذب رؤیا المؤمن کہ جب اقتراب زمان ہو تو مؤمن کا خواب بہت کم جھوٹا ہوتا ہے۔ اقترابِ زمان سے کیا مراد ہے اس کی کئی تشریحیں کی گئی ہیں۔

ایک تشریح یہ ہے کہ الزمان سے مراد قیامت کا زمانہ ہے اور اقترابِ زمان سے مراد ہے کہ جب قیامت قریب آ جائے گی تو خواب بکثرت سچے ہوا کریں گے۔ اس لئے کہ قربِ قیامت کا زمانہ در حقیقت خرقِ عادات زمانہ ہو گا بہت سارے کام اس میں خرقِ عادت ہوں گے۔ مہدی کی بہت ساری کرامات خرقِ عادت ہوں گی، دجال خرق عادت ہو گا، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام خرق عادت ہو گا وغیرہ وغیرہ۔ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ چونکہ اس زمانے

میں مؤمن اجنبیت کا شکار ہوگا، اس کا کوئی انیس نہیں ہوگا اس لئے اچھے اور سچے خوابوں کو اس کی تسلی کا سامان بنایا جائے گا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ الزمان سے مراد صبح کا وقت ہے تو مطلب یہ ہے کہ جب صبح کا وقت قریب ہو تو خواب عموماً سچے ہوتے ہیں۔یعنی آخر شب کے خواب زیادہ قابل اعتبار ہوتے ہیں۔

اور تیسرا قول یہ ہے کہ دن رات کا اپنی لمبائی میں ایک دوسرے کے تقریباً برابر ہو جانا مراد ہے، یعنی نہ دن زیادہ لمبے ہوں اور نہ رات زیادہ لمبی ہو۔اور ایسا ہوتا ہے جب کہ موسم بھی معتدل ہو۔تو مطلب ہوا کہ جب موسم میں اعتدال ہو تو خواب زیادہ سچے ہوتے ہیں اس لئے کہ خواب ان موسموں میں دیگر عوارض سے کم متأثر ہوتے ہیں۔

ساتھ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا خواب چونکہ نبوت کا جز ہے اور جو چیز نبوت کا جز ہو وہ جھوٹی نہیں ہوتی اس لئے خواب بھی جھوٹے نہیں ہوتے۔اس کی وضاحت کرنے کے لئے محمد بن سیرین نے خواب کی تین قسمیں ذکر فرمائی ہیں۔یہ بتانے کے لئے کہ یہ بات ہر خواب کے بارے میں نہیں ہے بلکہ تیسری قسم کے خواب یعنی بشریٰ من اللہ کے بارے میں ہے۔لہٰذا ہر خواب کا سچا ہونا ضروری نہیں ہے۔

آخر میں محمد بن سیرین یہ فرمارہے ہیں کہ ہم سے پہلے زمانے میں خواب میں یہ دیکھنا کہ گلے میں طوق ہے ناپسند سمجھا جاتا تھا۔یعنی صحابہ کرام اس کو اچھا خواب نہیں سمجھتے تھے یا نبی کریم ﷺ اس کو اچھا خواب نہیں سمجھتے تھے ،اس لئے کہ گلے میں طوق اہلِ دوزخ کی علامت ہے ﴿اذا الاغلال فی اعناقهم والسلاسل يسحبون فی الحميم ثم في النار يسجرون﴾ [الغافر : ٧١- ٧٢] اور یہ بھی فرمایا کہ سلف کو خواب میں بیڑی دیکھنا یعنی یہ دیکھنا کہ پاؤں کے اندر بیڑی ہے یہ پسند تھا اس لئے کہ پاؤں میں بیڑی ہونا یہ علامت ہے پابند ہونے کی اور دین بھی درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لگائی گئی کچھ پابندیوں کا نام ہے تو پاؤں میں بیڑی ہونے کا مطلب یہ ہے

کہ اس کو دین میں رسوخ اور ثابت قدمی حاصل ہے۔ اہلِ تعبیر یہ بھی کہا ہے کہ ہر خواب میں بیڑی کی تعبیر دین میں ثابت قدمی ہو نا ضروری نہیں ہے، بعض قرائن کی وجہ سے تعبیر مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ اس روایت سے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو خواب دیکھنے میں ناپسندیدہ ہو اس کی تعبیر بھی بری ہو۔ جو چیز جاگتے ہوئے ناپسند ہوتی ہے اس کی تعبیر بھی بری ہو یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ پاؤں میں بیڑی پڑ جانا جاگتے ہوئے اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن یہی چیز اگر خواب کے اندر دیکھتا ہے تو پسندیدہ ہے۔

حدیث کا کونسا حصہ مرفوع ہے اور کونسا نہیں:

اس روایت کے تین حصے ہیں، پہلا حصہ ہے حدیث کے شروع سے لے کر ''لایکذب'' تک۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں خواب کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ تیسرا حصہ وہ ہے جس طوق اور بیڑی کی تعبیر بیان کی گئی ہے۔ مشہور روایات کے مطابق اس حدیث کی سند کا مدار محمد بن سیریں ہیں، محمد بن سیرین سے یہ روایت ان کے کئی شاگردوں نے نقل کی ہے۔ یہاں صاحبِ مشکوۃ نے بخاری کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اسے محمد بن سیرین سے رایت کرنے والے راوی کا نام عوف ہے۔ عوف نے یہاں تینوں حصوں کے بارے میں الگ الگ وضاحت کر دی ہے کہ پہلا حصہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے، دوسرا محمد بن سیرین کا اور تیسرا بھی انہی کا ہے جس میں وہ اپنے بڑوں کی بات نقل کر رہے ہیں۔ امام بخاری فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ عوف نے تو ان تینوں حصوں کو الگ کر دیا ہے لیکن دیگر کئی راویوں نے تینوں باتوں کو حدیث مرفوع میں ہی مدرج کر دیا ہے۔ گویا امام بخاری کے نزدیک عوف کی روایت راجح ہے اور ان کی رائے میں خوابوں کی تین قسمیں اور طوق اور بیڑی کی بات حدیث مرفوع کا حصہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ امام بخاری کی رائے ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے قرطبیؒ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک راجح یہ ہے کہ تینوں باتیں نبی کریم

ﷺ کا ارشاد ہیں[1]۔ اس کا ایک قرینہ یہ ہو سکتا ہے کہ امام نسائی کی السنن الکبری میں ابو سلمۃ بن عبد الرحمن کی حضرت ابوہریرہ سے روایت نقل کی ہے اس میں حضور اقدس ﷺ سے نقل کرتے ہوئے خواب کی یہی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں[2]، اس سند میں محمد بن سیرین نہیں ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقسیم دراصل محمد بن سیریں کی طرف سے نہیں ہے۔ سلف میں ایسا ہوتا تھا کہ حدیث تو مرفوع ہوتی تھی لیکن کسی موقع پر اسے بیان کرتے ہوئے کسی وجہ سے اسی صراحتاً نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جہاں محمد بن سیریں کے قول کے طور پر یہ بات منقول ہو وہاں بھی اصل صورتِ حال یہی ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

خواب میں اپنا سر کٹتے دیکھنا

(٩) وَعَن جَابر قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إلى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ رَأْسِي قُطِعَ قَالَ: فَضَحِكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ: «إِذَا لَعِبَ الشَّيْطَانُ بِأَحَدِكُمْ فِي مَنَامِهِ فَلَا يُحَدِّثْ بِهِ النَّاس» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ میرا سر کاٹ دیا گیا ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کسی شخص کو اس کی نیند میں شیطان کھلونا بنائے تو اس کا لوگوں کے سامنے ذکر نہ کیا کرے۔

1۔ فتح الباری ۱۲/۴۰۹۔

2۔ السنن الکبری للنسائی حدیث نمبر ۱۰۶۷۶

اس شخص نے خواب میں یہ دیکھا تھا کہ میرا سر کاٹ دیا گیا تو حضور اقدس ﷺ نے اس کو ایک شیطانی مذاق قرار دیا کہ شیطان نے تمہارے ساتھ تمسخر کیا ہے، اس لئے اس خواب کو کوئی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ خواب میں سر کٹنے کی کوئی تعبیر ہی نہیں ہے بلکہ اہل تعبیر نے اس کی مختلف تعبیریں لکھی ہیں، بعض تعبیریں اچھی ہیں، بعض بری ہیں۔ مثلاً ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ اگر وہ بیمار ہے تو شفایاب ہو جائے گا۔ اگر مقروض ہے تو اس کے قرضے ادا ہو جائیں گے۔ اور اگر جیل میں ہے تو رہا ہو جائے گا اور اگر کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے تو چھوٹ جائے گا۔ یہ تعبیر بھی اس کی ہے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں اس کو شیطانی خواب اس لئے قرار دیا کہ تعبیر کے بارے میں اشخاص کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے۔ ایک ہی خواب ہوتا ہے کسی شخص کے حق میں اس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی بلکہ اضغاث احلام ہوتے ہیں یا تخویف الشیطان کے قبیل سے ہوتا ہے اور دوسرے شخص کے حق میں اس کی اچھی تعبیر ہوتی ہے۔ اور کسی شخص کے حق میں اس کی بری تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ تو یہاں اس شخص کے بارے میں دوسرے قرائن اور شواہد یا اپنی فراست سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ اس کے لئے یہ خواب بے معنی ہے اور اکثر اس طرح کے خواب بے معنی ہی ہوتے ہیں لیکن بعض کے حق میں ان کی کوئی تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔

ناموں کے معانی کے ذریعے خواب کی تعبیر

(۱۰) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «رَأَيْتُ ذَاتَ لَيْلَةٍ فِيمَا يَرَى النَّائِمُ كَأَنَّا فِي دَارِ عُقْبَةَ بْنِ رَافِعٍ ، فَأُوتِينَا بِرُطَبٍ مِنْ رُطَبِ ابْنِ طَابٍ ، فَأَوَّلْتُ أَنَّ الرِّفْعَةَ لَنَا فِي الدُّنْيَا وَالْعَاقِبَةَ فِي الْآخِرَةِ ، وَأَنَّ دِينَنَا قَدْ طَابَ» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا جیسا کہ ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہوں اور ہمارے پاس ابن طاب کی کھجوریں لائی گئیں تو میں نے اس کی تعبیر یہ سمجھی کہ ہمارے لئے دنیا میں سربلندی ہے اور آخرت میں اچھا انجام ہے اور ہمارا دین بہت اچھا ہے۔

خواب یہ دیکھا کہ ہم عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ہمارے پاس ابن طاب کی کھجوریں لائی گئی ہیں۔ یہ کھجوروں کی ایک خاص قسم کا نام ہے اور یہ کسی شخص کی طرف منسوب ہیں۔ بعض اوقات پھل وغیرہ کی قسمیں کسی شخص کی طرف منسوب کردی جاتی ہیں جس کا پہلا باغ اس قسم کے پھل کا ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ لنگڑا آم ہے۔ اور اسی طرح ابنِ طاب اصل میں تو کوئی آدمی ہوگا، لیکن اس کے نام پر کھجوروں کی خاص قسم کا نام ہوگیا۔ چونکہ عقبہ کے گھر میں ہیں اس لئے تعبیر یہ سمجھی گئی کہ العاقبۃ لنا فی الاٰخرۃ کہ آخرت میں ہمارے لئے اچھا انجام ہے۔ اور چونکہ عقبہ بن رافع کے گھر میں جس کے گھر میں ہیں اس کے والد کا نام رافع ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہمارے لئے رفعت اور سربلندی ہے اور چونکہ ابن طاب کی کھجوریں کھائی گئی ہیں اور طاب یطیب کے معنی ہوتے ہیں اچھا ہونا اس لئے اس کی تعبیر یہ ہے کہ ہمارا دین اچھا ہے۔ یعنی کامل، خوبصورت اور آسان ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ تعبیر کے دوسرے اصولوں کے علاوہ ایک اصول یہ بھی ہے کہ جو چیز دیکھی گئی ہے اس کے ناموں کے لغوی معنی کے اعتبار سے تعبیر دی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ایک خواب

(۱۱) وَعَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «رَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أُهَاجِرُ مِنْ مَكَّةَ إِلَى أَرْضٍ بِهَا نَخْلٌ ، فَذَهَبَ وَهْلِي إِلَى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرُ ، فَإِذَا هِيَ الْمَدِينَةُ يَثْرِبُ. وَرَأَيْتُ فِي رُؤْيَايَ هَذِهِ: أَنِّي هَزَزْتُ سَيْفًا فَانْقَطَعَ صَدْرُهُ ، فَإِذَا هُوَ مَا أُصِيبَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ أُحُدٍ. ثُمَّ هَزَزْتُهُ أُخْرَى فعادَ أَحْسَنَ مَا

كانَ ، فإِذا هوَ ما جَاءَ اللهُ بِهِ مِنَ الْفَتْحِ وَاجْتِمَاعِ الْمُؤْمِنِينَ)). متفق عليه.

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے خواب کے اندر دیکھا کہ میں مکے سے ایسی زمین کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جس میں کھجوریں بہت ہیں تو میرا ذہن اس طرف گیا کہ یہ یمامہ یا ہجر ہے لیکن بعد میں وہ مدینہ یعنی یثرب نکلا، اور میں نے اپنے اس خواب میں یہ دیکھا کہ میں نے ایک تلوار کو حرکت دی تو اس کا اگلا حصہ کٹ گیا۔ اس سے مراد وہ تکلیف تھی جو مسلمانوں کو احد والے دن پہنچی۔ پھر میں نے اس کو دوسری مرتبہ ہلایا تو وہ اچھی حالت پر لوٹ آئی اس سے مراد وہ فتح اور مسلمانوں کی اجتماعیت تھی جو اللہ تعالیٰ نے بعد میں عطا فرمائی۔

اس خواب میں حضور اقدس نے تین چیزیں دیکھی ہیں۔ یہ خواب آپ نے مکی دور میں دیکھا ہے اور اسی ترتیب سے ان کی تعبیریں رونما ہوئی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ دیکھی کہ میں ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہوں جہاں کھجوروں کے باغات پائے جاتے ہیں۔ اٹھ کر میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں کھجوروں والے علاقے کی طرف ہجرت کروں گا اور یہ ذہن میں آیا کہ غالباً یہ یمامہ یا ہجر کا علاقہ ہوگا، کیونکہ ان علاقوں میں بھی کھجوریں بکثرت پائی جاتی تھیں، لیکن بعد میں عملاً ایسا نہیں ہوا بلکہ اللہ کی طرف سے مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا حکم آیا۔ اس سے پتا چلا کہ نبی کا خواب اگرچہ وحی ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن خواب کی تعبیر کی تفصیلات چونکہ نہیں بتائی جاتیں، وہ بعض اوقات اپنے اجتہاد سے طے کرنی ہوتی ہیں، اس لئے اس میں غلطی واقع ہو سکتی ہے۔ مثلاً تعبیر تو صحیح سمجھی لیکن اس کے وقت میں غلطی ہو گئی یا تعبیر تو صحیح سمجھی لیکن اس کے جزوی انطباق میں غلطی ہو گئی۔ جیسا کہ قرآن وحدیث یقیناً وحی اور منزل من اللہ ہیں لیکن کسی مجتہد سے کسی نص کو سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نص من جانب اللہ نہیں رہی یا وحی نہیں رہی۔ اسی طرح خواب کی تفصیلات سمجھنے میں اگر اجتہادی غلطی واقع ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ خواب وحی نہیں تھا۔ مثال کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں یہ

دیکھا کہ ہم عمرہ کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تعبیر یہ سمجھے کہ ہم عمرہ کریں گے اور اس حد تک یہ تعبیر سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ البتہ یہ کہ کب کریں گے خواب میں اس کا کوئی ذکر یا اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے کہ شاید اسی سال موقع مل جائے لیکن اس سال موقع نہیں ملا آئندہ سال موقع ملا۔ تو خواب وحی تھا اور فی الجملہ اس کی تعبیر بھی صحیح ثابت ہوئی ہے لیکن ایک ثانوی امر میں غلطی واقع ہوگئی۔ اسی طریقے سے یہاں پر ہوا کہ خواب میں دیکھا کہ ایسی زمین کی طرف جا رہا ہوں جہاں کھجوریں کثرت سے پائی جاتی ہیں اور اس کی تعبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سمجھے کہ ایسے علاقے کی طرف میں ہجرت کروں گا جہاں کھجوریں ہوں گی۔ اس حد تک تعبیر سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ تعبیر میں تو غلطی نہیں ہوئی البتہ اس تعبیر کے کسی زمان یا مکان پر منطبق کرنے میں غلطی واقع ہوگئی۔ کہ پہلے خواب میں زمان پر انطباق صحیح ثابت نہیں ہوا، اور یہاں مکان پر انطباق صحیح ثابت نہیں ہوا کہ اندازہ یہ لگایا کہ یہ یمامہ یا ہجر ہو لیکن ہجرت ہوئی بعد میں مدینہ منورہ کی طرف لیکن اصل خواب اور اس کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی۔

دوسری چیز خواب میں یہ دیکھی اور یہ ہجرت کے بعد پیش آئی کہ میرے ہاتھ میں ایک تلوار ہے اور اس تلوار کو میں نے ہلایا تو اس کا اگلا حصہ کٹ گیا، اس میں اشارہ تھا اس شکست اور مسلمانوں کے نقصان کی طرف جو غزوۂ احد میں ہوا۔ تیسری چیز خواب میں دیکھی کہ اسی تلوار کو جب دوسری مرتبہ ہلایا تو وہ بالکل صحیح ہوگئی۔ اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ غزوۂ احد میں ہونے والے نقصان کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتوحات اور کامیابیاں عطا فرمائیں گے۔ ایک کوششِ جہاد بظاہر عارضی طور پر ناکام نظر آئے گی لیکن بعد میں جہاد کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔ تلوار ہلانا یہ اشارہ ہے جہاد کی کوشش کی طرف تو ایک مرتبہ تو اس میں دیکھنے میں ناکامی سی محسوس ہوئی لیکن بعد میں سب کچھ درست ہو گیا۔

مسیلمہ اور اسود کے بارے میں نبی ﷺ کا ایک خواب

(١٢) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ بِخَزَائِنِ الْأَرْضِ فَوُضِعَ فِي كَفَّيَّ سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ فَكَبُرَا عَلَيَّ فَأُوحِيَ إِلَيَّ أَنِ انْفُخْهُمَا فَنَفَخْتُهُمَا فَذَهَبَا فَأَوَّلْتُهُمَا الْكَذَّابَيْنِ اللَّذَيْنِ أَنَا بَيْنَهُمَا صَاحِبَ صَنْعَاءَ وَصَاحِبَ الْيَمَامَةِ» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَفِي رِوَايَةٍ: «يُقَالُ لِأَحَدِهِمَا مُسَيْلِمَةُ صَاحِبُ الْيَمَامَةِ وَالْعَنْسِيُّ صَاحِبُ صَنْعَاءَ» لَمْ أَجِدْ هَذِهِ الرِّوَايَةَ فِي (الصَّحِيحَيْنِ)، وَذكرهَا صَاحب الْجَامِع عَن التِّرْمِذِيّ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی اثنا میں کہ میں سویا ہوا تھا میرے پاس زمین کے خزانے لائے گئے اور میرے دونوں ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن رکھے گئے۔ اور یہ کنگن مجھ پر گراں گزرے تو خواب میں ہی مجھے وحی کی گئی کہ انہیں پھونک مارو۔ میں نے ان دونوں کو پھونک ماری تو وہ دونوں اڑ گئے۔ میں نے اس کی تعبیر کی ہے دو جھوٹے شخصوں سے جن کے درمیان میں میں ہوں ایک صنعا والا آدمی ہے، اور دوسرا یمامہ والا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ان میں سے ایک مسیلمہ ہے جو یمامہ کا رہنے والا ہے اور دوسرا اسود عنسی ہے جو کہ صنعا کا رہنے والا ہے۔

اس خواب میں بھی تین چیزیں ہیں۔ پہلی چیز تو یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میرے پاس زمین کے خزانے لائے گئے اور ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ زمین مجھے سمیٹ کر دکھائی گئی اور جتنی زمین مجھے سمیٹ کر دکھائی گئی وہاں وہاں تک میری امت کا اقتدار پہنچے گا۔ اور ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ مجھے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں۔ اس زیرِ بحث روایت میں یہ ہے کہ خزانے دیئے گئے اور دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ زمین

کے خزانوں کی چابیاں میرے ہاتھ میں پکڑائی گئیں۔اس میں در حقیقت اشارہ ہے کہ اللہ جل جلالہ اس امت کو زمین کے خزائن عطافرمائیں گے۔ چنانچہ آج یہی صورت حال ہے کہ قدرتی وسائل سے مالامال دنیا کے جو علاقے ہیں ان کاایک بہت بڑا حصہ ایساہے جہاں مسلمان آباد ہیں۔ مسلمانوں کے کئی علاقے زراعت کے اعتبار سے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ کئی علاقے معدنی ذخائر اور تیل و گیس وغیرہ کے اعتبار سے سے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں۔ مزید پتا نہیں کیاکچھ مسلمانوں کی زمینوں کے نیچے چھپاہواہے۔ یہ در حقیقت نبی کریم ﷺ کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان ان وسائل سے فائدہ نہ اٹھائیں اور ان سے غیر فائدہ اٹھالیں اور ان کا تسلط ان پر قائم ہو۔ یہ ہماری اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہے۔اللہ تعالیٰ نے بہر حال خزائنِ ارض جتنے اس امت کو عطافرمائے ہیں اتنے کسی امت کو عطا نہیں فرمائے۔

دوسری چیز خواب میں یہ دیکھی کی ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کنگنوں کی وجہ سے میری طبیعت پر بڑی گرانی ہوئی۔ یہ در حقیقت اشارہ تھااور یہ تعبیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بیان فرمائی،اشارہ تھادو جھوٹے نبیوں کی طرف ایک مسلیمۂ کذاب جو کہ یمامہ کا رہنے والا تھا، اور دوسرااسودِ عنسی جو کہ صنعاء کا رہنے والا تھا۔ صنعاء یمن کاایک اہم شہر تھااور ہے،جو کہ مدینہ منورہ سے جنوب میں ہے۔ یمامہ نجد کے ایک علاقے کا نام ہے،جو تقریباًاس علاقے میں ہے جہاں آج کل سعودی عرب کا دار الحکومت ریاض ہے۔ یہ علاقہ مدینہ منورہ سے تقریبامشرق کی طرف ہے۔اس طرح یہ جو آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں ان دو آدمیوں کے درمیان میں ہوں تو یہ درمیان میں ہونا مجازاً ہے۔ بالکلیہ درمیان میں تب ہوتے جبکہ ایک جنوب میں ہے تو دوسرا شمال ہوتا۔

یہاں شارحین حدیث نے یہ سوال اٹھایاہے کہ جھوٹی نبوت اور سونے کے کنگنوں میں مناسبت کیاہے۔ تو مناسبت در حقیقت یہ ہے کہ سونے پہننامرد کے لئے جائز نہیں ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں سونے کاہونا یہ ایک قسم کا وضع الشیَٔ فی غیر محلہ اور ظلم ہے اور جھوٹی نبوت کے دعوے سے بڑھ کر ظلم کیاہو سکتاہے اس لئے یہ تعبیر بیان کی گئی۔

تیسری چیز کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے خواب میں حکم دیا گیا کہ ان کو پھونک مارو میں نے پھونک ماری تو دونوں کنگن اڑ گئے، جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ بظاہر کچھ خوش نمائی ہو گی، کچھ کچھ شور شرابا ہو گا، بعض لوگ ان کے فتنے میں مبتلا بھی ہو جائیں گے لیکن بہت جلدی یہ فتنہ فرو ہو جائے گا، اور انہیں ملے گا کچھ نہیں، بس دو پھونکوں کی مار ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ اسودِ عنسی تو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں قتل ہو گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الوفات میں حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور مسلیمۂ کذاب کی اگرچہ ایک بڑی طاقت تھی لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں اس کے خلاف جو جنگ ہوئی اس میں ان کو شکست ہوئی اور حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مسلیمۂ کذاب بھی جہنم رسید ہو گیا، اور اس طریقے سے دونوں فتنے بہت جلد فرو ہو گئے اور ان کا دنیا میں کہیں نام و نشان باقی نہ رہا۔

یہاں صاحب مشکوۃ فرما رہے ہیں مجھے یہ روایت صحیحین میں نہیں ملی، حالانکہ صاحبِ شرح السنہ نے اسے صحاح میں ذکر کیا ہے جس میں وہ صحیحین میں سے کسی کی حدیث لایا کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث لفظوں کے معمولی فرق کے ساتھ صحیحین میں موجود ہے، مثلاً صحیح بخاری کے کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفہ میں اور کتاب التعبیر، باب النفخ فی المنام میں۔ اور صحیح مسلم کے کتاب الرؤیا، باب رؤیا النبی ﷺ میں۔

خواب میں چشمہ دیکھنے کی تعبیر

(١٣) وَعَنْ أُمِّ الْعَلَاءِ الْأَنْصَارِيَّةِ قَالَتْ: رَأَيْتُ لِعُثْمَانَ بْنِ مَظْعُونٍ فِي النَّوْمِ عَيْنًا تَجْرِي فَقَصَصْتُهَا عَلَى رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: «ذَلِكِ عَمَلُهُ يُجْرَى لَهُ» . رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ

ترجمہ: ام علاء انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے خواب میں حضرت عثمان بن

مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے ایک بہتا ہوا چشمہ دیکھا تو میں نے یہ خواب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ یہ ان کے عمل ہیں جو ان کے لئے جاری ہیں۔

یہ خواب امّ علاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد دیکھا کہ عثمان بن مظعون ہیں اور ان کا ایک چشمہ ہے جو بہہ رہا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ ان کے عمل ان کے انتقال کے بعد بھی جاری ہیں۔ ویسے اصول تو یہ ہے کہ موت سے عمل منقطع ہو جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ بھی ہوتے اور ان کے عمل کا سلسلہ یعنی ان کا ثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

خواب میں بعض گناہوں کی سزا کی تمثیل

(١٤) وَعَن سُمرةَ بنِ جُندب قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ فَقَالَ: «مَنْ رَأَى مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا؟» قَالَ: فَإِنْ رَأَى أَحَدٌ قَصَّهَا فَيَقُولُ: مَا شَاءَ اللهُ. فَسَأَلَنَا يَوْمًا فَقَالَ: «هَلْ رَأَى مِنْكُمْ أَحَدٌ رُؤْيَا؟» قُلْنَا: لَا قَالَ: «لَكِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ أَتَيَانِي فَأَخَذَا بِيَدَيَّ فَأَخْرَجَانِي إِلَى أَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ ، فَإِذَا رَجُلٌ جَالِسٌ وَرَجُلٌ قَائِمٌ بِيَدِهِ كَلُّوبٌ مِنْ حَدِيدٍ يُدْخِلُهُ فِي شِدْقِهِ فَيَشُقُّهُ حَتَّى يَبْلُغَ قَفَاهُ ثُمَّ يَفْعَلُ بِشِدْقِهِ الْآخَرِ مِثْلَ ذَلِكَ وَيَلْتَئِمُ شِدْقُهُ هَذَا فَيَعُودُ فَيَصْنَعُ مِثْلَهُ. قُلْتُ: مَا هَذَا؟ قَالَا: انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا حَتَّى أَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ عَلَى قَفَاهُ وَرَجُلٌ قَائِمٌ عَلَى رَأْسِهِ بِفِهْرٍ أَوْ صَخْرَةٍ يَشْدَخُ بِهَا رَأْسَهُ فَإِذَا ضَرَبَهُ تَدَهْدَهَ الْحَجَرُ فَانْطَلَقَ إِلَيْهِ لِيَأْخُذَهُ فَلَا يَرْجِعُ إِلَى هَذَا حَتَّى يَلْتَئِمَ رَأْسُهُ وَعَادَ رَأْسُهُ كَمَا كَانَ فَعَادَ إِلَيْهِ فَضَرَبَهُ فَقُلْتُ: مَا هَذَا؟ قَالَا: انْطَلِقْ.

فَانْطَلَقْنَا حَتَّى أَتَيْنَا إِلَى ثَقْبٍ مِثْلِ التَّنُّورِ أَعْلَاهُ ضَيِّقٌ وَأَسْفَلَهُ وَاسِعٌ تَتَوَقَّدُ تَحْتَهُ نَارٌ فَإِذَا ارْتَفَعَتِ ارْتَفَعُوا حَتَّى كَادَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا وَإِذَا خَمَدَتْ رَجَعُوا فِيهَا وَفِيهَا رِجَالٌ وَنِسَاءٌ عُرَاةٌ فَقُلْتُ: مَا هَذَا؟ قَالَا: انْطَلِقْ. فَانْطَلَقْنَا حَتَّى أَتَيْنَا عَلَى نَهَرٍ مِنْ دَمٍ فِيهِ رَجُلٌ قَائِمٌ عَلَى وَسْطِ النَّهَرِ وَعَلَى شَطِّ النَّهَرِ رَجُلٌ بَيْنَ يَدَيْهِ حِجَارَةٌ فَأَقْبَلَ الرَّجُلُ الَّذِي فِي النَّهَرِ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فِي فِيهِ فَرَدَّهُ حَيْثُ كَانَ فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ رَمَى فِي فِيهِ بِحَجَرٍ فَيَرْجِعُ كَمَا كَانَ فَقُلْتُ مَا هَذَا؟ قَالَا: انْطَلِقْ. فَانْطَلَقْنَا حَتَّى انْتَهَيْنَا إِلَى رَوْضَةٍ خَضْرَاءَ فِيهَا شَجَرَةٌ عَظِيمَةٌ وَفِي أَصْلِهَا شَيْخٌ وَصِبْيَانٌ وَإِذَا رَجُلٌ قَرِيبٌ مِنَ الشجرةِ بَيْنَ يَدَيْهِ نَارٌ يُوقِدُهَا فَصَعِدَا بِيَ الشَّجَرَةَ فأدخلاني دار أوسطَ الشَّجَرَةِ لَمْ أَرَ قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهَا فِيهَا رِجَالٌ شُيُوخٌ وَشَبَابٌ وَنِسَاءٌ وَصِبْيَانٌ ثُمَّ أَخْرَجَانِي مِنْهَا فصعدا بِي الشَّجَرَة فأدخلاني دَاراً هِيَ أَحْسَنُ وَأَفْضَلُ مِنْهَا ، فِيهَا شُيُوخٌ وَشَبَابٌ. فَقُلْتُ لَهُمَا: إِنَّكُمَا قَدْ طَوَّفْتُمَانِي اللَّيْلَةَ فَأَخبِرَانِي عَمَّا رَأَيْتُ قَالَا: نَعَمْ أَمَّا الرَّجُلُ الَّذِي رَأَيْتَهُ يُشَقُّ شِدْقُهُ فَكَذَّابٌ يُحَدِّثُ بِالْكَذْبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتَّى تَبْلُغَ الْآفَاقَ فَيُصْنَعُ بِهِ مَا تَرَى إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِي رَأَيْتَهُ يُشْدَخُ رَأْسُهُ فَرَجُلٌ عَلَّمَهُ اللهُ الْقُرْآنَ فَنَامَ عَنْهُ بِاللَّيْلِ وَلَمْ يَعْمَلْ بِمَا فِيهِ بِالنَّهَارِ يُفْعَلُ بِهِ مَا رَأَيتَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَالَّذِي رَأَيْتَهُ فِي الثَّقْبِ فَهُمُ الزُّنَاةُ وَالَّذِي رَأَيْتَهُ فِي النَّهَرِ آكِلُ الرِّبَا وَالشَّيْخُ الَّذِي رَأَيْتَهُ فِي أَصْلِ الشَّجَرَةِ إِبْرَاهِيمُ وَالصِّبْيَانُ حَوْلَهُ فَأَوْلَادُ النَّاسِ

وَالَّذِي يُوقِدُ النَّارَ مَالِكٌ خَازِنُ النَّارِ وَالدَّارُ الْأُولَى الَّتِي دَخَلْتَ دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِينَ وَأَمَّا هَذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ وَأَنَا جِبْرِيلُ وَهَذَا مِيكَائِيلُ فَارْفَعْ رَأْسَكَ فَرَفَعْتُ رَأْسِي فَإِذَا فَوْقِي مِثْلُ السَّحَابِ وَفِي رِوَايَةٍ مِثْلُ الرَّبَابَةِ الْبَيْضَاءِ قَالَا: ذَلِكَ مَنْزِلُكَ قُلْتُ: دَعَانِي أَدْخُلْ مَنْزِلِي قَالَا: إِنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَهُ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ» . رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَذُكِرَ حَدِيثُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ فِي رُؤْيَا النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَدِينَةِ فِي» بَاب حرم الْمَدِينَة

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی نماز پڑھتے تو اپنا چہرہ ہماری طرف کرکے متوجہ ہوتے اور فرماتے کہ تم میں سے کس شخص نے آج رات کوئی خواب دیکھا ہے۔ حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو وہ بیان کرتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں وہ کچھ فرماتے جو اللہ تعالیٰ چاہتے۔ ایک دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے سوال کیا اور یہ فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی شخص نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ہم نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا لیکن آج رات میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے اور انہوں نے میرے ہاتھ پکڑے اور اور وہ مجھے ایک ارضِ مقدسہ کی طرف لے گئے۔ تو وہاں میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور ایک آدمی کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک کنڈی سی ہے جسے وہ اس بیٹھے ہوئے شخص کی باچھوں میں داخل کرتا ہے اور اس کی باچھوں کو چیرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی گُدّی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کی دوسری باچھ کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کی پہلی باچھ اتنے میں ٹھیک ہو جاتی اور پہلی حالت پر لوٹ آتی ہے۔ تو یہ اس کے ساتھ دوبارہ ویسے ہی کرتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تو ان دونوں نے کہا کہ آگے چلو۔ چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جو گُدّی کے بل لیٹا ہوا تھا اور دوسرا شخص اس کے سر کے پاس ایک بڑا پتھر لے کر کھڑا تھا۔ فہر کا معنی بھی

بڑا پتھر ہے صخرہ کا معنی بھی بڑا پتھر ہے راوی کو شک ہے کہ کون سا لفظ بولا - اور اس کے ذریعے وہ اس کے سر کو کچل رہا ہے۔ جب وہ اسے مارتا ہے تو پتھر لڑھک کر نیچے چلا جاتا ہے تو یہ شخص اس پتھر کو پکڑنے کے لئے جاتا ہے اور اس کے پاس واپس نہیں آتا مگر اس حالت میں کہ اس کا سر درست ہو چکا ہوتا ہے اور اپنی پہلی والی حالت میں لوٹ آتا ہے۔ تو یہ شخص لوٹ کر اس کے پاس آتا ہے اور اسے دوبارہ مارتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ ان دونوں نے کہا کہ چلو۔ چنانچہ ہم چلے، یہاں تک کہ ہم ایک سوراخ کے پاس پہنچے جو تنور کی طرح تھا، یعنی اس کا اوپر والا حصہ تنگ تھا اور نیچے والا حصہ کھلا تھا۔ اور اس کے نیچے آگ جل رہی ہے جب وہ آگ اوپر کو آتی ہے تو یہ لوگ جو اس کے اندر ہیں وہ بھی اوپر کو آتے ہیں یہاں تک کہ اس بات کے قریب ہوتے ہیں کہ وہ اس تنور سے باہر نکل آئیں اور جب وہ آگ نیچے جاتی ہے تو یہ بھی تنور میں نیچے چلے جاتے ہیں۔ اور اس تنور یا اس سوراخ میں کچھ ننگے مرد اور ننگی عورتیں ہیں۔ (آگ ہونا مستقل عذاب اور ننگے ہونا مستقل عذاب) میں نے کہا کہ یہ کیا؟ ان دونوں نے کہا کہ چلو۔ چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ ایک خون کے ایسے دریا کے پاس پہنچے جس میں ایک آدمی دریا کے درمیان میں کھڑا ہے اور دریا کے کنارے پر بھی ایک آدمی ہے جس کے سامنے کچھ پتھر رکھے ہوئے ہیں تو جو شخص دریا کے اندر ہے وہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ باہر نکلنے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ شخص اس کے منہ میں پتھر مارتا ہے اور اس کو اسی جگہ پر لوٹا دیتا ہے جہاں پر پہلے وہ تھا۔ جب بھی یہ نکلنے کے لئے آتا ہے تو یہ اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے اور وہ پہلی جگہ پر لوٹ جاتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان دونوں نے کہا کہ آگے چلو۔ چنانچہ ہم چلے یہاں تک کہ ایک سرسبز باغ میں پہنچے جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا اور اس درخت کی جڑ کے قریب ایک بوڑھے شخص اور کچھ بچے بیٹھے ہوئے تھے، اور اس درخت ہی کے قریب ایک آدمی تھا جس کے سامنے آگ تھی جس کو وہ جلا رہا تھا۔ ان دونوں نے مجھے اس درخت پر چڑھایا اور درخت کے درمیان میں ایک ایسے گھر میں مجھے داخل کیا جس سے خوبصورت گھر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اندر کچھ لوگ تھے بوڑھے بھی، جوان بھی، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ پھر انہوں نے مجھے اس گھر سے نکالا اور درخت پر چڑھایا اور مجھے ایک ایسے گھر میں داخل کیا جو پہلے سے بھی

خوبصورت اور بہتر تھا۔اس میں بوڑھے اور جوان تھے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ آج رات تم نے مجھے خوب گھمایا ہے، اب مجھے ان چیزوں کے بارے میں بتاؤ جو میں نے دیکھی ہیں۔ان دونوں نے کہا کہ ہاں اب بتاتے ہیں۔ وہ جو آپ نے آدمی دیکھا تھا کہ اس کی باچھیں چیریں جارہی تھیں تو یہ ایسا جھوٹا شخص ہے جو کوئی جھوٹی بات کرتا ہے اوراس سے نقل کی جاتی ہے یہاں تک کہ پوری دنیامیں پھیل جاتی ہے تو قیامت تک اس کے ساتھ وہی سلوک کیاجاتارہے گا جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ شخص جس کے سر کو کچلا جارہا تھاتو یہ ایسا شخص ہے جس کواللہ تعالیٰ نے قرآن سکھایا تھالیکن یہ رات کے وقت اس سے سویا رہااور دن میں بھی ان باتوں پر عمل نہیں کیاجو قرآن میں ہیں،اس کے ساتھ قیامت تک یہی سلوک ہوتا رہے گا جو آپ نے دیکھا۔ اور وہ منظر جو آپ نے اس سوراخ میں دیکھا تھاتو یہ زانی لوگ ہیں۔اور وہ شخص جس کو آپ نے خون کے دریامیں دیکھا تھا یہ سود خور ہے۔اور وہ بوڑھا شخص جسے آپ نے درخت کی جڑ کے قریب دیکھا تھا یہ ابراہیم علیہ السلام تھے اوران کے ارد گرد جو بچے تھے یہ لوگوں کی نابالغ اولاد تھی۔ یعنی جو بچپن میں انتقال کر جاتے ہیں۔اور وہ شخص جو آگ جلارہا تھا یہ مالک ہیں جو دوزخ کے داروغے ہیں اور پہلا گھر جس میں آپ داخل ہوئے تھے یہ عام مسلمانوں کا گھر (یعنی عام مسلمانوں کی جنت ہے)اور یہ گھر جو آپ نے بعد میں دیکھا یہ شہدا کا گھر ہے۔اور میں جبرئیل ہوں اور یہ میکائیل ہیں۔اب ذرا سر اوپر اٹھایئے تو میں نے اپنا سر اوپر اٹھایاتو میرے اوپر بادلوں جیسی ایک چیز تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ سفید بدلی جیسی ایک چیز تھی۔ان دونوں نے کہا کہ یہ آپ کا ٹھکانا ہے۔ میں نے کہ مجھے چھوڑیئے تاکہ میں اپنے گھر میں داخل ہو جاؤں، توان دونوں نے کہا کہ آپ کی عمر کا کچھ حصہ باقی ہے۔اگر آپ نے اپنی عمر مکمل کرلی ہوتی تو آپ اپنے گھر میں داخل ہو جاتے۔

کیارسول اللہ ﷺ نے جبریل ومیکائیل کو فوراً پہچان لیا تھا:

یہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب ہے جس میں آپ کو جزاوسزا کے کئی منظر دکھائے گئے۔اس طرح کے اور بھی کئی خواب حضورِاقدس ﷺ نے دیکھے ہیں اور صحابہ سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔اسی طرح کے کچھ

مناظر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کے موقع پر بھی دیکھے ہیں۔اس میں یہ آیا کہ یہ دو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئے ہیں اور ارض مقدسہ کی طرف لے کر گئے۔ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی ارضِ مقدسہ ہو یعنی ایسا علاقہ تھا جو ذرا مقدس سا معلوم ہو رہا تھا، لیکن یہ پتا نہیں کہ کونسا۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارضِ مقدسہ سے مراد شام کا علاقہ ہو۔یہ مناظر دکھانے کے لئے اس علاقے کا انتخاب شاید اس لئے کیا گیا ہو کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ محشر بھی وہیں لگے گا۔تو وہ بھی ایک جزاو سزا کی صورت ہے اور یہ بھی جزاو سزا کی شکلیں دکھائی گئی ہیں۔اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً ان دو شخصوں کو پہچانا نہیں بلکہ آخر میں خود جبرئیل علیہ السلام نے تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں جبرئیل ہوں اور یہ میرے ساتھ میکائیل ہیں۔ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اندازہ لگالیا ہو لیکن پورے طور پر نہ پہچانا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالکل ہی نہ پہچانا ہو۔جبرئیل علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بکثرت آتے رہتے تھے تو پھر نہ پہچاننے کی کیا وجہ ہے؟ تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ من جانب اللہ تھا۔کیونکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ایسے شخص کو بھی انسان پہچان سکتا ہے جس کو زندگی بھر نہ کبھی دیکھا ہو اور نہ اس کے بارے میں سنا ہو۔اور اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہیں تو اپنے باپ اپنے بیٹے کو بھی نہ پہنچانے۔ہوتا تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہو سکتا ہے کہ کسی حکمت کے تحت یہاں معرفت میں کوئی چیز حائل کر دی ہو۔حکمت اللہ جانے اللہ کے رسول جانیں۔البتہ ایک حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ مقصود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مناظر دکھ کے پہلے ذرا حیران کرنا تھا۔کیونکہ حیرانگی کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے وہ ذہن میں زیادہ بیٹھتی ہے۔اس لئے کہ حیرانگی سے انسان کے ذہن میں ایک تجسس سا پیدا ہو جاتا ہے، جاننے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جو بات معلوم ہوتی ہے وہ زیادہ اوقع فی القلب ہوتی ہے۔اسی لئے آج کل کہانی لکھنے کے جو اصول ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بہت ساری باتوں کے بارے میں خاص طور پر کہانی کے جو اہم کردار ہوتے ہیں ان کے بارے میں ابتدا میں بہت ساری باتیں مخفی رکھی جاتی ہیں اور درمیان میں جاکر یا آخر میں جاکر کہانی کے بنیادی کردار یا ہیروز کے بارے میں پتا چلتا ہے یہ کیا اور کون ہیں۔یہ بھی ایک اسلوب ہوتا ہے اور اس کے نفسیاتی اثرات ہوتے ہیں تو یہاں پر بھی یہ کہانی اسی انداز سے

چلائی گئی ہے۔یہی وجہ ہے غالباً کہ ساتھ ساتھ حضور اقدس ﷺ کو ہر منظر کی تشریح نہیں بتائی گئی، حالانکہ بتانے کو تو بتا سکتے تھے بلکہ یہ کہا کہ چلو آگے چلو سب کچھ جب سامنے آگیا تو پھر ابتدا سے آخر تک سب کا مطلب بھی بتادیا گیا۔

جھوٹا پروپیگنڈا کرنے والے کی سزا:

پہلا شخص جس کی باچھیں چیری جارہی تھیں یہ وہ شخص ہے جو جھوٹ بولتا تھا صرف جھوٹ نہیں بولتا بلکہ ایسا جھوٹ بولتا ہے جو پوری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ گویا یہ سزا محض جھوٹے شخص کی نہیں بلکہ جھوٹا پروپیگنڈا کرنے والے کی ہے۔پہلے زمانے میں اس طرح کے جھوٹ شاید اتنے زیادہ نہیں پائے جاتے تھے لیکن آج کل تو دنیا چل ہی اس طرح کے جھوٹوں پر رہی ہے کہ ایک بات بناؤاور اسے منٹوں سیکنڈوں میں اڑاؤ۔اور اس طرح بے بنیاد یا مبالغہ آمیز باتوں کی وجہ سے لمحات میں دنیا میں پتا نہیں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔تو اس طرح کے جھوٹ کی سزا بھی ظاہر ہے کہ عام جھوٹ سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔اس طرح کا جھوٹا آدمی چونکہ منہ پھٹ قسم کا ہوتا ہے بے باک قسم کا ہوتا ہے اس لئے سزا بھی اسی کے مناسب ہے کہ اس کی باچھیں چیری جارہی ہیں۔

دوسرے شخص کو اس میں زانیوں کو سزادی جارہی ہے ۔ایک تو دوزخ کی سزا ہے آگ کی سزا ہے اور دوسرے سب کے سامنے ننگا ہونے کی سزا ہے ۔اس لئے کہ انہوں نے بھی دنیا میں بے حیائی کا ارتکاب کیا تھا اور تیسرا یہ کہ ایک دوسرے کے سامنے سزا بھگت رہے ہیں۔ باقی جو ہیں وہ الگ الگ سزا بھگت رہے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے سامنے سزا بھگت رہے ہیں اس لئے کہ انہوں نے جو کام کیا تھا وہ بے حیائی کا تھا۔سود خور کو خون کے دریا میں دکھایا گیا ہے اس لئے کہ سود خور بھی درحقیقت دنیا میں سود کے ذریعے لوگوں کا معاشی خون چوسنے کی کوشش کرتا ہے۔اور اسی طرح باقی مناظر ہیں کہ ہر ایک کے اندر جرم اور سزا میں تقریباً مناسبت واضح ہے۔

کیا صلاۃ اللیل واجب ہے:

اس حدیث میں یہ بھی آیا کہ ایک آدمی کا سر کچلا جارہا تھا اور اس سے مراد وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا، لیکن اس نے اس کے بارے میں دو کوتاہیاں کی ہیں۔ ایک الفاظ کے بارے میں کہ نام عنہ باللیل کہ رات کے وقت اس سے سویا رہا، یعنی رات کی نماز میں اسے نہیں پڑھا۔ اور دوسری کوتاہی معانی کے بارے میں کہ اس نے قرآن پر عمل نہیں کیا، یعنی جو حرام کام تھے ان کا ارتکاب کرتا رہا اور جن کو ضروری قرار دیا گیا تھا ان کو چھوڑتا رہا۔ دوسری بات تو واضح طور پر قابل سزا ہے کہ جب پتا تھا کہ یہ کام ناجائز ہے تو پھر کیوں اس سے نہیں بچا اور جب پتا تھا کہ یہ کام ضروری ہے تو پھر کیوں نہیں کیا۔ پتا نہ ہونا بھی جرم ہے لیکن پتا ہو کر عمل نہ کرنا اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ البتہ پہلی بات بظاہر عجیب سی لگتی ہے کہ صلاۃ اللیل اور رات کی نماز میں قرآن پڑھنا بظاہر ضروری نہیں ہے تو اس کے چھوڑنے پر سزا کیوں؟

تو اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ سزا اصل میں مجموعے پر ہے محض صلاۃ اللیل چھوڑنے پر نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اتنی بات تو معلوم ہوئی کہ اس کا سزا میں دخل ضرور ہے اس لئے بظاہر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ صلوۃ اللیل واجب ہے اور ہمارے قریب کے علما میں سے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے بھی اعلاء السنن میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ اور خاص طور پر اس کی تاکید حفظۃ القرآن (قرآن کے حافظوں) کے لئے زیادہ ہے کہ وہ رات کی نماز میں قرآن پڑھیں یہ قرآن کا ایک حق ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ إن اللہ تعالیٰ وتر یحب الوتر فأوتروا یا أہل القرآن۔ اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ اہلِ قرآن سے مراد قرآن پر ایمان لانے والے ہیں اور وتر سے مراد معروف وتر ہیں تو مطلب یہ کہ تمام مؤمنین پر وتر واجب ہیں، جیسا کہ حنفیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ اور دوسری تشریح اس کی یہ کی گئی ہے کہ اہلِ قرآن سے مراد حفظۃ القرآن ہیں۔ اور وتر سے مراد صلوۃ اللیل ہے کہ ان کو خاص طور پر کہا جارہا ہے کہ تم صلوۃ اللیل کا اہتمام کرو۔ اور دوسری تشریح اس وجہ سے راجح معلوم ہوتی ہے کہ ایک روایت میں یہ

آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تو کسی بدو نے عرض کیا کہ میں بات سمجھا نہیں، ذرا دوبارہ دہرائیے دوبارہ فرمائیے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ لیست لک ولا لأحد من اصحابک [1]۔ اگر نہیں بھی سمجھ میں آئی تو کوئی بات نہیں اس لئے کہ یہ تیرے لئے اور تیرے جیسوں کے لئے نہیں ہے۔ اس سے پتا چلا کہ اہلِ قرآن سے مراد سب مؤمنین نہیں ہیں۔ تو صلاۃ اللیل ضروری اور خاص طور پر حفظۃ القرآن کے لئے قرآن کا یہ حق ہے کہ رات کی نماز میں کچھ قرآن پڑھا جائے۔ البتہ عشاء کی سنتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کے بعد وتر پڑھے جاتے ہیں وہ کسی نہ کسی درجے میں صلاۃ اللیل کے قائم مقام ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی رات کی نماز ہے۔ اس لئے اگر ان کی پابندی کر لی تو اس وعیدِ شدید سے تو امید ہے کہ انسان نکل جائے گا۔ اور یہ جو بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ جس نے فلاں فلاں آیتیں رات کے وقت پڑھ لیں تو اس کے لئے کافی ہو جائیں گی، فلاں سورت رات کے وقت پڑھ لی تو اس کے لئے کافی ہو جائے گی۔ اور جس نے اتنی آیتیں پڑھ لیں تو وہ غافلین میں نہیں لکھا جائے گا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اتنا کرنے سے اس وعیدِ شدید سے بچ جائے گا۔ لیکن وعیدِ شدید سے اگرچہ بچ جائے پھر بھی قرآن کا یہ حق ضرور ہے کہ اسے اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق رات کی نماز میں پڑھے۔

تاہم اس حدیث کے حوالے سے یہ بحث یہاں ذکر شدہ الفاظ کے مطابق ہے۔ ورنہ صحیح بخاری کی بعض روایتوں میں یہ لفظ آتے ہیں: فإنه يأخذ القرآن، فيرفضه، وينام عن الصلاة المكتوبة [2]، اس روایت کے مطابق پوری بات ہی بدل جاتی ہے اور یہ وعید قرآن کو چھوڑنے اور فرض نماز کو چھوڑنے کے بارے میں ہو جاتی ہے۔

1۔ مسند أبي يعلى الموصلی حدیث نمبر: ۴۹۸۷ والسنن الکبری للبیہقی: ۲/ ۶۵۷۔

2۔ صحیح البخاری، کتاب التہجد حدیث نمبر: ۱۱۴۳

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے گھر میں جانا چاہا تو یہ کہا گیا کہ چونکہ ابھی آپ کی عمر باقی ہے اس لئے آپ نہیں جا سکتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پہلے اور دوسرے گھر میں یعنی عامۃ المؤمنین اور شہدا کے گھروں میں آپ کیسے چلے گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں جو جانا چاہتے تھے بظاہر مالکانہ حیثیت سے تھا۔ اور مالکانہ حیثیت سے جانے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ دوسروں کے گھر میں جو گئے ہیں وہ ظاہر ہے کہ مالکانہ حیثیت سے نہیں بلکہ بطور زائر کے گئے ہیں، دیکھنے کے لئے گئے ہیں۔ اور دیکھنے کے لئے آدمی دوسرے کے گھر میں بھی جا سکتا ہے اس لئے اس میں چلے گئے اور اپنے گھر میں جانے کی آپ کو اجازت نہیں ملی۔

الفصل الثانی

خواب پرندے کے پاؤں پر

(١٥) عَن أبي رزين العقيليِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ ، وَهِيَ عَلَى رِجْلِ طَائِرٍ مَا لَمْ يُحَدِّثْ بِهَا فَإِذَا حَدَّثَ بِهَا وَقَعَتْ» . وَأَحْسِبُهُ قَالَ: «لَا تُحَدِّثْ إِلَّا حَبِيبًا أَوْ لَبِيبًا» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ قَالَ: «الرُّؤْيَا عَلَى رِجْلِ طَائِرٍ مَا لَمْ تُعْبَرْ ، فَإِذَا عُبِرَتْ وَقَعَتْ» . وَأَحْسِبُهُ قَالَ: «وَلَا تَقُصَّهَا إِلَّا عَلَى وَادٍّ أَوْ ذِي رأيٍ»

حضرت ابو رزین عقیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جز ہے۔ اور یہ پرندے

کے پاؤں پر ہوتا ہے جب تک اسے بیان نہ کیا جائے، جب اسے خواب دیکھنے والا بیان کردے تو خواب واقع ہو جاتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ خواب صرف خیر خواہ یا عاقل آدمی کے سامنے بیان کرو۔

خواب میں مرنے والے کو سفید لباس میں دیکھنا

(١٦) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ : سُئِلَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَن وَرَقَةَ. فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: إِنَّهُ كَانَ قَدْ صَدَّقَكَ وَلَكِنْ مَاتَ قَبْلَ أَنْ تَظْهَرَ. فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أُرِيتُهُ فِي الْمَنَامِ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيضٌ وَلَوْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَكَانَ عَلَيْهِ لِبَاسٌ غَيْرُ ذَلِكَ» . رَوَاهُ أَحْمد وَالتِّرْمِذِيّ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ انہوں نے آپ کی تصدیق تو کردی تھی لیکن آپ کی دعوت ظاہر ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مجھے خواب میں دکھائے گئے تھے اور اس وقت ان پر سفید کپڑے تھے اور اگر وہ دوزخ والوں میں ہوتے تو ان پر اس کے علاوہ کوئی اور لباس ہوتا۔

ورقہ بن نوفل کا تذکرہ

یہ ورقہ بن نوفل ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچازاد بھائی تھے۔ لیکن عمر میں حضرت خدیجہ سے کافی بڑے تھے۔ جس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غارِ حرا میں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے بوجھ اور اس کی شدت کی وجہ سے بہت زیادہ گھبرا گئے تھے اور آپ پر کپکپی طاری

ہو گئی تھی۔ آپ غارِ حرا سے سیدھے گھر تشریف لائے۔ یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ غارِ حرا ایسی جگہ پر ہے کہ جلدی وہاں جانے کا آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تو اتنی گھبراہٹ، کپکپی اور پریشانی اور بوجھ اور پتا نہیں کیا کیفیت ہو گی اس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے اتر کر حضرت خدیجہ کے گھر میں آنا یہ بڑی عجیب اور بڑے حوصلے کی بات ہے۔ بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا سے اتر کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ زملونی زملونی کہ مجھے چادر اوڑھا دو چادر اوڑھا دو۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ پر چادر ڈالی کچھ دیر آپ نے آرام فرمایا، اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو لے کر ورقۃ بن نوفل کے پاس گئیں۔ اس وقت بھی یہ بہت بوڑھے تھے اور تورات کے بہت بڑے عالم تھے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی یہ پوری بات ان کے سامنے رکھی۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی۔ تفصیل سے یہ حدیث آگے ان شاء اللہ مشکوۃ[1] ہی میں آجائے گی۔ انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے اس وقت یہ کہا تھا کہ آپ کے پاس جو فرشتہ آیا ہے یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیا کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے۔ اس طرح آپ کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کے فوراً بعد دعوت کا آغاز نہیں کیا بلکہ درمیان میں کچھ عرصہ ایسا گذرا ہے جسے فترۃ وحی کا دور کہا جاتا ہے اس میں وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد دوبارہ آپ پر وحی نازل ہونا شروع ہوئی یٰأیہا المدثر قم فأنذر تو یہاں سے آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ ورقۃ بن نوفل نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق تو کر دی تھی لیکن ظہور دعوۃ کے بعد ایمان لانے کا موقع نہیں ملا بلکہ اس سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا، اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ ان کی نجات ہوئی ہے یا نہیں۔ اگر اس بات کو دیکھیں کہ آپ کی تصدیق تو کر دی تھی تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ نجات ہو گئی ہو اور اگر اس کو دیکھیں کہ اگرچہ تصدیق کی تھی لیکن باقاعدہ دعوت کے بعد تصدیق کا موقع نہیں ملا تو کسی کے ذہن میں دوسرا خیال بھی آسکتا ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ

1- باب المبعث وبدء الوحی۔

ورقہ بن نوفل کو میں نے خواب میں دیکھا تھا اس وقت انہوں نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ جنتی ہیں دوزخی نہیں ہیں اس لئے کہ دوزخی پر سفید لباس نہیں ہو سکتا۔ اس سے پتا چلا کہ اگر کسی شخص کو اس کے انتقال کے بعد خواب میں سفید لباس کے اندر دیکھا جائے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی نجات ہو گئی ہے۔

کسی کے خواب کو پورا کرنا

(١٧) وَعَنِ ابْنِ خُزَيْمَةَ بْنِ ثَابِتٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي خُزَيْمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ أَنَّهُ رَأَى فِيمَا يَرَى النَّائِمُ أَنَّهُ سَجَدَ عَلَى جَبْهَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَهُ فَاضْطَجَعَ لَهُ وَقَالَ: «صَدِّقْ رُؤْيَاكَ» فَسَجَدَ عَلَى جَبْهَتِهِ. رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ. وَسَنَذْكُرُ حَدِيثَ أَبِي بَكْرَةَ: كَأَنَّ مِيزَانًا نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ فِي بَابِ «مَنَاقِبِ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا»

حضرت خذیمہ بن ثابت کے بیٹے اپنے چچا ابو خزیمہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اس چیز میں جس کو سونے والا دیکھتا ہے یعنی خواب میں دیکھا کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خواب بتایا تو آپ ان کے سامنے لیٹ گئے اور فرمایا کہ اپنے خواب کو سچا کر لو، چنانچہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کیا۔

یہاں ایک تو یہ بات ذہن میں رکھیں کہ پیشانی پر سجدہ کیا ہے پیشانی کو سجدہ نہیں کیا۔ جیسا ہم زمین پر سجدہ کرتے ہیں زمین کو سجدہ نہیں کرتے یا جائے نماز پر سجدہ کرتے ہیں جائے نماز کو سجدہ نہیں کرتے اسی طرح یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کیا ہے پیشانی کو سجدہ نہیں کیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ایک ہے سجدہ

کرنا عام سی جگہ پر اور ایک ہے سجدہ کرنا کسی بابرکت جگہ پر یہ فرق تو ہے لیکن بہر حال اس جگہ پر سجدہ کرنا ہے اس جگہ کو سجدہ کرنا نہیں ہے۔ دوسرے اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کوئی خواب دیکھے اور اس کو پورا کرنا دوسرے کے اختیار میں ہو تو اگر وہ بسہولت کرسکے اس کی کسی مصلحت وغیرہ کے خلاف نہ ہو تو ایسا کر لینا چاہیے۔ جیسا کہ انہوں نے یہاں خواب دیکھا کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی پر سجدہ کر رہا ہوں تو حضور اقدس ﷺ نے ان کو موقع دیا کہ تم میری پیشانی پر سجدہ کرلو۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ خواب واقعتا ایسا ہو جس کو سچا کرنا چاہیے، اضغاث الاحلام کے قبیل سے یا کسی اور قسم کا نہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ بآسانی اس خواب کو پورا کرسکتا ہو ورنہ کل آپ یہ کہیں کہ ہم نے خواب دیکھا آپ نے ہماری دعوت کی اور اس دعوت میں یہ یہ کچھ کھلایا چونکہ ہم نے خواب دیکھ لیا ہے اس لئے آپ اس خواب کو سچا کریں۔ تو روزانہ کوئی نہ کوئی خواب لے کر آجایا کریں گے، کیونکہ بلی کو آتے تو چھیچھڑوں کے خواب ہی ہیں تو روزانہ کوئی نہ کوئی نئے چھیچھڑے لے کر آجایا کریں گے کہ یہ میں نے خواب میں دیکھے ہیں۔

الفصل الثالث

(۱۸) عَن سَمُرَةَ بْنِ جُنْدَبٍ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا يَكْثُرُ أَنْ يَقُولَ لِأَصْحَابِهِ: «هَلْ رَأَى أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنْ رُؤْيَا؟» فَيَقُصُّ عَلَيْهِ مَنْ شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُصَّ. وَإِنَّهُ قَالَ لَنَا ذَاتَ غَدَاةٍ: « إِنَّهُ أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتِيَانِ وَإِنَّهُمَا ابْتَعَثَانِي وَإِنَّهُمَا قَالَا لِي: انْطَلِقْ وَإِنِّي انْطَلَقْتُ مَعَهُمَا». وَذَكَرَ مِثْلَ الْحَدِيثِ الْمَذْكُورِ فِي الْفَصْلِ الْأَوَّلِ بِطُولِهِ ، وَفِيهِ زِيَادَةٌ لَيْسَتْ فِي الْحَدِيثِ الْمَذْكُورِ وَهِيَ قَوْلُهُ: «فَأَتَيْنَا عَلَى رَوْضَةٍ مُعْتِمَةٍ فِيهَا مِنْ كُلِّ نَوْرِ الرَّبِيعِ وَإِذَا بَيْنَ ظَهْرَيِ الرَّوْضَةِ رَجُلٌ طَوِيلٌ لَا أَكَادُ أَرَى رَأْسَهُ طُولًا فِي السَّمَاءِ وَإِذَا حَوْلَ الرَّجُلِ مِنْ

أَكْثَرِ وِلْدَانٍ رَأَيْتُهُمْ قَطُّ قُلْتُ لَهُمَا: مَا هَذَا مَا هَؤُلَاءِ؟» قَالَ: «قَالَا لِيَ: انْطَلِقْ فَانْطَلَقْنَا فَانْتَهَيْنَا إِلَى رَوْضَةٍ عَظِيمَةٍ لَمْ أَرَ رَوْضَةً قَطُّ أَعْظَمَ مِنْهَا وَلَا أَحْسَنَ». قَالَ: «قَالَا لِيَ: ارْقَ فِيهَا». قَالَ: «فَارْتَقَيْنَا فِيهَا فَانْتَهَيْنَا إِلَى مَدِينَةٍ مَبْنِيَّةٍ بِلَبِنِ ذَهَبٍ وَلَبِنِ فِضَّةٍ فَأَتَيْنَا بَابَ الْمَدِينَةِ فَاسْتَفْتَحْنَا فَفُتِحَ لَنَا فَدَخَلْنَاهَا فَتَلَقَّانَا فِيهَا رِجَالٌ شَطْرٌ مِنْ خَلْقِهِمْ كَأَحْسَنِ مَا أَنْتَ رَاءٍ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ كَأَقْبَحِ مَا أَنْتَ رَاءٍ» . قَالَ: «قَالَا لَهُمْ: اذْهَبُوا فَقَعُوا فِي ذَلِكَ النَّهَرِ» قَالَ: «وَإِذَا نَهَرٌ مُعْتَرِضٌ يَجْرِي كَأَنَّ مَاءَهُ الْمَحْضُ فِي الْبَيَاضِ فَذَهَبُوا فَوَقَعُوا فِيهِ ثُمَّ رَجَعُوا إِلَيْنَا قَدْ ذَهَبَ ذَلِكَ السُّوءُ عَنْهُمْ فَصَارُوا فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ» وَذَكَرَ فِي تَفْسِيرِ هَذِهِ الزِّيَادَة: «وَأما الرجلُ الطويلُ الَّذِي فِي الرَّوْضَةِ فَإِنَّهُ إِبْرَاهِيمُ ، وَأَمَّا الْوِلْدَانُ الَّذِينَ حَوْلَهُ فَكُلُّ مَوْلُودٍ مَاتَ عَلَى الْفِطْرَةِ» قَالَ: فَقَالَ بَعْضُ الْمُسْلِمِينَ: يَا رَسُولَ اللهِ وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَأَوْلَادُ الْمُشْرِكِينَ. وَأَمَّا الْقَوْمُ الَّذِينَ كَانُوا شطرٌ مِنْهُم حسن وَشطر مِنْهُمْ حَسَنٌ وَشَطْرٌ مِنْهُمْ قَبِيحٌ فَإِنَّهُمْ قَوْمٌ قَدْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا تَجَاوَزَ الله عَنْهُم» . رَوَاهُ الْبُخَارِيّ.

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بکثرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ کیا تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے تو جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتے وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا خواب بیان کرتا۔ ایک صبح کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا کہ آج رات میرے پاس دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے اٹھایا

اورانہوں نے مجھ سے کہا کہ چلو۔ میں ان کے ساتھ چلا۔ اس کے بعد حدیث کا مضمون وہی ہے جس مضمون کی حدیث فصل اول میں گزر چکی ہے۔ البتہ اس حدیث میں کچھ زائد الفاظ ایسے ہیں جو اُس حدیث میں نہیں تھے اور وہ یہ ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر ہم ایک انتہائی سرسبز باغ میں آئے جس میں موسم بہار کے ہر قسم کے پھول تھے، اور باغ کے سامنے ایک لمبے آدمی تھے جن کی لمبائی کی وجہ سے میرے لئے ان کا سر دیکھنا مشکل تھا اور اس شخص کے ارد گرد اس بڑی سے بڑی تعداد میں بچے تھے جو میں نے کبھی دیکھی ہو یعنی بہت بڑی تعداد میں بچے تھے۔ تو میں نے ان دونوں ساتھیوں سے کہا کہ یہ کیا ہے؟ اور یہ لوگ کون ہیں؟ تو ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ چلو چنانچہ ہم چلے اور ایک بڑے باغ کے پاس پہنچے جس سے بڑا اور جس سے خوبصورت باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ اوپر چڑھ جاؤ چنانچہ ہم اس میں اوپر چڑھے، تو ہم ایک شہر کے پاس پہنچے جو ایسے بنا ہوا ہے کہ ایک اینٹ سونے کی ہے اور ایک اینٹ چاندی کی ہے۔ ہم اس شہر کے دروازے کے پاس آئے دروازہ کھلوایا اور ہمارے لئے دروازہ کھول دیا گیا ہم اس میں داخل ہوئے تو اس میں ہمارے سامنے کچھ ایسے لوگ آئے جن کے جسموں کا آدھا حصہ اتنا خوبصورت ہے جتنی خوبصورت چیز تم نے کبھی دیکھی ہو اور ان کا آدھا حصہ اتنا بدصورت جتنی بدصورت چیز تم نے کبھی دیکھی ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان دو آدمیوں نے یعنی میرے دو ساتھیوں نے ان لوگوں سے کہا کہ تم جاؤ اور اس دریا کے اندر غوطہ لگاؤ۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک چوڑا دریا دیکھا جو کہ چل رہا تھا اور اس کا پانی خالص سفید تھا۔ چنانچہ یہ لوگ گئے اور انہوں نے اس دریا میں غوطہ لگایا پھر ہمارے پاس واپس آئے اس حال میں کہ ان کی یہ بدصورتی ختم ہو چکی تھی اور یہ بہت خوبصورت شکل میں ہو چکے تھے۔ یہ جو زائد مناظر دیکھے گئے ہیں ان کی تفسیر بیان کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ جو لمبے آدمی تھے جو کہ باغ کے اندر تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے ارد گرد جو بچے تھے یہ تمام ایسے بچے تھے جن کا فطرت پر یعنی دین اسلام پر انتقال ہوا ہے۔ تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ یا رسول اللہ مشرکین کی اولاد بھی؟ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں مشرکین کی اولاد بھی۔ کیونکہ بچہ پیدا ہی فطرت پر ہوتا ہے

(جب تک اس نے کوئی دوسرا دین اختیار نہیں کیا تو فطرت پر ہی سمجھا جائے گا)۔ وہ لوگ جن کا آدھا حصہ خوبصورت تھا اور آدھا حصہ بدصورت تھا یہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے نیک اعمال اور برے اعمال کو خلط ملط کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے در گرز فرمایا (یعنی جو آدھا جسم خوبصورت ہے یہ ظاہر کر رہا ہے ان کے نیک اعمال اور آدھا جسم جو بدصورت ہے یہ ظاہر کر رہا ہے ان کے برے اعمال لیکن جب اس نہر کے اندر دریا کے اندر دریائے مغفرت کے اندر غوطہ لگایا تو ان کے گناہ اور برے اعمال معاف ہو گئے اس لئے سارا جسم خوبصورت ہو گیا)۔

جھوٹا خواب گھڑنا بد ترین جھوٹ ہے

(۱۹) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مِنْ أَفْرَى الْفِرَى أَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَا لم تريا» . رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کی طرف ایسی چیز کا دیکھنا منسوب کرے جو انہوں نے دیکھی نہیں ہے۔

ایک چیز دیکھی نہیں ہے لیکن کہتا یہ ہے کہ میں نے یہ دیکھی یا اندازِ کلام سے ظاہر یہ کرتا ہے کہ میں نے یہ چیز دیکھی ہے۔ اس میں دو صورتیں شامل ہیں ایک تو یہ کہ جاگتے ہوئے دیکھنے کے بارے میں جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے فلاں ملک بھی دیکھا فلاں ملک کے فلاں فلاں عجائب بھی دیکھے ہوئے ہیں یا صراحتاً تو نہیں کہتا کہ دیکھے ہوئے ہیں لیکن بات اس انداز سے کرتا ہے کہ اگلا یہ سمجھے کہ بہت کچھ دیکھا ہوا ہے یہ بھی اس میں داخل ہے۔ اور یہ بھی داخل ہے اور اسی بات کے لئے یہ حدیث اس باب لائے ہیں کہ خواب میں کوئی چیز دیکھی نہیں لیکن کہتا یہ ہے کہ میں نے یہ چیز دیکھی ہے یعنی جھوٹا خواب گڑھ کر لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔

آخر شب کے خواب زیادہ سچے ہوتے

(۲۰) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «أَصْدَقُ الرُّؤْيَا بِالْأَسْحَارِ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ والدارمي

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے سچے خواب آخر شب میں ہوتے ہیں۔

کتاب الآداب

کتاب الآداب

ادب کے معنی ہوتے ہیں کسی بھی کام کو اس کے صحیح طریقے اور ڈھب سے کرنا۔ کتاب الأطعمۃ کے شروع میں ادب کے مفہوم پر بات ہو چکی ہے۔ یہاں مقصود ان آداب کو بیان کرنا ہے جن کا تعلق انسانی کی معاشرتی زندگی یعنی لوگوں کے ساتھ میل جول کے ساتھ ہے۔ گویا اس عنوان کے تحت ان احادیث کو پیش کرنا مقصود ہے جن میں اسلامی معاشرے کے social etequette کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس موضوع کی احادیث کی تشریح کرتے ہوئے ''آداب الصحبۃ'' کا عنوان اختیار فرمایا ہے۔

باب السلام

الفصل الأول

سلام کرنا انسانی فطرت کا تقاضا

(١) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «خَلَقَ اللهُ آدَمَ على صُوْرَتِهِ طُوْلُه سِتُّون ذِرَاعًا فَلَمَّا خَلَقَهُ قَالَ اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلَى أُولَئِكَ النَّفَرِ وَهُمْ نَفَرٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ جُلُوسٌ فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّونَكَ فَإِنَّهَا تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ فَذَهَبَ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالُوا: السَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللهِ» قَالَ: «فَزَادُوهُ وَرَحْمَةُ اللهِ» . قَالَ: «فَكُلُّ مَنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلَى صُورَةِ آدَمَ وَطُولُهُ سِتُّونَ ذِرَاعًا فَلَمْ يَزَلِ الْخَلْقُ يَنْقُصُ بعدَه حَتَّى الْآن». متفق عليه .

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا اس حالت میں کہ ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا۔ جب اللہ تعالی نے انہیں پیدا کیا تو انہیں کہا کہ جاؤ اور اس جماعت کو سلام کرو، اور وہ فرشتوں کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی، تو سنو کہ وہ کیا آداب پیش کرتے ہیں، وہی تمہارا اور تمہاری نسل کا ملاقات کے وقت نیک تمنا ظاہر کرنے (greeting) کا طریقہ ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام گئے اور کہا: السلام علیکم تو فرشتوں نے کہا السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں نے ''ورحمۃ اللہ'' کا اضافہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو جنت میں داخل ہوگا وہ آدم علیہ السلام کی صورت پر ہوگا کہ اس کا قد ساٹھ ہاتھ ہوگا۔ پھر اس کے بعد سے لے کر اب تک مسلسل جسامت گھٹتی رہی۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد یہ طے کرنا چاہا کہ ان کی نسل کا تحیہ کیا ہو گا، یعنی جب ایک دوسرے سے ملاقات ہو گی تو ایک دوسرے کو wish کرنے ، آداب پیش کرنے اور نیک خواہشات کے اظہار کا کیا طریقہ ہو گا۔اس مقصد کے لئے اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے پاس بھیجااور کہا کہ وہاں جاتے ہی جو الفاظ تمہاری زبان سے صادر ہوں گے اور فرشتے اس کا جو جواب دیں گے وہی تمہارااور تمہاری نسل کا تحیہ ہو گا یعنی ملاقات کے وقت بولے جانے والے نیک خواہشات کے اظہار والے الفاظ ہوں گے۔ جب آدم علیہ السلام وہاں پہنچے توان کی زبان سے السلام علیکم کے لفظ ادا ہوئے اور فرشتوں نے جواب میں کہاعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ نسائی کی سنن کبری کی ایک روایت میں ہے وعلیک السلام ورحمۃ اللہ۔ آدم علیہ السلام نے صرف سلام کا لفظ بولا تھا فرشتوں نے اس پر اللہ کی رحمت کا اضافہ کر دیا۔

اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ سلام کرنا کسی خاص کلچر یا تہذیب کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ فطرتِ انسانیہ کے لئے اللہ تعالی کا الہام اور تمام انبیا کی سنت ہے۔ بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ملاقات کے وقت کن لفظوں سے نیک خواہشات کا اظہار کیا جائے یہ محض کلچر کا معاملہ ہے، دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں چونکہ سب بڑا مسئلہ تحفظ کا ہوتا تھا، لوٹ مار اور قتل وغارت گری عام تھی، ہر آدمی دوسرے سے ڈر رہا ہوتا تھا اس لئے ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلامتی کا یقین دلایا جاتا تھا۔ اس طرح سے سلام کرنا بنیادی طور پر عرب کلچر کا حصہ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض معاشروں میں جہاں خوراک کی بہت قلت ہوتی تھی وہاں ملاقات کے وقت کھانے کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اس حدیث سے اس سوچ کی تردید ہو گئی اور واضح ہو گیا کہ سلام انسانی فطرت کا تقاضا ہے، کسی خاص کلچر کا نہیں۔

کیا سلام اس امت کی خصوصیت ہے:

اس حدیث میں ہے کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ تمہارا اور تمہاری ذریت یعنی تمہاری نسل کا تحیہ ہے۔اس کی تشریح میں بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ یہاں ذریت سے مراد صرف مسلمان ہیں یا امت مسلمہ ہے۔لیکن اول تو یہ بات اس حدیث کے سیاق اور ظاہری الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی، دوسرے اس بات کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں کہ گذشتہ انبیاء اور ان کے صحیح پیروکاروں کے ہاں سلام کا کوئی تصور نہیں تھا، بلکہ اس کے برعکس صحیح بخاری وغیرہ کی ایک روایت جس میں موسی اور خضر کا واقعہ بیان ہوا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ موسی علیہ السلام جب حضرت خضر کے پاس پہنچے تو انہوں نے سلام کیا، اس پر حضرت خضر کو حیرت ہوئی اور کہا ''وأنّی بأرضک السلام''اس سرزمین میں سلام کہاں سے آگیا[1]۔اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں جو لوگ اسلامی تعلیم سے ناواقف تھے وہ تو سلام نہیں کرتے تھے لیکن موسی اور خضر جیسے لوگ سلام سے واقف بھی تھے اور کرتے بھی تھے۔قرآن نے جگہ جگہ انبیاء علیہم السلام پر سلام کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔اہلِ جنت کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمایا: تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ۔

اصل میں بعض حضرات کو بعض روایات سے شبہ ہو گیا ہے۔مثال کے طور پر حضرت ابوذر غفاری ؓ کی ایک روایت صحیح مسلم وغیرہ میں ہے، جس میں انہوں نے اپنے اسلام لانے کا تفصیلی واقعہ بیان کیا ہے۔اس میں یہ بھی ہے کہ ان کی رسول اللہ ﷺ سے جب پہلی ملاقات ہوئی تو عرض کیا ''السلام علیک یا رسول اللہ''اس کے

---

[1]۔ صحیح البخاری، کتاب العلم: باب ما یستحب للعالم إذا سئل أی الناس أعلم الخ۔

بارے میں وہ خود کہتے ہیں "فکنت أول من حیاہ بتحیة الإسلام"[1] لیکن یہ اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہو رہا کہ پچھلی شریعتوں میں سلام کا کوئی تصور نہیں تھا، اس سے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہاں یہ سنت متروک ہو چکی تھی، اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے، جیسا کہ اسی باب میں آگے آرہا ہے کہ عربوں کے ہاں اس کی جگہ أنعم صباحا وغیرہ دیگر الفاظ نے لے لی تھی۔ سنت ابراہیمی کے بعض کام زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں باقی تھے، لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے سلام والی سنت بہت حد تک متروک ہو چکی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آسمانی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے مدعی یہود وغیرہ کے ہاں بھی یہ سنت متروک ہو چکی ہو۔ بہر حال اس بات کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں کہ سلام اس امت کے ساتھ خاص ہے۔

اسی طرح بعض حضرات نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے[2] جس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: "جعل الله السلام تحية لأمتنا وأمانا لأهل ذمتنا" یعنی اللہ تعالی نے سلام کو ہماری امت کے لئے تحیہ اور ہمارے ذمیوں کے لئے اطمینان دلانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن اس سے بھی سابقہ شریعتوں میں سلام کی نفی لازم نہیں آتی، بلکہ اس کے برعکس اس غیر مسلموں کو سلام کرنے کا جواز ثابت ہو رہا ہے، چنانچہ حضرت ابوامامہؓ کی یہی رائے تھی، اور یہ حدیث ایک یہودی کے سلام کے موقع پر حضرت ابوامامہ نے سنائی۔ غیر مسلم کو سلام کرنے کا مسئلہ آگے رہا ہے۔

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب کوئی سلام کرے تو بہتر ہے کہ جواب میں دعائیہ لفظ میں اضافہ کر دیا جائے، جیسا کہ آگے حدیث نمبر: ۱۷ میں بھی آرہا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ہے: وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ

1۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ: باب من فضائل أبي ذر

2۔ فتح الباری ۱۱/۴۔

فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (النساء : ٨٦) یعنی جب تمہیں تحیہ پیش کیا جائے تو اس سے بہتر جواب دو و گرنہ کم از کم اتنا جواب تو ضرور دے دو۔ سلام کرنے اور اس کا جواب دینے کا حکم کیا ہے اور اس میں کتنے الفاظ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اس پر بات آگے آ رہی ہے۔

خلق اللہ آدم علی صورتہ کا مطلب:

علی صورتہ میں مضاف الیہ بننے والی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ضمیر آدم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہو۔ مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو ان کی شکل پر پیدا کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ جب شروع شروع میں آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور ان کو جنت میں ٹھہرایا گیا تو شاید ان کی شکل کچھ اور ہو اور زمین پر آنے کے بعد ان کی شکل تبدیل ہو گئی ہو اور وہ شکل ہو گئی ہو جو آج کل ہے۔ شاید یہ شکل جنت کے مناسب نہ ہو۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے فرمایا خلق اللہ آدم علی صورتہ، صورتہ سے مراد ہے جو صورت انسان کی معروف ہے۔ اسی کی تاکید کے لئے آخر میں دوبارہ فرمایا کہ جتنے لوگ بھی جنت میں جائیں گے وہ اسی شکل پر ہوں گے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اگر کسی ضرورت کے تحت کسی انسان کو مارنا پڑے تو چہرے پر نہ مارو۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا خلق اللہ آدم علی صورتہ۔ سوال یہ ہے کہ اس مطلب کے مطابق اس جملے کا پچھلی بات سے کیا تعلق ہے۔ تو اس مطلب کے مطابق اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کہنا یہ مقصود ہے کہ انسان کا چہرہ اور اس کی شکل بہت محترم ہے، اس لئے کہ جب اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا تھا اس وقت بھی اس کی یہی شکل تھی، جنت میں بھی یہی شکل تھی اور ہو گی۔

دوسرا احتمال یہ ہو سکتا ہے کہ صورتہ کی ضمیر اللہ تعالی کی طرف لوٹ رہی ہو۔ اب مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اول تو یہاں یہ بحث ہے کہ اللہ تعالی کی طرف صورت کی نسبت کس معنی میں ہے۔ اللہ تعالی کے لئے صورت کا استعمال صفاتِ متشابہہ میں سے ہیں، جن کی تعبیر و تشریح میں خود اہل السنۃ والجماعۃ میں

مختلف رجحانات موجود ہیں، یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔اتنی بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق کے مشابہ نہیں ہے۔ لیس کمثلہ شیء۔ جبکہ یہاں آدم علیہ السلام کی صورت کو اللہ تعالی کی صورت کے مشابہ قرار دیا جارہا ہے جس سے نفی تشبیہ کا یہ متفقہ اصول مطابقت نہیں رکھتا۔اس کے بارے میں ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اسے بھی متشابہات میں قرار دیتے ہوئے اس کے علم کی تفصیل اللہ کے سپرد کردیں۔دوسرے یہ کہ بعض حضرات نے کہا کہ صورتہ میں اللہ تعالی کی طرف اضافت تشریفیہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ آدم کو اللہ تعالی نے اس شکل پر پیدا کیا جو اللہ تعالی کی سب سے پسندیدہ تھی۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صورت سے مراد صفت ہے، یعنی آدم کو اللہ تعالی نے اپنی صفت کے مطابق پیدا کیا۔اگرچہ انسان سمیت کوئی مخلوق بھی کسی صفت میں اللہ تعالی کے مشابہ نہیں ہو سکتی، لیکن انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مخلوقات میں سے اللہ تعالی کی صفات کا سب سے بڑا مظہر اور پرتو ہے۔

آدم علیہ السلام کا قد:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا۔ بعض روایات میں اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کی چوڑائی سات ہاتھ تھی۔ایک ذراع (ایک ہاتھ) تقریباً ڈیڑھ فٹ کا ہوتا ہے،اس لحاظ سے ساٹھ ذراع تقریبا نوے فٹ یا تیس گز بنتے ہیں۔ بعض روایتوں میں ستون ذراعا فی السماء کے لفظ ہیں۔یعنی آسمان کے ساٹھ ذراع۔آسمان کا ذراع کتنا ہوتا ہے اسے کہیں بیان نہیں کیا گیا،اس لئے ساٹھ ذراع کی مقدار بھی بیان کرنا مشکل ہے۔ بہر حال بحیثیتِ مجموعی جو بات کہنی مقصود ہے وہ یہ کہ آدم علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو ان کا قد بہت لمبا تھا، آج کے انسان سے کافی زیادہ لمبا تھا۔یہ بھی حدیث سے معلوم ہوا کہ جب لوگ جنت میں جائیں گے تو اس وقت بھی ان کا قد غیر معمولی طور پر لمبا ہو گا۔

اور قد کا ٹھ گھٹتے رہے:

اس حدیث کے آخر میں یہ ہے کہ آدم علیہ السلام جب پیدا ہوئے تو ان کا قد بہت لمبا تھا۔اس پر سوال ہو سکتا تھا کہ اب تو انسانوں کے قد اتنے لمبے نہیں ہوتے۔اس کا جواب دیتے ہوئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا بعد میں وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ جسم چھوٹے ہوتے گئے یہاں تک کہ موجودہ حالت تک پہنچ گئے۔اس پر ایک معروف سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ بعد والی نسل کے قد پچھلی نسلوں کے مقابلے میں چھوٹے ہوں گے اور پچھلے زمانوں کے لوگوں کے قد آج کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے، جبکہ امرِ واقعہ اس کی تائید نہیں کرتا، اس لئے کہ اب تک پرانے زمانے کے لوگوں کی جو باقیات دریافت ہوئی ہیں ان کے قد آج کے لوگوں سے بہت زیادہ بڑے نہیں ہیں۔حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ اس کا ایک قرینہ یہ ہے قدیم اقوام جیسے قومِ ثمود وغیرہ کی رہائش گاہوں کے آثار بھی موجود ہیں۔ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے ان کے قد اتنے لمبے نہیں تھے۔اس لئے کہ ان کے قد اگر لمبے ہوتے تو اسی حساب سے ان کی رہائش گاہیں بھی اونچی ہوتیں اور ان کے دروازے بھی بہت اونچے اونچے ہوتے، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔حافظ ابنِ حجرؒ کہتے ہیں کہ اب تک میری نظر سے اس سوال کا جواب نہیں گذرا۔

اس سوال کا جو جواب فہمِ ناقص میں آتا ہے اسے سمجھنے سے پہلے بطور تمہید یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حدیث میں لفظ ہیں: حتی الآن، اس میں الآن کا لفظ زمانہ حال پر دلالت کر رہا ہے، یعنی زمانہ حال تک جسم گھٹتے رہے، زمانہ حال میں گھٹنے کا سلسلہ رک گیا۔زمانہ حال سے کیا مراد ہے۔علمائے بلاغت نے زمانۂ حال کی تعریف یہ کی ہے یہ وہ زمانہ ہے جو ماضی اور مستقبل کے کچھ اجزا کا مجموعہ ہے۔اس لئے کہ حقیقی اور منطقی حال بہت ہی معمولی سا ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جزء لا یتجزی ہوتا ہے۔اس لئے کہ زمانے کا جو لمحہ گذر گیا وہ ماضی بن گیا۔جو ابھی آیا نہیں وہ مستقبل ہے۔جب آپ کہتے ہیں میں کھانا کھا رہا ہوں تو عرفاً اور زبان کے قواعد کے لحاظ یہ زمانہ حال کہلاتا ہے، حالانکہ جب آپ یہ بات کہہ رہے ہوتے ہیں اس وقت کچھ کھانا آپ کھا چکے ہوتے ہیں اور کچھ ابھی آپ نے کھانا ہوتا ہے۔عرفاً اس سب کو زمانہ حال ہی شمار کیا جاتا ہے۔اس لئے زمانہ حال در حقیقت ماضی اور مستقبل کے اجزا کا مجموعہ ہوتا ہے۔اب حال، ماضی اور مستقبل

کے کتنے حصے پر محیط ہو گا اس کا انحصار جملے کے مضمون پر ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں میں کھانا کھا رہا ہوں، یہ بھی حال ہے اور چند منٹوں پر مشتمل ہو گا۔ آپ کہتے ہیں کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔ یہ بھی حال ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم کتنے ہزار یا کتنے لاکھ یا اس سے بھی زیادہ سالوں پر مشتمل ہے۔

اصل بات یہاں یہ ہے کہ ابتدا میں اللہ تعالی نے آدم کو غیر معمولی قد کاٹھ والا بنا کر بھیجا۔ اس میں اللہ تعالی کی بے شمار حکمتیں ہوں گی۔ پھر اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا تھا کہ اس زمین پر رہنے کے لئے انسان کو اتنے بڑے جسم کی ضرورت نہیں، اسے ایک خاص سطح پر ہونا چاہئے۔ یہ بھی اللہ کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ انسان کو یک دم چھوٹا کر کے اس سطح پر لانے کی بجائے تدریجاً اس سطح پر لانا مناسب ہو گا۔ اس لئے ہر نسل میں انسان کی جسامت پچھلی سطح سے کم ہونے لگی۔ جب گھٹتے گھٹتے انسان اس سطح پر آ گیا جہاں رکھنا اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا تھا تو یہ سلسلہ رک گیا۔ جس وقت یہ سلسلہ رکا اس وقت سے لے کر اب تک کا سارا وقت ''الآن'' کے زمانہ حال میں داخل ہے۔ جو انسانی باقیات یا قدیم رہائش گاہیں موجودہ قد کاٹھ کے مطابق ملی ہیں وہ سب کی سب اس ''الآن'' کے بعد کی ہیں۔ اس سے پہلے کا انسان یقیناً اس سے بڑا ہو گا۔ اگر علم الآثار (Archaeology) سے اس کا ثبوت نہ بھی ملے تو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ نہ معلوم کتنی حقیقتیں ہیں جنہیں انسان پہلے نہیں جانتا تھا بعد میں ان کا انکشاف ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ اب بھی بہت سی حقیقتیں موجود ہوں اور انسان انہیں دریافت نہ کر سکا ہو۔ قرآن کریم نے قوم عاد کے ہلاک ہونے والے لوگوں کے بارے میں کہا ہے کأنهم أعجاز نخل خاوية [الحاقة : ۷] یعنی ان کی لاشیں کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح تھیں۔ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ تشبیہ ان کے قد و قامت کی لمبائی کو بیان کرنے لئے ہو۔ ظاہر ہے کہ کھجور کے تنے کی لمبائی آج کے انسان کے قد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس آیت کے اس مطلب کے مطابق اس سے بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کوئی دور ایسا بھی گذرا ہے جب انسان کا قد اور وجود آج کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر بڑا ہوتا تھا۔ انٹر نیٹ پر ایک تصویر چلتی رہی ہے جس میں بعض جگہوں سے دریافت ہونے والے ایسے انسانی ڈھانچے دکھائے گئے ہیں جو بہت بڑے بڑے ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہ قوم عاد کے لوگ ہیں۔ مجھے ان تصویروں کی حقیقت کے بارے میں تحقیق تو

نہیں ہے تاہم یہ واضح ہے کہ ایسا ہونا ممکن ضرور ہے اور جب صحیح حدیثوں میں یہ بات آگئی تو اسے ماننا ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے۔

ہر ایک کو سلام کرو جان پہچان ہو یا نہیں

(۲) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو: أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: «تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ». متفق عليه.

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے ایک آدمی نے سوال کیا اسلام (کے کاموں میں سے) کون سا (زیادہ) بہتر ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کھانا کھلاؤ اور جسے پہچانتے ہو اور نہیں پہچانتے اسے سلام کرو۔

سب سے افضل عمل کونسا؟

یہ بحث کتاب الایمان میں گذر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کونسا عمل سب سے افضل ہے تو آپ نے مختلف احادیث میں اس سوال کے مختلف جواب ارشاد فرمائے، اس کی وجہ اور حکمت کیا ہے۔ اس حدیث کے تحت بعض شارحین نے یہ فرمایا ہے کہ یہاں سائل کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اسلامی اعمال جن کا تعلق ایک دوسرے کے حقوق اور ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ سے ہے ان میں سے سب سے افضل عمل کونسا ہے۔ ممکن ہے سائل کا مقصد یہی ہو، اور آں حضرت ﷺ نے سوال کا منشا یہی سمجھ کر جواب دیا ہو۔ تاہم حدیث میں سوال کے الفاظ عام ہیں۔ اس لئے اس احتمال کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ سوال کا مقصد بحیثیت مجموعی تمام اعمالِ اسلام میں سے سب سے

افضل کے بارے میں پوچھنا ہو۔ فرق یہ پڑے گا کہ پہلے احتمال پر حدیث کا مطلب یہ بنے گا کہ معاشرتی اعمال میں سے سب سے بہتر مذکورہ دو عمل ہیں اور دوسرے احتمال پر مطلب یہ بنے گا کہ تمام اعمال میں سے بہتر یہ عمل ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حدیث میں سوال افضیلت کے بارے میں نہیں بلکہ خیر ہونے کے بارے میں ہے۔ خیر کے لفظ میں نافعیت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔اس کے مطابق حدیث کا مقصد نافع ترین عمل کا بیان ہے۔ دنوں عملوں کا تعلق معاشرتی حقوق و آداب سے ہے۔ پہلا عمل سوسائٹی میں ایک دوسرے کے حقوق سے متعلق ہے۔ ایک معاشرے میں رہنے والوں کا ایک دوسرے پر سب سے بڑا حق یہ ہے کہ ایک دوسرے کی ضروریات کا خیال رکھیں، اور ضروریات میں کھانے کی ضرورت سب سے اہم ہے، اس کے بغیر زندگی نہیں بچ سکتی اس لئے شاید یہاں اس کا ذکر کیا گیا ہو۔ دوسری چیز سوسائٹی میں باہمی تعلقات کی بہتری کے بارے میں ہے۔ ہر ایک کو سلام کرنے سے باہمی الفت و محبت پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ اسی باب کی چوتھی حدیث میں آرہا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ حدیث میں کھانا کھلانے کا ذکر ہے، جس کو کھلایا جارہا ہے اس کے بھوکے اور محتاج ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ متعدد حدیثوں میں بھوکوں کو کھلانے کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔اس طرح کے مواقع پر مطلق کو اپنے اطلاق پر اور مقید کو اپنی تقیید پر رکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھوکوں اور محتاجوں کو کھانا کھلانا ایک مستقل نیکی ہے اور ویسے کھانا کھلانا ایک مستقل نیکی ہے۔ آپ اپنے کسی دوست کی دعوت کرتے ہیں اور اسے کھلاتے ہیں، اپنے کسی مہمان کو کھلاتے ہیں، اگرچہ وہ محتاج نہیں ہے تب بھی اسے کھلانا اط-عام الطعام میں داخل ہے۔اس کا کم از کم فائدہ یہ ہے کہ اس سے باہمی الفت پیدا ہوتی ہے۔اس طرح سے حدیث میں ذکر کردہ دوسرے عمل کا باہمی الفت پیدا کرنے سے تعلق تو ہے ہی، پہلا عمل بھی اس فائدے سے خالی نہیں۔

لوگوں سے الفت کا تعلق عقل مندی ہے:

لہذا اس حدیث کا بڑا محور معاشرے میں باہمی الفت کے ساتھ ہے۔ایک حدیث روایت کی گئی ہے، جس کی سند میں اگرچہ کچھ ضعف ہے، لیکن متعدد طرق سے مروی ہے، جس کا مضمون یہ ہے کہ ایمان کے بعد سب سے بڑی نیکی التودد إلی الناس ہے۔یعنی ایسا انداز اختیار کرنا جس سے لوگ آپ سے مانوس ہوں۔ بعض روایتوں کے لفظ ہیں کہ لوگوں کے ساتھ دوستی اور الفت کا برتاؤ کرنا ایمان کے بعد سب سے بڑی عقل مندی ہے[1]۔ بعض سلف سے یہ منقول ہے کہ مروّت میں سب سے پہلی چیز خندہ پیشانی ہے۔دوسری چیز تودد إلی الناس یعنی لوگوں کے ساتھ الفت والا برتاؤ ہے۔اور تیسری چیز لوگوں کے کام آنا ہے[2]۔

مسلمان کے چھ حقوق

(۳) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " لِلْمُؤْمِنِ عَلَى الْمُؤْمِنِ سِتُّ خِصَالٍ: يَعُودُهُ إِذَا مَرِضَ وَيَشْهَدُهُ إِذَا مَاتَ وَيُجِيبُهُ إِذَا دَعَاهُ وَيُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِذَا لَقِيَهُ وَيُشَمِّتُهُ إِذَا عَطَسَ وَيَنْصَحُ لَهُ إِذَا غَابَ أَوْ شَهِدَ «لَمْ أَجِدْهُ» فِي الصَّحِيحَيْنِ «وَلَا فِي كِتَابِ الْحُمَيْدِيِّ وَلَكِنْ ذَكَرَهُ صَاحِبُ» الْجَامِعِ " بِرِوَايَةِ النَّسَائِيِّ

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مومن

1-المعجم الأوسط حدیث نمبر: ۶۰۷۰ مجمع الزوائد ۸/۱۷ باب مداراۃ الناس ۸/۲۸ باب العقل والعقلاء۔

2-المجالسۃ وجواہر العلم للدینوری ۳/۱۸۹

کے ذمے دوسرے مومن کے لئے چھ کام ہیں۔ جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے۔ جب وہ مر جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو۔ جب وہ بلائے (دعوت کرے) تو اسے قبول کرے۔ جب اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرے۔ جب اسے چھینک آئے تو رحمت کی دعا کرے۔ اور جب وہ سامنے موجود ہو یا غائب ہو تو اس کا بھلا سوچے۔

اس حدیث میں مسلمان کے مسلمان کے ذمے چھ حقوق ہیں۔ بعض حدیثوں اور اسی حدیث کی بعض روایتوں میں پانچ حقوق کا بھی ذکر ہے۔ حقوق سے کیا مراد ہے، اس میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا کہ حقوق سے مراد حقوقِ واجبہ ہیں۔ بعض نے کہا غیر واجب حقوق مراد ہیں۔ یعنی اخلاق اور مروت کا تقاضا ہے کہ یہ کام کئے جائیں۔ بعض نے کہا کہ حقوق واجبہ مراد ہیں، لیکن یہ حقوق واجب علی العین نہیں بلکہ واجب علی الکفایہ ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصود مطلقا حق ہونے کو بیان کرنا ہے۔ واجب ہونے یا نہ ہونے، واجب علی العین یا علی الکفایہ ہونے کا فیصلہ دیگر حالات اور موقع محل کی بنیاد پر ہوگا۔

اس حدیث میں پہلا حق یہ ذکر کیا گیا ہے جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کی جائے۔ عیادت کے مفہوم میں دو چیزیں داخل ہیں۔ ایک یہ کہ بیمار کی دیکھ بھال کی جائے۔ اگر خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ ہو تو اس معنی میں عیادت واجب علی الکفایہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جب کوئی بیمار ہو تو اس کا حال پوچھا جائے۔ اس سے بیمار کا جی بھی خوش ہو جاتا ہے، بیماری کی مدافعت کے لئے اسے معنوی اور نفسیاتی طاقت ملتی ہے اور باہمی روابط میں بہتری میں بھی اس سے مدد ملتی ہے اور یہ پیغام ملتا ہے کہ ہمارا دکھ درد سانجھا ہے۔ اس معنی میں عیادت مکارمِ اخلاق میں سے ہے، جس کی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، جو کتاب الجنائز کے شروع میں گذر چکی ہیں۔ دوسرا حق جنازے میں شریک ہونا ہے۔ جس میں نمازِ جنازہ میں شرکت بھی شامل ہے اور اس کے ملحقات جیسے تدفین وغیرہ بھی داخل ہے۔

تیسری چیز ہے ویجیبہ،اذادعاہ کہ جب وہ دعوت کرے تواس کی دعوت کو قبول کرے۔دعوت قبول کرنے کا حکم کیاہے اس کی تفصیل کا موقع تو کتاب النکاح میں باب الولیمہ ہے۔یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ اکثر علما کے نزدیک دعوت قبول کرنا سنت ہے اور سنت موکدہ ہے۔البتہ دعوتِ ولیمہ قبول کر لینے میں تاکید زیادہ ہے بنسبت عام دعوت کے۔اگر کسی نے دعوت کی اور اس کے ہاں چلا گیا لیکن روزے وغیرہ کی وجہ سے کچھ کھایا نہیں تو بھی دعوت قبول ہو گئی۔

دعوت قبول کرنا اگرچہ سنت موکدہ ہے لیکن اعذار کی وجہ سے اس کی سنیت یا وجوب ختم ہو جاتاہے اور اعذار کے اندر بڑی وسعت ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی عذر سمجھا گیا ہے۔ آدمی کی کچھ طبیعت خراب ہے یا کچھ اور مصروفیت ہے، سردی ہے زیادہ گرمی ہے وغیرہ وغیرہ حتی کہ امام مالک نے یہاں تک فرمایاہے کہ جس جگہ پر دعوت ہے اگر وہاں پر امکان ہے اور یہ اندازہ ہے کہ میرے حق کے مطابق مجھے مقام نہیں دیا جائے گا، بے توقیری ہو گی تو یہ بھی عذر ہے۔اس صورت میں اگر دعوت قبول نہ کرے تو یہ بھی جائز ہے۔اپنی عزت کی حفاظت کرنا یہ تواضع کے خلاف نہیں ہوتا۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی فقہانے عذر قرار دے دیا ہے۔

حدیث میں یہ فرمایا کہ ویجیبہ اذادعاہ۔اس کے مفہوم میں جس طرح کھانے وغیرہ کی دعوت قبول کرنا داخل ہے اسی طرح اس کے عمومی مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ جب بھی وہ بلائے تو اس کی بات سنے۔''دعاہ'' کے لفظ عام ہیں چاہے وہ کھانے کے لئے بلائے چاہے وہ اپنی مدد کے لئے بلائے اس کو آپ کی مدد ضرورت ہے تو اس کی مدد کے لئے اس کی بات سننا یہ بھی اس کا حق اور یجیبہ اذادعاہ کے اندر داخل ہے۔

چوتھا حق یہ بیان فرمایا'' ویشمتہ،اذاعطس''کہ جب وہ چھینکے تو اس کو یرحمک اللہ کہے۔اس کا حکم آگے باب العطاس والتثاؤب میں ان شاءاللہ آجائے گا۔

آخری بات یہ فرمائی ''وینصح لہ، اذاغاب او شہد ''یعنی اپنے مسلمان بھائی کے سامنے ہو یا وہ غائب ہو ہر حال میں اس کی خیر خواہی کی بات کرو، سامنے بھی خیر خواہی کی بات کرو، اور پسِ پشت بھی خیر خواہی کی بات کرو۔ بعض روایتوں میں اس کی جگہ لفظ یہ آتے ہیں ''اذا استنصحک فانصح لہ،'' جب تم سے وہ نصیحت طلب کرے یا خیر خواہی طلب کرے تو تم اس کو نصیحت کرو یا خیر خواہی کرو۔ لیکن ہمارے سامنے جو حدیث ہے اس کے الفاظ عام ہیں چاہے وہ خیر خواہی طلب کرے یا نہ کرے مطلقاً حکم اس کی موجودگی میں یا عدم موجودگی میں دونوں صورتوں میں اس کے ساتھ وہ برتاؤ کرو جس کو تم اس کے لئے بہتر سمجھو اس کے ساتھ خیر خواہی کا سلوک کرو۔

سلام اور اس کے جواب کی حیثیت:

درمیان میں ایک جملہ آیا ہے ''ویسلم علیہ اذالقیہ'' یہ جملہ یہاں ذرا تفصیل طلب ہے، اس لئے باب کے متعلق یہی جملہ ہے کہ جب اپنے مسلمان بھائی سے ملو تو اسے سلام کرو۔ یہ اس کا حق ہے۔ لیکن سلام کرنا حقِ واجب نہیں بلکہ سنت یا مستحب ہے۔ جس سے آدمی ملتا ہے اس کو سلام کرنا واجب نہیں بلکہ سنت یا مستحب ہے۔ البتہ سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ لیکن زیادہ ثواب سلام کرنے میں ہے جواب دینے میں نہیں۔ اصل قاعدہ تو یہی ہوتا ہے کہ فرض اور واجب کا ثواب زیادہ ہوتا ہے بنسبت نوافل اور سنن وغیرہ کے۔ لیکن یہاں پر یہ مسئلہ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہے یہاں پر ابتداء بالسلام کرنے والے کو ثواب زیادہ ملے گا اور جواب دینے والے کو ثواب ملے گا تو سہی لیکن کم ملے گا۔ کیونکہ اس کو جو جواب دیناپڑا ہے اسی کے سلام کی وجہ سے دیناپڑا ہے تو اس نے جس واجب کو ادا کیا ہے اس کا سبب بھی یہی بنا ہے اس لئے ابتداء بالسلام کا ثواب زیادہ ہے۔

دوسرے کو سلام کا جواب سنانے کا حکم:

سلام کا جواب دیناواجب ہے اس کے ساتھ کئی علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جسے جواب دیا جارہا ہے اسے سنانا بھی واجب ہے ، اگر آدمی بہرا ہے تو کم از ہونٹ ہلادے تاکہ اگلے کو معلوم ہو جائے کہ اس نے سوال کا جواب دیا ہے۔ لیکن بعض علمانے یہ فرمایاہے کہ جواب دیناتوواجب ہے لیکن جواب سنانا واجب نہیں ۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نے بھی یہی فرمایاہے کہ ردّالسلام توواجب ہے لیکن اطلاع الرد واجب نہیں۔ ہاں البتہ اگر آپ نے سلام کا جواب آہستہ سے دیااسے سنایانہیں اس کی وجہ سے خطرہ یہ ہے کہ وہ اس کو بے توجہی اور بے اعتنائی پر محمول کرے گا، یہ سمجھے گا کہ میرے سلام کو اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی ''مجھے اس نے گھاس ہی نہیں ڈالی''تو اس صورت میں دوسرے کو ذہنی ایذا سے بچانے اور غلط فہمی سے بچنے کے لئے سنانا بھی ضروری ہوگا۔ تو بذات خود تو سنانا ضروری نہیں لیکن میں نے کہاالسلام علیکم دوسرے نے آہستہ جواب دیا میں یہ سمجھا کہ اس نے جواب دیا ہی نہیں تو میرے دل میں کدورت پیدا ہو جائے گی تو اگر کدورت پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو پھر تو سلام کا جواب دینا بھی ضروری اور سنانا بھی ضروری لیکن اگر کدورت پیدا ہونے کا خطرہ نہ ہو تو پھر سلام کا جواب دینا تو ضروری ہے لیکن سنانا ضروری نہیں۔ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ اگر جواب دوسرے کو سنایا نہیں تو وہ جواب ہی نہیں بنا۔ بظاہر اس کا محمل بھی وہی معلوم ہوتا ہے جو ابھی ذکر کیا۔

خط میں سلام کا جواب دینا:

اس سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ کسی کا خط آیا اس میں سلام لکھا ہوا ہے تو اب اس کا جواب کیسے دیں۔ اس کے جواب کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم بھی اس کو اس کے خط کے جواب میں خط لکھیں۔ بعض علمانے کہا ہے کہ خط کا جواب دیناواجب ہے، اس لئے کہ خط کے اندر سلام ہے اور سلام کا جواب دیناواجب ہے اور یہ واجب موقوف ہے خط کے جواب پر۔ اس لئے خط کا جواب دیناواجب ہے۔ لیکن جو اصول پہلے ذکر کیا اس کے مطابق زبانی جواب دے

دیاتو بھی کافی ہے۔خط پڑھ کر کہہ دیاو علیکم السلام تو بھی کافی ہے۔کیونکہ سلام کاجواب دیناضروری ہے اور دوسرے تک پہچاناضروری نہیں ہے۔

ملاقات کی صورتیں اور السلام علیکم سے ابتداء:

یہ فرمایا کہ اسے سلام کروجب تم اسے ملو۔یسلم علیہ اذالقیہ۔تو ملناعام ہے،کسی بھی طریقے سے دوسرے مسلمان سے تمہارارابطہ ہوتواس کاحق یہ ہے کہ اسے سلام کیاجائے۔آمنے سامنے ملاقات ہورہی ہے تو بھی،پانچ منٹ کے بعددوبارہ ملاقات ہورہی ہے تو بھی،یہاں تک کہ اگرپتھر کے پیچھے،چٹان کے پیچھے تھوڑی دیر کے لئے چھپنے پردوبارہ اس کے سامنے آگئے تو بھی اذالقیہ پایاگیاتواب چاہئے کہ سلام کرے۔

میں یہ عرض کررہاتھاکہ ملنے کی کئی صورتیں ہیں۔خط کے ذریعے سے رابطہ ہوتویہ بھی ''لقیہ''کاایک فردہے لہٰذاجب کسی کو خط لکھنے لگیں تواس میں بھی سلام لکھناچاہئے السلام علیکم سے شروع کرناچاہئے۔اسی طریقے سے کسی سے فون پر رابطہ ہوتو بھی سلام کرناچاہئے۔یہ جوطریقہ ہے کہ فون اٹھاتے ہی کلام کاآغاز ہیلوسے کرتے ہیں تویہ انگریزی طریقہ ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب فون اٹھائیں تواٹھاتے ہی السلام علیکم کہیں۔کیونکہ آپ نے فون اٹھاکر کسی سے بات کی توآپ کاکسی سے رابطہ ہوگیاتواذالقیہ کامفہوم پایاگیااوراغلب یہی ہے کہ آپ کوجوفون کررہاہے وہ مسلمان ہی ہوگایہ توبعدمیں وہ بتائے گاکہ میں کون ہوں لیکن اغلب یہی ہے کہ وہ کوئی مسلمان ہی ہوگا،چاہے تم پہچانتے ہویانہ پہچانتے ہو،ہر حالت میں جب فون اٹھاؤتوالسلام علیکم کہو،اس کے بعد فون کرنے والاسلام کاجواب دے گاپھر جوبات ضروری ہے وہ کرے

حدیث کی تخریج پر ایک بحث:

یہاں یہ حدیث صاحبِ مشکوۃ نے الفصل الأول میں ذکر کی ہے۔ صاحبِ مصابیح نے بھی یہ حدیث "صحاح" میں ذکر کی ہے۔ الفصل الاول اور صحاح میں وہ حدیثیں ذکر کی جاتی ہیں جو صحیحین میں سے کسی ایک میں ہوں۔ اس حدیث کے بارے میں صاحب مشکوۃ یہ بتا رہے ہیں کہ یہ حدیث مجھے صحیحین میں کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح الحمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں اس کا ذکر نہیں کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں بھی یہ حدیث صحیحین میں نہیں ملی۔ ابن الأثیر نے بھی جامع الأصول میں یہ حدیث صحیحین کے حوالے سے ذکر نہیں کی بلکہ نسائی کے حوالے سے ذکر کی ہے۔ یعنی انہیں بھی صحیحین میں یہ حدیث نہیں ملی۔

اس گفتگو سے حدیث کی تخریج کا مسئلہ تو حل ہو گیا کہ امام نسائی نے یہ حدیث روایت کی ہے [1]۔ تاہم یہ سوال برقرار ہے کہ جب یہ حدیث غیر صحیحین کی ہے تو اسے الفصل الأول میں کیوں ذکر کیا گیا۔ تو اصل بات یہ کہ یہ حدیث ان لفظوں کے ساتھ اگرچہ صحیحین میں نہیں ہے تاہم لفظوں کے فرق کے ساتھ صحیح بخاری کتاب الجنائز: باب اتباع الجنائز میں موجود ہے جو ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے: حق المسلم علی المسلم خمس یہی حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے اور ان لفظوں سے شروع ہوتی ہے: حق المسلم علی المسلم ست۔

سلام کی کثرت باہمی محبت کا ذریعہ

(٤) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا تَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ

---

[1]۔ سنن النسائی، کتاب الجنائز: باب النہی عن سب الأموات۔

حَتَّى تُؤْمِنُوا وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا أَو لَا أدلكم على شَيْء إِذا فعلتموه تحاببتم؟ أفشوا السَّلَام بَيْنكُم» رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جنت میں اس وقت داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مؤمن نہ بن جاؤ، اور تم مومن نہیں بنو گے جب تک کہ تم آپس میں محبت نہ کرو گے۔ کیا میں تمہاری رہنمائی ایسے کام کی طرف نہ کروں کہ جب تم وہ کر لو گے تو آپس میں محبت کرنے لگ جاؤ گے (وہ کام یہ ہے) کہ اپنے درمیان سلام کو عام کرو۔

جنت میں داخل ہونے کے لئے ایمان شرط ہے۔ مؤمن بننے سے مراد یہ ہے کہ مؤمن کامل بنو۔ نفس ایمان تو عقیدے کی اصلاح سے ہو جاتا ہے لیکن یہاں پر وہ مراد نہیں بلکہ ایمان سے مراد ایمان کا کامل درجہ ہے۔ تو جنت کا اولین حصول جب ملے گا کہ تم مؤمن بن جاؤ۔ اس لئے میں نے یہ ترجمہ نہیں کہ ایمان لے آؤ۔ میں نے ترجمہ کیا ہے مؤمن بن جاؤ۔ دونوں میں فرق ہے کہ عقیدہ ٹھیک کر لیا اور اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ کہہ دیا، شہادتین کا اقرار کر لیا تو ایمان لے آئے، لیکن مؤمن بننے سے مراد ہے ایمان کے تقاضے تمہارے اندر پیدا ہو جائیں۔ تو جنت کا اولین حصول موقوف ہے مؤمن بننے پر۔ اور مؤمن بننا موقوف ہے اس بات پر کہ آپس میں نفرت اور عداوت کے بجائے محبت ہو۔ تو اب یہ ضروری ہے کہ محبت پیدا کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ آپس میں محبت کیسے پیدا ہو گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا طریقہ میں تمہیں بتلاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ سلام کثرت سے کرو۔ جب سلام کثرت سے کرو گے تو آپس میں محبت پیدا ہو جائے گی۔ اور جب آپس میں محبت پیدا ہو گی تو مؤمن بن جاؤ گے اور جب مؤمن بن جاؤ گے تو جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ یہ حدیث کا حاصل ہے۔

اب یہاں کثرت سے سلام کر لینے میں اور محبت پیدا ہونے میں کیا تعلق ہے۔ یعنی جو فرمایا کہ کثرت سے سلام کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگ جاؤ گے اس کی وجہ کیا ہے؟ تو وجہ جاننے کی ضرورت نہیں حضور اقدس

ﷺ نے فرمایا کہ کثرتِ سلام کی وجہ سے آپس میں محبتیں بڑھیں گی۔ تو پتہ چلا کہ کثرت سلام میں واقعۃً یہ تاثیر ہے چاہے ہمیں یہ سمجھ میں آئے کہ یہ تاثیر کیوں ہے یا سمجھ میں نہ آئے۔ جیسے حکیم نے، ڈاکٹر نے ایک نسخہ لکھ کر دیا تو آپ سمجھتے ہیں کہ اس میں یہ تاثیر ہوگی کہ اس سے میری بیماری زائل ہو جائے گی، چاہے یہ میری سمجھ میں آئے کہ کیسے زائل ہوگی یا سمجھ میں نہ آئے۔ اسی طریقے سے یہاں پر ہے۔ البتہ اتنی بات بہت واضح ہے کہ جب سلام کسی کو کیا جاتا ہے تو سلام کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سلام کرنے والا اس کو اپنے بارے میں اطمینان دلا رہا ہے کہ میں تمہاری سلامتی کا خواہاں ہوں، تمہاری سلامتی چاہتا ہوں لہٰذا تم مجھ سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرو۔ تو جب ہر آدمی ایک دوسرے کو اطمینان دلا رہا ہو کہ تم مجھ سے کوئی خطرہ محسوس نہ کرو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں تو ظاہر ہے کہ محبتیں پیدا ہوں گی۔

حدیث کے اعراب کی ایک بحث:

یہاں ولا تومنوا حتی تحابوا میں دو روایتیں ہیں۔ یہ حدیث یہاں پر صحیح مسلم کے حوالے سے روایت کی گئی ہے۔ تو اس کے لفظ کے بارے میں صحیح مسلم کی ہی دو روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے لفظ ہیں: ''لا تؤمنون'' یہ روایت تو قاعدے کے بالکل مطابق ہے۔ کیونکہ یہاں مضارع کو نصب یا جزم دینے والی کوئی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے آخر سے نون اعرابی حذف ہو ک، کیونکہ لا تومنون کا لا نافیہ ہے لا ناہیہ نہیں ہے۔ نہی کا لا مضارع کو جزم دیتا ہے لیکن نفی کا لا مضارع کو جزم یا نصب نہیں دیتا اس لئے یہ روایت تو قاعدے کے مطابق ہے اس پر کوئی سوال نہیں۔ لیکن جو معروف روایت ہے اور مشکوۃ کے اکثر و بیشتر نسخوں میں ہے وہ ہے لا تومنوا۔ آخر سے نون حذف ہو گیا تو سوال یہ ہے کہ نون کیسے حذف ہو گیا کیونکہ قاعدے کا تقاضا یہ تھا کہ نون پڑھا جائے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مجانست کی وجہ سے نون کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ مجانست کے معنی یہ ہیں کہ اس سے ملتا جلتا لفظ کوئی اور ہے تو دونوں لفظوں کو ایک جیسا کرنے کے لئے نون کو حذف کر دیا۔ اس سے پہلے

حتی تومنوا ہے، وہاں پر واقعۃً نون حذف ہونا چاہیئے اس لئے کہ اُس سے پہلے حتی ہے تو چونکہ وہاں نون حذف ہوا اس لئے اس کے ساتھ مجانست برقرار رکھنے کے لئے لا تومنوا کے اندر بھی نون کو حذف کر دیا۔ یہ نحو کا مستقل ایک اصول و قاعدہ ہے کہ بعض دفعہ محض پڑوس کی وجہ سے کوئی حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔ صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ صحبت کا اثر نحو کے اندر بھی چلتا ہے۔ آپ نے جرّ جوار سنی ہو گی۔

کون کس کو سلام کرے

(٥) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى الْمَاشِي وَالْمَاشِي عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ» متفق عليه.

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوار سلام کرے پیدل کو اور پیدل چلنے والا بیٹھنے والے کو اور تھوڑوں کو چاہیئے کہ سلام کریں زیادہ کو۔

(٦) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُسَلِّمُ الصَّغِيرُ عَلَى الْكَبِيرِ وَالْمَارُّ عَلَى الْقَاعِدِ وَالْقَلِيلُ عَلَى الْكَثِيرِ»

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھوٹا سلام کرے بڑے کو اور گزرنے والا سلام کرے بیٹھنے والے کو اور تھوڑے سلام کریں زیادہ کو۔

یہ دو حدیثیں ہیں، ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس کا حق بنتا ہے کہ وہ دوسرے کو سلام کرے۔ اس طرح کی اور بھی کچھ حدیثیں ہیں جن میں یہ باتیں بتلائی گئی ہیں کہ کس کو کس پر سلام کرنا چاہیئے۔ تو اس سلسلے میں ساری

حدیثوں کو ملا کر جو بنیادی اصول سمجھ میں آتے ہیں وہ ذہن میں رکھ لینے چاہئیں۔

کون کس کو سلام کرے اس کی بنیادیں تین ہیں بلکہ اگر غور کریں تو دو بنتی ہیں۔ پہلا اصول تو یہ ہے کہ آنے والے کا حق بنتا ہے کہ وہ اُسے یا انہیں سلام کرے جن کے پاس وہ آیا ہے۔ تو داخل کا حق بنتا ہے کہ وہ سلام کرے مدخول علیہم پر۔ لٰہذا جسے بھی آنے والے کے ساتھ مشابہت ہو گی اس کو چاہئے کہ وہ دوسرے کو سلام کرے۔ لٰہذا ایک آدمی راستے میں بیٹھا ہوا ہے دوسرا اس کے پاس گذر رہا ہے تو آنے والے کے مشابہ گزرنے والا ہے لٰہذا اس کو چاہئے کہ وہ قاعد کو سلام کرے۔ ایک آدمی پیدل جارہا ہے اور دوسرا سواری پر تو دونوں ایک دوسرے کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن آنے والے کے ساتھ زیادہ مشابہت سوار کو ہے اس لئے سوار کو چاہئے کہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ جو در حقیقت اسی سے نکلتا ہے وہ ہے دوسرے کو سلامتی کا اطمینان دلانا اور اس کے دل سے خطرے کو زائل کرنا۔ جس کے بارے میں دوسرے کے دل میں کھٹکا ہو سکتا ہے کہ پتا نہیں کون ہے اور کس لئے آیا ہے اور میرے ساتھ کیا کرے گا، اس کو چاہئے کہ السلام علیکم کہہ کر دوسرے کے دل سے اس خطرے کو زائل کردے اور اس کے دل کو مطمئن کردے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلے سے کسی جگہ بیٹھے ہوئے شخص کو آنے والے کے بارے میں خطرہ ہوتا ہے۔ آپ کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں جو آنے والا ہے اس کو آپ سے خطرہ نہیں ہو گا ہاں البتہ آپ کے دل میں ضرور خیال آئے گا کہ پتا نہیں کون آیا ہے۔

اور تیسرا اصول ہے توقیر، کہ جس پر جس کی تعظیم واجب ہے یا جس کو جس کی توقیر کرنی چاہئے اسے چاہئے کہ اسے سلام کرے۔ چنانچہ یہ جو فرمایا کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے یہ اسی قبیل سے ہے۔ اس میں ازالۂ خطر کی بات نہیں اس لئے کہ بڑے کو چھوٹے سے خطرہ نہیں ہوتا لیکن توقیر اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ اسے سلام کرے۔

یہ تو حاصل ہے اس اصول کا کہ کون کس کو سلام کرے۔ لیکن جس کو چاہئے تھا کہ وہ سلام میں پہل کرے اس کی بجائے دوسرے نے سلام میں پہل کر دی تو یہ اور اچھی بات ہے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ مثلاً چھوٹے کو چاہئے تھا کہ وہ بڑے کو سلام کرے لیکن بڑے نے پہلے سلام کر دیا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں بلکہ زیادہ اچھی بات ہے، اس لئے کہ اس کا منشا اس بڑے کی تواضع ہے۔ اسی طرح سوار کو چاہئے تھا کہ وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے لیکن پیدل چلنے والے نے پہلے سلام کر دیا تو یہ نہیں کہا جائے گا اس نے پہلے کو سلام کیوں کیا، بلکہ یہ اور اچھی بات ہے کیونکہ سلام کی پہل کرنا یہ تو ضع کی علامت ہے۔

بچوں کو سلام کرنا

(۷) وَعَن أَنَسٍ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰہَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مر على غلْمَان فَسلم عَلَيْهِم. متفق عليه.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر کچھ بچوں پر ہوا تو آپ نے انہیں سلام کیا۔

اس کی وجہ میں ایک احتمال تو یہ ہے کہ آپ ﷺ مارّ کے مشابہ تھے اور وہ قاعد کے مشابہ تھے، آپ گزر رہے تھے وہاں سے اور وہ پہلے سے وہاں موجود تھے اس لئے قاعدے کے لحاظ سے آپ کو سلام کرنا چاہئے تھا۔ یا تھوڑا سا دوسرے اعتبار سے دیکھیں کیونکہ وہ چھوٹے تھے اور آپ بڑے ہیں تو لہٰذا ان کو سلام کرنا چاہئے تھا لیکن آپ نے ابتدأ بالسلام کی ہے تواضع کی وجہ سے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ جیسے بڑوں کو سلام کرنا سنت ہے اسی طرح چھوٹوں کو اور بچوں کو سلام کرنا بھی سنت ہے۔ ہاں البتہ یہ ہے وہ صبیّ ممز ہو یعنی اتنی عمر اس کی ہو کہ وہ سلام کو سمجھتا ہو اس کو پتہ ہو کہ سلام

کیا ہوتا ہے۔اب ایک سال کا بچہ چوسنی لے کر لیٹا ہوا ہے اور آپ اس کے پاس سے گزرتے ہیں اور کہتے ہیں السلام علیکم تو یہاں سلام کی ضرورت نہیں۔

غیر مسلموں کو سلام کرنے کا حکم

(٨) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عَلَيْهِ وَسلم: «لَا تبدؤوا الْيَهُودَ وَلَا النَّصَارَى بِالسَّلَامِ وَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِي طريقٍ فَاضْطَرُّوهُ إِلَى أضيَقِه» رواه مسلم.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہودیوں سے سلام کی ابتدا نہ کیا کرو اور نہ ہی عیسائیوں سے۔اور جب تم ان میں سے کسی کو راستے میں ملو تو ان کو راستے کے تنگ حصے کی طرف مجبور کر دو۔

(٩) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمُ الْيَهُودُ فَإِنَّمَا يَقُولُ أَحَدُهُمْ: السَّامُ عَلَيْك. فَقل: وَعَلَيْك متفق عليه.

حضرت ابن رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تمہیں یہودی سلام کرتے ہیں تو ان میں کوئی شخص یوں کہتا ہے السلام علیک تو تم کہو وعلیک۔

(۱۰) وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " إِذَا سَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَهْلُ الكتابِ فقولُوا: وَعَلَيْكُم "

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم انہیں کہو وعلیکم۔

ذمیوں کو تنگ راستے پر چلانے کا مطلب اور ذمیوں کے بعض احکام:

یہ تین حدیثیں ہیں ان میں پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب اہل کتاب میں سے کسی کو راستے میں پاؤ تو اس کو راستے کے تنگ حصے پر چلنے پر مجبور کر دو۔ راستے کے درمیان میں نہ چلنے دو۔ بلکہ وہ ایک طرف ہو کر چلے۔ اس کا تعلق ذمیوں کے احکام کے ساتھ ہے، ذمیوں کے احکام کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے، تاہم یہ بات ذہن میں رہے کہ قرآن کریم نے سورہ توبہ کی آیت نمبر ۲۹ میں جہاں غیر مسلموں کو ذمی بنانے کا ذکر ہے وہاں یہ بھی فرمایا ﴿حتی يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون﴾ اس میں ذمیوں کے لئے صغار کا ذکر ہے۔ صغار کے معنی ہیں دب کر رہنا، تابع ہو کر رہنا۔ اس حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ انہیں تنگ راستے پر مجبور کرو، یہ بھی بظاہر اسی کی عملی شکل ہے۔ صغار کے معنی بیان کرتے ہوئے امام شافعیؒ نے فرمایا ''هو جريان أحكام أهل الإسلام عليهم''[1] یعنی اصل مقصود یہ ہے کہ وہ ہمارے ماتحت ہو کر رہیں، ہماری ریاستی رٹ اور عمل داری کو تسلیم کریں، کسی قسم کی بغاوت یا سرکشی نہ کریں۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس آیت میں صغار کا ذکر ہے اس میں ان کفار کی بات ہو رہی ہے جو قتال کے نتیجے میں ہماری تابع داری اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ لہٰذا آیت براہِ راست ان کفار سے متعلق نہیں

1۔ تفسیر بغوی۔

جن کے ساتھ ہمارا عہد کسی اور نوعیت کا ہو۔ ظاہر ہے کہ جو محض قتال کے نتیجے میں ہماری تابع داری میں آئے ہیں ان سے سرکشی کا خطرہ بھی لازماً رہے گا، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ اس زمانے میں جو علاقے غیر مسلموں کے ہوتے تھے وہاں تقریباً وہی رہائش پذیر ہوتے تھے، اس لئے ان کے جتھا بنانے کے امکانات اور زیادہ ہو جاتے تھے۔ ایسی حالت میں قرآن نے خصوصیت سے کہا کہ انہیں ہمارا قانون تسلیم کر کے ہی رہنا ہو گا، سر چڑھ کر نہیں۔ لہذا امام شافعی کے الفاظ کے مطابق ہمارا قانون ان پر جاری ہونے سے ہی صغار کا قرآنی تقاضا تو پورا ہو جاتا ہے، لیکن ابھی ذکر کی گئی وجوہات کی بنیاد پر جس طرح کی سرکشی کا خطرہ ان سے ہو سکتا ہے اس کے دفعیے کے لئے بعض دیگر اقدامات بھی کرنے پڑ سکتے ہیں جن سے ذریعے ان میں یہ احساس تازہ رہے کہ ہم نے کسی قسم کی سرکشی نہیں کرنی، تاہم ان اقدامات کی نوعیت انتظامی ہو گی اور وہ زمان و مکان کے بدلنے سے بدل سکتے ہی وہ اقدامات بذاتِ خود مقصود نہیں ہیں۔ تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں جو ذمیوں کے احکام میں ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ یہ کیا جائے وہ کیا جائے ان کی نوعیت بھی یہی سمجھنی چاہئے۔

یہاں حدیث میں جو کہا گیا ہے کہ انہیں تنگ راستے پر مجبور کر و یہ بھی اسی طرح کی خاص صورتِ حال کے خاص اقدامات سے متعلق ہے۔ یہ اس لئے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کر رہے کہ ابو صالح، ان سے روایت کر رہے ہیں ان کے بیٹے سہیل، ان سے آگے بے شمار حضرات روایت کر رہے ہیں۔ سہیل کے شاگردوں کا اس حدیث کے نقل کرنے میں خاصا اختلاف ہے کہ یہ حکم کس کے بارے میں ہے۔ یہاں مشکوۃ میں صحیح مسلم کے حوالے سے جو روایت مذکور ہے اس میں یہود و نصاری کا لفظ ہے۔ بعض روایات میں مشرکین کا لفظ ہے [1] بعض روایتوں میں سہیل کے شاگرد زہیر سے پوچھا گیا کہ کیا یہود و نصاری مقصود ہیں، انہوں نے کہا نہیں، مشرکین کی

1۔ مثلاً مصنف عبد الرزاق حدیث نمبر: ۹۸۳۷۔

بات ہو رہی ہے[1]۔ بعض روایتوں میں صرف جمع مذکر کی ضمیر ہے، اِذا لقیتمو ہم[2]۔ لہذا اس بات میں خاصا ابہام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات کس سیاق میں کس طرح کے لوگوں کے بارے فرمائی ہے۔ اس لئے اس کا انطباق قواعدِ عامہ کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ جیسا کہ آگے سورہ ممتحنہ کے حوالے سے آئے گا کہ غیر محارب کفار کے ساتھ ہمیں اچھے سلوک سے منع نہیں کیا گیا اس لئے اس آیت کی رو سے انہیں اچھا راستہ دینا ممنوع نہیں ہو گا اور ہم انہیں تنگ راستے پر چلانے کے مکلف نہیں ہوں گے۔ اگر اس حدیث کو بالکل اپنے عموم پر رکھا جائے تو یہ بات سورہ ممتحنہ کی اس آیت کے خلاف ہو گی۔ حنفیہ کے ہاں تو ویسے ہی جب خبر واحد نص قرآنی کے خلاف ہو تو اس میں تاویل کی جاتی ہے خصوصا جبکہ اس خبر واحد میں اپنے مصداق کے حوالے سے بھی خاص ابہام موجود ہو۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آج کل مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم رہ رہے ہوتے ہیں وہ 'معاہد' کے مفہوم میں تو داخل ہو سکتے ہیں عموماً وہ ذمی نہیں ہوتے، اس لئے ذمہ ایک خاص قسم کا عقد ہے جو ان کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ انہیں ان مسلمان ملکوں کا مکمل شہری تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کے ساتھ ہمارے عہد کی نوعیت بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح غیر مسلم ملکوں کے عام باشندے بھی ہمارے لئے معاہد تو اس لئے ہم ایک عہد کے ساتھ وہاں رہائش پذیر ہیں لیکن نہ وہ ہمارے ذمی ہیں نہ ہی ہم ان کے ذمی ہیں۔

دوسری بات یہ کہ ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ یہودی مسلمانوں کو سلام کرتے تھے تو تاثر تو یہ دیتے تھے کہ ہم السلام علیکم کہہ رہے ہیں لیکن کہتے تھے السام علیکم۔ سام کے دو معنی آتے ہیں معروف معنی تو اس کا ہوتا ہے ''موت'' کہ تم پر موت ہو اور بعض نے اس کا معنی کیا ہے کہ یہ سأمت سے مشتق ہے کہ تم پر اکتاہٹ ہو یعنی تم اپنے دین سے جلدی اکتا جاؤ۔ یہودی ظاہر تو یہ کرتے تھے کہ ہم السلام علیکم کہہ رہے ہیں، لیکن حقیقت میں السلام کی بجائے

1۔ مسند ابن الجعد حدیث نمبر ۲۶۷۲۔ مسند امام احمد بن حنبل حدیث نمبر: ۲۵۶۷۔

2۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۶۷۔

السام کے لفظ بول رہے ہوتے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے انہیں جواب دینے کا طریقہ یہ بتایا کہ انہیں وعلیکم السلام یا وعلیکم السام کہنے کی بجائے صرف وعلیکم کہہ دیا کرو۔ اس طرح سے باحسن انداز ان کا جواب ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اگر ہم جواب میں وعلیکم السام کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس نے السلام علیکم کہا ہو، تو اس صورت میں اسے یہ کہنا کہ تم پر موت ہو غیر مناسب ہے۔ اور اگر ہم وعلیکم السلام کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ اس نے السام علیکم کہا ہو، اس صورت میں اس کے لئے سلامتی کی دعا کرنا اس کی چالاکی کامیاب بنانا ہے۔ یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا تم صرف وعلیکم کہہ دیا کرو۔ یعنی جو تم نے ہم پر بھیجا وہی تم پر۔

غیر مسلموں کو ابتدا بالسلام کا حکم:

ان حدیثوں سے متعلق دو مسئلے ہیں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ذمیوں کو ابتداءً سلام کرنے کا کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں۔ تو اس میں کئی اقوال ہیں بعض نے اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض نے ناجائز۔ جنھوں نے غیر مسلم کو ابتداءً سلام کرنے سے منع کیا ہے انہوں نے حضرت ابو ہریرۃؓ کی مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہود و نصاری سے سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ جنھوں نے انہیں ابتداء بالسلام کو جائز قرار دیا ہے انہوں نے ایک تو استدلال کیا چند حدیثوں کے بعد آنے والی حضرت اسامہؓ کی حدیث سے، جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر ایک ایسے مجمع سے ہوا جس میں مسلمان، مشرک اور اہلِ کتاب سب موجود تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں سلام کیا۔ لیکن اس کے بارے میں دوسری رائے والے حضرات یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اصل مقصود مسلمانوں کو سلام کرنا تھا، غیر مسلموں کو ضمناً ہو گیا۔ نیز ان حضرات نے استدلال کیا ہے افشاء السلام (سلام پھیلانے)

کے بارے میں حدیثوں کے عموم سے۔ حضرت سفیان بن عیینہؒ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے جواز بیان کرتے ہوئے سورۂ ممتحنہ کی اس آیت سے استدلال کیا[1]:

لا ینهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين

اللہ تعالی تمہیں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے قتال نہیں کیا اور نہ ہی تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اس بات سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور انصاف کرو، یقیناً اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر محارب کفار کے ساتھ حسنِ سلوک جائز ہے۔ اور سلام بھی حسنِ سلوک کی ایک شکل ہے۔ سلام کے مفہوم میں ضروری نہیں کہ آخرت ہی کی سلامتی اور مغفرت ہو، بلکہ سلام کے مفہوم میں دنیاوی تکالیف سے تحفظ، ہدایت نصیب ہونا وغیرہ بھی داخل ہیں، اور ظاہر ہے ان چیزوں کی غیر مسلم کے لئے دعا میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جواز کے حق میں یہ بات کی کہی جاسکتی ہے کہ اس باب کی پہلی حدیث میں آیا کہ جب آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سلام کیا تو اس کے بارے میں حضرت آدم کو اللہ تعالی کی طرف سے کہا گیا فإنها تحيتك وتحية ذريتك یہ تمہارا اور تمہاری ذریت کا تحیہ ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ سلام بنیادی طور پر تمام اولادِ آدم کے لئے ہے، یہ محض اسلامی نہیں بلکہ انسانی تحیہ ہے۔ اس حدیث کے عموم کا تقاضا بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل اس میں جواز ہے۔ کیونکہ یہاں نسلِ انسانی کا تذکرہ عموم کے ساتھ بغیر کسی تقیید کے ہوا ہے۔

1۔ تفسیر قرطبی، سورۃ مریم، قولہ تعالی: قال سلام علیک الخ۔

جہاں تک تعلق ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی یہاں ذکر ہونے والی حدیث کا، جس میں یہود و نصاری سے سلام میں پہل کرنے سے منع کیا گیا ہے تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کو اپنے عموم پر محمول کرنا درست نہیں، بلکہ اس کا تعلق مخصوص صورتِ حال سے ہے۔ جیسا کہ اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ انہیں تنگ راستے پر چلنے پر مجبور کرو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی بھی نہیں کہتا ہے کہ ہر حالت میں یہود و نصاری کے ساتھ راستے میں یہ سلوک کرنا ضروری ہے، نہ اس روایت کے علاوہ اس بات کے قرائن ملتے ہیں مدینہ منورہ میں یہودیوں کے ساتھ ایسا کیا جاتا تھا۔ یہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ تنگ راستے پر چلانے والے اس حکم کو خاص تناظر اور شریعت کے عام قواعد کی روشنی دیکھنا ہوگا۔ یہ حکم تمام کفار کے بارے میں نہیں، بلکہ تمام ذمیوں کے بارے میں بھی نہیں ہے صرف خاص قسم کے لوگوں کے بارے میں ہے جن پر صغار کا اطلاق کرنے کے لئے اضافی انتظامات کی ضرورت ہو۔ حدیث کے پہلے حصے کی طرح اس کا یہ دوسرا حصہ یقیناً خاص صورتِ حال سے متعلق ہے۔ یہ بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ آج کل عموماً غیر مسلموں کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت عقدِ ذمہ والی نہیں ہوتی۔ خواہ وہ مسلمان ملکوں کے غیر مسلم ہوں یا غیر مسلم اکثریت والے ان ملکوں کے جن میں مسلمان بھی آباد ہیں۔ آج کے یہ غیر مسلم جب ذمی نہیں تو صغار کا حکمِ قرآنی بھی ان کے بارے میں متوجہ نہیں ہوتا جو اس حدیث کا پہلا حصہ ہے۔ لہذا یہ سوال بڑا اہم ہو جاتا ہے کہ کیا حدیث کا یہ دوسرا حصہ ان غیر مسلم معاہدین کے بارے میں ہوگا؟

امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ایک بات یہ فرمائی ہے کہ جن حدیثوں سے غیر مسلموں کو سلام کا جواز ثابت ہوتا ہے یہ منسوخ ہیں۔ یہ حدیثیں اس زمانے کی ہیں جب ان سے قتال کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ جب قتال کا حکم نازل ہوا تو انہیں سلام کی اجازت منسوخ ہوگئی[1]۔ امام طحاوی کی اس بات کو اگر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ سلام کی ممانعت انہیں کفار کے لئے ہیں جن سے ہمیں قتال کا حکم ہے، یعنی جو

1۔ شرح معانی الآثار، کتاب الکراہیۃ: باب السلام علی اہل الکفر۔

محارب ہیں، غیر محارب کو سلام کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔اس کے علاوہ امام طحاوی نے حضرت ابو بصرہ غفاریؓ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں کل کو (تمہیں ساتھ لکے کر) یہودیوں کے ہاں جاؤں گا، جب وہاں پہنچو تو سلام میں پہل نہ کرنا اور اگر وہ سلام کریں تو صرف "وعلیکم" کہہ دینا۔ لیکن یہ حدیث بھی عمومی ممانعت پر دلالت نہیں کرتی۔ عین ممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کے تحت حضور ﷺ نے یہ ہدایت ارشاد فرمائی ہو۔ مثلاً آں حضرت ﷺ یہودیوں کو کوئی وارننگ دینا چاہ رہے ہوں، جیسا کہ بنو نضیر وغیرہ کے ساتھ ہوا۔ ایسی حالت میں پہلے سلامتی کی بات کرنا وہ بھی نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں پھر اس طرح کی وارننگ دینا آں حضرت ﷺ نے مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ بہر حال علی الاطلاق تمام غیر مسلموں کو سلام کرنے کے عدمِ جواز کی کوئی دلیل میری ناقص نظر میں اب تک نہیں آسکی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آج کل یہ مسئلہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ دنیا بہت سکڑ گئی ہے اور روابط بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ جن میں غیر مسلموں کے ساتھ روابط بھی شامل ہیں۔ غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی بڑی بڑی تعدادیں آباد ہیں۔ ایسے ماحول میں بحیثیت مجموعی ہم سب کے ساتھ ایک جیسا معاملہ کرتے ہوئے افشاء السلام (سلام پھیلانا) کے حکم پر عمل کریں تو بظاہر اس میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے اندر اگر دوسروں کے کلچر کی چیزیں رواج پارہی ہوں تو ہم سے بجا طور پر ناپسندیدہ جانتے ہیں۔ سلام کرنا اسلامی تہذیب کا اہم حصہ ہے، اگر ہمارا طریقہ دیارِ غیر میں رواج پارہا ہو تو بظاہر تو یہ ہمارے لئے خوشی کی بات ہونی چاہئے۔

حاصل یہ کہ غیر مسلموں کو سلام میں پہل کرنے کے جواز اور عدمِ جواز دونوں کے حق میں دلائل موجود ہیں۔ صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق موقع محل سے ہے۔ اگر موقع کا تقاضا یہ ہو کہ سلام کرلینا چاہئے، مثلاً اس سے کوئی ضروری کام ہے اور سلام نہ کرنے کی صورت میں اس کے برا منانے کا خطرہ ہے، وہ کام وغیرہ میں تمہارا ساتھی ہے، اس کا حقِ صحبت ادا کرنے کے لئے سلام کیا جارہا ہے، وہ پڑوسی ہے، اس کے پڑوسی ہونے کا حق ادا کرنے کے لئے سلام کیا جارہا ہے، وہ تمہارا ہم سفر ہے اس لئے اسے سلام کررہے ہو، غرضیکہ جہاں اسے سلام کرنے کا کوئی صحیح داعی

اور باعث موجود ہو وہاں سلام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ سلف میں سے کئی حضرات سے اہلِ ذمہ کو سلام کرنا منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ساتھ سفر میں ایک دہقان (غیر مسلم زمیندار) تھا، آپ نے اسے سلام کیا، پوچھا گیا کہ کیا انہیں سلام میں پہل کرنا مکروہ نہیں ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ بات تو ہے، لیکن صحبت کا بھی حق ہوتا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ جب اپنے گھر جارہے ہوتے تو راستے میں بڑا چھوٹا، مسلم غیر مسلم جو بھی ملتا اسے سلام کرتے ہوئے جاتے۔ آپؓ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ ہمیں افشاء السلام کا حکم دیا گیا ہے۔امام اوزاعی سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم سلام کرتے ہو تم سے پہلے نیک لوگوں نے سلام کیا ہے اور نہیں کرتے تو تم سے پہلے نیک لوگ سلام نہ کرنے والے بھی گذرے ہیں[1]۔

[1] ۔ تفسیر قرطبیؒ، حوالہ بالا، قرطبیؒ کی پوری عبارت یہ ہے:

فبان بهذا أن حديث أبي هريرة (لا تبدءوهم بالسلام) إذا كان لغير سبب يدعوكم إلى أن تبدءوهم بالسلام، من قضاء ذمام أو حاجة تعرض لكم قبلهم، أو حق صحبة أو جوار أو سفر. قال الطبري: وقد روي عن السلف أنهم كانوا يسلمون على أهل الكتاب. وفعله ابن مسعود بدهقان صحبه في طريقه، قال علقمة: فقلت له يا أبا عبد الرحمن أليس يكره أن يبدءوا بالسلام؟! قال: نعم، ولكن حق الصحبة. وكان أبو أمامة إذا انصرف إلى بيته لا يمر بمسلم ولا نصراني ولا صغير ولا كبير إلا سلم عليه، فقيل له في ذلك فقال: أمرنا أن نفشي السلام. وسُئِل الأوزاعي عن مسلم مر بكافر فسلم عليه، فقال: إن سلمت فقد سلم الصالحون قبلك، وإن تركت فقد ترك الصالحون قبلك.

تاہم یہ طے شدہ ہے کہ مسلمان کو سلام کرنا مستحب اور اس کا حق ہے۔ غیر مسلم کو سلام کرنا زیادہ سے زیادہ جائز ہوگا۔

ذمی کو جواب دینے کا طریقہ:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ ابتداءً سلام کر لیں تو جواب دینے کا کیا حکم ہے تو اس میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات نے کہا کہ ان کے جواب میں علیکم السام کہنا چاہئے، یا صرف علیکم کہنا چاہئے اور اس میں نیت یہ ہونی چاہئے کہ تم پر موت ہو۔ بعض نے کہا السلام علیکم اور بعض کے نزدیک علاکم السلام کہنا چاہئے۔ لیکن یہ باتیں علی الاطلاق درست معلوم نہیں ہوتیں۔ اگرچہ حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ تم علیکم کہو لیکن یہاں حدیث میں بات ان لوگوں کی ہو رہی ہے جو السلام علیکم کہنے کے بجائے السام علیکم کہتے تھے تو انہیں تو اس طرح کا جواب دینا قاعدے کے مطابق درست معلوم ہوتا ہے، لیکن جس نے واقعۃً السلام علیکم کہا ہے اس کو صراحۃً یا کنایۃً بد دعا دینا یا برا کلمہ کہنا کہ تجھ پر موت ہو درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ بہر حال وہ ذمی یا معاہد ہے، حربی نہیں ہے اور جب تک اس نے ہم پر زیادتی نہیں کی تو ہمیں بھی اس پر زیادتی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ باقی ان حدیثوں میں جو بات ہو رہی ہے وہ ان لوگوں کے بارے میں ہو رہی ہے جو سلام کرتے ہی نہیں تھے بلکہ السلام علیکم کی بجائے السام علیکم کہتے تھے۔ اب اگر کوئی ہمیں سلام کرتا ہے اور ہمیں اندازہ ہے کہ وہ ہمیں سلام کرنے کے بجائے السام علیکم کہہ رہا ہے پھر تو یہ بات متعین ہے جو حدیث میں آئی کہ تم جواب میں کہو علیکم کہ جو چیز تم نے ہم پر بھیجی وہی تم پر۔ لیکن اگر وہ اس طرح کی بات نہیں کرتا، نہ اس کا کوئی اشارہ ہے، بلکہ تقریباً یقین ہے کہ السلام علیکم ہی کہتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس نے سلام ہی کیا ہے تو اس کے بارے میں راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ ابتداء بالسلام کا اگر کوئی داعی اور محرک موجود ہو تو جائز ہے، جب ابتدا جائز ہے تو جواب دینا تو بطریقِ اولی جائز ہوگا، اور جس طرح اس سے کوئی کام وابستہ ہونا داعی اور محرک بن سکتا ہے اسی طرح اس کا از خود سلام کرنے میں پہل کرنا بھی داعی

اور محرک بن سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بعض سلف سے منقول ہے کہ انہوں نے قرآنی آیت وإذا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحُيّوْا بِأَحْسَنَ مِنْها أَوْ رُدُّوها میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو شامل کیا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو بھی تمہیں سلام کرے تم اس کا جواب دو، اگرچہ وہ مجوسی ہو، پھر تائید میں انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ بعض نے کہا کہ اچھا جواب دینے سے مراد مسلمان کو جواب دینا ہے اور ردّوھا یعنی اتنا جواب لوٹادو سے غیر مسلم کو جواب دینا ہے، تاہم بعض حضرات نے آیت کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے[1]۔

غیر مسلموں کے ساتھ بھی تحمل وخوش اسلوبی کی تعلیم

(۱۱) وَعَن عائشةَ قَالَتْ: اسْتَأْذَنَ رَهْطٌ مِنَ الْيَهُودِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا السَّامُ عَلَيْكُمْ. فَقُلْتُ: بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ. فَقَالَ: «يَا عَائِشَةُ إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْأَمْرِ كُلِّهِ» قُلْتُ: أَوَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالُوا؟ قَالَ: «قَدْ قُلْتُ وَعَلَيْكُمْ». وَفِي رِوَايَةٍ: «عَلَيْكُمْ» وَلم يذكر الْوَاو متفق عليه. وَفِي رِوَايَةٍ لِلْبُخَارِيِّ. قَالَتْ: إِنَّ الْيَهُودَ أَتَوُا النَّبِي صلى الله عَلَيْهِ وَسلم ، فَقَالُوا: السَّام عَلَيْكَ. قَالَ: «وَعَلَيْكُمْ» فَقَالَتْ عَائِشَةُ: السَّامُ عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ فَقَالَ رَسُولُ اللهَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَهْلًا يَا عَائِشَةُ عليكِ بالرِّفق وإِياك والعنفَ والفُحْشَ» . قَالَت: أَو لم تسمع مَا قَالُوا؟ قَالَ: «أَو لم تَسْمَعِي مَا قُلْتُ رَدَدْتُ عَلَيْهِم فَيُسْتَجَابُ لِي فِيهِمْ وَلَا يُسْتَجَابُ لَهُمْ فِيَّ» وَفِي

1۔ تفسیر طبری۔

رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ. قَالَ: «لَا تَكُونِي فَاحِشَةً فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الفُحْشَ والتفحُّش»

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی اور یہ کہا "السام علیکم"، تو میں نے کہا "بل علیکم السام واللعنۃ" بلکہ تم پر موت اور لعنت ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرمی والے ہیں اور ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ نے وہ بات نہیں سنی جو انہوں نے کہی۔ تو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ بھی کہہ دیا "وعلیکم"۔ اور ایک روایت میں "علیکم" ہے بغیر واؤ کے۔ اور بخاری کی ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عائشہ (رض) نے فرمایا کہ یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا "السام علیک" تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وعلیکم" اس پر حضرت عائشہ (رض) نے کہا "السام علیکم ولعنکم اللہ وغضب علیکم کہ تم پر موت ہو اور تم پر اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ! صبر کرو تم نرمی کو لازم پکڑو اور تم سختی اور سخت کلامی سے بچو۔ حضرت عائشہ (رض) نے عرض کیا کہ کیا آپ نے وہ بات نہیں سنی جو انہوں نے کہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو میں نے کہی کہ میں نے انہی جواب دے دیا ہے، میری بد دعا تو ان کے بارے میں قبول کی جائے گی اور ان کی بات میرے بارے میں قبول نہیں ہوگی۔ اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم بد گوئی یا سخت گوئی کرنے والی نہ بنو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بد کلامی کو یا فحش کلامی کو پسند نہیں کرتے۔

حاصل یہ ہے کہ یہودی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی عادت کے مطابق انہوں نے تاثر تو یہ دیا کہ ہم سلام کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں کہا "السام علیک" جیسا کہ آتا ہے "حیوک بمالم یحییک بہ اللہ" کہ اس انداز سے سلام کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اس انداز سے سلام کرانا مطلوب نہیں۔ تو یہاں پر انہوں نے اپنی

عادت کے مطابق یہی کہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر سا جواب دیا۔ اور یہ وہی جواب دیا جس کی آپ نے امت کو تلقین فرمائی کہ تم ان کے جواب میں علیکم کہہ دو بس۔ آپ نے بھی ایسا ہی کیا۔ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کی یہ بات سن کر غصہ آگیا کہ عام مسلمان کے ساتھ ایسی بدتمیزی کریں چلو قابل گوارا ہو سکتی ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی یہی انداز اختیار کریں اور اس طرح کا مذاق کریں یہ تو گوارہ نہیں۔ اس لئے حضرت عائشہؓ نے ساتھ کچھ لفظ اور بڑھا دیئے، ایک تو ان کے جواب میں یہ کہا "بل علیکم السام" کہ تم پر موت ہو۔ اور دو باتیں اور کہہ دیں اس کے علاوہ۔ ایک یہ کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو اور دوسرا یہ کہ تم پر اللہ کا غضب ہو۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو ٹوکا اور یہ فرمایا کہ اس طرح کی سخت کلامی سے بچنا چاہئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ وہ خود بھی وہ رحیم ہیں اس لئے وہ اپنے بندوں کے بارے میں یہ چاہتے ہیں کہ وہ حتی الامکان نرمی کا برتا اور نرمی کا معاملہ کریں۔ جو کام نرمی سے چل سکتا ہو وہاں پر سختی نہ کریں اس لئے تمہیں اس طرح نہیں کہنا چاہئے تھا۔

آں حضرت ﷺ نے حضرت عائشہ کو اس طرح کہنے سے منع تو کیا لیکن کیوں؟ یہ بات تھوڑی سمجھنے کی ہے۔ آپ ﷺ نے اس وجہ سے منع نہیں کیا کہ یہودی بہت اچھے ہیں یا وہ اس طرح کی باتوں کے مستحق نہیں کیونکہ اللہ نے اپنے غضب اور لعنت کی بات ان کے بارے خود قرآن کریم میں کہی ہے۔ صرف ایک غضب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں " فباءوا بغضب علی غضب" اور قرآن نے یہ کہا "لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داود وعیسی بن مریم" ان پر انبیا کی زبان سے لعنت ہوئی ہے۔ قرآن میں یہودیوں کے بارے میں جگہ جگہ یہ دو لفظ آتے ہیں ایک ان پر اللہ کا غضب اور دوسرے اللہ کی لعنت۔ تو آپ کے فرمانے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ اچھے ہیں اور یہ لوگ اس طرح کے الفاظ کے فی نفسہ مستحق نہیں بلکہ آپ نے یہ بات حضرت عائشہ کی اصلاح کے لئے فرمائی ہے، کہ دیکھنے کی یہ بات نہیں کہ وہ کیسے ہیں بلکہ اس سے زیادہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہئے۔ ہم سے اللہ تعالیٰ کیا چاہتے ہیں، کیا کام ہمیں کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ہماری شریعت ہم سے کیا تقاضا کرتی ہے وہ واقعۃً اللہ کے

غضب کے مورد ہیں لعنت کے مورد ہیں لیکن چونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے حتی الامکان نرمی کا اس لئے ہمیں ان کی برائیوں کو دیکھ کر اپنے اخلاق کو خراب نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی عادت کو نہیں بگاڑنا چاہئے بلکہ اپنے اخلاق وعادات کی نگہداشت رکھنی چاہئے۔ اور یہ بڑی اہم بات ہے بعض اوقات اس بات پر تو نظر ہوتی ہے اہل باطل کے بارے کہ وہ اتنے بُرے ہیں اور ان کے برے ہونے کا تقاضا یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم جو زبان ان کے بارے میں چاہیں بولیں۔ حالانکہ یہ بات نہیں بلکہ وہ جیسے کیسے بھی ہوں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہئے۔ آج کل بعض جذباتی لوگوں سے اگر یہ کہا جائے کہ الفاظ کے استعمال میں احتیاط برتیں تو بعض اوقات وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ فلاں فلاں فرقے کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ تو اس اصول کے مطابق نعوذ باللہ یہ کہنا پڑے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ حالانکہ یہ بات سوچی بھی نہیں جاسکتی تو حضور اقدس ﷺ نے حضرت عائشہ کی تربیت اور اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ بات فرمادی۔

لیکن اس میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند کرتے ہیں'' تو یہاں مراد یہ نہیں کہ علی الاطلاق ہر جگہ نرمی محمود ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نرمی محمود ہے۔ جو کام نرمی سے چل سکتا ہو وہ نرمی سے ہی چلانا چاہئے۔ لیکن بعض جگہوں پر جہاں نرمی سے کام نہ چلتا ہو وہاں نرمی نہیں بلکہ وہاں سختی محمود ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں فرمایا ''جاہد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم'' تو یہاں غلظت اور شدت کا بھی حکم ہے۔ سختی کا بھی ہے ''اشدآء علی الکفار رحمآء بینہم'' تو بعض جگہوں پر سختی اور شدت کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو وہاں نرمی مطلوب نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ نرمی سے کام لیا جائے لیکن کچھ جگہیں ایسی ہیں جہاں نرمی سے کام نہیں چلتا تو وہاں نرمی کے بجائے سختی مطلوب ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ کے ذہن میں بھی یہی اصول تھا اور اسی اصول کے پیش نظر حضرت عائشہ (رض) نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طالب علمانہ سوال کیا۔ سوال یہ کیا کہ یہ تو بات ٹھیک ہے کہ نرمی اچھی بات ہے لیکن اس قاعدے سے کچھ استثنا بھی تو ہیں۔ جہاں نرمی کے بجائے سختی سے کام لیا جاتا ہے۔ میرے ناقص فہم میں یہ آتا ہے یہ

موقع اس استثنا کا ہے اس لئے کہ انہوں نے آپ کے بارے میں نامناسب الفاظ استعمال کئے ہیں اور السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہہ دیا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا یہ سمجھیں ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے یہ لفظ سنے نہیں یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ انہوں نے واقعۃً سلام کیا ہے اس لئے حقیقتِ حال بتانے کے لئے حضرت عائشہ (رض) نے بات کہی ہو کہ چونکہ آپ کو پتا نہیں چلا کہ انہوں نے السام علیکم کہا ہے اس لئے میں نے جواب میں یہ بات کہی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہ نے ویسے ہی علمی طور پر سوال کیا ہے کہ بات تو آپ کی سر آنکھوں پر لیکن مجھے اس پر اشکال ہو رہا ہے۔ اگر اس کے بارے تشفی ہو جائے تو اچھی بات ہے۔ ویسے تو نرمی اچھی چیز ہے لیکن بظاہر یہ لگ رہا ہے یہاں یہ نرمی کے مستحق نہیں۔ انہوں نے جو بدکلامی کی ہے اس کا جواب ہونا چاہیئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن جس ضرورت کی طرف تم توجہ دلا رہی ہو وہ ضرورت میں نے پوری کر دی ہے اور با حسن طریق پوری کر دی ہے۔ وہ یہ کہ میں نے ان کے جواب میں کہہ دیا "علیکم" کہ تم پر بھی یہی ہو۔ بس ان کا جواب ہو گیا۔ ماحول میں تلخی بھی پیدا نہیں ہوئی اور ان کی بات کا جواب بھی ہو گیا۔ ان پر بھی موت بھیج دی گئی۔ اصل میں ذرا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے یہ بات صراحۃً نہیں کہی تھی بلکہ تعریضاً اور کنایۃً کہی تھی۔ اور کوئی تعریضاً یا کنایۃً کوئی بات کہے چھیڑ چھاڑ اس انداز سے کرے تو اس کے جواب میں کھلم کھلا غصے میں آ جانا اچھا نہیں لگتا۔ اس سے بعض اوقات دوسرے کو تھوڑی سی خوشی ہوتی ہے کہ میں نے چابی دے دی اور یہ چالو ہو گیا۔ جب کوئی تعریضاً یا کنایۃً کوئی چوٹ کرے تو اسی انداز سے جواب دیا جانا زیادہ بہتر ہوتا ہے یعنی تعریضاً اور کنایۃً۔ یہ اَوْقَع بھی ہوتا ہے مؤثر بھی ہوتا ہے اور خوبصورت بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا مطلب یہ ہے میں نے تو موقع محل کی مناسبت سے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ ان کا جو پتھر تھا انہی پر پھینک دیا، سانپ بھی مر گیا، لاٹھی بھی بچ گئی۔ اس کے برعکس تم غصے میں آ گئیں اور دو چار اور سنا دیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے اشکال کا جواب دے کر ان کی تسلی کے لئے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے جو السام علیکم کہا ہے تو یہ انہوں نے ایک بد دعا کی ہے اور میں نے بھی اس کے جواب میں یہی کہا

ہے تو ان کی بد دعا تو ہمارے حق میں قبول نہیں ہوگی لیکن ہماری ان کے بارے میں قبول ہو جائے گی، اس لئے بھی ہمارا پلہ بھاری ہے جب پہلے سے ہمارا پلہ بھاری ہے تو پھر مزید غصہ نکالنے کی ضرورت نہیں زور وہ لگایا کرتا ہے جو نیچے ہو اوپر آنے کے لئے زور لگاتا ہے اور جو پہلے سے اوپر ہو اس کو زور لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ ہم پہلے سے اوپر ہیں۔

حضور اقدس ﷺ نے یہودیوں کو جو جواب دیا اس کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ایک میں آتا ہے ''علیکم''اور دوسری روایت میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا''وعلیکم''۔دونوں صورتوں میں مطلب ذرا مختلف ہو جائے گا۔ اگر علیکم (بغیر واؤ کے) ہو تو پھر بظاہر مطلب یہ ہوگا کہ موت ہم پر نہیں بلکہ تم پر ہو۔ اور اگر واؤ ہو ''وعلیکم''تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ ہم پر بھی ہو اور تم پر بھی ہو کیونکہ اس پر عطف ہے تو گویا انہوں نے جو جملہ کہا اس کو بھی تسلیم کر لیا۔تو مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح کے باتیں کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر کہو گے پھر بھی تم نے بھی مرنا ہم نے بھی مرنا اور اگر نہیں کہو گے پھر بھی تم نے بھی مرنا ہے اور ہم نے بھی مرنا ہے۔مرنا تو ہر ایک نے اپنے وقت پر ہے ہی تو اس طرح کی باتیں کرنے کا فائدہ کیا۔یہ مطلب واؤ کے ساتھ ہونے کی صورت میں بنے گا۔

گستاخ رسول کا حکم:

اس حدیث سے بعض فقہا نے ایک مسئلے پر استدلال کیا ہے۔وہ یہ کہ ان یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کوئی سزا نہیں دی اس سے بعض علما نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی ذمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو اس کے باوجود وہ ذمی ہی رہے گا اور اس کا عقدِ ذمہ ختم نہیں ہوگا۔ اگر ایک مسلمان آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس پر مرتد والے احکام جاری ہوں گے کہ کتب فقہ میں مذکور تفصیل و شرائط کے مطابق اس کی سزا قتل ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔اور اگر ایک ذمی اسی طرح کی بات کرتا ہے اس کے بارے میں حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کا

ذمہ برقرار ہے لہٰذا اس کو قتل کرنا ضروری نہیں۔ حنفیہ کا مذہب عام طور پر اس میں یہی بیان کیا جاتا ہے اور اس پر استدلال کیا گیا ہے اس حدیث سے کہ یہاں دیکھئے کہ ان یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نامناسب الفاظ کہے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ نے ایک تو ان کو ذمی ہی سمجھا اور دوسرا انہیں کوئی سزا نہیں دی صرف ''وعلیکم'' کہا۔ اس سے زائد الفاظ بھی اگرچہ حضرت عائشہ (رض) نے کہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو ٹوک دیا۔ شاتم رسول ﷺ اگر ذمی ہو تو اس کے بارے میں فقہا کے اختلاف اور دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں تاہم حنفیہ کے پاس اپنے موقف پر اگرچہ دیگر دلائل موجود ہیں لیکن اس حدیث سے حنفیہ کے مذہب پر استدلال بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔ کئی وجوہ سے:

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی شان میں گستاخی صراحۃً اور کھل کر نہیں کی تھی بلکہ ظاہری طور پر انہوں نے یہی تاثر دیا تھا کہ ہم سلام کر رہے ہیں لیکن سلام کا لفظ اس انداز سے بولا کہ حقیقت میں انہوں نے ''السام علیکم'' کہا۔ تو جس انداز سے انہوں نے توہین کی شاید اس کو ثابت کرنا مشکل ہو جاتا۔ گویا صراحۃً کھلم کھلا توہین نہیں کی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ اور ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ یہ بات ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ (رح) نے لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل تھا کہ آپ اپنی توہین کرنے والے کو معاف کر دیں اور آپ نے بہت سوں کو معاف کیا بھی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ امت کو بھی یہ حق اسی طرح حاصل ہو۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاف کرنا یہ آپ کے حسن اخلاق کی دلیل ہے۔ ہم اگر معاف کریں گے تو یہ ہمارے ایمان کی کمزوری کی دلیل ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا نہیں دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف کر دیا یہ مسئلہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہمارے لئے بھی ایسا کرنا جائز ہے۔ وہ معاملہ الگ ہے اور یہ معاملہ الگ ہے اس لئے اس حدیث سے جن حضرات نے حنفیہ کے مذہب پر استدلال کیا ہے وہ درست نہیں۔

ایک بات اور ہے تھوڑی سی۔ وہ یہ ہے کہ یہاں یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نامناسب طرز اختیار کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس پر غصہ آیا اور اس کو سخت الفاظ بھی کہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ کو تنبیہ فرمائی، تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمارے سامنے اگر کوئی اس طرح کی بات کرے تو ہمیں اس کو بآسانی برداشت کر لینا چاہیئے اور کچھ نہیں کرنا یا کہنا چاہیئے ہو سکتا ہے کہ حدیث کا منشا یہ سمجھ لیا جائے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے اس لئے کہ یہاں یہ بات نہیں کہ یہودیوں کا جواب ہی نہیں دیا گیا یہ مطلب تو حدیث سے تب اخذ کیا جاتا جبکہ آنحضرت ﷺ یہ فرماتے کہ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ ہم ان کی بات کا جواب نہیں دیتے۔ حالانکہ یہ صورتِ حال نہیں ہے بلکہ آپ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں نے تم سے زیادہ موئثر طریقے سے جواب دے دیا ہے اس لئے تمہارے بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی کے سامنے اگر کوئی اس طرح کی بات کرے تو اس کو خاموش رہنا چاہیئے اور آسانی سے اُسے برداشت کر لینا چاہیئے۔ ہاں یہ بات ضرور نکلتی ہے جہاں تک ممکن ہو جواب دینا سوچ سمجھ کر چاہیئے تاکہ اُس جواب میں حکمت بھی ہو اور تاثیر بھی زیادہ ہو عقلمندی بھی ہو۔

مسلم وغیر مسلم ملے جلے ہوں تو سلام

(۱۲) وَعَن أُسامة بن زيد: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ بِمَجْلِسٍ فِيهِ أَخْلَاطٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُشْرِكِينَ عَبَدَةِ الْأَوْثَانِ وَالْيَهُودِ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ. متفق عليه.

حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا ایک ایسی مجلس کے پاس سے کہ جس میں مسلمان اور مشرک یعنی بت پرست اور یہودی ملے جلے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سلام کیا۔

اس میں مشرکین کے ساتھ وضاحت کے طور پر "عبدۃ الاوثان" اس لئے کہا کہ مشرک کا اطلاق بعض اوقات مجازاً یہود و نصاریٰ پر بھی ہو جاتا ہے۔ اہل کتاب کو بھی بعض دفعہ مشرک کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں یہ بتادیا کہ یہاں مشرکین سے مراد یہ نہیں بلکہ مشرکین سے مراد بت پرست ہیں۔ تو اس مجلس میں کچھ مسلمان تھے اور کچھ مشرک تھے اور کچھ یہودی تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے گذرے تو انہیں سلام کیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی مجلس میں اس طریقے سے مسلمان اور کافر ملے جلے بیٹھے ہوئے ہوں تو وہاں سلام کرنا تو جائز ہے یہاں کافروں کو سلام بالتبع ہوا ہے۔ باقی غیر مسلموں کو سلام کرنے کا مسئلہ ابھی گذر چکا۔

راستوں کے حقوق

(١٣) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ بِالطُّرُقَاتِ» . فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ مَا لَنَا مِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِيهَا. قَالَ: «فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ» . قَالُوا: وَمَا حَقُّ الطَّرِيقِ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: «غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْأَذَى وَرَدُّ السَّلَامِ والأمرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنكرِ» متفق عليه.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم راستوں میں بیٹھنے سے بچو۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے لئے ہمارے راستوں میں بیٹھے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم ان میں باتیں کرتے ہیں۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم ضرور بیٹھنا ہی چاہو تو راستے کو اس کا حق دیتے رہا کرو۔ صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ! راستے کا حق کیا ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نظر کو بچانا، تکلیف دہ چیز کو ہٹانا، سلام

کا جواب دینا، نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ فرمایا کہ راستوں میں کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر باتیں نہ کیا کرو۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو گی کہ عام طور پر جو راستے ہوتے ہیں وہ بازار وغیرہ بھی ہوتے ہیں تو وہ برکت کے اعتبار سے اتنی اچھی جگہیں نہیں ہیں۔ دوسرا یہ کہ راستوں میں بیٹھنا یا کھڑے ہونا بسا اوقات وقار کے بھی خلاف ہوتا ہے یا کوئی اور وجہ ہو گی۔ جو بھی وجہ ہو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم اس طریقے سے راستوں میں نہ بیٹھا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ! راستوں میں بیٹھنا ہماری ضرورت ہے۔ اس لئے ہمارے لئے اس سے بچنا مشکل ہے۔ ضرورت اس لئے ہے کہ بہر حال مل کر بعض باتیں کرنی پڑتی ہیں، بعض امور پر مشورہ کرنا پڑتا ہے یا کچھ اور باتیں اکٹھے بیٹھ کر کرنی پڑتی ہیں اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہوتی جہاں ہم بیٹھ سکیں اس لئے یہ ہماری مجبوری ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجبوری کی وجہ سے تمہیں راستوں میں بیٹھنا پڑے تو راستے کے حقوق ادا کیا کرو۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ! راستے کے حقوق کیا ہیں تو آپ نے کچھ حقوق بیان فرمائے۔ جن میں سے کچھ کا اس روایت کے اندر ذکر ہے اور کچھ حقوق کا اگلی دو روایتوں میں ذکر ہے۔

راستے کا پہلا حق:

غض البصر، اس میں یہ بھی آگیا کہ کسی غیر محرم پر ناجائز طور پر نظر نہ پڑے اس میں یہ بھی آگیا کہ کسی کی چیز کو لالچ کی نظر سے نہ دیکھو، کسی کی چیز کو حسد کی نظر سے نہ دیکھو۔ لوگ غض البصر کا معنی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ نامحرم کو نہ دیکھو اور بد نظری صرف اِسی کو سمجھتے ہیں کہ نامحرم عورتوں کو دیکھ لیا۔ وہ بھی بد نظری ہے اور وہ بھی قابل ترک ہے لیکن بد نظری محض وہ نہیں ہے بلکہ جس انداز سے بھی کسی چیز کو آپ نے دیکھا اور وہ شرعاً ناپسندیدہ ہے تو وہ بد نظری ہے اور اس بچنا غض البصر کے اندر داخل ہے۔

راستے کا دوسرا حق:

دوسری چیز ہے کف الاذیٰ کہ تکلیف دِہ چیز کو نہ رکھنا۔ ایک ہے اماطۃ الاذیٰ کہ راستے میں پہلے سے کوئی تکلیف دِہ چیز موجود ہے تو اس کو ہٹا دیا جائے یہ بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے اور یہاں ہے کف الاذیٰ کہ خود راستے میں ایسا کام نہ کیا جائے جس سے گزرنے والوں کو تکلیف ہو۔ مثلاً وہاں بیٹھ کر پھل فروٹ کھائے اور ان کے چھلکے راستے کے درمیان میں پھینک دیئے، کوئی گزرے گا تو پھسل سکتا ہے اور نہ بھی پھسلے تو بھی راستہ گندہ ہو جائے گا۔ گزرنے والے کو اچھا نہیں لگے گا۔ یا راستے میں اس انداز سے بیٹھے مجلس اس انداز سے جمائی کہ گزرنے والوں کو گزرنے میں تنگی ہونے لگی۔ یہ بھی ''اذیٰ'' کے اندر داخل ہے۔ بیٹھنا ہی ضروری ہے تو ایک طرف ہو کر بیٹھ جاؤ تا کہ گزرنے کی جگہ خالی رہے۔ اسی میں یہ بھی آ گیا کہ جلسہ کرنا ہے اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جلسہ ہو گا اور بڑی ساری روڈ بلاک کر دی تو زبان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان ہو رہی ہے اور عمل سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ یا اس طرح کے جلسے ہوتے ہیں بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ شاید لوگ کم آئیں تو اس کے لئے کسی ایسے چوراہے کا یا روڈ کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ وہاں خود بخود رش پڑ جائے۔ اسی طرح اگر جلوس نکالنا ہے تو بعض راستے بڑے شہروں کے اندر ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں ایک گاڑی پانچ منٹ کے لئے رک جائے یا خراب ہو جائے تو پیچھے گاڑیوں کی ایسی لائن لگ جاتی ہے کہ اچھا خاصا جلوس بن جاتا ہے اور چار پانچ آدمیوں کو آپ متفرق جگہوں پر ڈنڈے لے کھڑے کر دیں گے کر تو لگے گا کہ بہت بڑا جلوس ہے۔ یہ دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ کف الاذیٰ کا مطلب یہ ہوا کہ اول تو راستے میں بیٹھو ہی نہیں اگر بیٹھنا ہے تو اس انداز سے بیٹھو کہ اس کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہو اور وہاں کوئی کام ایسا نہ کرو اور کوئی اثر وہاں ایسا چھوڑ کر نہ جاؤ جس کی وجہ سے کسی کو تکلیف ہو۔

تیسرا حق:

اور تیسرا حق سلام کا جواب دینا کہ اگر کوئی گزرنے والا تمہیں سلام کرے تو اس کا جواب دو۔

چوتھا حق:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کوایک بھی شئی کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کو اچھی باتوں کی رہنمائی کرو اور برے کاموں سے ان کو روکو۔ لیکن امر بالمعروف کیسے کرنا ہے اس کے بارے میں ملا علی قاریؒ نے بہت شاندار لفظ اس کی تشریح میں کہے ہیں "الامر بالمعروف ای بالطریقۃ المعروفۃ عند العارفین" کہ امر بالمعروف تو کرنا ہے لیکن اس طریقے سے جو جاننے والوں کے ہاں معروف ہے۔ یعنی مناسب طریقے سے۔ دین کو لٹھ کی طرح کسی پر مسلط کرنا، اس انداز سے کہ وہ دوبارہ کسی داڑھی والے آدمی کو دیکھ کر بھاگ جائے یہ الطریقۃ المعروفۃ عند العارفین نہیں۔ اسی طرح النہی عن المنکر اس میں یہ کہا کہ نہی عن المنکر تو کرو لیکن اس سے کہ وہ نہی عن المنکر کس انکر یعنی بڑے منکر کا باعث نہ بن جائے اس کی وجہ سے کوئی بڑا منکر نہ پیدا ہو جائے۔

یہاں پر حدیث میں یہ لفظ آیا "فاذا أبیتم الا المجلس" اس کو بہتر یہ ہے کہ لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے کسرہ کے ساتھ نہیں اس لئے کہ مجلس –بالکسر- اسم ظرف ہے ظرفِ زمان یا ظرفِ مکان۔ یہاں یہ معنی مراد نہیں بلکہ مصدری معنی مراد ہیں کہ بیٹھنے کے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو، تم ضرور ہی بیٹھنا چاہو۔ تو یہ مصدر میمی ہوا اور اہل لغت نے لکھا ہے کہ جب یہ مصدری معنی میں استعمال ہو تو پھر لام کے فتحہ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے اس کو یہاں پر بفتح اللام پڑھا جائے گا۔

(١٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ: «وَإِرْشَادُ السَّبِيلِ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ عَقِيبَ حَدِيثِ الْخُدْرِيِّ هَكَذَا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

اسی سلسلے میں یہ ارشاد نقل کیا کہ آپ نے فرمایا ''وارشاد السبیل'' اور راستہ دکھانا راستہ بتانا۔

یہ بھی راستے کا ایک حق ہے کہ کسی کو راستے کا پتا نہیں فلاں کی دکان کہاں ہے فلاں کا گھر کہاں ہے فلاں مسجد کدھر ہے تو اس کو راستہ بتلادو۔ باقی جو حدیث حضرت ابوہریرہ (رض) نے نقل کی ہے اس کا مضمون بھی وہی ہے جو حضرت ابوسعید خدری (رض) کی حدیث، کا تھا اتنا فرق کہ اس میں راستے کا ایک اور حق ذکر کیا گیا جو اس میں نہیں تھا یعنی ارشاد السبیل۔

(١٥) وَعَنْ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي هَذِهِ الْقِصَّةِ قَالَ: «وَتُغِيثُوا الْمَلْهُوفَ وَتَهْدُوا الضالَّ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد عقيب حَدِيث أبي هُرَيْرَة هَكَذَا وَلم أجدهما فِي «الصَّحِيحَيْنِ».

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے کہ تم پریشان حال آدمی کی فریادرسی کرو گمشدہ راہ کو راہ بتادو۔

اس میں باقی مضمون تو وہی ہے جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا تھا، البتہ اس میں دو لفظوں کا اضافہ ہے۔ ایک یہ کہ وتغیثوا الملہوف کوئی آدمی تکلیف زدہ ہو پریشان حال ہو، مصیبت زدہ ہو تو اس کی مدد جو تم سے ہو سکے کر دو۔ کوئی آدمی مالی وجہ سے پریشان ہے، بھوکا ہے اس کے کھانے کا بندوبست کر دو، کسی پر کوئی ظلم کر رہا ہے اگر تمہارے بس میں ہے تو اس کو ظلم سے بچالو۔ کسی آدمی سے کوئی سامان نہیں اٹھایا جا رہا تو اس کے

اٹھانے میں اس کی مدد کر دو۔ کسی آدمی کی گاڑی سٹارٹ نہیں ہو رہی اس کو دھکے کی ضرورت ہے تو اس کو دھکا لگا دو۔ یہ ساری کی ساری چیزیں تغیثوا الملھوف کے اندر آ گئیں۔ اور دوسری چیز ہے تہدوا الضال یہ اس ارشاد السبیل سے ملتی جلتی ہے کہ کوئی آدمی بھٹکا ہوا پھر رہا ہے کہ فلاں کا گھر کہاں فلاں دکان کہاں ہے یا فلاں مسجد کہاں ہے فلاں چوک کدھر تو اس کو بتا دو کہ وہ اس طرف ہے۔

ان حدیثوں میں لفظ حق آیا ہے، یعنی راستوں کا حق ادا کرو، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں واجب ہیں ؟ ان میں اکثر چیزیں تو واجب ہیں۔ غض البصر، کف الاذیٰ۔ سلام کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بعض صورتوں میں فرض بعض میں واجب اور بعض میں مستحب ہوتا ہے تفصیل متعلقہ باب میں آجائے گی۔ باقی حق کا لفظ جب استعمال ہوتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ واجب ہو بلکہ غیر واجب پر بھی اس کا اطلاق ہو جاتا ہے۔

نص کے ہوتے ہوئے اجتہاد اور غور کی ضرورت:

اس حدیث میں جب آپ نے فرمایا کہ راستوں میں نہ بیٹھا کرو تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ وہ عرض کرتے کہ ٹھیک ہے اب نہیں بیٹھا کریں گے، اب مزید پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی حدیثوں میں یہ بات آتی ہے کہ جب آپ نے کوئی حکم صادر فرمادیا تو صحابہ نے اس پر عملی حوالے سے کوئی سوال پیش کر دیا۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں خطبہ دے رہے تھے اس میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مکے کی حرمت کا تقاضا ہے کہ اس میں فلاں کام بھی نہ کرو اور فلاں بھی نہ کرو۔ اُسی میں آپ نے فرمایا لا یختلی خلاہا ولا یعضد شجرہا کہ خودرو درخت نہ کاٹا جائے اور یہاں سے کوئی گھاس نہ کاٹی جائے۔ اس پر حضرت عباسؓ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور فرمایا الا الاذخر یارسول اللہ! کہ اذخر کو مستثنیٰ کر دیجئے۔ فانہ لبیوتنا ولقبورنا۔ اس لئے کہ وہ ہمارے

گھروں میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور ہماری قبروں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اس لئے یہ تو ہمیں کاٹنا ہی پڑتا ہے۔تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الا الاذ خر، کہ ویسے تو حدود حرم کے اندر خود رو گھاس کو کاٹنا ٹھیک نہیں ہے لیکن اذ خر گھاس کو کاٹ سکتے ہو۔ یہاں پر بھی وہی بات ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا کہ نہیں کاٹنا اس کے بعد اس پر اس درخواست کا کیا مطلب اور آں حضرت ﷺ کے اس استثنا کا کیا مطلب۔اس پر شارحینِ حدیث نے لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں۔ لیکن آسان بات وہی ہے جو میں عرض کروں گا۔ اسی طریقے سے اور بھی کئی جگہوں پر ایسی باتیں آئیں گی۔ مشکوۃ کے شروع میں یہ حدیث گذر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ مجلس میں تشریف فرما تھے تو آپ اٹھ کر چلے گئے۔ صحابہ کرام کو بڑی پریشانی ہوگئی کافی دیر ہوگئی آئے نہیں پتا نہیں کہاں تشریف لے گئے۔ کہیں کوئی دشمن آپ کو نقصان نہ پہنچادے۔اور صحابہ کے علاوہ حضرت ابو ہریرہؓ بھی تلاش کرنے کے لئے نکلے۔ایک باغ کے پاس پہنچے۔اندازہ ہوا کہ شاید اس میں آپ ﷺ تشریف فرما ہوں۔آپ ﷺ کو نہیں پتا تھا کہ پیچھے صحابہ پریشان ہیں۔بظاہر باغ کے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔پانی کا ایک راستہ تھا تو وہاں لومڑی کی طرح سکڑ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔وہاں واقعۃً آپ ﷺ تشریف فرما تھے۔ بہر حال لمبی بات ہے۔ حضرت ابو ہریرۃؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ صحابہ پریشان ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک تو ان کو بتادو کہ میں یہاں پر موجود ہوں اور دوسرے جو بھی ملے اس کو یہ خوشخبری دے دینا کہ جو بھی لا الہ الا اللہ پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور ساتھ بطور نشانی کے اپنے نعلین مبارک بھی دے دیئے تاکہ یقین ہو جائے کہ واقعۃً ابو ہریرہ حضور اقدس کے پاس سے آرہے ہیں۔ اتفاق سے راستے میں سب سے پہلے ملاقات حضرت عمر سے ہوئی اور یہی بات حضرت عمرؓ کو سنادی۔ حضرت عمر نے حضرت ابو ہریرۃ کو جنت کی یہ خوش خبری آگے نقل کرنے سے منع کیا اور واپس حضور ﷺ کی خدمت میں چلنے کے لئے کہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر آئے تھے وہ کہاں رکنے والے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو روکنے کے لئے ان کے سینے پر ہاتھ مارا اور یہ گر پڑے اور روتے ہوئے دوبارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت عمرؓ کی شکایت لگائی۔ یہاں دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ لوگوں یہ

بات پہنچادو۔ بات تو فی نفسہ ٹھیک تھی اس پر تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوئی اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ پہنچادو اور حضرت عمر (رض) کیا کہہ رہے ہیں کہ نہ پہنچاؤ۔ بظاہر نص کے مقابلے میں حضرت عمر اپنی بات کررہے ہیں۔اسی طرح کی اور بھی بہت ساری باتیں آپ کو حدیثوں کے اندر ملیں گیں۔

تو اس سے ایک بات سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ کوئی حدیث سنداً صحیح ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس پر غور وفکر کے دروازے ہر اعتبار سے بند ہوگئے۔ بلکہ اس پر اور بعض پہلوؤں سے غور کرنا پڑتا ہے اور وہ غور عام طور پر فقیہ کیا کرتے ہیں۔ان میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بعض اوقات الفاظ تو عام ہوتے ہیں نص کے لیکن وہ عموم مراد نہیں ہوتا، بلکہ شریعت کے طے شدہ قواعد عامہ کی روشنی میں اس میں تخصیص ہوتی ہے۔ اگرچہ اس تخصیص کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ تخصیص کو اس لیئے ذکر نہیں کیا جاتا کہ اس کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی۔ واضح سی بات ہوتی ہے۔ لیکن جو ظاہر پرست ہوگا صرف حدیث کے الفاظ کو دیکھے گا وہ اس کو اطلاق پر محمول کرے گا الا الإذخر والی بات میں بھی یہی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ نہیں کاٹا جائے گا۔ لیکن شریعت کا طے شدہ ضابطہ ہے ''ما جعل علیکم فی الدین من حرج'' اور الحرج مرفوع یا الضرر یزال۔ یہ شریعت کا ایک طے شدہ قاعدہ ہے ۔تو حضرت عباس (رض) نے جو پوچھا الا الاذخر یارسول اللہ تو اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے لفظوں میں اطلاق ذکر کیا ہے لیکن آیا واقعتا یہ اطلاق ہی مراد ہے یا اس عام قاعدے کی وجہ سے اس میں تخصیص ہو جائے گی کہ جس کے نہ کاٹنے کی وجہ سے ضرر شدید کا خطرہ ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہوگا۔ حضرت عباس کے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر اس طرح کی تخصیص ہے تو ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کردی جائے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اطلاق مراد نہیں بلکہ یہ تقیید ہے۔اور یہ تقیید شریعت کے مسئلے کے اندر ہوتی ہے۔ یہاں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تجویز پر کوئی نیا مسئلہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں کیا۔ مسئلہ وہی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمادی۔ چنانچہ امام ابو

یوسف نے غالباً اپنی کتاب الرد علی سیر الاوزاعی میں ذکر فرمایا ہے کہ اگر بالفرض حضور اقدس ﷺ سے صراحۃً اذخر گھاس کا استثناء نہ بھی کرایا جاتا تب بھی مسئلہ یہی ہوتا۔

اسی طریقے سے یہاں پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا کہ راستوں میں نہ بیٹھا کرو۔ اب یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اگر ضرورت ہو اور نہ بیٹھنے کی وجہ سے تکلیف یا تنگی میں مبتلا ہونا پڑے تو آیا الحرج مدفوع جیسے قاعدوں کے ذریعے اس میں تخصیص ہوگی یا نہیں ہوگی۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہ ہوتے تو ہمیں اجتہاد کرنا پڑتا لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اس لئے جس بات پر اجتہاد کے ذریعے غور کرنا تھا وہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صراحۃً پوچھ لی کہ نص تو عام ہے کہ راستوں میں نہ بیٹھو لیکن آیا شریعت کے اس عمومی قاعدے کی وجہ سے اس میں تخصیص ہوگی یا نہیں ہوگی۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تخصیص ہو جائے گی۔ اگر واقعۃً راستے میں بیٹھے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو ضرورت ہو تو پھر یہ جائز ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ راستوں کا حق ادا کرو۔

اسی سے ملتا جلتا واقعہ حضرت عمرؓ کا ہے۔ اصل میں دو باتیں ہیں ایک یہ کہ جو لا الہ الا اللہ پڑھے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور دوسرا ہے اس بات کو پھیلانا۔ دونوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم ہیں پہلی بات پر تو حضرت عمر کو کوئی اعتراض تھا ہی نہیں کیونکہ حضرت عمر کا موقف یہ نہیں تھا کہ تم کہتے ہو داخل ہوگا اور میں کہتا ہوں کہ نہیں داخل ہوگا۔ البتہ دوسری بات کے بارے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بتادو اور حضرت عمر فرمارہے ہیں کہ نہ بتاؤ۔ لیکن حضرت عمرؓ کی اجتہادی نظر وہاں پہنچی جہاں حضرت ابوہریرہ کی نہیں پہنچ سکی تھی۔ حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ کہ ان دو باتوں میں پہلی بات کہ کلمہ گو جنت میں داخل ہو جائے گا شرعی مسئلہ ہے اور دوسری بات کہ اس بات کی عام اشاعت کردو یہ آں حضرت ﷺ کا انتظامی حکم ہے۔ بعض کسی حکم پر مخصوص حالات میں عمل کرنا خلافِ مصلحت ہوتا ہے۔ اب موجودہ حالات کے اعتبار سے فوری طور پر لوگوں کو یہ بات بتانا مناسب ہے یا نہیں تو حضرت عمر کی رائے یہ تھی کہ فی الحال نہ بتائی جائے۔ اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کے سامنے اس بات کا ذکر کیا گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کی تصدیق اور ان کی رائے کی تائید فرمائی۔ یہی کام ہوتا ہے فقیہ کا۔ دیکھنے میں یہ لگتا ہے کہ فقیہ اور مجتہد نص کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ دیکھو بخاری میں کوئی حدیث آتی ہے وہ ہمارے لئے جتنی صحیح ہے حضرت عمر کے لئے حضرت ابوہریرہ کا نقل کرنا اس سے کہیں زیادہ قابل اعتماد تھا، اس لئے کہ درمیان میں واسطہ صرف ابوہریرہ کا ہے۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے نص آنے پر بھی غور کا سلسلہ جاری رکھا، نص کی مخالفت میں غور کرنا تو جائز نہیں ہے خود نص اور صاحبِ نص کا منشا اور مقصد سمجھنے کے لئے غور کرنا الگ چیز ہے۔

اس بات کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ میں آپ سے کہتا ہوں پینے کے لئے پانی کا ایک گلاس لادو۔ آپ نے میرے سامنے سے یہ گلاس اٹھایا اور پانی لینے کے لئے باہر نکلے۔ باہر نکلتے ہی آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا خون خوار درندہ کھڑا ہے، اور پتا ہے کہ دو قدم بھی آگے بڑھائے تو شدید جانی نقصان ہو سکتا ہے۔ اس لئے آپ پانی لانے کی بجائے وہیں سے واپس آجاتے ہیں۔ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جب میں نے پانی لانے کا کہا تو ساتھ ہی کہہ دیا کہ اگر باہر کوئی خطرہ نہ ہو تو پانی کا گلاس لادو۔ اس صورت میں تو آپ کا پانی نہ لانا یقیناً حکم عدولی نہیں۔ اس لئے کہ میں نے اصل حکم کے اندر ہی یہ قید لگادی تھی۔ لیکن اگر میں اس طرح کی قید نہیں بھی لگاتا تب بھی آپ کا واپس آنا حکم عدولی نہیں سمجھا جائے گا، اس لئے کہ صراحتاً یہ قید ذکر نہ کرنے کے باوجود میرے اس حکم کے اندر یہ تقیید چھپی ہوئی ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ راستے میں کوئی خطرہ جان کر لاحق ہو تو پھر پانی نہ لانا لیکن ایک طے شدہ قاعدہ ہے کہ جان پانی سے اہم ہے اس کی وجہ سے خود بخود اس میں تخصیص ہو گئی ہے۔ جو تفقّہ سے دور ہو گا وہ تو یہ کہے گا کہ حکم ہوا ہے پانی لانے کا اس لئے بہر حال لانا ہی ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا بھی یہ منشا نہیں تھا۔ اگر وہ پانی لینے چلا گیا اور اس کا نقصان ہو گیا تو ظاہر ہے کہنے والا کہے گا کہ میرا تو یہ مطلب نہیں تھا۔ جس نے بظاہر حکم پر عمل نہیں کیا اور خطرہ دیکھ کر واپس آگیا اس نے قائل کا منشا ہی پورا کیا ہے۔

تو یہاں بھی صحابہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تشریح کروا رہے ہیں۔ صحابہ تو عمل کرنے کے لئے ہر وقت تیار تھے، وہ تکلیف برداشت کر کے بھی عمل کر لیتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے۔ مسجد کے اندر بعض حضرات کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ حضرت ابن مسعود ذرا فاصلے پر آ رہے تھے۔ آپ تک یہ آواز پہنچی تو آپ وہاں ہی بیٹھ گئے۔ لیکن اگر ہر جگہ صحابہ یہی طریقہ اختیار کرتے تو ان کو تواجر ملتا لیکن نصوص سے اس طرح وضاحت نہ ہوتی ہمیں نہ پتہ چلتا ان باتوں کا کہ اس طرح کی تخصیصات بھی نصوص کے اندر ہوتی ہیں۔ صحابہ تو عمل کر لیتے راستوں میں بیٹھنے سے بچ جاتے لیکن ہمیں اگر ضرورت پڑتی تو حدیث شریف پر عمل کرنے کے لئے اتنی تکلیف برداشت نہ کر سکتے۔ تو یہ مقصد ہے صحابہ کے پوچھنے کا کہ آپ نے جو فرمایا کہ راستے میں نہ بیٹھو آیا کہ یہ حکم مطلق ہے یا دوسرے قواعد کی وجہ سے تخصیص ہو گئی ہے ۔

الفصل الثانی

(١٦) وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِّ صَلَّى اللهُّ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " لِلْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ بِالْمَعْرُوفِ: يُسَلِّمُ عَلَيْهِ إِذَا لَقِيَهُ وَيُجِيبُهُ إِذَا دَعَاهُ وَيُشَمِّتُهُ إِذَا عَطَسَ وَيَعُودُهُ إِذَا مَرِضَ وَيَتْبَعُ جِنَازَتَهُ إِذَا مَاتَ وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ " رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ والدارمي.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں قاعدے (اور عرف) کے مطابق۔ جب اس کو ملے تو اس کو سلام کرے، جب وہ اس کو بلائے تو اس کی دعوت کو قبول کرے، جب وہ چھینکے تو اُسے یرحمک اللہ کہے ، جب وہ بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کرے، اس کے جنازے کے ساتھ جائے جب وہ مر جائے اور اس کے

لئے وہی سلوک پسند کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

کن موقعوں پر سلام نہیں کرنا چاہیئے؟

اس میں تقریباً باتیں تو وہی ہیں جو پہلے حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں گذر چکی ہیں کہ للمؤمن علی المؤمن ست خصال البتہ اس میں ایک لفظ کا اضافہ ہے "بالمعروف" کہ قاعدے کے مطابق، عرف کے مطابق، اس طریقے سے جس کو اچھا سمجھا جائے، جو معروف طریقہ ہے اس کے مطابق۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں جن چھ چیزوں کا ذکر ہوا وہ ہر حالت میں کرنا ضروری نہیں اور نہ ہی ہر حالت میں اس کا کرنا مطلوب ہے۔ بعض حالات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن میں ان کا کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے، بعض حالات میں بیمار پرسی ضروری نہیں ہوتی، جنازے کے ساتھ ہر ایک کے لئے جانا ضروری نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض حالات میں یہ کام مطلوب بھی نہیں ہوتے بلکہ غیر پسندیدہ ہوتے ہیں مثلاً یہ فرمایا کہ جب مسلمان کو ملے تو اُسے سلام کرے، اصل تو یہی ہے کہ جس سے بھی ملاقات ہو اس کو سلام کیا جائے چاہے اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو لیکن یہ حکم بھی مشروط ہے بالمعروف کی قید کے ساتھ۔ لہٰذا کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ جہاں پر سلام کرنا معروف نہیں ہوگا بلکہ منکر ہو جاتا ہے یعنی شرعاً اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ فقہا نے بہت ساری جگہیں لکھ دی ہیں ایسی جن جگہوں میں سلام کرنا مکروہ ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو سلام نہیں کیا جائے گا، کوئی آدمی قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہوا ہے، دیہاتوں میں بعض جگہ بیت الخلاء نہیں ہوتے ، کھلی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں تو آپ وہاں سے گزرے تو اذا لقیہ، تو یہاں بھی پایا جارہا ہے لیکن سلام کرنا مکروہ ہے۔ کوئی آدمی کھانا کھانے میں مصروف ہے اس کو سلام کرنا مکروہ ہے اذا لقیہ، تو پایا جارہا ہے لیکن اس کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ ہاں البتہ فقہا نے ایک استثنا کیا ہے کہ اگر اپنے آپ کو بھوک زیادہ لگی ہوئی ہے تو سلام کر لینا چاہئے۔ کوئی ذکر اللہ میں مصروف ہو یا کوئی تلاوت کر رہا ہو تو اس کو سلام کرنا مکروہ ہے اس لئے کہ ان جگہوں پر سلام کرنا معروف نہیں یعنی شریعت کے قاعدے کے مطابق نہیں۔ یہ جزئیات تو بہت ساری ہیں لیکن ان تمام جزئیات کا اصول یہ ہے کہ سلام

کرنا جہاں پر عرفاً قبیح سمجھا جاتا ہو یا سلام کرنے کی وجہ سے کسی کے ذہن الجھنے کے کا خطرہ ہو اگلے کو اپنا کام چھوڑ کر آپ کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہو ،ایسی جگہوں پر سلام نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً ایک آدمی قضائے حاجت کے لئے بیٹھا ہوا ہے تو اسے آپ سلام کریں گے تو یہ قبیح سمجھا جاتا ہے ،انسانی طبیعت اس کو اچھا نہیں سمجھتی۔ کوئی آدمی عبادت کر رہا ہے ذکر کر رہا ہے نماز پڑھ رہا ہے اسے سلام کرتے ہیں تو یہ اس کی عبادت میں خلل ہے یا کوئی آدمی اپنے کسی کام میں مصروف ہے اور منہمک ہے اگر آپ اُسے سلام کریں گے تو اس کو آپ کی طرف توجہ کرنے کی وجہ سے کچھ ذہنی تشویش ہو گی اور اس کی طبیعت پر بار ہو گا تو اس حالت میں بھی سلام کرنا جائز نہیں۔ یہ جو آج کل مسجدوں میں رواج ہوتا ہے کہ جب مسجد میں داخل ہوتے ہیں تو سلام کرتے ہیں تو یہ طریقہ صحیح نہیں۔ہاں البتہ اگر کوئی آدمی آپ کو مسجد میں ایسا ملا جو کسی عبادت میں، پڑھنے میں یا کسی اور کام میں مصروف نہیں وہ آپ کے آنے کی وجہ سے آپ کی طرف متوجہ ہو گیا تو آپ اسے سلام کر سکتے ہیں۔

باقی یہ بھی مسئلہ ہے کہ جن جگہوں پر سلام کرنا مکروہ ہے ایسے موقعوں پر اگر کوئی سلام کرلے تو سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہوتا یعنی جن جگہوں پر سلام کرنا مکروہ ہے اور کسی نے لاعلمی کی وجہ سے سلام کیا تو اس کا جواب دینا واجب نہیں۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم کہ سلام ملاقات کا ایک ادب ہے۔ یسلم علیہ اذالقیہ اور جب کوئی شخص آپ کی طرف پورے طور پر متوجہ ہی نہیں ہے تو اذالقیہ والی شرط نہیں پائی گئی ہے۔ ایک تو یہ جو تقییدات نکالی ہیں بالمعروف کی قید سے۔ لیکن اگر یہ قید نہ بھی ہوتی تو اذالقیہ، کا تقاضا بھی یہی ہے کہ صرف آپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے بلکہ وہ بھی آپ کی طرف متوجہ ہو۔ باقی اس کو آپ اپنی طرف متوجہ کریں یا نہ کریں اس کے لئے موقعہ محل دیکھنا پڑتا ہے بعض موقعوں پر اگر آپ اس کو اپنی طرف متوجہ کریں گے تو اس کی طبیعت پر بوجھ ہو گا۔ تو موقع محل کی مناسبت سے کام کرنا چاہئے۔ بالمعروف کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمان کے مسلمان پر یہ چھ حق ہیں لیکن موقع محل کی مناسبت سے۔

اس میں پہلے جو حضرت ابوہریرہ (رض) کی جو حدیث آئی تھی اس میں یہ تھا وینصح لہ، اذا غاب او شہد اور یہاں پر اس کی جگہ ہے یحب لہ ما یحب لنفسہ۔ مآل دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمان کے ساتھ اس کے سامنے یا اس کی عدم موجودگی میں خیر خواہی کا برتاؤ کرے۔ لیکن خیر خواہی ہو گی کیسے ؟اس میں بعض اوقات انسان کا نفس انسان کو تاویل سکھا دیتا ہے کسی کے ساتھ کوئی سلوک کر رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کی وجہ سے کر رہا ہوں۔ بچوں کو پڑھا رہا ہے اپنے کسی طالب علم سے معمولی سی غلطی ہوئی اور اس کو پیٹنا شروع کر دیا بہت زیادہ مارا۔ ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں اس کی تربیت کے لئے کر رہا ہوں۔ اس طرح اور بہت سارے مقامات ہوتے ہیں کسی کی تحقیر کر رہا ہے اس کے عیوب بیان کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کر رہا ہوں تو اصل واجب تو یہی ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کا برتاؤ کیا جائے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔ لیکن اس ضابطے کے انطباق میں انسان کا نفس انسان کو تاویلیں سکھا دیتا ہے۔ تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کہیں میرا نفس تاویل تو نہیں کر رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نفس کی پیمائش کا ایک پیمانہ اور ایک ضابطہ ہمیں دے دیا۔ اور یہ ضابطہ ایسا ہے کہ اس میں معاشرت اور معاملات کے نہ جانے کتنے اصول آ گئے ہیں۔ وہ ضابطہ یہ ہے کہ جو سلوک اور برتاؤ تم دوسرے کے ساتھ کرنے لگے ہو، وہ سلوک اور برتاؤ کرنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ اگر اس کی جگہ پر میں ہوتا اور وہ میری جگہ پر ہوتا تو میں اپنے ساتھ یہ سلوک برداشت کرتا یا نہ کرتا۔ بس یہ معیار ہے اگر اپنے لئے برداشت کر لیتے اپنے لئے اُسے پسند کرتے تو دوسرے کے لئے اس کو پسند کرو، وگرنہ نہیں۔ وہی مثال بچے کو مارنے والی لے لیجئے اس کو مار رہے ہیں چھوٹی سی غلطی پر بہت زیادہ مار از خمی کر دیا اور کہتے ہیں کہ خیر خواہی ہے تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کسی شیخ طریقت کے پاس جانے کی ضرورت نہیں بلکہ بات بہت موٹی سی اور سیدھی سی ہے۔ بڑا آسان ہے فیصلہ کرنا۔ وہ یہ کہ تم یہ سوچو اگر میرا بچہ کسی معلم کے پاس ہو اور اُس سے اتنی سی غلطی ہو اور وہ اس پر اتنا مارے جتنا میں نے مارا ہے تو مجھے یہ کیسا لگے گا واقعۃً میرے بچے کی تربیت ہو رہی ہے یا غصہ نکالا جا رہا ہے تو یہ سوچ لو فیصلہ ہو جائے گا۔ جو دوسروں کے بارے میں تم سوچ رہے ہو اس کو پہلے اپنے اوپر منطبق کر کے دیکھ لو بڑی آسانی سے پتا چل جائے گا کہ دوسرے کے

ساتھ یہ معاملہ کرنا ہے یا نہیں۔ایک ساس ہے وہ اپنی بہو کے ساتھ برتاؤ کرتی ہے اور کہتی یہ ہے کہ میں یہ بھی اس کے ساتھ خیر خواہی کر رہی ہوں گھر کا انتظام درست کرنے کے لئے سب کچھ کر رہی ہوں تو ہو سکتا ہے واقعی یہ مقصد ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ مقصد نہ ہو یہ محض تاویل یا حقیقت ہے اس کے لئے یہ سوچو اگر میری ساس میرے ساتھ یہ کرتی تو میری کیا رائے ہوتی وہی رائے اس کے بارے میں رکھو۔بہو اپنی ساس کے ساتھ جو معاملہ کر رہی ہے وہ دیکھے جب میرے بیٹوں کی شادی ہو گی اور میری بہو آئے گی تو میں اس طرح کا برتاؤ اپنے ساتھ پسند کروں گی یا نہیں۔ یہ باپ بیٹا دیکھ لے، ماں بیٹی دیکھ لے، استاد شاگرد دیکھ لیں جہاں کہیں بھی دو آدمیوں کے درمیان کسی قسم کا تعلق ہو تو جو معاملہ بھی کرنے لگے ہو تو اس کو پہلے اپنے اوپر چسپاں کر کے دیکھ لو مسئلہ حل ہو جائے گا۔اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول اگر انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق ہو جائے تو پھر اسلام کے معاشرت کے بارے میں جو احکامات ہیں وہ بڑی تفصیل سے شاید جاننے کی ضرورت بھی نہ رہے آدھے سے زیادہ مسئلے تو اس سے حل ہو جاتے ہیں چھوٹا سا اصول ہے "یحب لہ مایحب لنفسہ"۔

یہیں سے ایک اور غلط فہمی بھی دور ہونی چاہئے۔بعض طالب علم اس کا ترجمہ کرتے ہیں "کہ اس کے لئے وہ چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے" اب فرض کیجئے ایک شخص کو دال بہت پسند ہے اور میں اس کا مہمان بن گیا تو جتنے دن رہا وہ مجھے دال ہی کھلاتا رہا کیوں؟ اس لئے کہ جو چیز اپنے لئے پسند ہو وہی دوسرے کے لئے پسند ہونی چاہئے چاہے دوسرے سے کھائی جائے یا نہ کھائی جائے۔تو یہاں یہ مطلب نہیں ہے 'ما' سے مراد برتاؤ ہے، سلوک ہے۔وہ سلوک کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور اپنے لئے پسند یہ کرتے ہو کہ جو چیز تمہیں اچھی لگے وہ کھائی جائے تو اس طرح دوسرے کے ساتھ بھی یہی کرو جو اسے اچھی لگتی ہے اس کی پسند کا لحاظ رکھو تو ما سے مراد یہ کھانے پینے کی چیزیں مراد نہیں ہیں۔

سلام کے لفظ بڑھنے سے ثواب بھی بڑھ جاتا ہے

(۱۷) وعنِ عمرَان بن حُصَيْن أَنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم: «عشر» . ثمَّ جَاءَ لآخر فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ فَرَدَّ عَلَيْهِ فَقَالَ: «ثَلَاثُونَ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا السلام علیکم تو آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا، پھر وہ بیٹھ گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دس نیکیاں ہو گئیں ہیں۔ پھر ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ تو آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا کہ بیس نیکیاں مل گئیں۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ تو آپ نے اس کا جواب دیا اور وہ آدمی بیٹھ گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیس نیکیاں ہو گئیں۔

(۱۸) وَعَن معَاذ بْنِ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَعْنَاهُ وَزَاد ثُمَّ أَتَى آخَرُ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ وَمَغْفِرَتُهُ فَقَالَ: «أَرْبَعُونَ» وَقَالَ: «هَكَذَا تكون الْفَضَائِل» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی مضمون کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور یہ زائد بات بھی نقل کرتے ہیں کہ ایک اور آدمی آیا اور اُس نے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ تو آپ نے فرمایا چالیس۔ اور فرمایا کہ فضیلتیں اس طریقے سے ہوتی ہیں۔

یعنی جوں جوں عمل بڑھتا چلا جاتا ہے فضیلت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ سلام کرنے میں اگر السلام علیکم کہا تو اس پر اجر ہے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے پر اس سے زیادہ اور اگر السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا تو اس سے بھی زیادہ اجر ہوگا۔اور دوسری روایت کے مطابق ومغفرتہ بڑھادیا تو اجر اس سے بھی زیادہ ہوگا۔

اگر کسی نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور جواب دینے والے نے جواب میں صرف وعلیکم السلام کہہ دیا یعنی ورحمۃ اللہ اور وبرکاتہ نہیں کہا تو اب آیا جواب ہوا یا نہیں۔ تو صحیح یہی ہے کہ جواب اس سے بھی ہو جاتا ہے یعنی جو جواب دینا واجب ہے اُس واجب کی ادائیگی ہو جائے گی کیونکہ ایک درجے میں یہ قرآنی حکم فردوھا میں داخل ہے۔

سلام میں پہل کی فضیلت

(۱۹) وعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاللهِ مَنْ بَدَأَ السَّلَامِ» . رَوَاهُ أَحْمد وَالتِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں اللہ کے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جو سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں۔

اس لئے کہ پہلے سلام کرنا یہ علامت ہے تواضع کی اور جتنی تواضع ہوتی ہے اتنا ہی انسان اللہ کے قریب ہوتا ہے اور دل میں جتنا کبر ہوتا ہے انسان اتنا ہی اللہ سے دور رہتا ہے۔

عورتوں کو سلام کرنا

(۲۰) وَعَن جَرِيرٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَى نِسْوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِنَّ. رَوَاهُ أَحْمَدُ.

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر کچھ عورتوں کے پاس سے ہوا تو آپ نے انہیں سلام کیا۔

عورتوں کو سلام کرنے کا کیا حکم ہے کہ جس طرح عورتوں کے ساتھ بات کرنا گفتگو کرنا فی نفسہ جائز ہے لیکن جہاں فتنے کا خوف ہو وہاں جائز نہیں یا اس انداز سے بات کرنا جس میں فتنے کا خوف ہو وہ جائز نہیں اسی طرح سلام کرنا عورت کو یا عورتوں کو فی نفسہ تو مباح ہے لیکن خوفِ فتنہ کی وجہ سے ممنوع ہے لہٰذا جہاں یہ بات نہ ہو وہاں سلام کرنے کی گنجائش ہے۔ مثلاً ایک عورت نہیں کافی ساری عورتیں ہیں تو ظاہر ہے کہ ایک ہو تو فتنے کا امکان ہے لیکن جب زیادہ عورتیں ہوں تو فتنے کا امکان نہیں یا عورت بڑی عمر کی ہے۔ اس لئے کہ بات اصل میں یہ ہے کہ سلام بھی کلام ہی کا ایک فرد ہے گفتگو ہی کا ایک حصہ ہے تو جہاں گفتگو جائز ہو گی وہاں بظاہر سلام بھی جائز ہو گا۔ جب بات ہی کرنی ہے مثلاً کسی خاتون کو ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ گیا تو وہاں جا کر اگر خاتون سلام کرلے ڈاکٹر کو تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں یا کسی مرد کو کسی ضرورت کی وجہ سے کسی عورت کے پاس جانا پڑ گیا کوئی بات کرنی پڑ گئی یا فون پر بات کی تو جہاں بات کرنا جائز ہے وہاں سلام کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے۔ کسی عورت کو کسی عالم سے مسئلہ پوچھنا پڑ گیا جا کر مسئلہ پوچھا یا فون کے ذریعے مسئلہ پوچھا تو جہاں مسئلہ پوچھنا جائز ہے تو اس صورت میں اگر وہ اپنی بات سے پہلے سلام کرلے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔

ایک کا سلام سب کی طرف سے

(۲۱) وَعَنْ عَلِيِّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: يُجْزِئُ عَنِ الْجَمَاعَةِ إِذَا مَرُّوا أَنْ يُسَلِّمَ أَحَدُهُمْ وَيُجْزِئُ عَنِ الْجُلُوسِ أَنْ يَرُدَّ أَحَدُهُمْ. رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ مَرْفُوعا. وروى أَبُو دَاوُد وَقَالَ: وَرَفعه الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ وَهُوَ شَيْخُ أَبِي دَاوُدَ.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک جماعت جب کسی کے پاس سے گزرے تو ان کی طرف سے یہ بات کافی ہے کہ ان میں کوئی ایک سلام کرلے اور بیٹھنے والوں کی طرف سے یہ کافی ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک جواب دے دے۔

حاصل یہ کہ سلام کرنا سنت ہے لیکن سنت علی الکفایہ ہے لہٰذا اگر کئی شخص کسی جگہ گئے اور ان میں سے ایک نے سلام کرلیا تو سب کی طرف سے سنت ادا ہوگئی، اسی طرح اگر بیک وقت کئی آدمیوں کو سلام کیا گیا ہے تو ان میں سے ایک نے بھی جواب دے دیا تو سب کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔ سب کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔

محض ہاتھ کے اشارے سے سلام کرنا

(٢٢) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْهُمْ أَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا لَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ وَلَا بِالنَّصَارَى فَإِنَّ تَسْلِيمَ الْيَهُودِ الْإِشَارَةُ بِالْأَصَابِعِ وَتَسْلِيمَ النَّصَارَى الْإِشَارَةُ بِالْأَكُفِّ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: إِسْنَاده ضَعِيف.

عمرو بن شعیب اپنے والد سے نقل کرتے ہیں اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ لوگ ہم میں سے نہیں یا وہ شخص ہم سے نہیں جو ہمارے غیر کی مشابہت اختیار کرے۔ تم یہودیوں کی مشابہت اختیار نہ کرو اور نہ ہی عیسائیوں کی۔ یہودیوں کا سلام انگلیوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور عیسائیوں کا سلام ہتھیلیوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہودی عام طور پر جب سلام کرتے ہیں تو محض انگلیوں کا اشارہ کر دیتے ہیں اور عیسائی جب سلام کرتے ہیں تو محض ہاتھ کا اشارہ کافی سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہمیں منع کیا گیا ہے کفار اور مشرکین کی مشابہت

اختیار کرنے سے اس لئے ہم جب سلام کریں تو ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس حدیث میں انگلیوں کے ساتھ یا ہاتھ کے ساتھ سلام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اب مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی جو ہاتھ کے ساتھ سلام کرتے تھے تو محض ہاتھ کے اشارے پر اکتفا کرتے تھے لہٰذا اگر کوئی شخص اس طریقے سے سلام کرتا ہے کہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتا محض ہاتھ سے سلام کا اشارہ کر دیتا ہے، تو اس سے سلام ادا نہیں ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ تشبہ میں داخل ہو جائے گا، البتہ اگر زبان سے بھی سلام کیا السلام علیکم کہا لیکن جسے سلام کیا جارہا ہے وہ اتنے فاصلے پر ہے کہ شاید سلام نہ سن سکے اس لئے بطور علامت کے ہاتھ سے بھی اشارہ کر دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس حدیث میں ایک اصول بیان کیا گیا کہ یہود و نصاریٰ کی بلکہ ہمارے جتنے بھی غیر ہیں ان کی مشابہت اختیار نہ کرو، تشبہ اختیار نہ کرو۔ تشبہ باب تَفَعُّل کا مصدر ہے جس کا معنی ہوتا ہے "بتکلف کسی جیسا بننے کی کوشش کرنا"، تو شریعت میں برے لوگوں کے ساتھ تشبہ ممنوع ہے اور اچھے لوگوں کے ساتھ تشبہ مطلوب ہے۔ تشبہ کب بنتا ہے کب نہیں اس کی تفصیل کتاب اللباس میں گذر چکی ہے۔

عمرو بن شعیب عن أبیہ عن جدہ

یہ حدیث روایت کی گئی عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ اس سے کیا مراد ہے؟ عمرو بن شعیب کا نسب نامہ یہ ہے: عمرو بن شعیب بن محمد بن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ عمرو کے والد ہیں شعیب اور عمرو کے دادا محمد ہیں۔ اور ان کے والد حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہیں۔ یہاں یہ آیا کہ عن ابیہ عن جدہ۔ یہ دو ضمیریں کس طرف لوٹ رہی ہیں۔ تو اس میں ابیہ کی ضمیر تو عمرو کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی عمرو کے باپ مراد ہیں اور وہ شعیب ہیں تو عمرو روایت کر رہے ہیں اپنے والد شعیب سے۔ جدہ کی ضمیر کس طرف لوٹ رہی ہے، اس میں دو احتمال ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ضمیر لوٹے عمرو کی طرف سے جیسے ابیہ کی ضمیر عمرو کی طرف لوٹ رہی ہے، تو مطلب ہوگا کہ عمرو روایت کر رہے ہیں اپنے والد شعیب سے اور شعیب روایت کر رہے ہیں عمرو کے دادا سے یعنی محمد سے یعنی اپنے

باپ سے تو اس صورت میں یہ روایت محمد سے ہو گی۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ جدہ کی ضمیر لوٹے شعیب کی طرف تو اب مطلب یہ ہو گا کہ عمرو روایت کر رہے ہیں اپنے والد شعیب سے اور شعیب روایت کر رہے ہیں عمرو کے دادا سے نہیں بلکہ اپنے دادا سے اور شعیب کے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص (رض) ہیں۔ دو احتمال ہو گئے۔ پہلے احتمال کے مطابق یہ حدیث مرسل بنے گی۔ مرسل کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات تابعی نقل کرے اس لئے کہ یہاں محمد جد ہیں وہ صحابی نہیں بلکہ تابعی ہیں محمد کہہ رہے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا درمیان میں صحابی کا واسطہ مذکور نہیں ہے۔ اور دوسری صورت میں یہ روایت مسند بنے گی یعنی صحابی کا بھی واسطہ مذکور ہو گا کیونکہ عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں۔ تو عقلی اور اصولی طور پر دو احتمال بنتے ہیں۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں پر مراد کون ہے تو عام طور پر جب اس طرح کی سند آتی ہے تو وہاں ابیہ اور جدہ دونوں ضمیروں کا مرجع ایک ہی ہوتا ہے مثلاً عن بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ تو مراد ہے کہ بہز روایت کر رہے ہیں اپنے باپ سے اور وہ روایت کر رہے بہز کے دادا سے۔ باپ بھی بہز کے مراد ہیں اور دادا بھی انہیں کے۔ عام طور پر ابیہ اور جدہ کی ضمیریں پہلے شخص کی طرف لوٹا کرتی ہیں۔ لیکن یہاں پر ایسا نہیں ہو گا۔ یہاں ابیہ کی ضمیر عمرو کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی عمرو کے والد مراد ہیں اور جدہ کی ضمیر عمرو کی طرف نہیں لوٹ رہی بلکہ یہ شعیب کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی شعیب کے دادا مراد ہیں۔ اب مطلب یہ ہو گا کہ عمرو روایت کر رہے ہیں اپنے والد شعیب سے اور شعیب روایت کر رہے ہیں عمرو کے دادا سے نہیں بلکہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو سے۔ تو یہاں صحیح یہی ہے کہ جدہ سے مراد حضرت عبداللہ بن عمرو ہیں۔

اس سند پر محدثین کی گفتگو ہوئی ہے کہ یہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ جہاں عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ آجائے تو یہ قابل قبول ہے یا نہیں۔ تو صحیح یہی ہے کہ یہ قابل قبول ہے اور کم از کم حسن ضرور ہے۔ ان کے نیچے کسی راوی میں ضعف آجائے تو الگ بات ہے لیکن اس حد تک اس سند میں کسی قسم کا اشکال نہیں ہے۔

تھوڑی جدائی کے بعد ملاقات پر بھی سلام کرو

(٢٣) وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اتا: «إِذَا لَقِيَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ فَإِنْ حَالَتْ بَيْنَهُمَا شَجَرَةٌ أَوْ جِدَارٌ أَوْ حَجَرٌ ثُمَّ لَقِيَهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی سے ملے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے سلام کرے اور اگر ان دونوں کے درمیان کوئی درخت یا کوئی دیوار یا کوئی پتھر حائل ہو جائے پھر دوبارہ اُسے ملے تو اُسے چاہئے کہ اُسے سلام کرے۔

یعنی جب بھی ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے ملاقات ہو تو اس کا ادب یہ ہے کہ سلام کیا جائے چاہے یہ ملاقات بہت سے معمولی وقت وقفے کے بعد ہو رہی ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے بس اتنا ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے پیچھے چلا گیا تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر چلا گیا تھوڑی دیر کے لئے کسی ایسی جگہ چلا گیا کہ درمیان میں کوئی چٹان وغیرہ حائل ہو گئی تو تھوڑی دیر کے لئے بھی کہیں اٹھ کر گیا ہے تو جب واپس آئے تو اس کا ادب یہ ہے کہ سلام کرے۔

ملاقات کے اختتام پر سلام

(٢٤) وَعَن قَتَادَة قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذَا دَخَلْتُمْ بَيْتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهِ وَإِذَا خَرَجْتُمْ فَأَوْدِعُوا أَهْلَهُ بِسَلَامٍ» رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي «شُعَبِ

الْإِيمَانِ» مُرْسَلًا

حضرت قتادہ رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایاکہ جب تم کسی گھر میں داخل ہونے لگو توگھر والوں کوسلام کرواور جب تم وہاں سے نکلوتواس گھر والوں کوسلام کے ساتھ رخصت کرو۔

اس حدیث کامقصد یہ ہے کہ سلام دو جگہوں پر مسنون ہے۔ایک جگہ تولوگوں میں معروف ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب دوآدمیوں کی آپس میں ملاقات ہوایک شخص دوسرے شخص کو ملے۔حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا یہ چاہتے ہیں اور یہ بات آگے بھی کچھ حدیثوں میں آئے گی کہ محض ملاقات کے وقت سلام کرنامسنون نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جداہونے لگوملاقات کاخاتمہ ہونے لگے تواُس وقت بھی سلام مسنون ہے۔دوآدمی ملے کھڑے کھڑے باتیں کیں توان کوچاہئے کہ جاتے وقت بھی سلام کرے آپ کسی کے گھر میں گئے توجب اس کے گھر میں گئے توسلام کروجیساکہ اس حدیث میں آیااور جب وہاں سے جانے لگوتو بھی سلام کرو۔حاصل یہ کہ جب ملاقات ہورہی ہے تواس وقت بھی سلام مسنون ہےاور جب ملاقات کاخاتمہ ہورہاہےایک دوسرے سے جداہورہے ہیں تواس وقت بھی سلام مسنون ہے ایک سلام لقاء ہے اور ایک سلام وِداع ہے البتہ بعض حضرات نے یہ فرمایاہے کہ جوپہلاسلام ہے اس کاجواب دیناتو واجب ہے دوسرے سلام کاجواب دیناواجب نہیں ہے اس لئے کہ قرآن کریم میں لفظ آتاہے تحیۃ کاکہ واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا اوردوہا اور تحیہ سلام لقاکو کہتے ہیں سلامِ وِداع کو نہیں کہتے اس لئے اس کاجواب دیناواجب نہ ہوا۔لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتاہے کہ احادیث میں جوردالسلام کاذکرہے وہ عام ہے اس کاتقاضایہ ہے کہ دونوں سلاموں کاجواب دیناچاہئے۔پہلی دلیل بھی بالکل بے وزن نہیں ہے لیکن احتیاط کاتقاضاپھر بھی یہی ہے کہ واجب سمجھ کر پھر بھی سلام کاجواب دے دیاجائے۔

گھر میں داخل ہوتے وقت سلام باعثِ برکت

(٢٥) وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «يَا بُنَيِّ إِذَا دَخَلْتَ عَلَى أَهْلِكَ فَسَلِّمْ يَكُونُ بَرَكَةً عَلَيْكَ وَعَلَى أَهْلِ بَيْتِك» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے بیٹے جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو یہ تمہارے لئے برکت کا باعث ہوگا اور تمہارے گھر والوں کے لئے بھی۔

یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمارہے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ حضرت انسؓ اس وقت چھوٹے بچے تھے تقریباً دس سال کی عمر تھی جب ان کی والدہ نے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیا اور یہ کہا تھا کہ یہ بچہ آپ کی خدمت کرے گا چنانچہ دس سال تک انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تو اس دوران حضور اقدس ﷺ نے حضرت انس کو یہ فرمایا کہ جب اپنے گھر جایا کرو تو اپنے گھر میں سلام کیا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص سے آدمی خدمت لے اس کی تربیت کا اور ادب سکھانے کا بھی اہتمام کرنا چاہیے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس کو یہ بات فرمائی۔ یہ جو آپ نے فرمایا کہ تمہارے لئے اور تمہارے گھر والون کیلئے باعث برکت ہوگی یہ اشارہ ہے در حقیقت قرآن کریم کی آیت طرف کہ اذا دخلتم بیوتاً فسلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبٰرکۃ طیبۃ۔ کہ جب تم اپنے گھروں میں داخل ہو تو سلام کرو اپنے آپ کو سلام کرو۔ حالانکہ سلام اپنے آپ کو نہیں کرنا بلکہ گھر والوں کو کرنا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ جو تم دوسروں کو سلام کرتے ہو تو یوں سمجھو کہ اپنے آپ کو سلام کر رہے ہوں اس لئے کہ المؤمنون کالجسد الواحد لہٰذا دوسروں کو سلام کرنا، اپنے کو سلام کرنا ہے سلام اس لئے کرنا ہے کہ یہ ایسا تحیہ ہے کہ جس میں تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ عنداللہ ہے اللہ کی طرف سے آیا ہوتا ہے۔

اور دوسرا یہ کہ یہ برکت ہے، اس میں برکت بڑی ہے۔

اور تیسرا یہ کہ یہ پاکیزہ ہے لفظ ہی کتنے اچھے ہیں سلامتی ہی سلامتی ہے۔

کلام سے پہلے سلام

(٢٦) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «السَّلَامُ قَبْلَ الْكَلَامِ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيث مُنكر

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلام کلام سے پہلے ہوتا ہے۔

اس حدیث کے بارے میں امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ لیکن یہ منکر ہے سند کے اعتبار سے۔ جہاں تک معنی اور مضمون کا تعلق ہے تو وہ دوسرے دلائل شرعیہ سے ثابت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب کسی سے گفتگو کرنی ہو تو اس کی ابتدا سلام سے کرنی چاہئے پہلے سلام کریں پھر کوئی اور بات کریں۔ حال احوال پوچھیں یا جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ مقصد بعد میں ہو اور یہ بات صرف اس حدیث سے ثابت نہیں ہو رہی بلکہ دوسری احادیث کا مقتضی بھی یہی ہے۔ البتہ ایک سوال یہاں اور ہے وہ یہ ہے کہ اگر استیذان کی ضرورت ہو اجازت طلب کرنی ہو تو وہاں پہلے اجازت طلب کی جائے پھر سلام کیا جائے یا کوئی اور ترتیب ہو؟ استیذان بھی ایک کلام ہے تو یہ کلام سلام سے پہلے ہونی چاہئے یا بعد میں۔ یہ مسئلہ آگے باب الاستیذان میں آجائے گا۔

جاہلیت کے ایک لفظ سے ممانعت

(۲۷) وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ: كُنَّا فِي الْجَاهِلِيَّةِ نَقُولُ: أَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا وَأَنْعَمَ صَبَاحًا. فَلَمَّا كَانَ الْإِسْلَامُ نُهِينَا عَنْ ذٰلِكَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں ملاقات کے وقت یہ کہا کرتے تھے "انعم اللہ بک عینا" اللہ تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کرے اور کہا کرتے تھے "انعم صباحاً" کہ صبح بخیر ہو۔ جب اسلام آیا تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا۔

زمانۂ جاہلیت مین دو لفظ کہا کرتے تھے کبھی تو ملاقات کے وقت یہ کہا کرتے تھے "انعم اللہ بک عینا" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اس میں بائے زائدہ ہے تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ انعم اللہ عینک اللہ۔ تمہاری آنکھ کو ٹھنڈا کرے، یعنی تم خوش و خرم رہو۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ باسبیت کے لئے، یعنی تمہارے ذریعے سے اللہ تعالیٰ آنکھیں ٹھنڈی کریں، یعنی تمہیں خوش و خرم دیکھ کر ہماری آنکھیں بھی ٹھنڈی ہوں۔

دوسرا لفظ ہے انعم صباحاً۔ اس میں صباحاً انعم کا ظرف ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ صبح کے وقت خوش رہو۔ صبح کے وقت اچھے رہو۔ اور بامحاورہ ترجمہ ہوگا "صبح بخیر"۔ زمانہ جاہلیت میں جب ایک دوسرے سے لوگ ملتے تھے تو یہ لفظ بولے جاتے تھے تو جب اسلام آیا تو اس میں اس کی بجائے السلام علیکم کا طریقہ سکھایا گیا۔ یہ جو جملے ہیں معنی کے اعتبار سے یہ بھی غلط نہیں۔ ان میں کوئی غلط بات نہیں۔ لیکن پھر بھی ہمیں اس کا متبادل لفظ السلام علیکم سکھایا گیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو خوبیاں السلام علیکم میں پائی جاتی ہیں وہ ان جملوں کے اندر نہیں پائی جاتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اسلام محض کسی اچھی بات یا کا کام کا نام نہیں ہے بلکہ اسلام نام ہے حکم ماننے کا۔ لہٰذا تم جو کچھ پہلے کہتے چلے آرہے تھے وہ اپنی جگہ پر اگرچہ غلط نہیں تھا لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے طرزِ عمل سے یہ پتہ چلے کہ تم کسی کام

کو محض اچھا سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ اس لئے کرتے ہو کہ اللہ کا حکم ہے اس لئے بھی اس کا متبادل بتادیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کے لفظ کہنے کا حکم کیا ہے کسی کو انعم اللہ بک عینا کہا، کسی کو صبح بخیر کہہ دیا، یا شب بخیر کہہ دیا اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر السلام علیکم کی سنت ادا کر دی تو اس کے ساتھ ساتھ اس طرح کے لفظ بھی کہہ دیئے جائیں تو بھی کوئی حرج کی بات نہیں، لیکن ان کو خالصتاً سلام کے قائم مقام کرنا اور انہی پر اکتفا کرنا اور سلام کو متروک کر دینا درست نہیں ہے۔

کسی کا سلام پہنچے تو جواب دینے کا طریقہ

(۲۸) وَعَن غَالب قَالَ: إِنَّا لَجُلُوسٌ بِبَابِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ إِذْ جَاءَ رَجُلٌ فَقَالَ: حَدَّثَنِي أَبِي عَنْ جَدِّي قَالَ: بَعَثَنِي أَبِي إِلَى رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ائته فَأَقْرِئْهُ السَّلَامَ. قَالَ: فَأَتَيْتُهُ فَقُلْتُ: أَبِي يُقْرِئُكَ السَّلَامَ. فَقَالَ: عَلَيْكَ وَعَلَى أَبِيكَ السَّلَامُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت غالب قطان فرماتے ہیں کہ ہم حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے دروازے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص آئے اور انہوں نے کہا کہ میرے والد نے مجھے میرے دادا سے نقل کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے کہا یعنی میرے دادا نے کہا کہ میرے والد نے یعنی پر دادا نے مجھے بھیجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور یہ کہا کہ تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میری طرف سے سلام کہنا۔ یہ فرماتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ میرے والد آپ کو سلام کہتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علیک وعلی ابیک السلام۔

اس حدیث سے کئی مسئلے معلوم ہوئے:

پہلا مسئلہ:

کسی نمائندہ کے ذریعے کسی شخص تک اپنا سلام بھیجنا درست اور جائز ہے۔ایک آدمی دوسرے کے پاس جارہا ہے توآپ اُسے کہتے ہیں کہ اُسے میری طرف سے سلام کہنا تواِس طرح بالواسطہ سلام پہنچانا یہ بھی جائز ہے البتہ اِس میں اس بات کالحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جسے آپ سلام پہنچانے کا کہہ رہے ہیں اس پر اس کی وجہ سے بوجھ نہ پڑے۔ مثلاً کبھی یادرکھنے کا بوجھ ہوتاہے آپ نے کہہ دیا اب اسے یادرکھناپڑے گااور کبھی ایسا بھی ہوسکتاہے کہ جہاں وہ جارہاہے وہاں اس کاارادہ اس شخص سے ملاقات کا نہ ہو، لیکن آپ نے جواسے اپناسلام تھمادیاوہ اُس تک پہنچانے کے لئے بالقصداس سے ملاقات کرے گا یاکسی بھی اور وجہ سے بوجھ ہوسکتاہے۔تو ایسی صورت میں کسی کو سلام کاواسطہ نہیں بناناچاہیئے۔اسی طرح آج کل جو عام طور پر خط کے اندر لکھ دیاجاتاہے کہ فلاں کوسلام کہہ دینافلاں کو بھی فلاں کو بھی سارے ساتھیوں کوسلام اور سارے اساتذہ کو تو یہ مناسب نہیں ہے اور اگر کہنا بھی ہو توزیادہ بہتر ہے کہ یوں کہاجائے کہ اگریادرہے اور موقعہ ملے تومیری طرف سے سلام کہہ دینا۔اب اس صورت میں نہ یادرکھنے کابوجھ اس پر ہوگااور نہ ہی صرف اس مقصد کے لئے اس سے ملاقات کرنے کابوجھ اس پر ہوگا۔لیکن جہاں پر اس قسم کے بوجھ کا کوئی امکان نہ ہوتووہاں پر سلام میں کسی کوواسطہ بناناجائزہے کوئی حرج کی بات نہیں ہے مثلاً کوئی آدمی آپ کاپیغام لے کر دوسرے کے پاس جارہاہے یہ بات یقینی ہے کہ اس سے ملناہی ہے اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کے حوالے سے ملناہے توجب آپ کے حوالے سے اس سے بات کرنی ہے توپہلے آپ کی طرف سے سلام پہنچادے تواس میں بھی اس پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔

دوسرا مسئلہ:

دوسرامسئلہ اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اگر کسی کا سلام بالواسطہ پہنچے تواس کا بھی جواب دیناچاہیئے۔

تیسرا مسئلہ:

تیسرا مسئلہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایسے سلام کا جواب کیسے دینا چاہئے۔ تو مسئلہ یہ سمجھ میں آیا کہ سلام کا جواب دیتے وقت پہلے سلام بھیجنا چاہئے اس شخص پر جو اس کو لے کر آیا ہے، جو واسطہ بنا ہے اور پھر سلام بھیجنا چاہئے اس شخص پر جس کی طرف سے سلام آیا ہے۔ واسطے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً یوں کہے علیک وعلیہ السلام۔ علیہ کی جگہ اس آدمی کا نام بھی لے سکتے ہیں جیسے یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علیک وعلی ابیک السلام، لیکن سلام بھیجنے والے کا نام لینا ضروری نہیں علیہ کہہ دیا تو ضمیر خود بخود اس کی طرف لوٹ جائے گی۔

خط میں پہلے کس کا نام لکھا جائے

(۲۹) وَعَن أبي الْعَلَاء بن الْحَضْرَمِيّ أَنَّ الْعَلَاءَ الْحَضْرَمِيَّ كَانَ عَامِلَ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ إِذَا كَتَبَ إِليه بدأَ بنفسِه. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت ابو علاء[1] حضرمی روایت کرتے ہیں کہ علاء حضرمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بحرین پر عامل تھے۔ جب وہ (علاء حضرمی) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خط لکھتے تو اپنے نام سے ابتدا کرتے۔

یعنی علاء حضرمی جب حضور اقدس ﷺ کی طرف خط لکھا کرتے تھے تو پہلے اپنا نام لکھتے تھے اس کے بعد مکتوب الیہ یعنی آں حضرت ﷺ کا نام لکھتے تھے اور اس کے بعد سلام وغیرہ ہوتا تھا۔ قرآن کریم نے حضرت

1۔ مشکوۃ کے بعض نسخوں میں یہاں ابو العلاء الحضرمی کی بجائے ابن العلاء ہے، اور یہی زیادہ صحیح اور ابوداود وغیرہ کے مطابق ہے۔

سلیمان علیہ السلام کا جو خط ملکۂ سبا کے نام نقل کیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنا نام پہلے لکھا تھا۔ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے حکام اور بادشاہوں کو جو دعوتی خط لکھے ہیں ان میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے کہ: من محمد عبداللہ ورسولہ الیٰ فلان۔ اسی طرح آپ نے اپنے متعدد صحابہ کے نام خط لکھے ہیں اور بعض خطوط ان میں سے کافی معروف بھی ہیں مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف تعزیتی خط لکھا تھا ان کے بیٹے کی وفات پر تو اس طرح کے جتنے بھی خطوط ہیں اسی طریقے سے شروع ہوتے ہیں کہ پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا نام ہے اس کے بعد مکتوب الیہ کا نام اور اس کے بعد سلام وغیرہ ذکر کر کے اصل مضمون شروع فرمایا ہے۔ یہی بات یہاں پر ہے کہ حضرت علاحضرمی رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کی طرف سے بحرین کے عامل تھے انہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا۔

اب مسئلہ کیا ہے؟ اگر خط لکھیں تو پہلے کیا لکھنا چاہئے۔ تو سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہاں پر یہ حدیث لانے کا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ ملاقات کا ادب یہ ہے کہ جب بھی ایک شخص کا دوسرے شخص سے رابطہ ہو تو اس کا آغاز سلام سے ہونا چاہئے اس پر کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ خط بھی رابطے کا ایک ذریعہ ہے اور خط کے اندر سلام سے پہلے بعض اور باتیں لکھی جاتی ہیں مثلاً یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ خط کس کی طرف سے ہے اور یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ خط کس کی طرف ہے بخدمت فلاں فلاں صاحب لکھا جاتا ہے اس کے بعد السلام علیکم لکھا جاتا ہے، تو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید یہ طریقہ درست نہ ہو اور سلام سے آغاز کرنے کی جو سنت ہے یہ طریقہ اس کے خلاف ہو تو یہ حدیث لا کر بتادیا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ خط کے اندر جو تمہیدی امور ہوتے ہیں ان کے بعد اگر سلام لکھا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔ اصل مقصود تو یہ حدیث یہاں لانے کا یہ ہے۔ البتہ مسئلہ پھر بھی قابل غور ہے کہ اگر ہم خط لکھیں تو اس کا آغاز کیسے کرنا چاہئے۔ خط لکھنے والے کو اپنا نام پہلے لکھنا چاہئے یا مکتوب الیہ کا نام۔ تو اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نام جو پہلے لکھا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا مرتبہ اور مقام بہت اونچا تھا اور آپ نے جو خط لکھے ہیں وہ زیادہ تر رؤسا اور حکام کو لکھے ہیں تو اپنے نام کو یعنی اللہ کے نبی کے نام کو ان کے نام کے بعد رکھنا

مناسب نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ بادشاہ کے نام کو سب سے پہلے لکھا جائے اس کو شاہی عظمت کا تقاضا سمجھا جاتا تھا تو یہاں یہ طریقہ اختیار کرنے یعنی مکتوب الیہ بادشاہ کا نام پہلے لکھنے میں تشبّہ کا شائبہ بھی تھا اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے گریز فرمایا ہے۔ علاء بن حضرمی نے اپنا نام پہلے کیوں لکھا، اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کی اتباع کرنا چاہتے تھے، دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے اور علاقے کا عرف رواج ہی یہ ہوگا، چنانچہ امام بیہقی فرماتے ہیں حضرت عمرؓ کے عمال اور گورنر جب ان کے نام خط لکھتے تھے تو وہ بھی اپنے نام سے ابتدا کرتے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے ابو عبیدۃ بن الجراح اور خالد بن الولید کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ بکر بن عبد اللہ مزنیؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے کسی حاکم کے نام کسی کے کام کی سفارش کرنے کے لئے خط لکھا اور اس میں مکتوب الیہ کا نام پہلے لکھا، اس پر بعض لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے کہا کہ میرا اس میں کیا بگڑتا ہے کہ کسی حاجت مند کا کام ہو جائے، یعنی اپنا نام پہلے دیکھ کر وہ خوش ہو جائے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کا عام دستور یہی تھا کہ لکھنے والا اپنا نام پہلے لکھتا تھا، تبھی تو بکر بن عبد اللہؒ کے عمل پر حیرانی کا اظہار کیا گیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ کے نام خط لکھنے ارادہ کیا، اس میں ان کا ارادہ پہلے اپنا نام لکھنے کا تھا، لیکن لوگوں کے مجبور کرنے پر پہلے مکتوب الیہ کا نام لکھا، إلی معاویۃ من عبد اللہ بن عمر[1]۔

اب ہم کیا کریں؟:

تو اس کے بارے میں علامہ قرطبیؒ رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر کے اندر یہ لکھا ہے کہ امت میں جو طریقہ مروّج ہے وہ یہی چلا آ رہا ہے کہ پہلے مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا ہے۔ البتہ اس میں ذرا تفصیل کی جا سکتی ہے وہ یہ کہ بذات خود کوئی طریقہ شریعت میں مطلوب نہیں ہے نہ کاتب کا نام پہلے لکھنا مطلوب ہے اور نہ مکتوب الیہ کا نام۔ بلکہ جیسا موقعہ محل ہو

1۔السنن الکبری للبیہقی ۱۰/۲۲۰ کتاب أدب القاضی: باب الرجل یبدأ بنفسه فی الکتاب۔

اس کی رعایت کر لینی چاہئے، مثلاً کوئی شخص اپنے شیخ، اپنے استاد کو خط لکھ رہا ہے تو وہاں پر اوپر اپنا نام ہو اور نیچے اس مکتوب الیہ کا نام ہو اس میں خلافِ ادب ہونے کا شائبہ ہے اس لئے یہاں بہتر یہی ہے کہ اوپر اپنا نام نہ لکھا جائے۔ اس کے علاوہ عام حالات میں وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس میں مکتوب الیہ کو سہولت ہو۔ سہولت کیسے ہو گی سہولت یہ ہو گی کہ ہر زمانے میں اور ہر معاشرے میں عام طور پر خط لکھنے کا ایک ڈھانچہ اور فارمیٹ مروج ہوتا ہے کہ پہلے یہ لکھا جاتا ہے پھر یہ لکھا جاتا ہے پھر یہ لکھا جاتا ہے کہ یہ کس کو لکھ رہے ہیں، جو طریقہ اور ڈھانچا مقرر ہے اس کی اتباع میں مکتوب الیہ کو سہولت ہوتی ہے۔ وہ سہولت کیسے؟ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے سامنے خط آیا تو خط میں کیا ہے؟ یہ جاننے سے پہلے اسے یہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس کا خط ہے تو جو طریقہ مروج ہے کہ بھیجنے والے کا نام یہاں پر لکھا جاتا ہے اگر اسی کی اتباع کریں گے تو وہ فوراً وہاں نظر ڈالے گا ایک سیکنڈ میں اسے پتا چل جائے گا کہ یہ کس کا خط ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر آپ اپنا طریقہ اختیار کریں گے تو اسے ڈھونڈنا پڑے گا کہ یہ خط کس کی طرف سے آیا ہے اول سے آخر تک پورا خط پڑے گا، درمیان میں کہیں پتا چل جائے گا کہ یہ فلاں کا خط ہے۔ دوسرے مسلمان کو سہولت میں رکھنا اور اسے تنگی اور تکلیف سے بچانا یہ مقاصد شریعت میں سے ہے لہذا جس طریقے سے یہ مقصد حاصل ہو وہ طریقہ اختیار کر لینا چاہئے۔

حاصل یہ نکلا کہ شریعت میں بذاتِ خود کوئی طریقہ مطلوب نہیں۔ البتہ دو باتیں مدِّ نظر رکھنی چاہئیں۔

﴿۱﴾ ایک تو مکتوب الیہ اگر واجب الاحترام اور عظیم شخصیت ہے تو اس کے ادب کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

﴿۲﴾ مکتوب الیہ کی سہولت کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

خط لکھ کر خاک ڈالنا

(۳۰) وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إذا كتب أحدكُم كتابا

فليتر بِهِ فَإِنَّهُ أَنْجَحُ لِلْحَاجَةِ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيث مُنكر

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کوئی خط لکھے تو اسے چاہئے کہ اس پر مٹی ڈالے، اس لئے کہ یہ حاجت کو زیادہ پورا کرنے والا ہے۔

اس حدیث کے بارے میں سب سے پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ حدیث سنداً صحیح نہیں ہے جیسا کہ خود امام ترمذی نے بھی فرمادیا کہ ہذا حدیث منکر۔ چونکہ یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے اس لئے اس کی تشریح اور تفصیل کی بھی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو پھر اس کا مطلب کیا ہوگا اس کے بارے میں شارحینِ حدیث نے گفتگو کی ہے۔

ایک مطلب تو یہ ہے کہ مٹی ڈالنے سے مراد سچ مچ مٹی ڈالنا ہے۔ یہ حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ پرانے زمانے کے جو قلم ہوتے تھے اس طرح کے قلم سے لکھا جائے۔ پہلے زمانے میں قلم کو سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھا جاتا تھا اور ہوتا عام طور پر یہ تھا کہ سیاہی گیلی ہوتی تھی اب اگر اسی طریقے سے خط کو بند کردیا جائے تو یہ خطرہ ہوتا تھا کہ لفظ مٹ نہ جائیں۔ اس لئے فرمایا کہ سیاہی کو خشک کرکے پھر بند کرنا چاہئے اور سیاہی کو خشک کرنے کے کئی طریقے ہوتے تھے۔ مثلاً آپ میں سے کسی نے شاید وہ زمانہ دیکھا ہو جب سیاہی چوس ہوتے تھے وہ لکھے ہوئے پر رکھ دیتے تھے۔ اسی طریقے سے اس پر مٹی ڈال دیا کرتے تھے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مٹی جھاڑ دیا کرتے تھے تو جو گیلی گیلی سیاہی ہوتی تھی وہ مٹی کے ساتھ مل جاتی تھی یوں لفظ سوکھ جاتے تھے۔ اس کے بعد اس کو بند کرنے میں یہ خطرہ نہیں ہوتا تھا کہ لفظ گڑبڑ ہو جائیں گے تو اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مٹی ڈال لو۔ اس میں جس مقصد کے لئے آپ خط لکھ رہے ہیں وہ زیادہ پورا ہوگا۔ کیونکہ مکتوب الیہ خط کو سمجھے گا تو ہی آپ کا کام کرے گا اگر وہ خط کو سمجھا ہی نہیں تو مقصد آپ کا کیسے حاصل ہوگا۔ لٰہذا یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جب کہ اس طرح کا قلم

استعمال کیا جائے اور سیاہی گیلی ہو اور اگر مٹی کے بجائے سیاہی کو کسی اور طریقے سے خشک کر لیا تو بھی اس پر عمل ہو گیا مٹی دالنا کوئی ضروری نہیں۔

بعض حضرات نے حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے یہ کہا کہ خط لکھ کر اسے خاک میں ڈال دے یعنی یہ بھول جائے کہ میں نے خط لکھا ہے۔یعنی جس مقصد کے حصول کے لئے اس نے خط لکھا ہے خط لکھ کر اب اعتماد اپنے خط پر نہ ہو کہ میں نے چونکہ فلاں کو لکھ دیا ہے اس لئے اس کی وجہ سے یہ کام ہو ہی جائے گا بلکہ نظر اللہ تعالیٰ پر ہو کہ سبب کے درجہ میں جو مجھ سے ہوا وہ میں نے کر لیا لیکن اب اس پر نظر نہیں ہے بلکہ کام تبھی ہو گا جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے۔

بعض نے کہا کہ جب خط لکھے تو اس میں خاکساری اختیار کریں عاجزی اور تواضع کے ساتھ لکھے۔ اس سے مکتوب الیہ پر اثر ہو گا اور آپ کی بات مانے گا۔اور اگر اکڑ کے ساتھ خط لکھا تو مکتوب الیہ آپ کی بات ہو سکتا ہے نہ مانے لہٰذا خاکساری اختیار کرنا مقصد کے حصول میں زیادہ مؤثر ہے۔

لیکن واضح اور ظاہر مطلب پہلا ہی ہے کہ مٹی ڈالو یعنی حروف کو خشک کرو تا کہ مکتوب الیہ کو پڑھنے میں دقت نہ ہو۔

روایت ضعیف ہو یا کیسی بھی ہو لیکن یہ جو اصول اس سے نکل رہا ہے وہ دوسرے دلائل سے بھی مؤید ہے کہ خط اس انداز سے لکھنا چاہئے اور خط لکھنے میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مکتوب الیہ کو آپ کا مدعیٰ سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ویسے تو عام گفتگو میں بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ آپ کا مخاطب آسانی سے آپ کی بات سمجھ جائے اور یہ کہ آپ کے اندازِ گفتگو میں تعلی اور تکبر نہ ہو۔ لیکن عام گفتگو میں اگر بات اسے سمجھ میں نہ آئی تو وہ آپ سے پوچھ لے گا، اگر آپ کا کوئی لفظ تعلی کا شائبہ پیدا کر رہا ہے تو آپ کے عمومی انداز اور باڈی لینگو یج سے غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ لیکن مکتوب الیہ چونکہ دور ہے اس لئے آپ سے فوری طور پر وہ پوچھ نہیں سکتا، اسی طرح آپ کا انداز اس کے سامنے نہیں ہے، اس کے سامنے صرف آپ کے الفاظ ہیں اس لئے خط میں الفاظ کا انتخاب احتیاط سے ہونا چاہئے۔ نیز لکھائی ایسی

ہو کہ وہ پڑھی جاسکے۔ نیز یہ کہ خط کی ترتیب ایسی ہو کہ اس میں کسی قسم کی الجھن نہ ہو۔

قلم کو کان پر رکھنا

(31) وعَن زيدِ بن ثابتٍ قالَ: دَخلتُ علَى النَّبيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّم وَبَيْنَ يَدَيهِ كاتِبٌ فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: "ضَعِ القَلَمَ عَلَى أُذُنِكَ فَإنَّهُ أَذْكَرُ لِلْمَآلِ. رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ وَفِي إِسْنَادِهِ ضَعفٌ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گیا اُس وقت آپ کے سامنے ایک لکھنے والا موجود تھا تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قلم کو اپنے کان پر رکھ لو اس لئے کہ یہ مآل کے یاد رکھنے میں زیادہ معاون ہے۔

پہلے یہ بات ذہن میں رکھیں جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح نہیں ہے، بلکہ اس میں خاصا ضعف ہے، اس لئے اس کی سند کے دو راوی ضعیف ہیں، اس حدیث کو ابن جوزی نے موضوع بھی قرار دیا ہے، تاہم چونکہ یہی مضمون بعض دیگر روایات میں بھی آیا ہے، مثلا حضرت انسؓ سے بھی اسی مضمون کی حدیث روایت کی گئی ہے، اگرچہ وہ بھی ضعیف ہے لیکن دونوں کے ملنے سے حدیث موضوع ہونے سے تو نکل جاتی ہے۔ تاہم اگر اس کو صحیح یا کسی درجے میں قابلِ قبول تسلیم کرلیں تو حدیث قابل تشریح ضرور ہے۔ اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔

ایک مطلب تو یہی ہے کہ قلم کو کان پر رکھنے سے مضمون کے یاد آنے میں اور اس کے ذہن میں منتقل ہونے میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ اب اس کی وجہ کیا ہے؟ تو ہوسکتا ہے کہ دونوں باتوں میں کوئی ایسا تعلق اور ربط ہو جو ابھی تک ہمیں سمجھ میں نہیں آیا۔

دوسرا مطلب بعض شارحین نے یہ بیان کیا ہے کہ بعض نسخوں میں اذکر للماٗل کی جگہ اُذْکرُ لِلْمُمْلِی ہے کہ لکھنے والے کو یاد کرانے کا ذریعہ ہے۔ زیادہ صحیح یہی لفظ معلوم ہوتا ہے، اس لئے یہاں یہ حدیث ترمذی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے اور ترمذی کے تقریبا تمام نسخوں میں مملی ہے۔ مملی کے معنی اگرچہ املا کرانے والے کے ہوتے ہیں لیکن یہاں زیادہ تر شارحین نے مجازاًخود لکھنے والا مراد لیا ہے۔ اور مطلب اس کا یہ بیان کیا ہے کہ قلم اگر کان پر کھ لیا جائے تو دوبارہ لکھنے لگیں گے تو قلم کو تلاش کرنے میں دقت پیدا نہیں ہوگی۔ اور اگر اِدھر اُدھر رکھ لیا جائے تو بعض اوقات دوبارہ کچھ لکھنا پڑتا ہے تو قلم کے تلاش کرنے میں ایک تو ذہنی الجھن ہوتی ہے اور دوسرے اس میں کچھ وقت بھی لگ جاتا ہے۔ اور یہ بڑے تجربے کی بات ہے کہ بعض اوقات آدمی لکھتے لکھتے قلم کہیں رکھ لیتا ہے، مثلاً لکھ رہا ہے درمیان میں کتابیں دیکھنی پڑ گئیں تو جب دوبارہ لکھنے لگا تو پتا نہیں چلتا کہ قلم کہاں رکھا ہے، کبھی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتا ہے کبھی کوئی کتاب اٹھا کر دیکھتا ہے شاید اس کے نیچے ہوگا۔ کبھی اپنے پاؤں کے نیچے دیکھتا ہے اور کبھی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ تو بعض دفعہ اس میں اچھا خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انتظام بیان فرمایا کہ کوئی چیز استعمال کرکے اس کو اس کی ایک مقررہ جگہ پر رکھو۔ یعنی جو چیز آپ کو بار بار استعمال کرنی پڑتی ہے اس کے رکھنے کے لئے ایک جگہ مقرر ہونی چاہئے اور اس کی عادت ڈالو کہ وہ چیز استعمال کرکے اپنی مقررہ جگہ پر ہی رکھو تاکہ دوبارہ اگر وہ چیز لینی پڑے تو ذہنی الجھن اور تشویش بھی نہ ہو اور اس کی تلاش میں وقت بھی ضائع نہ ہو۔ یہاں اگرچہ صرف قلم کا ذکر ہے لیکن ہر چیز کے اندر یہی اصول انسان کو اپنانا چاہئے اس سے وقت میں برکت ہوتی ہے اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو کسی قسم کی الجھن بھی نہیں۔ تو مقصد یہ ہے کہ قلم کی بھی ایک جگہ مقرر کرلو اور جب بھی استعمال کرو استعمال کرکے وہیں پر رکھو مثلاً آج کل قلم دان ہوتے ہیں تو اگر قلم دان رکھا ہوا ہے تو استعمال کرکے عادت ڈالو کہ قلم اسی میں رکھا جائے۔ یا دراز میں آپ نے کوئی جگہ مقرر کی ہوئی ہے تو عادت ڈالو کہ استعمال کرکے دراز میں رکھنا ہے اگر جیب میں یا گریبان پر لگانے کی عادت ہو تو اس کو پکا کرلو اور اگر کوئی اور جگہ نہیں تو کان کو پکا کرلو۔ کیونکہ یہ ایسا قلم دان ہے جو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس مطلب کا حاصل یہ ہوا کہ اُذْکر کا تعلق مضمون کے ساتھ نہیں ہے بلکہ قلم کے ساتھ ہے کہ قلم کو یاد کرنے میں کہ کہاں پہ رکھا ہوا ہوا آسانی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اس کا بالواسطہ اثر مضمون پر بھی پڑتا ہے اس لئے کہ بعض اوقات انسان کے ذہن میں مضمون کی تار بن جاتی ہے اور تھوڑا سا بھی ذہن اِدھر اُدھر مشوّش ہو جائے تار ٹوٹ جاتی ہے۔ اور یہ بات بھی تجربہ سے ہی سمجھ میں آتی ہے تو بہر حال حدیث اگرچہ سنداً ضعیف ہے لیکن اس کا جو معنی ہے اس کی تائید ایک تو شریعت کے عمومی مزاج سے ہو رہی ہے اور تجربات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت زید بن ثابت کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کا حکم

(٣٢) وَعَنْهُ قَالَ: أَمَرَنِي رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ أَتَعَلَّمَ السُّرْيَانِيَّةَ. وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّهُ أَمَرَنِي أَنْ أَتَعَلَّمَ كِتَابَ يَهُودَ وَقَالَ: «إِنِّي مَا آمَنُ يَهُودَ عَلَى كِتَابٍ» . قَالَ: فَمَا مَرَّ بِيَ نِصْفُ شَهْرٍ حَتَّى تَعَلَّمْتُ ، فَكَانَ إِذَا كَتَبَ إِلَى يَهُودَ كَتَبْتُ ، وَإِذَا كَتَبُوا إِلَيْهِ قَرَأْتُ لَهُ كِتَابَهُمْ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں سریانی زبان سیکھ لوں اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں یہودیوں کی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لوں۔ اور یہ فرمایا کہ مجھے یہودیوں پر خط و کتابت کے بارے میں اطمینان نہیں۔ تو حضرت زید فرماتے ہیں کہ مجھ پر آدھا مہینہ بھی نہیں گزرا کہ میں نے سریانی زبان سیکھ لی چنانچہ جب حضور اقدس ﷺ یہودیوں کی طرف خط لکھنے لگتے تو وہ خط میں لکھتا اور جب یہودی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خط لکھتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کا خط میں پڑھتا۔

کچھ یہود تو مدینہ منورہ کے ارد گرد آباد تھے یا مدینے میں آباد تھے اس کے علاوہ اور جگہوں پر بھی یہودی رہتے تھے یا ایسے لوگ رہتے تھے جن کی زبان سریانی تھی اور وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اوقات خط وغیرہ لکھتے

تو سریانی زبان میں لکھتے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُنہی کی زبان میں خط کا جواب دینا پڑتا اس کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر مدینے کے یہودیوں کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے کہ جب کوئی خط آیا تو کسی یہودی کو بلا لیا اور اس سے کہا کہ یہ خط پڑھ کر اس کا عربی میں ترجمہ ہمیں کر دو اور اس خط کا جواب دینا ہوتا تو بھی کسی یہودی کو اپنا مضمون بتادیتے اور یہ کہتے کہ اس کو سریانی زبان میں منتقل کر کے لکھ دو۔ یہ کام عام طور پر حضور اقدس ۔ ﷺ یہودیوں سے لیا کرتے۔ لیکن یہودی بہر حال یہودی ہیں، ان کی فطرت میں شرارت اور سازش ہے، اس لئے یہ خطرہ موجود تھا کہ جو خط آیا ہے اس کا مضمون کچھ اور ہو لیکن ترجمے میں کچھ گڑ بڑ کر دیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مطلب کچھ اور سمجھیں۔ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خط کا جواب اسے عربی میں بتاتے ہیں کہ سُریانی میں اس کا ترجمہ کر کے بھیج دو تو ہو سکتا ہے کہ ترجمہ کے اندر گڑ بڑ کر دیں۔ بعض اوقات ترجمے میں معمولی سی تبدیلی سے بات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ترجمے کے معاملے میں یہودیوں پر بے اعتمادی کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے حضرت زید بن ثابت سے اپنی یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ ان کی زبان سمجھنے والا ہمارا کوئی اپنا آدمی ہونا چاہئے تاکہ اس پر اطمینان ہو اور ان کی طرف سے جو خط آئے اس کا ترجمہ ٹھیک کرے اور جو جواب دینا ہو تو وہ بھی ٹھیک جواب دے ۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ چونکہ پہلے ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابت کا کام کر رہے تھے وحی بھی لکھا کرتے تھے اور چیزیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لکھا کرتے تھے اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی حکم دیا کہ ان کی زبان سیکھ لو تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ تو حضرت زید بن ثابت نے بڑی محنت کی اور صرف دو ہفتے میں ان کی زبان پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ ان کی طرف سے خط آئے تو اسے صحیح سمجھ بھی سکیں اور جواب دینا ہو تو ان کی زبان میں جواب لکھ بھی سکیں۔

زید بن ثابتؓ کو کونسی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا تھا:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کی مذہبی زبان تو عبرانی ہے، یہاں سریانی سیکھنے کا حکم فرمایا جا رہا ہے۔ دونوں باتوں میں بظاہر کوئی مطابقت نظر نہیں آرہی۔ اس بارے میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن میں رہے کہ اس

حدیث کو حضرت زید بن ثابتؓ سے دو حضرات روایت کر رہے ہیں۔ایک خارجہ بن زید بن ثابت، جو زید بن ثابتؓ کے صاحبزادے ہیں، دوسرے ثابت بن عبید۔ جہاں تک خارجہ کی روایت کا تعلق ہے تو اس میں کہیں کسی زبان کی تعیین کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔اس کا مضمون صرف اس قدر ہے کہ آں حضرت ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے خط وکتابت کے معاملے میں یہودیوں پر اعتماد نہیں ہے،اس لئے تم ان کا لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔ابو داؤد کی ایک روایت کے لفظ یہ ہیں: "أمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم فتعلمت له كتاب يهود، وقال: «إني والله ما آمن يهود على كتابي» فتعلمته" اس میں یہ تو ہے کہ زید بن ثابتؓ نے ان کا لکھنا پڑھنا سیکھ لیا، لیکن کونسی زبان میں، اس کا ذکر نہیں ہے۔ جبکہ ثابت بن عبید کی روایت میں یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس لوگوں کے خطوط آتے ہیں، اس لئے کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم سریانی زبان سیکھ لو۔ چنانچہ زید بن ثابتؓ نے سترہ دن میں یہ زبان سیکھ لی۔ ثابت بن عبید سے نیچے اکثر راویوں نے تو سریانی زبان کا ذکر کیا ہے، تاہم ابن ابی داؤد کی کتاب المصاحف کی ایک روایت میں تردد کے ساتھ ہے "سریانی یا عبرانی"۔اب پہلی روایت یعنی خارجہ کی روایت کے مطابق تو سرے سے اس نوعیت کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اس میں کسی زبان کی تعیین نہیں ہے۔ جہاں تک دوسری روایت کا تعلق ہے تو یہاں ایک سوال قابلِ بحث یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے یا الگ الگ۔ امکان دونوں ہی ہیں۔ الگ واقعہ ہونے کا ایک قرینہ یہ ہو سکتا ہے کہ خارجہ کی روایت میں "کتاب یہود" کے لفظ ہیں، یعنی یہود کا لکھنا پڑھنا، اس میں کسی خاص زبان کی تعیین نہیں ہے۔ جبکہ ثابت کی روایت میں زبان کی تعیین تو ہے، جو اکثر روایات کے مطابق سریانی ہے، لیکن اس میں یہودیوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف اتنا ہے کہ میرے پاس لوگوں کے خطوط آتے ہیں، جن کے بارے میں میں نہیں چاہتا کہ وہ ہر ایک کے علم میں آئیں، اس لئے تم سریانی زبان سیکھ لو۔ مثلاً مسند ابن ابی شیبہ کے لفظ اس روایت میں یہ ہیں: «إنه يأتيني كتب من الناس ولا أحب أن يقرأها كل أحد، فهل تستطيع أن تتعلم كتاب السريانية؟»۔ نیز پہلی روایت میں دو ہفتے سے بھی کم وقت میں زبان سیکھنے کا ذکر ہے، جبکہ دوسری میں سترہ (یا بعض روایات میں انیس) دن میں سیکھنے کا ذکر ہے۔ حاصل یہ کہ ایک روایت میں یہودیوں کا ذکر ہے لیکن

زبان کا ذکر نہیں ہے اور دوسری میں زبان کی تعیین ہے لیکن یہودیوں کا حوالہ نہیں ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہودیوں کی زبان سیکھنے کا کہا ہو اور وہ انہوں نے دو ہفتے سے کم وقت میں سیکھ لی ہو اور بعد میں رومیوں اور شام و عراق کی طرف کے سربراہاں وغیرہ کے بالخصوص مسیحی لوگوں کے خطوط آنے لگے ہوں جو سریانی زبان میں ہوتے تھے اس لئے آپ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو دوبارہ سریانی زبان سیکھنے کا کہا ہو اور وہ انہوں نے سترہ یا انیس دن میں سیکھ لی ہو۔ جب زید بن ثابت کی خارجہ بن زید کے سامنے بات ہو رہی ہو اس وقت موقع محل کے مناسب یہودیوں کی زبان سیکھنے کا تذکرہ ہو اور جب ثابت بن عبید وغیرہ سے بات ہو رہی ہو تو سریانی کا تذکرہ موقع محل کے زیادہ لائق ہو۔ بہر حال الگ واقعات ہونے کے امکان کو بالکلیہ مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس صورت میں مذکورہ بالا اشکال سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ سریانی زبان سیکھنے کا یہودیوں کے ساتھ براہِ راست تعلق نہیں ہے۔

تاہم اگر ایک ہی واقعہ قرار دیں تو مطلب یہ ہوگا کہ خارجہ کی روایت میں یہودیوں پر بے اعتمادی کی وجہ سے جس زبان کے سیکھنے کا ذکر ہے اس سے مراد سریانی زبان ہے۔ گویا ثابت کی روایت خارجہ کی روایت کی تشریح کر رہی ہے۔ اس احتمال کو لینے کی صورت میں واقعی مذکورہ بالا سوال پیدا ہوگا کہ یہودیوں کی زبان تو عبرانی تھی، اس لئے بظاہر حضرت زید کو بھی عبرانی سیکھنے کا امر فرمانا چاہئے تھا۔ تو بات اصل میں یہ ہے کہ عربی، آرامی، سریانی اور عبرانی یہ سب کی سب زبانوں کے ایک ہی قبیلے یعنی سامی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ عبرانی خاصی قدیم زبان ہے اور ایک زمانے میں بنی اسرائیل کی عام بول چال کی زبان بھی رہی، لیکن آہستہ آہستہ عام بول چال میں یہ زبان متروک ہو گئی، البتہ یہودیوں میں اس کی مذہبی اہمیت ہمیشہ برقرار رہی۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی یہودیوں کی یہ مذہبی زبان تھی اور ان کا زیادہ تر مذہبی لٹریچر اسی زبان میں تھا۔ تاہم جزیرہ عرب کے شمال میں اور عراق و شام کے بہت سے علاقوں میں صدیوں سے عام زندگی میں سریانی زبان مروج تھی، اور یہودیوں کے ان علاقوں سے تاریخی تعلقات بھی تھے، نیز وہ چونکہ پڑھے لکھے لوگ بھی تھے اس لئے یہ بات بعید نہیں ہے کہ ان میں کم از کم کچھ لوگ ایسے ہوں جو

سریانی زبان لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔اس لئے مذکورہ علاقوں سے حضور اقدس ﷺ کی جو خط و کتابت ہوتی ہو اس کے لئے ابتدا میں آپ یہودیوں کی خدمات حاصل کرتے ہوں، لیکن بعد میں آنحضرت ﷺ نے زید بن ثابتؓ کو خود یہ زبان سیکھنے کا حکم فرمادیا ہو۔

غیر مسلموں کی زبان سیکھنے کا حکم:

اس حدیث کے تحت بعض حضرات نے یہ مسئلہ چھیڑا ہے کہ کفار کی زبان سیکھنے کا کیا حکم ہے۔آج کل تو اتنی زیادہ بحث اس پر نہیں ہوتی لیکن کسی زمانے میں جب شروع شروع میں انگریزی تعلیم مروّج ہوئی تو اس مسئلہ پر کافی بحث ہوتی رہی ہے۔عام طور پر معروف لوگوں میں یہ ہے کہ مولویوں نے ابتدا میں انگریزی کو حرام قرار دے دیا تھا لیکن بعد میں عملی طور پر ان کا فتوی چلا نہیں اس لئے یہ خود اپنے فتوے میں ڈھیلے پڑ گئے۔اور یہ کہ مولویوں کا کام ہی یہ ہے کہ بغیر سوچے سمجھے فتویٰ دے دیتے ہیں پھر وہ چلتا نہیں ہے اس لئے فتویٰ بدل بھی لیتے ہیں۔کہتے ہیں کہ پہلے لاؤڈ اسپیکر کو حرام قرار دیا تھا اور بعد میں سب سے زیادہ استعمال ہی مولوی کرتے ہیں۔

اس کے بارے میں ضمناً ویسے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے۔اصل میں جہاں یہ اشکال ہوتا ہے فتویٰ بدلنے کا ایک تو ویسے ہی رائے بہر حال بدل سکتی ہے اور شروع سے چلا آرہا ہے علما میں کہ اپنی رائے سے رجوع بھی کر لیا کرتے ہیں۔صحابہ نے بہت سے مسائل میں اپنی رائے سے رجوع کیا۔ائمہ مجتہدین نے رجوع کیا۔امام ابو حنیفہ کے بارے میں آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ پہلے اُن کا یہ فتویٰ تھا لیکن بعد میں جب دوسری طرف کے دلائل سامنے آئے تو رجوع کر لیا علمی دنیا میں یہ اتنی کوئی بڑی بات نہیں ہے۔دوسری بات جو علامہ شبیر احمد عثمانی فرمایا کرتے تھے کہ جب یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ فتویٰ بدل گیا حقیقت میں فتویٰ نہیں بدلا ہوتا بلکہ صورتِ حال بدلی ہوتی ہے کہ ایک وقت میں صورت حال کچھ اور ہوتی ہے۔خیر عام لوگوں کے مذکورہ شکوے میں کچھ مبالغہ بھی ہے، لیکن کچھ حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔کسی نئی چیز میں پہلی مرتبہ رائے قائم کرتے ہوئے حال اور مستقبل کے حوالے سے صورتِ حال پوری گہرائی کے

ساتھ تمام پہلوؤوں سے دیکھنا چاہیئے۔

انگریزی سیکھنے کے بارے میں جس طرح عام طور پر کہا جاتا ہے معاملہ یوں نہیں ہے۔ بلکہ شروع ہی سے علما نے مسئلہ یہ بیان کیا کہ زبان کوئی بھی ہو وہ بحیثیت زبان مذموم اور بری نہیں ہے۔ اس لئے کہ ساری کی ساری زبانیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ ومن اٰیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم کہ زبانوں کا مختلف ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے۔ لہٰذا کوئی بھی زبان اپنی ذات کے اعتبار سے بحیثیت زبان بری نہیں ہے یہ ساری کی ساری چیزیں اپنے ذہنی خیالات اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ زبان تو ایک ظرف ہے اور اصل چیز ظرف نہیں ہوتی بلکہ وہ مظروف ہوتا ہے جو ظرف کے اندر ڈالا جائے۔ پیالی کے اندر چائے ہے تو وہ حلال ہے اور اگر اسی پیالی کے اندر شراب ہے تو وہ حرام ہے۔ اس لئے زبان کے ذریعے سے جن باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے وہ اگر درست ہیں تو زبان کوئی بھی ہو ٹھیک ہے اور اگر وہ باتیں غلط ہیں کوئی زبان بھی ہو وہ غلط ہیں۔ اب اگر کفریہ باتیں ہوں اور وہ عربی زبان میں ہوں تو وہ غلط ہی رہیں گی۔ جیسے حضرت تھانوی (رح) کے مواعظ میں آتا ہے کہ ایک صاحب نماز پڑھا رہے تھے، ایک جگہ پر وہ بھول گئے۔ تیسری رکعت تھی کھڑا ہونا تھا لیکن غلطی سے وہ بیٹھ گئے۔ لقمہ دینے کا معروف طریقہ وہی ہے کہ سبحان اللہ کہہ دیا جائے۔ لیکن پیچھے کسی مدرسے کے ایک طالب علم کھڑے تھے انہوں نے کہا قم۔ بعد میں امام صاحب نے ان سے کہا کہ آپ نے قم کیوں کہا۔ اس طرح کہنے سے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ میں نے نور الایضاح، قدوری میں پڑھا ہے کہ نماز کلام الناس سے ٹوٹتی ہے تو گویا کلام الناس کا وہ مفہوم یہ سمجھے تھے کہ جو غیر عربی میں ہو وہ کلام الناس ہے اور جو عربی میں ہو وہ کلام اللہ ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کوئی زبان اپنی ذات کے اعتبار سے بری اور مذموم نہیں ہے۔ ہاں البتہ دو چیزوں سے حکم مختلف ہو جائے گا۔ (۱) ایک تو نیت سے کہ اگر تو آپ یہ کام مباح نیت سے کر رہے ہیں تو زبان سیکھنا بھی مباح رہے گا۔ مثلاً آپ کوئی زبان سیکھ رہے ہیں حلال روزگار حاصل کرنے کے لئے تو کوئی حرج کی بات نہیں مباح ہے۔ اور اگر آپ سیکھتے ہیں بری نیت سے تو وہ سیکھنا گناہ ہوگا اور اگر زبان سیکھنے میں کوئی نیت محمود ہے تو زبان سیکھنا بھی

محمود ہو جائے گا۔ ﴿۲﴾ دوسری چیز ہے اس کے نتائج اور اثرات کہ اس زبان سیکھنے کے اثرات اور نتائج کیا ہوں گے۔ اگر نتائج اس کے مباح ہیں تو اس کا سیکھنا بھی مباح ہوگا۔ اور اگر نتائج اس کے محمود ہیں تو اس کا سیکھنا محمود ہوگا۔ اور اگر اس کے نتائج اور اثرات مذموم ہیں تو پھر ان برے اثرات سے بچنے کی بھی اگر کوشش کی جاتی ہے پھر تو اس کا سیکھنا جائز ہوگا لیکن اگر اس پر برے اثرات کا مرتب ہونا یقینی یا مظنون ہے یعنی اس کا ظن غالب ہے اور ان اثرات سے بچنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی گئی تو اس صورت میں یہ زبان سیکھنا مذموم ہوگا۔ یہ حکم عربی سمیت کسی بھی زبان کا ہو سکتا ہے۔ یہی حکم علما نے انگریزی زبان پر لگایا۔ کوئی خاص حکم جو صرف انگریزی زبان کے ساتھ مخصوص ہو وہ نہیں لگایا۔ چنانچہ امداد الفتاویٰ کی چھٹی جلد میں بڑا مفصل فتویٰ اس کے بارے میں موجود ہے اور بوقتِ ضرورت اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ اور لُبِّ لباب یہی ہے جو میں نے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا۔ یہی حکم دنیا کی اور زبان سیکھنے کا ہے۔ مذکورہ بالا اصول سے بظاہر کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا، اور یہ اصول ہر زبان کے لئے ہے، صرف انگریزی کے لئے نہیں ہے۔ تاہم امرِ واقعہ پر اس اصول کے اطلاق کے حوالے سے کئی آراء ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اس اصول کا ایک حصہ اثرات و نتائج کو دیکھنا ہے۔ تو انگریزی یا کوئی بھی مغربی زبان سیکھنے کے اثرات و نتائج کو علما نے اُس وقت جس انداز سے دیکھا ہو سکتا ہے کہ بعض مفکرین اسی چیز کو اور زاویے دیکھتے ہوں۔

اصل مسئلہ زبان کا نہیں، نظامِ تعلیم کا تھا:

البتہ یہ بات جو مشہور ہوئی کہ علما نے انگریزی سیکھنے کی مخالفت کی تھی تو اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ وہ یہ کہ اصل میں انگریزوں کے دور میں برصغیر کے اندر جو نظامہائے تعلیم چل رہے تھے ان میں تین نظامِ تعلیم سر فہرست رہے ہیں۔ ﴿۱﴾ ایک وہ نظام تعلیم جس کی نمائندگی دیوبند کر رہا تھا ﴿۲﴾ دوسرا وہ تھا جس کی نمائندگی ندوہ کر رہا تھا اور ﴿۳﴾ تیسرا وہ ہے جس کی نمائندگی علی گڑھ کر رہا تھا۔ ان تین نظاموں پر تفصیل سے گفتگو کرنا ہمارا براہِ راست موضوع بحث نہیں ہے۔ البتہ اجمالاً سمجھ لیجئے کہ ان کے بارے میں بہترین تبصرہ وہ ہے جو اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے کیا ہے۔ وہ یہ کہ دیوبند کی مثال ایسی ہے جیسے کسی جسم کے اندر دل ہوتا ہے (دِلِ ہوشمند) اور ندوہ کی مثال زبان کی

ہے اور علی گڑھ کی مثال پیٹ کی ہے۔ایک نے دل کی خدمت کی اور ایک نے زبان کو بنایا سنوارا، اور ایک نے پیٹ کا مسئلہ حل کرنے کی فکر کی۔اگر اپنی ذات کے اعتبار سے دیکھیں تو تینوں چیزوں کی اپنی اپنی جگہ ضرورت ہے۔اس لئے کہ اگر دِل نہ ہو تو سب کچھ ختم۔جس طرح انسانی جسم کے اندر اگر دل نہ ہو تو انسانی جسم بے روح ہو جاتا ہے۔اسی طرح اگر ملت اور امت کے اندر دل موجود نہ ہو تو وہ ملت بھی ختم ہو سکتی ہے۔اس کی کوئی شناخت اور وجود نہ رہے گا۔ زبان کی بھی بہر حال ضرورت ہے اور پیٹ کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔یہ صحیح ہے کہ پیٹ مقصود لذاتہ نہیں ہے لیکن مقصود بالغیر ضرور ہے اس لئے کہ اگر پیٹ کا مسئلہ حل نہ ہو تو دل بھی صحیح طرح کام نہیں کرتا وہ بھی جواب دے دیتا ہے۔ اس لئے اس حد تک یہ جو تینوں نظام ہائے تعلیم ہیں انہوں نے اپنے اپنے دائرے کے اندر مسلمانوں کی خدمت کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی خدمت کی۔اور اپنے اپنے دائرے میں اس کے فوائد تھے کہ ایک کی وجہ سے ملت کو زبان ملی اور ایک کی وجہ سے اس ملت کے پیٹ کا مسئلہ حل ہوا۔ و گرنہ ظاہر ہے کہ ایک طرف تو آزادی کی کوشش کی جارہی تھی لیکن اگر سارے کے سارے مسلمان مولوی بن جاتے دنیا کی کوئی اور چیز کوئی اور علم کسی نے بھی حاصل نہ کیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ آزادی کے نتائج حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا اور سب کے سب ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوتے۔اس لئے اس حد تک تو تینوں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں اور اپنا اپنا دائرہ کار ہے اور ان میں سے کسی کی بھی افادیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ہاں البتہ جس شعبے نے یا جس نظام تعلیم نے جس ضرورت کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے طریقہ کار کیا اختیار کیا اس پر بحث ہو سکتی ہے۔بنیادی مقصد پر بحث نہیں۔یہ نہیں کہتے کہ زبان کی طرف توجہ نہیں ہونی چاہئے تھی یا پیٹ کے مسئلہ کی طرف توجہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔بلکہ ہم تو کہتے ہیں کاد الفقران یکون کفرا۔اور یہ وہی بات ہے جو میں نے پہلے کہی تھی کہ اگر پیٹ نہ ہو تو دل بھی جواب دے دیتا ہے اسی کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا کادا الفقر ان یکون کفرا۔اور واقعتاً یہ حقیقت ہے کہ اگر روٹی کا مسئلہ حل نہ ہو تو ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں روٹی مل رہی ہو لگتا ہے ایمان بڑا پکا ہے لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ ہم جیسے کمزوروں سے امتحان نہ ہی لیں تو اچھا ہے۔بہر حال ان تینوں کاموں اور تینوں مقاصد میں سے کسی کو بھی غیر اہم قرار دینا اس کا انکار کرنا مقصود نہیں ہے۔اس پر بحث ہو ہی نہیں سکتی تھی تینوں کی ضرورت تھی اور اس میں بھی کوئی قباحت نہیں تھی کہ تینوں کاموں کے

لئے الگ الگ لوگ اپنا میدان سنبھال لیتے اور تقسیم کار ہو جائے۔اس نے سوچا کہ میں پیٹ کا مسئلہ حل کروں گا، دوسرے نے سوچا کہ میں دل کا مسئلہ حل کروں گا تیسرے نے سوچا کہ میں زبان کا مسئلہ حل کروں گا۔ لیکن بحث اس میں ضرور ہو سکتی ہے کہ جس مقصد یا جس شعبہ کو آپ نے اختیار کیا ہے اس میں طریقہ کار آپ کا کیا ہے۔اس میں بحث دیوبند پر بھی ہو سکتی ہے،ندوہ پر بھی ہو سکتی ہے۔علما کو جو اعتراض تھا علی گڑھ کے سلسلہ تعلیم پر وہ اصل اعتراض یہ نہیں تھا کہ وہ دنیوی تعلیم کیوں دے رہا ہے، مسلمانوں کو دنیوی علوم سے آشنا کیوں کر رہا ہے۔ بلکہ اصل اعتراض طریقہ کار پر تھا کہ طریقہ کار ایسا ہے جس کی وجہ سے خطرہ ہے کہ پیٹ کا مسئلہ حل کرتے کرتے دل کا کام خراب نہ ہو جائے۔اسی طرح دیوبند پر اگر کسی کو تحفظات تھے تو عموما اس حوالے سے نہیں تھے کہ دین کا علم حاصل ہی نہیں کرنا چاہئے، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے کہ دل کی فکر کرتے کرتے کہیں پیٹ کا معاملہ ہی نہ گڑبڑ ہو جائے۔

مجلس کے اختتام پر بھی سلام

(۳۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِذَا انْتَهَى أَحَدُكُمْ إِلَى مَجْلِسٍ فَلْيُسَلِّمْ فَإِنْ بَدَا لَهُ أَنْ يَجْلِسَ فَلْيَجْلِسْ ثُمَّ إِذَا قَامَ فَلْيُسَلِّمْ فَلَيْسَتِ الْأُولَى بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ» رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی مجلس کے پاس پہنچے تو اسے چاہئے کہ سلام کرے پھر اگر اس کا ارادہ بنے کہ وہ بیٹھ جائے تو بیٹھ جائے پھر جب وہاں سے اٹھے تو اسے چاہئے کہ سلام کرے؛ اس لئے کہ پہلا سلام بعد والے سلام کی نسبت زیادہ اولی نہیں ہے (بلکہ برابر ہیں)۔

جب کسی مجلس کے پاس پہنچے تو یہ چونکہ مسلمانوں سے لقا ہو رہی ہے، اس لئے اس موقعہ پر سلام کرنا چاہئے، لیکن انہیں اصولوں کے مطابق جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ تو جب مجلس کے پاس پہنچو تو سلام کرو، اس کے بعد اگر تمہارا وہاں بیٹھنے کا ارادہ نہیں گزرنے کا ہی ارادہ ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اور اگر وہاں بیٹھنے کا ارادہ ہے تو جب وہاں سے اٹھ کر آنے لگو تو اس وقت دوبارہ سلام کرو، سلامِ وداع کرو۔ یہ اس لئے فرمایا کہ عام طور پر ذہنوں میں سلامِ لقا کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے، اور سلام وداع کی نہیں ہوتی۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ جس طرح سلامِ لقا اہم ہے اسی طرح سلام وداع بھی اہم ہے۔ سلامِ لقا میں دوسرے مخاطب کو یا چلنے والے مسلمان کو یہ اطمینان دلانا مقصود ہوتا ہے کہ تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے تو اس کی ضرورت وداع کے اندر بھی ہے کہ کسی مجلس سے اٹھ کر جا رہے ہیں اور مجلس والوں کے ذہن میں یہ آسکتا ہے کہ پتا نہیں کہ کیوں اٹھ کر چلے گئے ہیں، پتا نہیں ہماری باتیں جو یہاں پر ہو رہی ہیں راز کی بھی بعض باتیں تھیں یہ باتیں یہ باہر جا کر پھیلائے گا، پتا نہیں یہ کیا کرے گا، کیا کہے گا، لیکن جب رخصت ہوتے وقت السلام علیکم کہے گا تو اپنی طرف سے ان کو سلامتی کا پیغام دے رہا ہے، گویا اطمینان دلا رہا ہے۔ لیکن سلامِ وداع کے اندر بھی وہی بات ہے کہ اگر موقعہ محل ہو تو کرنا چاہئے اگر موقعہ محل نہ ہو تو نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً بیان ہو رہا ہے، وعظ ہو رہا ہے یا اسی طرح کی کسی خاص چیز کی طرف لوگ متوجہ اور اس میں مصروف ہیں اس صورت میں اگر آپ اٹھ کر آئیں گے اور سلام بھی کریں گے تو ظاہر ہے کہ ساتھیوں کو تشویش ہوگی تو ایسے موقعے پر سلام نہیں کرنا چاہئے۔

راستے میں بیٹھنا ہو تو کیا کرنا چاہئے

(٣٤) وَعَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا خَيْرَ فِي جُلُوسٍ فِي الطُّرُقَاتِ إِلَّا لِمَنْ هَدَى السَّبِيلَ ، وَرَدَّ التَّحِيَّةَ ، وَغَضَّ الْبَصَرَ ، وَأَعَانَ عَلَى الْحُمُولَةِ» رَوَاهُ فِي «شَرْحِ السُّنَّةِ» وَذُكِرَ حَدِيثُ أَبِي جُرَيٍّ فِي «بَاب فضل

الصَّدَقَة».

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ راستوں میں بیٹھنے میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے ان لوگوں کے جو لوگوں کو راستے بتائیں ،سلام کا جواب دیں، نظر کو بچا کر رکھیں اور سامان اٹھانے میں مدد کرائیں۔

یہ وہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ اول تو راستوں میں بیٹھنا نہیں چاہئے اور اگر بدرجہ مجبوری بیٹھنا پڑ جائے تو پھر ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے جن میں سے کچھ باتیں پہلے گزر چکیں اور کچھ باتیں اس میں نئی بھی آ گئی ہیں۔

الفصل الثالث

(٣٥) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَمَّا خَلَقَ اللهُ آدَمَ وَنَفَخَ فِيهِ الرُّوحَ عَطَسَ فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ ، فَحَمِدَ اللهَ بِإِذْنِهِ، فَقَالَ لَهُ رَبُّهُ: يَرْحَمُكَ اللهُ يَا آدَمَ ، اذْهَبْ إِلَى أُولَئِكَ الْمَلَائِكَةِ ، إِلَى مَلَإٍ مِنْهُمْ جُلُوسٍ فَقُلِ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ. فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ. قَالُوا: عَلَيْكَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ. ثُمَّ رَجَعَ إِلَى رَبِّهِ فَقَالَ: إِنَّ هَذِهِ تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ بَنِيكَ بَيْنَهُمْ. فَقَالَ لَهُ اللهُ وَيَدَاهُ مَقْبُوضَتَانِ: اخْتَرْ أَيَّتَهُمَا شِئْتَ؟ فَقَالَ: اخْتَرْتُ يَمِينَ رَبِّي وَكِلْتَا يَدَيْ رَبِّي يَمِينٌ مُبَارَكَةٌ ، ثُمَّ بَسَطَهَا ، فَإِذَا فِيهَا آدَمُ وَذُرِّيَّتُهُ فَقَالَ: أَيْ رَبِّ مَا هَؤُلَاءِ؟ قَالَ:

هَؤُلَاءِ ذُرِّيَّتُكَ فَإِذَا كُلُّ إِنْسَانٍ مَكْتُوبٌ عُمْرُهُ بَين عَيْنَيْهِ ، فَإِذا فيهم رجلٌ أضوؤهُم - أَوْ مِنْ أَضْوَئِهِمْ - قَالَ: يَا رَبِّ مَنْ هَذَا؟ قَالَ: هَذَا ابْنُكَ دَاوُدُ وَقَدْ كَتَبْتُ لَهُ عُمْرَهُ أَرْبَعِينَ سَنَةً. قَالَ: يَا رَبِّ زِدْ فِي عُمْرِهِ. قَالَ: ذَلِكَ الَّذِي كَتَبْتُ لَهُ. قَالَ: أَيْ رَبِّ فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُ لَهُ مِنْ عُمْرِي سِتِّينَ سَنَةً. قَالَ: أَنْتَ وَذَاكَ. قَالَ: ثُمَّ سَكَنَ الْجَنَّةَ مَا شَاءَ اللهُ ثُمَّ أُهْبِطَ مِنْهَا وَكَانَ آدَمُ يَعُدُّ لِنَفْسِهِ فَأَتَاهُ مَلَكُ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُ آدَمُ: قَدْ عَجَّلْتَ قَدْ كَتَبَ لِي أَلْفَ سَنَةٍ. قَالَ: بَلَى وَلَكِنَّكَ جَعَلْتَ لِابْنِكَ دَاوُدَ سِتِّينَ سَنَةً فَجَحَدَ فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ وَنَسِيَ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ " قَالَ: «فَمن يؤمئذ أَمر بِالْكتاب وَالشُّهُود» رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اوران میں روح ڈالی تو انہی چھینک آئی۔ تو انہوں نے الحمد للہ کہا تو انہوں نے اللہ کی حمد کی اللہ کی توفیق کے ساتھ۔ تو ان کے رب نے ان سے کہا یرحمک اللہ یا اٰدم، اے آدم تم پر اللہ کی رحمت ہو (گویا انہیں بتادیا کہ الحمد للہ کے جواب میں کیا کہنا چاہئے) تم ان فرشتوں کی طرف جاؤیعنی فرشتوں کی اس جماعت کی طرف جاؤ جو بیٹھے ہوئے ہیں اور کہو السلام علیکم تو انہوں نے وہاں جاکر السلام علیکم کہا، انہوں نے جواب میں کہا علیک السلام ورحمۃ اللہ۔ پھر آدم علیہ السلام اپنے رب کی طرف لوٹ کر آئے تو اللہ تعالیٰ نے کہا یہ تمہارا تحیہ ہے اور تمہاری اولاد کا آپس میں تحیہ ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا اس حالت میں کہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ بند تھے (جیسے مٹھی بند کرلی جاتی ہے) کہ ان دونوں میں جو چاہو چن لو، انہوں نے کہا کہ میں اپنے رب کے یمین (دائیں) کو چنتا ہوں جبکہ میرے رب کے دونوں ہاتھ ہی بابرکت ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس مٹھی کو کھولا تو اس مٹھی میں آدم بھی تھے اور آدم کی ذریت بھی تھی۔ اس پر آدم علیہ السلام نے کہا اے میرے رب یہ کون ہیں، تو اللہ تعالیٰ

نے فرمایا کہ یہ تمہاری اولاد ہے۔ تو یہ دیکھتے ہیں کہ ہر انسان کی عمر اس کی آنکھوں کے درمیان لکھی ہوئی ہے، (یعنی اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی ہے) تو آدم ان میں ایک آدمی پاتے ہیں جو سب سے روشن تھا یا یوں کہا کہ جو سب سے روشن تھے ان میں سے ایک تھا تو آدم نے کہا اے میرے رب یہ کون ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارا بیٹا داؤد ہے اور میں نے اس کی عمر چالیس سال لکھی ہے۔ آدم علیہ السلام نے کہا اے میرے رب اس کی عمر میں اضافہ کر دیجئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ وہ عمر ہے جو میں نے اس کے لئے مقرر کر دی ہے (اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی) تو آدم علیہ السلام نے کہا اے میرے رب میں نے ان کے لئے اپنی عمر کے ساٹھ سال کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم جانو اور وہ جانے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر آدم جنت میں قیام پذیر ہو گئے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر ان کو جنت سے اتار دیا گیا اور وہ اپنے لئے عمر کو شمار کرتے رہے (کہ میری اتنی عمر تھی اور اتنے سال گزر گئے) تو ان کے پاس ملک الموت آئے تو آدم علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ (تم جلدی آگئے ہو) میری عمر ہزار سال لکھی گئی تھی (اور تم ۹۴۰ سال گزرنے کے بعد آگئے ہو) فرشتے نے کہا کیوں نہیں (یعنی واقعتاً عمر تو آپ کی اتنی ہی لکھی گئی تھی) لیکن آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو ساٹھ سال دے دیئے تھے۔ تو آدم علیہ السلام بھی منکر ہو گئے اور ان کی اولاد بھی انکار کرنے لگ گئی اور آدم بھی بھول گئے اور ان کی اولاد بھی بھولنے لگ گئی، اسی وجہ سے اس دن سے حکم دیا گیا لکھنے اور گواہ بنانے کا (کہ یہ مخلوق ایسی ہے جو بھولتی بہت ہے اس لئے جب بھی کوئی معاملہ ہو خاص طور پر طویل عرصے کا معاملہ ہو اس کو لکھ لیا کرو اور گواہ بھی بنا لیا کرو)۔

حدیث کا بنیادی مضمون تو بالکل واضح ہے اور یہ حدیث یہاں پر اس لئے لائی گئی ہے کہ اس میں سلام کا ذکر ہے اور حدیث کے اس حصے کی تشریح پہلے بھی ہو چکی ہے۔ البتہ چند باتیں اس میں چھوٹی چھوٹی اور ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں سے کیا مراد ہے:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں تذکرہ آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے

مٹھی کی طرح بند کیاہوا تھااس سے کیامراد ہے۔یہ دراصل صفاتِ متشابہہ میں سے ہے اور صفات متشابہہ میں اہل سنت والجماعت کااصل مذہب تعطیل اور تجسیم دونوں کی نفی ہے۔دونوں کی نفی کرتے ہوئے ان صفات کے بارے میں اہل سنت والجماعت نے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں۔جن میں سے سب سے احوط اور اسلم سلف کا طریقہ ہے کہ تفویض سے کام لیاجائے اوران کے معانی سے بحث ہی نہ کی جائے کہ کیامراد ہے اور کیساہاتھ ہے؟اس لئے ہم بھی اس پر عمل کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کادایاں اور بایاں:

آگے یہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام نے یہ کہاکہ میں اللہ تعالیٰ کے یمین کو منتخب کرتاہوں۔اختیار دیا گیا تھاچاہو تو یہ لے لو یا یہ لے لو توانہوں نے اللہ تعالیٰ کے یمین کو منتخب کیا۔ید سے جو بھی اللہ تعالیٰ کی مراد ہے اور وہ ید جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے اسی طرح یمین سے مراد کیاہے تواللہ اور رسول ہی جانتے ہیں کہ کیامراد ہے بہر حال یمین بھی ایسے ہی ہوگا جواللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ باقی اس سے زیادہ تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔لیکن اس کے ساتھ آدم نے ایک جملہ بولا وکلتایدی ربی یمین مبارکہ کہ اللہ تعالیٰ کے یمین کو میں منتخب کررہاہوں ویسے اللہ تعالیٰ کے دونوں ید یمین اور مبارک ہیں۔۔اس جملے میں دواحتمال ہیں۔ایک یہ کہ یہ بھی آدم علیہ السلام کاہی جملہ ہے اور دوسرااحتمال یہ ہے کہ یہ جملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایاہے کہ آدم نے یہ کہاکہ میں اللہ کے یمین کو منتخب کرتاہوں توجس کو بھی کہالیکن دوسراجوید اللہ تعالیٰ کا تھاوہ بھی بہر حال یمین ہی تھا یہ جملہ کس لئے کہا؟اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یمین کہنے سے یہ شبہ ہو سکتاہے کہ اللہ تعالیٰ کادوسرا ید یسار ہوگا اور عام طور پر بایاں ہاتھ اضعف ہوتاہے بہ نسبت دائیں کے اور بایاں ہاتھ انقص ہوتاہے بہ نسبت دائیں کے تواس سے اللہ تعالیٰ کے ید کی طرف یاان کی ایک صفت کی طرف نقص اور ضعف کی نسبت کا شائبہ ہو سکتا تھا۔نسبت لازم تو نہیں آتی لیکن اس کا شائبہ ہو سکتا تھا اس لئے یہ کہہ دیاکہ یہ بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے جو دونوں ید ہیں وہ دونوں ہی کامل ہیں۔کسی میں نقص نہیں ہے۔

بعض نے اس کی تشریح میں یہ بھی فرمایاہے کہ یہ جملہ اس لئے بولا کہ یمین کے لفظ سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہاں جو ید کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد ید الجارحۃ ہے یعنی وہ ہاتھ جو انسان کا ایک عضو ہوتا ہے یا کسی کا بھی ایک عضو ہوتا ہے تو اللہ تعالی کا بھی اسی طرح کا عضو ہے، کیونکہ یمین ویسار کا جو سوال ہوتا ہے عام طور پر وہ عضو کے بارے میں ہی ہوتا ہے کہ ایک دائیں طرف ہے اور ایک بائیں طرف ہے تو اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہاں ید الجارحۃ مراد ہے یعنی ہمارے جیسا عضو مراد ہے حالانکہ جس طرح ہمارا عضو ہوتا ہے اسی طرح کا کوئی عضو نہیں ہے۔ تو یمین کے لفظ سے یہ شائبہ ہو سکتا تھا کہ یسار بھی ہوگا اور یمین ویسار عام طور پر ہوتے ہیں جوارح کے اندر اس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہاں ید سے مراد بھی جارحہ ہے تو اس کو زائل کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ یہاں جارحہ مراد نہیں بلکہ یہاں صفت مراد ہے یہ کہہ دیا کلتا یدی ربی یمین مبارکہ۔

باقی یہاں ایک بات ہے کہ بعض روایات ایسی ہیں جن میں اللہ تعالی کے دو ید کا ذکر ہے یمین ویسار کا بھی ذکر ہے۔ لیکن جہاں پر وہ آئیں گی وہاں پر ان کی تشریح کر لیں گے۔

آدم کی ذریت کیسی تھی؟

اللہ تعالی نے اپنی مٹھی کھولی جیسی مٹھی اللہ تعالی کی شان کے لائق تھی تو اس میں آدم اور ان کی ذریت تھی ۔اس سے کیا مراد ہے؟

تو ذریت کے بارے میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی روحیں تھیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اجسادِ مثالیہ تھے لیکن آدم تو اس مٹھی میں اس وقت نہیں تھے تو آدم کے بارے میں بظاہر یہی کہنا پڑے گا کہ ان کی مثال تھی۔ باقی یہ اس عالم کی باتیں ہیں جس کو کسی نے دیکھا نہیں، سنا نہیں اتنا ہی پتا چل سکتا ہے جتنا ہمیں وحی کے ذریعے سے بتادیا گیا ہے اور اس میں صرف اتنی ہی بات آئی ہے لہٰذا اس سے زیادہ مزید کسی تفصیل اور بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے کہ اس کا ہمارے عمل یا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال جیسے بھی ہو بس اتنی

بات ہے کہ اس میں آدم اوران کی ذریت تھی کیسے تھی ؟روحیں تھیں اجسادِ مثالیہ تھے یا کوئی اور چیز تھی اس کی تفصیل میں زیادہ جانے کی ضرورت نہیں ہے ابھموا ما اُبھمہ اللہ۔تو گویا قیامت تک جتنی اولاد آدم علیہ السلام کی مقدر تھی وہ ساری کی ساری اس میں جمع تھی۔

ایک اشکال اوراس کا جواب:

تواس وقت آدم علیہ السلام نے دیکھااپنی اولاد کو تو داؤد علیہ السلام پر نظر پڑی جو ان میں سب سے نمایاں اور خوبصورت تھے۔یہاں دولفظ راوی نے ذکر کئے ہیں،ایک یہ کہ اضوئہم۔سب سے نمایاں تھے اور دوسرے یہ کہ من اضوئہم جو نمایاں لوگ تھے ان میں ایک تھے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال داؤد علیہ السلام سے خوبصورت ہیں بلکہ یوسف علیہ السلام سے بھی خوبصورت ہیں تو وہ آپ کو سب سے اچھے کیوں نہیں لگے،ان کی طرف آپ کا دھیان کیوں نہیں گیا۔یہ اشکال اضوئہم اگر کہا ہو تو زیادہ ہوتا ہے کہ سب سے نمایاں تھے اور اگر من اضوئہم ہو تب بھی اشکال پھر بھی ہے کہ کچھ لوگ نمایاں تھے اور ان میں سے ایک داود تھے لیکن باپے کی نظر ان ہی پر ٹک گئی تو اس کی کیا وجہ ہے،حالانکہ ان سے زیادہ خوبصورت اگر موجود ہیں تو بظاہر ان کی طرف متوجہ ہونی چاہئے تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک تو یہ بات ہے کہ جب کافی ساری چیزیں اکٹھی ہوتی ہیں تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو سب سے خوبصورت اور اچھی ہوتی ہے اس کی طرف آدمی کی نظر نہیں جاتی اور اس سے جو کم دوسرے نمبر کی ہوتی ہے اس کی طرف نظر چلی جاتی ہے۔آپ کوئی چیز خریدنے گئے،جوتا لینے گئے باہر شوکیس پر سارے جوتوں کے نمونے لگے ہوئے تھے آپ کا جس طرح کا ذوق ہے اس طرح کا جوتا وہاں موجود تھا،جو آپ کے ذوق کے مطابق سب سے پرکشش ہونا چاہئے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ آپ کا ادھر دھیان نہ جائے اور کسی اور جوتے پر آپ کی نظر ٹک جائے۔تو یہی بظاہر آدم علیہ السلام کے ساتھ ہوا ہوگا۔بہر حال جو بھی ہوا اس سے زیادہ ہم تفصیل میں کیا جاسکتے ہیں

اتنا ضرور ہے کہ آدم کی ایک خاص توجہ داؤد کی طرف ہوئی اور بعض اوقات کسی ثانوی بات کی وجہ سے بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ تو آدم علیہ السلام داؤد علیہ السلام پر اتنے شفیق اور مہربان ہوئے کہ یہ خیال ہوا کہ ان کو یہ جو عمر ملی ہے تھوڑی ملی ہے زیادہ عمر ملنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست بھی کی۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میں تو ان کو اور عمر نہیں دوں گا۔ آدم (ع) نے کہا کہ پھر میں اپنی عمر کا کچھ حصہ ان کو دے دیتا ہوں، چنانچہ ساٹھ سال داؤد (ع) کو دے دیئے اور داود علیہ السلام کی عمر سو سال ہو گئی۔

تقدیر کا لکھا ہوا کیسے بدل گیا:

یہاں پر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ کسی کی جو عمر ایک دفعہ لکھ دی جاتی ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے قضا و قدر میں جو لکھ دیا ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو یہاں اس میں تبدیلی کیسے ہو گئی۔ تو اس کی تفصیل کی جگہ تو کتاب الایمان میں باب الایمان بالقدر ہے۔ لیکن اجمالاً اتنا سمجھ لیجئے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی جو تقدیر ہوتی ہے وہ ہوتی ہے مفصل۔ اس میں کچھ تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے سامنے یا کسی بھی مخلوق کے سامنے جو آتی ہے اس کا ایک حصہ آتا ہے۔ ہمیں چونکہ اس تقدیر کا ایک حصہ نظر آ رہا ہوتا ہے اس لئے ہمیں یہ لگ رہا ہوتا ہے اس میں تبدیلی ہو گئی ہے لیکن اگر پوری تقدیر کو دیکھا جائے تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسے دکان دار نے شوکیس میں چیزیں لگائی ہوئی ہیں اور ہر ایک پر اس کی قیمت بھی لکھی ہوئی ہے لیکن دکاندار کے ذہن میں جو سو روپے لکھے ہوئے ہیں دکاندار کے ذہن میں یہ ہے کہ سو روپے کی چیز اسی روپے میں بیچنی ہے تو لکھے ہوئے ہیں سو، لیکن اس نے ہمیں دی ۸۰ روپے میں۔ ہمارے اعتبار سے اس کی قیمت بدلی ہے لیکن دکاندار کے علم کے اعتبار سے قیمت نہیں بدلی۔ دکاندار یہ نہیں سوچے گا کہ میں نے بیس روپے کا خسارہ اٹھایا ہے۔ اس کے ذہن میں پہلے ہی تھا کہ میں نے بیس روپے کم کرنے ہیں۔ تو چونکہ اس کے ذہن میں پوری تفصیل تھی اس لئے اس کے علم کے اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہاں البتہ دوسرے کے علم کے اعتبار سے تبدیلی ہو گئی۔ اسی طرح یہاں پر حضرت داؤد علیہ السلام کے ماتھے پر لکھی ہوئی عمر تو چالیس سال تھی اور آدم علیہ السلام کی عمر ہزار سال لکھی تھی، تو یہ تقدیر کا اصل میں ایک پہلو

تھا جو ہمارے سامنے آیا لیکن اللہ کے علم میں اتنی بات نہیں تھی یا اللہ کا فیصلہ اتنا نہیں تھا بلکہ اللہ کا فیصلہ مفصل تھا کہ پہلے اتنی اتنی لکھی جائے گی اور پھر آدم (ع) اپنی عمر کا اتنا حصہ داؤد کو دے دیں گے تو داود علیہ السلام کی عمر سو سال بن جائے گی اور آدم علیہ السلام کی نو سو چالیس بن جائے گی اور میں اس کو نافذ کر دوں گا۔ اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی نہیں۔ اشکال تب ہوتا ہے جب کہ اللہ کے علم میں کوئی تبدیلی ہوئی ہو، تبدیلی ہمارے علم میں ہوئی ہے۔

یہاں یہ لکھا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنی عمر کے ساٹھ سال داود علیہ السلام کو دیئے، جبکہ بعض روایات میں چالیس سال کا ذکر بھی آتا ہے کہ چالیس سال دیئے تو بعض حضرات نے ان میں تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ بات تو ایک ہی ہے یا ساٹھ سال دیئے ہیں یا چالیس سال دیئے ہیں حضور ﷺ نے ان میں سے ایک بات ہی فرمائی ہو گی، لیکن آگے راویوں کے تصرف کی وجہ سے بعض نے ساٹھ سال نقل کر دیئے بعض نے چالیس۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات کسی واقعے کی جو ثانوی اور ضمنی چیزیں ہوتی ہیں ان کو یاد رکھنے پر بعض لوگ زیادہ زور نہیں دیتے اور بعض ضمنی باتوں کو بھی اچھے طریقے سے یاد رکھتے ہیں۔ اتنی بات اہم ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنی عمر ان کو دی لیکن کتنے سال دیئے یہ بات اتنی زیادہ اہم نہیں تھی اس لئے بعض راویوں نے اس کو یاد رکھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، اور بعض نے اسے بھی اہم سمجھ کر اسے یاد رکھنے کا اہتمام کیا۔

عورتوں کے مجمع کو سلام کرنا

(٣٦) وَعَن أسماءَ بنت يزيدَ قَالَتْ: مَرَّ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي نِسْوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْنَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وَابْن مَاجَه والدارمي

ترجمہ: حضرت اسما بنت یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے اس حال میں کہ ہم کچھ عورتوں کے ساتھ تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہمیں سلام کیا۔

حضرت ابن عمر سلام کے لئے بازار جانا

(۳۷) وَعَن الطفيلِ بن أُبي بن كعبٍ: أَنَّهُ كَانَ يَأْتِي ابْنَ عُمَرَ فَيَغْدُو مَعَهُ إِلَى السُّوقِ. قَالَ فَإِذَا غَدَوْنَا إِلَى السُّوقِ لَمْ يَمُرَّ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ عَلَى سَقَّاطٍ وَلَا عَلَى صَاحِبِ بَيْعَةٍ وَلَا مِسْكِينٍ وَلَا أَحَدٍ إِلَّا سَلَّمَ عَلَيْهِ. قَالَ الطُّفَيْلُ: فَجِئْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ يَوْمًا فَاسْتَتْبَعَنِي إِلَى السُّوقِ فَقُلْتُ لَهُ: وَمَا تَصْنَعُ فِي السُّوقِ وَأَنْتَ لَا تَقِفُ عَلَى الْبَيْعِ وَلَا تَسْأَلُ عَنِ السّلع وتسوم بِهَا وَلَا تَجْلِسُ فِي مَجَالِسِ السُّوقِ فَاجْلِسْ بِنَا هَهُنَا نتحدث. قَالَ: فَقَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ: يَا أَبَا بَطْنٍ - قَالَ وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ - إِنَّمَا نَغْدُو مِنْ أَجْلِ السَّلَامِ نُسَلِّمُ عَلَى مَنْ لَقِينَاهُ. رَوَاهُ مَالك وَالْبَيْهَقِيّ فِي شعب الْإِيمَان.

حضرت طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ بازار جایا کرتے تھے۔ طفیل کہتے ہیں کہ جب ہم بازار جاتے تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا جس سقاط یعنی معمولی چیزیں بیچنے والے پر، یا کسی فروخت کرنے والے پر یا کسی مسکین پر یا کسی بھی اور شخص پر گزر ہوتا تو اسے سلام ضرور کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آیا تو وہ مجھے بازار اپنے ساتھ لے کر جانے لگے تو میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عرض کیا کہ آپ بازار میں کیا کریں گے، حالانکہ آپ نہ تو خرید وفروخت پر ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی سودوں کے بارے میں پوچھتے ہیں اور نہ ہی سودا کرتے ہیں اور نہ ہی بازار کی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، تو یہیں پر ہمارے ساتھ تشریف رکھئے کہ ہم باتیں کرتے ہیں

یا حدیثیں سنتے سناتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مجھے فرمایا اے ابو بطن (اور یہ اس لئے کہا کہ طفیل ذرا بڑے پیٹ والے تھے) ہم بازار میں سلام کی خاطر جاتے ہیں، تاکہ ہم ان لوگوں کو سلام کریں جن سے ہم ملیں۔

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ سلام دراصل ملاقات کا ادب ہے۔ یسلّم علیہ إذا لقیہ۔ اور ملاقات کے پائے جانے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ اگلا آپ کی طرف متوجہ ہو یا کم از کم آپ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہیں۔ جہاں دوسرا شخص آپ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہے وہاں سلام کا موقع ہی پیدا نہیں ہوا، کس کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے کس کو نہیں اس کے لئے موقع محل کو دیکھنا ہوتا ہے۔ اس روایت میں حضرت ابن عمرؓ کا جو طرزِ عمل ذکر کیا ہے اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آپ بازار میں ہر دکان دار اور چھابڑی والے کو اپنے کام سے ہٹا کر سلام کیا کرتے تھے۔ بلکہ روایت میں تصریح ہے نسلم علی من لقیناہ۔ جس سے ملاقات ہوتی تھی اسے سلام کرتے تھے۔ البتہ حضرت ابن عمر چونکہ نمایاں شخصیت تھے، اس لئے ان کے بازار میں جانے پر زیادہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے، اس لئے سلام کرنے کا زیادہ موقع مل جاتا ہوگا۔ یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے آپ یہ طریقہ اختیار کریں کہ بازار میں جائیں اور جو دوکان دار وغیرہ اپنے اپنے کاموں میں منہمک ہیں انہیں سلام کرتے ہوئے گذر جائیں۔ اگر ہر کوئی سلام کا ثواب حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنے لگ جائے تو بازار میں کام کرنا ہی مشکل ہو جائے اور سلام بھی ایک مذاق بن جائے۔

سلام نہ کرنا بہت بڑا بخل ہے

(۳۸) وَعَن جَابر قَالَ: أَتَى رَجُلٌ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: لِفُلَانٍ فِي حَائِطِي عَذْقٌ وَأَنَّهُ آذَانِي مَكَانُ عَذْقِهِ فَأَرْسَلَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَنْ بِعْنِي عَذْقَكَ» قَالَ: لَا. قَالَ: «فَهَبْ لِي» . قَالَ: لَا. قَالَ: «فَبِعْنِيهِ بِعَذْقٍ فِي

الْجَنَّةِ» ؟ فَقَالَ: لَا فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا رَأَيْتُ الَّذِي هُوَ أَبْخَلُ مِنْكَ إِلَّا الَّذِي يَبْخَلُ بِالسَّلَامِ» . رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے باغ میں فلاں شخص کا ایک تنا ہے (کھجور کا) اس کی موجودگی کی وجہ سے مجھے تکلیف ہوتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طرف پیغام بھجوایا کہ اپنا درخت مجھے بیچ دو، اس نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے ہبہ کر دو، اس نے کہا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ درخت مجھے بیچ دو جنت کے اندر ایک درخت کے عوض۔ اس نے کہا نہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ایسا شخص نہیں دیکھا جو تجھ سے بھی بخیل ہو سوائے اس شخص کے جو سلام میں بھی بخل کرے۔

یہ حدیث اس باب میں اس آخری جملے کی وجہ سے لائی گئی ہے کہ جو آدمی سلام میں بخل کرتا ہے وہ انتہائی بخیل ہے ایسا بخیل ہے کہ اس کو ضرب المثل بنایا جاسکتا ہے، اس لئے کہ جب آدمی سلام کرتا ہے خرچ اس کا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جو دو اچھے بول بھی کسی کو نہ دے سکے اس سے زیادہ بخیل اور کون ہو سکتا ہے اور اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے۔

اس حدیث میں ہے کہ ایک شخص کے باغ میں دوسرے کا درخت تھا کیونکہ درخت کسی اور کا تھا اسی لئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے درخت کی وجہ سے اس میں آتا جاتا بھی ہوگا یا اس درخت کی موجودگی کی وجہ سے اسے تنگی اور تکلیف ہوتی ہوگی تو اس لئے اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر یہ درخواست کی کہ مجھے اس کی وجہ سے تنگی ہو رہی ہے اگر اسے وہاں سے ہٹالیا جائے یا کسی اور طریقے سے مسئلہ حل ہو جائے۔ پہلے اس نے براہِ راست مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن وہ نہ مانا ہوگا تو باغ کا مالک حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے یہ راستہ سوچا کہ میں اسے خرید لیتا ہوں پھر اسے ہبہ کر دوں گا، جب اس کا ہو جائے گا تو جو چاہے تصرف کرے چاہے وہاں سے ہٹائے یا کچھ اور کرے۔ لیکن وہ اس بات پر نہ مانا اور فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ دوسری پیش کش آپ نے یہ کی کہ اگر بیچنا نہیں تو پھر ہبہ کر دو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بیچنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے تو آپ نے سوچا کہ شاید یہ اس پر راضی ہو جائے کہ یہ درخت مجھے ہبہ کر دے اور میں یہ باغ والے کو ہبہ کر دوں گا، آپ نے یہ پیش کش بھی کی کہ یہ درخت اگر مجھے دے دو گے تو تمہیں اس کے بدلے میں جنت کا درخت مل جائے گا، لیکن اس نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان فرمائی کہ تجھ سے زیادہ بخیل کوئی اور شخص نہیں ہو سکتا۔

آپ ﷺ کی بات نہ ماننے والا یہ شخص کیا منافق تھا؟

یہ شخص کون ہو گا بعض اوقات اس طرح کی احادیث کی تشریح میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ کوئی منافق ہو گا اس لئے کہ کوئی مؤمن بظاہر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن چونکہ اس کے منافق ہونے کی کوئی دلیل کسی روایت میں موجود نہیں اس لئے بظاہر یہ کہنا مشکل ہے، بلکہ حضور اقدس کے اسے بدلے میں جنت کا درخت پیش کرنے سے بظاہر اس کے منافق ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ حدیث کی تشریح اس کو منافق قرار دیئے بغیر بھی ممکن ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو منافق قرار نہ دیا جائے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ آپ نے پہلی پیش کش تو یہ کی ہے کہ مجھے بیچ دیا جائے تو یہ ایک معاملے کی بات ہے اور معاملے میں اگر کوئی نبی کی بات کو رد کرتا ہے تو نفاق اور کفر ہونا تو بعد کی بات ہے یہ کوئی ناجائز اور گناہ کی بات بھی نہیں ہے۔ اور اگر نبی کسی کو کسی معاملے کا ایجاب کرتا ہے تو جس طرح عام ایجاب کرنے والے کے ایجاب میں دوسرے کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اسی طرح پر اس کو یہاں پر بھی اختیار ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہیں گے کہ آپ کا مشورہ تھا تو مشورے میں بھی یہی بات ہے کہ دوسرے پر لازم نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑے آدمی کا مشورہ ماننے سے انکار کر دے تو کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ حضرت بریرہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔ یہی حال دوسری پیش کش کا ہے کہ مجھے ہبہ کر دیا جائے تو یہ

بھی ایک معاملے کی بات ہے ایک ایجاب ہے ایک مشورے کی بات ہے اگر اس نے نہیں مانا تو کسی کفر یا گناہ کی بات نہیں ہے۔ البتہ تیسری بات کچھ تھوڑی سی سنگین لگتی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے دے دو اس کے عوض تمہیں جنت میں درخت مل جائے گا اس پر بھی وہ آمادہ نہیں ہوا۔ یہ بات محلِ اشکال ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھیں تو یہ بات بھی کم از کم کفر کی حد تک نہیں پہنچتی اس لئے کہ اس میں آپ نے زیادہ سے زیادہ ایک عمل کی فضیلت بیان کی ہے اور کوئی عمل اگر واجب نہ ہو اور اس کی فضیلت بیان کی جائے اور کوئی فضیلت سن کر اس پر عمل نہ کرے تو یہ کفر نہیں ہے۔ مثلاً آپ کو کسی نے کہا کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے اور اس میں درخت لگتے ہیں سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کہنے سے، لہٰذا اگر آپ سبحان اللہ کہیں گے تو جنت میں آپ لئے ایک درخت لگ جائے گا۔ لیکن اگر اسے سن کر اگلا سبحان اللہ نہیں کہتا تو کوئی معصیت یا کفر نہیں ہے۔ تو یہی بات یہاں پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے لیکن فضیلت سے اس کا واجب ہونا ثابت نہیں ہوتا تو جب اس کا وجوب ثابت نہیں تو اس پر عمل نہ کرنا موجب کفر یا معصیت نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات کہنے کی تو ضرورت نہیں ہے کہ وہ شخص منافق تھا۔ ہاں البتہ وہ کوئی بدو اور اجڈ قسم کا آدمی ضرور ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ پیش کش کرنے والے بہر حال اللہ کے رسول ہیں اور پیش کش بھی جنت کے درخت کی کر رہے ہیں، اور عمومی فضیلت کا بیان نہیں ہے بلکہ اس متعین شخص سے جنت کے ایک درخت کا وعدہ ہو رہا ہے جو یقیناً بہت بڑی بات ہے۔ لیکن اس پر بھی وہ لا (نہیں) کہہ رہا ہے۔ بعض لوگ بہت خشک اور سخت مزاج کے ہوتے ہیں وہ معاملے کو صرف ضابطے کے حوالے سے دیکھتے ہیں، اس میں رابطے کے پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں تو یہ بھی اسی مزاج کا کوئی آدمی ہو گا۔ تو حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی وجہ سے اسے کہیں کہ وہ کوئی منافق آدمی ہو گا۔

پھر اس طرح کی روایات میں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ بظاہر خود نبی کریم ﷺ نے صحابہ کا یہ مزاج بنایا ہوا ہو گا کہ جب معاملے کی بات ہو تو کھل کر اپنی مرضی و منشا کا اظہار کرو۔ جیسا کہ حضرت بریرہؓ کے معاملے میں ہوا۔ اس لئے یہ صاحب بھی اس بات کو جانتے ہوں گے، اور خود نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی اس چھوٹ سے فائدہ

اُٹھاتے ہوئے انہوں نے یہ انداز اختیار کیا۔ چنانچہ خود نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے بخیل ہونے کا اظہار تو کیا کہ دوسرے کی خاطر اپنے موقف میں ذرا لچک دکھانے کے لئے اور دوسرے کو فائدہ پہنچانے کے لئے تیار نہیں ہے، حالانکہ اس میں اپنا بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ لیکن آپ نے اس حوالے سے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کہ اس نے ایک نبی کی اتنی بڑی پیش کش کو ٹھکرادیا۔

سلام میں پہل تکبر سے خالی ہونے کی علامت

(٣٩) وَعَن عَبْدِ الله عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْبَادِئُ بِالسَّلَامِ بَرِيءٌ مِنَ الْكِبْرِ». رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي «شعب الْإِيمَان».

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ سلام کی ابتدا کرنے والا تکبر سے بری ہوتا ہے۔

اس لئے کہ جس آدمی میں تکبر ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا ہوں اس لئے دوسرے کو چاہئے کہ وہ مجھے سلام کرے اگر میں اسے پہلے سلام کروں گا تو یہ میری شان کے خلاف ہے۔ ہمارے ایک تایا تھے حاجی محمد طفیلؒ یہیں فیصل آباد میں رہتے تھے وہ عالم بھی تھے اور طبیب بھی تھے۔ مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیعؒ کے خلیفہ مجاز بھی تھے۔ کسی زمانے میں ہندوستان میں دیوبند میں ان کی حکمت کی دوکان تھی اور غالباً حضرت قاری طیبؒ کے بھائی قاری محمد طاہرؒ کے مکان کا کچھ حصہ کرایہ پر لے کر رہتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جتنی دیر میں وہاں رہا ہوں میں نے بہت کوشش کی کہ جب کہیں راستے میں حضرت قاری صاحب سے ملاقات ہو تو میں پہلے سلام کروں لیکن انہوں نے کبھی اس کا موقع نہیں آنے دیا۔

باب الاستیذان

(۱) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: أَتَانَا أَبُو مُوسَى قَالَ: إِنَّ عُمَرَ أَرْسَلَ إِلَيَّ أَنْ آتِيَهُ فَأَتَيْتُ بَابَهُ فَسَلَّمْتُ ثَلَاثًا فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيَّ فَرَجَعْتُ. فَقَالَ: مَا مَنَعَكَ أَنْ تَأْتِيَنَا؟ فَقُلْتُ: إِنِّي أَتَيْتُ فَسَلَّمْتُ عَلَى بَابِكَ ثَلَاثًا فلم تردَّ عليَّ فَرَجَعْتُ وَقَدْ قَالَ لِي رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذَا اسْتَأْذَنَ أَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُؤْذَنْ لَهُ فَلْيَرْجِعْ» . فَقَالَ عُمَرُ: أَقِمْ عَلَيْهِ الْبَيِّنَةَ. قَالَ أَبُو سَعِيدٍ: فَقُمْتُ مَعَهُ فذهبتُ إِلى عمرَ فشهِدتُ. متفق عليه.

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے اور انہوں نے آکر کہا کہ میری طرف حضرت عمر نے یہ پیغام بھیجا یعنی ابو موسیٰ اشعری کی طرف پیغام بھیجا کہ میں ان کے پاس جاؤں تو میں حضرت عمر کے دروازے پر گیا اور میں نے تین دفعہ سلام کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تو میں واپس لوٹ آیا۔ بعد میں حضرت عمر نے فرمایا تجھے کس چیز نے روکا تھا کہ تم میرے پاس آؤ۔ (میں نے بلایا تھا تم پھر بھی نہیں آئے) تو میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے دروازے پر آیا تھا میں نے تین مرتبہ سلام کیا مگر آپ نے میرے سلام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جبکہ مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا جب تم میں سے کوئی آدمی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اسے پھر بھی اجازت نہ دی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ لوٹ جائے اس لئے میں واپس آگیا تو حضرت عمر نے کہا کہ اس پر گواہ قائم کرو۔ حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں میں اٹھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ حضرت عمر کے پاس گیا وہاں جا کر میں نے گواہی دی (کہ واقعتاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی)۔

استیذان کا حکم اور اس کی حکمتیں

یہ باب استیذان کے بارے میں ہے۔ استیذان کا معنی ہے اجازت طلب کرنا اور یہاں مراد ہے کسی کے گھر میں کسی کے کمرے میں یا کسی کی خلوت گاہ میں جانے کی اجازت مانگنا۔ اور یہ شریعت کے احکامِ معاشرت میں سے ایک اہم حکم ہے جس کا خود قرآن کریم میں بھی حکم ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ یعنی جب تم کسی کے گھر میں جاؤ جبکہ وہ تمہارا اپنا گھر نہ ہو تو اس وقت تک تمہیں اندر داخل نہیں ہونا چاہئے جب تک کہ تم استیناس اور سلام نہ کر لو۔ یہاں استیناس سے مراد استیذان بھی ہے کہ اندر آنے سے پہلے اجازت طلب کرو۔ اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔

انسانی کی نجی حالت کا تحفظ:

سب سے پہلی حکمت اس میں یہ ہے کہ شریعت میں دوسرے شخص کی نجی حالت کو جسے آج کل پرائیویسی کہا جاتا ہے تحفظ دیا گیا ہے۔ ہر آدمی کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی نجی حالت کو اور نجی باتوں کو دوسروں سے مخفی رکھے۔ بعض چیزیں تو معیوب اور بری ہوتی ہیں آدمی انہیں دوسرے سے چھپاتا ہی ہے۔ بعض باتیں معیوب نہیں ہوتیں مگر پھر بھی آدمی کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے نہ آئیں۔ آج کل کی جدید معاشرت میں اس پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ کسی کی پرائیویسی میں دخل نہ دیا جائے۔ لیکن یہ اصول شریعت مطہرہ نے آج سے چودہ سو سال پہلے سکھا دیا تھا اور ایسے معاشرے میں سکھایا تھا جس کو جاہل اور اجڈ قسم کا معاشرہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اندر اس اصول کی تعلیم دی کہ آدمی اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے ٹھیک ہے کہ وہ ایسی حالت میں نہیں ہے کہ اس کا ستر کھلا ہوا ہو کوئی معیوب حالت میں بھی نہیں ہے لیکن جس حالت میں بھی ہے شاید وہ اپنی اس حالت کو دوسرے پر مخفی رکھنا چاہتا ہو، ظاہر کرنا نہ چاہتا ہو۔ ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہوا ہے کرتا اتارے ہوئے ہیں۔ بنیان کے اندر ہے۔ اب پتا نہیں کہ اس حالت میں آپ کے

سامنے آنا چاہتا ہے یا نہیں۔ ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہوا ہے گھر کا سامان بکھرا ہوا ہے، کتابیں بکھری ہوئی ہیں، دوسری چیزیں بکھری ہوئی ہیں اب پتا نہیں کہ وہ اپنی یہ حالت اگرچہ بری نہیں ہے آپ کے سامنے لانا چاہتا یا نہیں لانا چاہتا ہے۔ کمرے میں یا اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہے کسی سے گفتگو کر رہا ہے تو پتا نہیں کہ جو وہ باتیں کر رہے ہیں اب دوسرے کے سامنے لانا چاہتے ہیں یا نہیں لانا چاہتے۔ حتی کہ عبادت کر رہے ہیں اور بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ انہماک کے ساتھ سجدے میں پڑے ہوئے ہیں رو رہے ہیں سجدے میں پتا نہیں کہ آپ کا دل اس حالت کو دوسرے پر ظاہر کرنے کو چاہتا ہے یا نہیں چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر دوسرا اچانک آجائے تو آپ اس کی وجہ سے خجالت محسوس کریں، شرمندگی محسوس کریں۔ اس کو کہتے ہیں نجی زندگی کا تحفظ۔ تو شریعت مطہرہ نے اس کا تحفظ کیا ہے۔ اسی وجہ سے حکم یہ ہے کہ اگر دو آدمی آپس میں گفتگو کر رہے ہیں وہ تمہیں نہیں بتانا چاہتے تو نہ سنو۔ حدیث میں آتا ہے جو ایسے طریقے سے بات کو سنے گا قیامت کے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسا ڈالا جائے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ناجائز بات ہی کر رہے ہوں اگر جائز بات بھی کر رہے ہوں کوئی اچھی بات بھی کر رہے ہوں ایک دوسرے کو کوئی نصیحت ہی کر رہے ہوں لیکن تمہیں وہ مطلع نہیں کرنا چاہتے تو تم خواہ مخواہ سن رہے ہو، یہ اچھی بات نہیں سمجھی گئی۔ اسی وجہ سے کسی کا خط بغیر اس کی اجازت کے پڑھنا درست نہیں۔ اس لئے کہ پتا نہیں وہ اپنی لکھی ہوئی بات پر آپ کو مطلع کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔

تو انفرادی اور نجی حالات کو محفوظ رکھنا انسان کی فطری خواہش بھی ہوتی ہے اور شریعت نے اس کو ایک حق بھی تسلیم کیا ہے اور بغیر استیذان آپ گھس جائیں تو اس سے اس کا یہ حق فوت ہوتا ہے اس سے اس کی اس خواہش کا احترام فوت ہوتا ہے اس لئے شریعت نے یہ کہا کہ اجازت لے کر جاؤ۔

حجاب اور شرم وحیا کا تقاضا:

دوسری حکمت یہ ہے اور یہ بات احادیث میں آتی ہے کہ آپ چلے جاتے ہیں گھر میں اچانک یا کسی کے کمرے میں تو حتی کہ اگر وہ اپنے محارم بھی ہوں تو بھی نہ جانے وہ کیسی حالت میں ہوں۔ ایسی حالت میں بھی ہو سکتا اچانک جانے میں بے حیائی کا شائبہ ہو۔ اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اچانک جانے سے کسی غیر محرم پر نگاہ پڑ جائے وہ نظر فتنے کا باعث بھی بن سکتی ہے تو استیذان میں فواحش، بے حیائی، دوسروں کے عیوب پر اطلاع سے بچاؤ ہے۔

ملاقات میں انس کا پہلو:

اور تیسرا فائدہ آنے والے کا ہے اور وہ یہ ہے کہ یوں ہی اگر اچانک اندر چلا جائے گا تو اس سے اس شخص کی طبیعت پر ایک بار ہو گا گرانی ہو گی اور ظاہر ہے کہ جب گرانی ہو گی تو یہ اس سے صحیح طریقے سے ملے گا بھی نہیں اور جس مقصد کے لئے اس کے پاس گیا ہے وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہو گا اس کے برعکس اگر استیذان کے ساتھ جائے گا تو خندہ پیشانی کے ساتھ اور خوب بشاشت کے ساتھ ملے گا۔ اس لئے قرآن کریم نے یہاں استیذان کی بجائے استیناس لفظ استعمال فرمایا ہے۔ حتی تستانسوا یہاں تک کہ تم انس حاصل کر لو۔ یہاں استیذان کی اس حکمت کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر استیذان کے ساتھ جاؤ گے تو ملاقات خوب انس اور الفت کے ساتھ ہو گی۔ اگر بغیر استیذان کے اندر گھس جاؤ گے تو یہ الفت باقی نہیں رہے گی۔ یہ بات باب السلام کی دوسری حدیث کی تشریح میں اختصار کے ساتھ آچکی ہے کہ مسلمان معاشرے میں انس اور الفت کا برقرار رہنا کتنا اہم ہے، باب السلام کی مذکورہ حدیث میں جن دو کتابوں کو سب سے افضل عمل قرار دیا گیا ہے دونوں کا اس مقصد کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ تو قرآنی تعبیر و اسلوب میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ استیذان کے حکم کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ یہ تو چند مثالیں ہیں ورنہ اس ایک حکم کے اندر نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی جو اللہ تعالی نے اس کے اندر مضمر رکھی ہوں گی ہمارا اصل کام یہی ہے کہ حکمت سمجھ آئے یا نہ آئے ہر حال میں عمل کریں تاہم حکمت سمجھ میں آنے سے حکم کو علی وجہ البصیرۃ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مواقع استیذان واحکام

استیذان کے کچھ مسائل ذہن میں رکھ لیں۔ آگے احادیث سے ان شاء اللہ وہ مزید واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ گھر کئی طرح ہوتے ہیں۔ ایک تو ایسا کمرہ یا گھر ہوتا ہے جس میں آدمی اکیلا ہی رہ رہا ہوتا ہے اور اسی کا سامان وغیرہ ہوتا ہے اور جب وہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ گھر میں کوئی اور نہیں ہے۔ چابی اپنے پاس ہے ابھی کھولا ہے تو استیذان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ دوسری صورت ہے کسی اجنبی کے گھر جا رہے رہیں تو یہاں استیذان واجب ہے بغیر استیذان کے گھر میں جانا ناجائز ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ گھر میں جانا ناجائز ہے بلکہ دیکھنا اور نظر ڈالنا بھی ناجائز ہے۔ الا یہ کہ غیر اختیاری طور سے نظر پڑ جائے اس وجہ سے کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایسے گھر میں جا رہا ہے جو اپنا گھر ہے اور جو عورتیں اس گھر میں رہتی ہیں وہ اپنی محارم ہیں مثلاً والدہ ہے، بہنیں ہیں یا کسی عورت کے لئے گھر میں اسی طرح کے مرد ہیں تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ استیذان کر کے ہی جائے اس لئے کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ گھر میں کوئی غیر محرم عورت ملنے کے لئے آئی ہوئی ہو، اب بغیر استیدان کے جانے میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس پر نظر پڑ جائے ہو سکتا ہے، اس کا سر کھلا ہوا ہو، وہ بے تکلف بیٹھی ہو اور اگر غیر محرم نہ بھی ہو تو اپنی محارم ہی کسی ایسی حالت میں ہو سکتی ہیں گھر میں کوئی نہیں تھا فرض کیجئے کرتہ اتار لیا تھا اگر ایسے جائیں گے تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس لئے یہاں تک کہا ہے کہ گھر میں صرف بیوی ہو جس کے بدن کو دیکھنا جائز ہے حلال ہے تب بھی استیذان کر لینا چاہئے اگرچہ واجب نہیں ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے بیوی بھی ایک حالت میں تمہارے سامنے نہ آنا چاہتی ہو کسی دوسری حالت میں آنا چاہتی ہو۔ اسی لئے تو کہا گیا ہے کہ جب آدمی طویل سفر سے واپس آئے تو بغیر اطلاع کے گھر نہیں جانا چاہئے، پہلے اطلاع کر کے جانا چاہئے۔ اس صورت میں بھی استیذان کر لینا بہتر ہے۔ لیکن فرق ہے تھوڑا سا وہ یہ کہ اجنبی گھر ہے یا جس میں غیر محرم عورتیں رہتی ہیں یا اپنا گھر نہیں ہے وہاں ایک تو یہ کہ استیذان واجب ہے اور دوسرا یہ کہ استیذان واجب ہے بمعنی اجازت طلب کرنے کے جب تک اجازت نہ ملے اس وقت تک اندر داخل ہونا جائز نہیں۔ اور اپنا گھر ہے اپنی والدہ وغیرہ ہے خاص طور پر اپنی بیوی وغیرہ ہے تو پھر استیذان کا اصل

مقصود اطلاع ہے۔ لہٰذا گھر میں داخل ہوتے اطلاع کر دینا کافی ہے مثلاً دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پاؤں زمین پر مار دیں یا تھوڑا سا کھنگار لیں یا اس طرح کا کوئی اور انداز اختیار کر لیں جس سے پتا چل جائے کہ آپ گھر آ گئے ہیں۔ اب اگر کوئی ایسی بات ہو گی کہ آپ کا آگے آنا مناسب نہیں ہے تو آپ کو بتا دیں گے کہ مہمان بیٹھے ہوئے ہیں آپ ذرا رک جائیں۔ لیکن اگر گھر سے کوئی ایسا جواب نہیں آتا تو بظاہر یہی ہے کہ جانے کی اجازت ہے۔ تو یہاں اطلاع کافی ہے بہر حال کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے یونہی گھر میں چلے جانا چاہے اپنا گھر ہی ہو مناسب نہیں ہے۔

استیذان کا طریقہ:

اس میں بحث چلی ہے کہ پہلے استیذان کرنا چاہئے یا پہلے سلام کرنا چاہئے۔ تو احادیث سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ امکان ہے کہ وہ آپ کی بات سن رہے ہیں آپ کی آواز سن رہے ہیں اور آواز ہی کے ذریعے آپ استیذان کر رہے ہیں دستک دے کر یا گھنٹی کے ذریعے استیذان نہیں کر رہے تو پہلے سلام کرنا چاہئے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ یوں کہے السلام علیکم أأدخل۔ پہلے السلام علیکم کہے پھر کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں؟ اس میں بہتر یہ ہے کہ آدمی پہلے اپنا نام بتا دے السلام علیکم میں فلاں ہوں کیا میں اندر حاضر ہو سکتا ہوں؟ اجازت ہے؟ تاکہ دوسرے کو پوچھنا نہ پڑے کہ تم کون ہو۔ اور اگر ایسے نہ ہو دوسرا پوچھ لے تو جواب واضح ہونا چاہئے۔ حدیث میں آتا ہے ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیا أنا، میں ہوں آپ نے فرمایا کہ أنا أنا کیا ہوتا ہے؟ میں میں کیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ میں تو ہر شخص ہوتا ہے۔ اصل تو یہی ہے کہ پہلے سلام کیا جائے پھر استیذان۔ اور استیذان میں آدمی اپنا پورا تعارف کرا دے تاکہ دوسرے کو پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے۔ لیکن یہ سلام سلامِ استیذان ہے اور جب اندر جائے تو وہاں سلام کر لے یہ سلامِ لقا ہو گا۔ لیکن اگر ابتدا میں سلام نہیں کرتا ویسے ہی استیذان کر لیتا ہے تو بھی کوئی حرج کی بات نہیں۔ خاص طور پر بعض مقامات میں استیذان ایسی صورت میں ہوتا ہے کہ دوسرے شخص تک آواز نہیں پہنچتی۔ مثلاً باہر سے گھنٹی بجا دی یا باہر سے دستک دے دی یہاں پر پہلے سلام کی کوئی صورت ہی نہیں یہاں دستک دینا ہی استیذان ہے۔ اسی

طرح ایک طریقہ آج کل یہ چلتا ہے کہ کوئی آدمی دفتر میں بیٹھا ہوتا ہے تو اپنا کارڈ اندر بھیج دیا جاتا ہے۔ وہ شخص جس سے استیذان طلب کرنا ہے وہ براہِ راست ہماری آواز نہیں سن رہا تو پھر پہلے سلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

استیذان جب کر لیا تو اس کے نتیجے میں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ متعلقہ شخص نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس کا حکم یہ ہے وہ اندر داخل ہو جائے اور جا کر سلام کرے اس کے بعد جو بات کرنی ہے کر لے۔ لیکن اگر اس نے اجازت نہ دی تو قرآن پاک کا حکم ہے :﴿وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ﴾[1]۔ اگر تمہیں واپس جانے کا کہا جائے تو دل کی خوشی کے ساتھ چلے جاؤ اور اس استیذان کو یا واپسی کا کہے جانے کو اپنی شان کے خلاف نہ سمجھو اس لئے کہ واپس جانا ہی تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔

اس سے معلوم ہوا جس شخص سے اجازت طلب کی جا رہی اجازت دینا اس پر لازم نہیں ہے بلکہ اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اجازت نہ دے، واپس جانے کو کہہ دے۔ ہاں البتہ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے حدیث میں آتا ہے: ان لزورک علیک حقاً کہ جو تم سے ملاقات کرنے کے لئے آنے والا ہے اس کا بھی تم پر حق ہے، اس لئے جو آدمی آیا ہے حتی الامکان کوشش کرنی چاہئے کہ اسے واپس نہ بھیجا جائے۔ بہر حال واپس کرنے کا اس کو حق ہے۔ خاص طور پر جب ملاقات کی جازت دینے میں کوئی عذر لاحق ہو۔ اگر وہ واپس جانے کا کہہ دے تو اس کو چاہئے کہ وہ برا محسوس نہ کرے بلکہ دل کی خوشی کے ساتھ واپس چلا جائے۔ پتہ نہیں اس کی کیا حالت ہو گی کیا عذر ہو گا کیا رکاوٹ ہو گی، دوسرے کے بارے میں اچھا گمان ہی رکھنا چاہئے اس کو اپنی شان میں کمی نہ سمجھنا چاہئے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر اجازت نہیں دی تو اس کا اظہار اچھے طریقے سے کرے۔ قرآن کریم نے یہ جو کہا ہے کہ واپس چلے جاؤ یہ آخری درجہ میں ہے اگر کھل کر بھی تمہیں کہہ دے کہ جاؤ واپس چلے جاؤ تو برا نہ مناؤ۔ یہ حکم ہے آنے والے کے لئے۔ لیکن

---

[1]۔ النور:۲۸

جس شخص سے اجازت طلب کی گئی ہے وہ بھی سیدھا اِرجعوا (لوٹ جاؤ) کہے یہ مطلب نہیں۔ بلکہ کوئی اور مناسب عنوان اختیار کر لینا چاہئے جو موحش نہ ہو۔ کہ یوں کہہ دے فلاں وقت تشریف لے آیئے گا، میں معذرت خواں ہوں ،مجھے شرمندگی ہو رہی ہے لیکن مجبوری ہے میں آپ سے مل نہیں سکتا۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس طرح کا کوئی ایسا عنوان، ایسا انداز اختیار کیا جائے جو موحش نہ ہو، البتہ آنے والے کو چاہئے کہ اگر اس نے ارجعوا کا لٹھ مار بھی دیا ہے تو وہ اس کا بھی برا محسوس نہ کرے بلکہ یہ سوچے کہ میرے کرنے کا کام یہی ہے کہ میں واپس چلا جاؤں۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب اس نے صراحتاً انکار کر دیا، اگر اس نے صراحتاً منع نہیں کیا اور کوئی جواب بھی نہیں آیا یعنی اندر بلایا بھی نہیں تو کیا حکم ہے۔ تو اس حدیث میں آیا ہے کہ تین مرتبہ اجازت طلب کرے اگر پھر بھی جواب نہ ملے تو لوٹ آئے۔ اب اس پر علما میں بحث چلی ہے کہ اب تین مرتبہ سے زائد بھی استیذان کی اجازت ہے یا نہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جب غالب گمان یہ ہو کہ اس نے میرا استیذان سنا نہیں ہے، میری آواز اس تک نہیں پہنچی۔ اس میں علما کے مختلف اقوال ہیں۔ لیکن جو بات بحیثیت مجموعی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ کہ لوٹنے کا حکم اس وقت ہے جب وہ اجازت دینے سے انکار کر دے۔ اجازت دینے سے انکار کرنا کبھی صاف لفظوں میں ہوتا ہے، اور کبھی موقع محل اور دلالتِ حال سے سمجھ آرہا ہوتا ہے۔ آپ کا جازت طلب کرنا بار بار سن کر کوئی جواب نہ دینے کا مطلب بھی یہی بنتا ہے کہ وہ کہنا چاہتا ہے کہ واپس چلے جاؤ۔

یہ جو حدیث میں فرمایا گیا کہ تین مرتبہ استیذان کے بعد اگر جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دلالۃً انکار ہی ہے۔ تین مرتبہ اس نے جواب نہیں دیا تو اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ وہ آپ سے ملنا نہیں چاہتا لیکن کھل کر انکار بھی نہیں چاہتا۔ لہٰذا جہاں تین مرتبہ استیذان کے بعد یہ صورت حال پائی جائے کہ قوی گمان یہ ہو کہ اگر اس نے اجازت دینی ہوتی تو دے دیتا تو پھر مزید استیذان نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن اگر تین مرتبہ استیذان کے بعد جواب نہ آنے سے کسی وجہ سے یہ اندازہ نہ ہو بلکہ کچھ اور صورتِ حال قرائن سے معلوم ہو رہی ہو تو پھر مزید استیذان کی بھی گنجائش ہے مثلاً یہ خیال ہو کہ پہلی دوسری مرتبہ اس نے میری آواز سنی نہیں ہے یا اس تک پہنچی

ہی نہیں ہے، یااندازہ یہ ہو کہ اگراس نے اجازت دینی بھی ہوتی یااندر بلانا ہو تواس میں کچھ وقت لگ سکتا ہے مثلاً کافی دور بیٹھا ہوا ہے اور وہاں سے وہ خود اٹھ کر باہر آئے گا یا مجھے بلائے گا یااس طرح کی کوئی اور صورت حال ہو تو ایسی صورت میں واپس نہ آنے اور کچھ انتظار کرنے کی گنجائش ہے۔

فون پر رابطے کے کچھ آداب:

اسی سے ملتے جلتے احکام ٹیلے فون کے ہیں، جب کسی سے فون پر بات کی جائے اس میں دو پہلو ہیں۔ایک پہلو یہ ہے کہ فون کرنے والا بھی آپ کا ایک زائر اور ملاقاتی ہے اس لئے جہاں تک ہو اسے چاہیئے کہ اِن لزورک علیک حقا والے اصول کا خیال رکھے۔لیکن دوسری طرف ملاقات کرنے والے کو بھی ایک تو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس وقت فون نہ کرے جب اسے اندازہ ہو کہ اس وقت فون کرنے میں اسے تکلیف یا ذہنی کوفت ہو گی،اور دوسرے یہ کہ جب فون کیا ہے تو اس کے فون اٹھانے کے بعد اگر کچھ لمبی بات کرنی ہے تو بہتر یہ ہے کہ اس سے پوچھ لیا جائے کہ میں آپ سے لمبی بات کرنا چاہتا ہوں اگر آپ کے پاس فرصت نہیں تو کچھ دیر کے بعد یا جب آپ کے پاس وقت ہو گا بات کرلوں گا۔اس لئے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ فرض کیجئے کہ ایک آدمی کو قضائے حاجت کا تقاضا ہے اور وہ اٹھ کر بیت الخلاء جانے لگا اور گھنٹی بج گئی،اب اس نے ٹیلے فون اٹھالیا اور اس نے آدھے گھنٹے کی بات کرنی شروع کردی۔یا فرض کیجئے چائے کا کپ پکڑا ہوا تھا وہ پی رہا تھا اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اس نے اتنی لمبی بات کی کہ اس کی چائے ٹھنڈی ہو گئی یا کوئی بھی حالت ایسی ہو سکتی ہے کہ آدمی رسیور اٹھا تو لیتا ہے لیکن لمبی بات کرنے کے لئے ذہناً تیار نہیں اس لئے اگر لمبی گفتگو کرنا ہو تو پوچھ لیا جائے کہ میں آپ سے ایسی بات کرنا چاہتا ہوں تو اگر آپ فرمائیں تو ابھی کر لیتا ہوں نہیں تو کسی اور وقت کرلوں گا۔اسی طرح تین دفعہ استیذان کے بعد جو حکم ہے کہ واپس آجاؤ تو اس حکم کی روح اور حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اگر بار بار گھنٹی بجنے کے باوجود وہ فون نہیں اٹھارہا تو مسلسل کالیں کرتے رہنا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

بلوائے ہوئے آدمی کو استیذان کی ضرورت ہے یا نہیں؟

ایک مسئلہ یہاں اور ہے جو اگلی حدیث سے بھی تعلق رکھتا ہے اور اس حدیث سے بھی اس کا تعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی آدمی نے کسی کو بلوایا یا فون کیا کہ آکر میری بات سن لیں یہ بلوایا ہوا آدمی جب آئے گا تو اسے استیذان کی ضرورت ہو گی یا نہیں، اس میں احادیث ذرا مختلف نظر آرہی ہیں۔ ایک حدیث تو آگے الفصل الثانی میں آرہی ہے ۔اذدعی احدکم فجاء مع الرسول فکان ذلک لہ اذن ۔کہ جب تمہیں بلوایا جائے اور تم اس آدمی کے ساتھ آؤ جس کے ذریعے سے بلوایا گیا تھا تو یہ بلوانا ہی استیذان ہے۔ مزید استیذان کی ضرورت نہیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے رسول الرجل الی الرجل اذنہ، ایک آدمی کا نمائندہ دوسرے کے پاس بلوانے کے لئے گیا تو یہی اذن ہے۔ لیکن یہاں اس واقعے میں حضرت عمرؓ نے حضرت موسیٰ اشعریؓ کو خود بلوایا تھا۔ مگر جب حضرت موسیٰ اشعریؓ گئے تو بغیر استیذان کے اندر نہیں گئے بلکہ تین مرتبہ استیذان کیا۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث اسی فصل کے آخر میں آرہی ہے کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا کہ جاؤ اصحابِ صفہ کو بلا کے لاؤ، چنانچہ میں انہیں بلا کر لایا۔ جب وہ آئے تو انہوں نے استیذان کیا، اجازت طلب کی۔ اس سے بظاہر معلوم ہو رہا ہے کہ اس صورت میں بھی استیذان کرنا چاہئے۔ یہ دو طرح کی روایات ہیں جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آرہی ہیں۔ ان کو علما نے مختلف طریقوں سے جمع کیا ہے۔ مثلاً ایک تطبیق یہ ہے کہ اگر بلایا ہوا شخص بلانے والے نمائندے کے ساتھ ہی آرہا ہے تو استیذان کی ضرورت نہیں ہے اگر پیغام پہنچا دیا ہے کہ فلاں صاحب آپ کو بلا رہے ہیں اور بلایا ہوا شخص اپنے طور پر اکیلا آرہا ہے تو استیذان کی ضرورت ہے۔ ایک تطبیق یہ ہے کہ یہاں دوسری صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بلانے والے کے بلانے اور اس شخص کے اس کے پاس آنے کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ بلانے والا اسی حالت میں اس کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بلائے جانے اور اس کے آنے کے درمیان وقفہ اور فاصلہ ہے۔ پہلی صورت میں استیذان کی ضرورت نہیں، جبکہ دوسری صورت میں استیذان کی ضرورت ہے۔ تاہم پہلی صورت میں بھی استیذان

کرنے میں حرج نہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرۃ والے واقعہ میں اہلِ صفہ نے جو استیذان کیا ہے اس کی وجہ بعض حضرات نے وفورِ ادب اور وفورِ حیا بیان کی ہے۔ بہر حال موقع محل دیکھ لینا چاہئے۔

اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہاں یہ فرمایا گیا کہ کسی کے پاس بلانے والے کا چلا جانا ہی اذن ہے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی امرِ تعبدی تو ہے نہیں، بلکہ یہ حکم معلول بالعلۃ ہے، اور وہ علت یہ ہے کہ یہ بلانا دلالتاً اذن ہے۔ اصل حکم شرعی یہ ہے کہ دوسرے کی پرائیویٹ جگہ اس کی صراحتاً یا دلالتاً اجازت کے بغیر نہیں جانا چاہئے۔ اب کونسا بلانا دلالتاً اذن ہے کونسا نہیں، یہ موقع محل کے بدلنے سے بدل جاتا ہے۔ جہاں بلانا دلالتاً اجازت سمجھا جائے وہاں پر بغیر استیذان کے جاسکتا ہے اور جہاں دلالۃً اذن نہ سمجھا جائے وہاں استیذان کرنا چاہئے۔ یعنی استیذان کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ اب کئی صورتیں ہوسکتی ہیں اب ایک آدمی باہر بیٹھے ہوئے تھے اور میں اندر بیٹھا ہوا تھا میں نے کہا کہ فلاں صاحب باہر سے تشریف فرما ہیں ان کو اندر بلالاؤ۔ اب اس کے آنے میں اور بلائے جانے میں بالکل معمولی فاصلہ ہے اس صورت میں استیذان کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ میں بالکل اس سے ملنے کے لئے تیار ہوں کسی اور سے بھی کوئی بات نہیں کر رہا۔ اور کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے کہ اس کے آنے سے مجھے تشویش ہوگی۔ ایک صورت یہ ہے کہ میں نے کسی سے کہا کہ فلاں کو بلا کے لاؤ اب وہ بلانے گیا اور گھنٹہ لگ گیا، اِدھر اُدھر تلاش کیا پھر پیغام پہنچایا پھر وہ صاحب آئے۔ اب ظاہر ہے کہ میں ہر وقت اسی سے ملنے کے لئے ذہناً اسی کے لئے تیار ہو کر نہیں بیٹھا ہوں گا۔ پتا نہیں کہ میں اس وقت اس کا آنا مناسب سمجھوں یا نہ سمجھوں تو اس صورت میں اگرچہ وہ بلوایا ہوا آیا ہے مگر اسے استیذان کرنا چاہئے۔ تو اصل اصول کو مد نظر رکھتے ہوئے موقع محل کے مطابق فیصلہ کر لینا چاہئے۔

حضرت عمر نے ابوموسی اشعری کو جواب کیوں نہیں دیا:

یہاں پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو خود بلوایا تھا لیکن جب تین مرتبہ استیذان کیا حضرت عمر نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی دو وجہیں شارحین نے بیان کیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ حضرت عمر کسی کام مصروف ہوں گے جس کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر ہو گئی ہو گی اور یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ تین مرتبہ استیذان کر کے واپس چلے جائیں گے کیونکہ اس حدیث کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم نہیں تھا۔ دوسری وجہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوئی ہے کہ حضرت عمر کو پتا چلا یا بعض ذرائع سے اندازہ ہوا کہ جس زمانے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوفہ کے گورنر اور عامل تھے اس زمانے میں عام طور پر ملاقاتی باہر کھڑے رہتے تھے اور ان کو ملاقات میں تنگی پیش آتی تھی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو تنبیہ کرنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا۔ چنانچہ روایتوں میں آتا بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جس طرح تمہارے اس احتساب سے یعنی میرے بلانے سے اور آپ کے باہر کھڑے رہنے سے جس طرح آپ کو تکلیف ہوتی ہے اسی طرح لوگوں کو بھی تکلیف ہوتی ہو گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنبیہ کرنا مقصود تھا۔ دونوں وجہیں جمع بھی ہو سکتی ہیں کہ اصل میں تو حضرت عمر نے مصروفیت کی وجہ سے ایسا کیا جب یہ واقعہ پیش آگیا تو حضرت عمر نے تنبیہ کے لئے بھی اس واقعہ کو استعمال کر لیا کہ دیکھو تم کو تکلیف ہوئی یا نہیں بغیر کسی وجہ کے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچانی چاہئے۔ ہاں اگر ضرورت کی بنا پر ہو تو کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر نے خود مصروفیت کی وجہ سے جواب نہیں دیا اور حضرت ابوموسی اشعری کو باہر کھڑے رہنا پڑا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری واپس چلے گئے بعد میں حضرت عمر نے پوچھا کہ میں نے بلایا تھا آپ آئے کیوں نہیں؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ میں حاضر ہوا تھا تین مرتبہ سلام اور استیذان کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا تو میں واپس چلا گیا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان میں نے سنا ہوا تھا کہ تم تین مرتبہ استیذان کرو اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے جاؤ۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تم نے حدیث نقل کی ہے اس پر گواہ

بھی پیش کرو۔ حضرت ابو موسیٰ پریشان ہو گئے کہ پتا نہیں اب کسی نے یہ بات سنی ہو گی یا نہیں۔ کچھ انصار بیٹھے ہوئے تھے تو حضرت ابو موسیٰ ان کے پاس گئے اور کہا کہ میرا یہ مسئلہ ہے اگر تم میں سے کسی نے واقعی حضور ﷺ سے سنا ہو تو حضرت عمرؓ کے پاس جا کر میرے حق میں گواہی دے دے۔ انصار نے کچھ دیر تو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مذاق کرتے رہے کہ اب تم پھنسے ہو تو اتنی آسانی سے تمہیں نہیں چھڑائیں گے۔ کچھ دیر بعد حضرت ابو سعید خدریؓ نے کہا کہ بیچارے پھنسے ہوئے ہیں وہ اٹھے اور جا کر حضرت عمرؓ کے پاس گواہی دے دی تو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی جان چھوٹی۔

ابو موسیٰ اشعریؓ سے حضرت عمر کے گواہ طلب کرنے کی وجہ:

اب سوال یہ ہے کہ کیا حضرت عمر کو حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت پر اعتماد نہیں تھا۔ یا کیا حضرت عمر خبر واحد کو حجت نہیں مانتے تھے۔ اس روایت کو بنیاد بنا کر بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت عمر خبر واحد کو حجت نہیں مانتے تھے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ خبر واحد کو تو حجت مانتے تھے لیکن یہ ضروری سمجھتے تھے کہ روایت کرنے والے کم از کم دو ہوں جیسا کہ بعض محدثین سے بھی یہ رائے منسوب ہے۔ انہوں نے اس سے استدال کیا ہے۔

لیکن یہ دونوں باتیں درست نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خبر واحد کو حجت سمجھتے تھے اس لئے کہ بہت سارے واقعات اس طرح کے آتے ہیں جہاں حضرت عمر کے سامنے کسی ایک صحابی نے کوئی حدیث نقل کی تو حضرت عمر نے اس کے مطابق عمل کیا۔ اس طرح کی کافی روایات آتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ حضرت عمر خبر واحد کو حجت نہیں سمجھتے تھے یہ لاعلمی کی بات ہے۔ یہاں پر بھی کہ دوسرے آدمی کی گواہی مل گئی تب بھی وہ خبرِ متواتر تو نہیں بلکہ خبر واحد ہی ہے لہٰذا اس سے خبر واحد کی عدم حجت ثابت نہیں کی جا سکتی۔

اب رہے دوسرے لوگ جو کہتے ہیں کہ خبر واحد ویسے حجت تو ہے لیکن نقل کرنے والے کم از کم دو ہوں تو یہ بات بھی یہاں سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے بہت سارے موقعوں پر حضرت عمر نے صرف ایک شخص کی روایت

کو قبول کر کے اس پر عمل فرمایا ہے اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ لیکن سوال پھر بھی باقی ہے کہ اگر خبر واحد بھی حجت ہے اور اس کے لئے دو آدمیوں کا ہونا بھی ضروری نہیں تو حضرت ابو موسیٰ اشعری سے دوسرے گواہ لانے کے لئے کیوں کہا گیا۔ کیا حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت پر اعتماد نہیں تھا ان کو ثقہ راوی نہیں سمجھتے تھے؟ یہ بات نہیں ہے اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے خود تصریح فرمائی بعد میں کہ میں نے جو گواہ طلب کیا وہ اس وجہ سے نہیں کہ مجھے تمہاری روایت پر اعتماد نہیں تھا۔ یہ وجہ نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسی اشعری سے کہا: والله إن كنت لأمينا على حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ولكن أحببت أن أستثبت [1]۔

اس کی جو معروف وجہ ہے وہ یہ ہے اور یہی اصل وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر یہ چاہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے میں لوگ غیر محتاط نہ ہو جائیں کہ ایسے ہی کچی پکی بات ویسے ہی آگے نقل کرنے لگ جائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا ہے۔ لوگوں کے اندر احتیاط کی عادت ڈالنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا۔ بذات خود حضرت عمر نے اس کی تصریح بیان فرمائی ہے کہ تم پر اطمینان ہے لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ لوگ کہیں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جری نہ ہو جائیں۔

خاص طور پر اس موقع پر اگر حضرت عمر اس روایت کو قبول کر لیتے تو بعض اور لوگوں کے جری ہونے کا امکان تھا۔ ایک خاص وجہ سے وہ یہ کہ یہاں حضرت ابو موسیٰ اشعری نے عام حالت میں حدیث نہیں سنائی بلکہ حدیث سنائی اپنا ایک عذر ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ میں نے تمہیں بلایا تھا پھر بھی نہیں آئے۔ اپنا عذر پیش کرنے کے لئے یہ حدیث بالکل صحیح سنائی۔ یہ امکان اور احتمال بھی نہیں تھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے جان بچانے کے لئے، بہانہ بنانے کے لئے یہ بات بیان کی ہو گی۔ لیکن اگر حضرت عمر حضرت ابو موسی اشعری کی بات

---

[1]- فتح الباري 30/11

کو یوں ہی قبول کر لیتے تو حضرت عمر نے محسوس فرمایا کہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے لئے جرأت کا راستہ کھل جائے وہ کہیں جب بھی پھنسے ہوں تو جان بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کوئی حدیث بیان کر دو۔ کہ میں نے یہ کام اس لئے کیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث میرے علم میں آئی تھی۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کے بارے میں یا صحابہ کے بارے میں یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ جری ہوں، یوں ہی حدیثیں بیان کرنے لگ جائیں گے۔ لیکن ان کو دیکھ کر دوسروں کو جرأت بڑھ سکتی تھی اس لئے اس خاص موقع پر ایسا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اسی سے اس سوال کا جواب بھی ہو گیا کہ یہاں اگر تثبت کی اور دوسرے لوگوں کو بے احتیاطی سے بچانے کی ضرورت تھی تو اور جگہوں پر جہاں حضرت عمرؓ نے ایک شخص کی روایت کو قبول کر کے اس پر عمل کر لیا تو وہاں اس کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ تو بات موقع محل کی ہوتی ہے۔ یہاں حالت ایسی تھی کہ اپنا ہی عذر بیان کر رہے تھے اور اپنا عذر بیان کرتے ہوئے اپنی جان بچانے کے لئے حضرت ابو موسیٰ اشعری جیسے شخص سے تو بے احتیاطی نہیں ہو سکتی لیکن کچے لوگوں سے کچا پن ہو سکتا ہے۔

استیذان کی ایک خاص صورت

(۲) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِذْنُكَ عَلَيَّ أَنْ تَرْفَعَ الْحِجَابَ وَأَنْ تَسْمَعَ سِوَادِي حَتَّى أَنْهَاكَ». رواه مسلم.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تمہاری میرے ہاں اجازت یہ ہے کہ تم پردہ اٹھاؤ اور میری پوشیدہ باتوں کو سن لو یہاں تک کہ میں تمہیں منع کر دوں۔

اس حدیث سے ایک تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی فضیلت و منقبت اور ان کا حضور اقدس ﷺ سے خصوصی تعلق سمجھ میں آرہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے میرے ہاں آنے کے لئے اس طرح کے استیذان کی ضرورت نہیں جس طرح دوسرے لوگوں کو ہوتی ہے۔ جب چاہو آجاؤ۔ ہاں البتہ میں منع کروں تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارے لئے اجازت ہی اجازت ہے۔ اگرچہ بظاہر کسی سے باتیں بھی کررہے ہوں بلکہ تنہائی کی باتیں کررہے ہوں تب بھی تم آسکتے ہو تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق کیسا تھا۔ چنانچہ ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ جب ہم یمن سے آئے تو ہم کافی دیر تک یہ سمجھتے رہے کہ عبداللہ بن مسعود آپ کے گھر کے فرد اور اہل بیت میں سے ہیں۔ آپ کے گھر میں آنا جانا اتنی کثرت سے تھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ ان کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ نسبی طور پر کوئی رشتہ نہیں تھا۔

یہاں ان ترفع الحجاب میں دو نسخے ہیں۔ ایک نسخہ تو یہ ہے جو ہمارے سامنے ہے اس سے مطلب یہ بنتا ہے کہ تمہیں استیذان کی ضرورت نہیں بس پردہ اٹھاؤ اور اندر آجاؤ۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دروازہ کھلا ہو تو تمہیں اجازت ہے ہاں اگر دروازہ بند ہو تو پھر اجازت لے لو۔ یعنی جہاں اندر آنے کے لئے صرف پردہ ہٹانے کی ضرورت ہو وہاں تمہیں استیذان کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر صرف پردہ اٹھانے کی بجائے دروازہ بھی کھولنا ہو تو استیذان کرکے کھولو۔ صحیح مسلم اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں یہ لفظ یوں ہے: ان یُرفَع الحجابُ۔ تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر پردہ اٹھا ہوا ہو تو اندر آنے کی اجازت ہے آسکتے ہو بے تکلف استیذان کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر پردہ دروازے پر لٹکا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اجازت نہیں ہے۔ چونکہ عبداللہ بن مسعودؓ کا آپ کے ہاں بکثرت آنا جانا تھا اس لئے ہر دفعہ اجازت لینے کا پابند کرنے کی بجائے ایک علامت مقرر کردی۔ تاکہ ہر دفعہ صراحتاً اجازت لینے کی زحمت نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی کے ساتھ خصوصی تعلق ہو تو کوئی علامت بھی مقرر کی جاسکتی ہے کہ اگر یہ علامت پائی جائی تو آجایا کرو اگر یہ علامت نہ پائی جائے تو اجازت لے کر آیا کرو۔

ہاں البتہ یہاں ایک اور بات بظاہر سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ آپ نے فرمایاان تسمع سوادی حتی اُنہاک، کہ تم اندر آکر میری باتیں بن سکتے ہو یہاں تک کہ میں منع کر دوں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی بھی گنجائش ہے کہ اگرچہ یہاں استیذان کی ضرورت نہیں لیکن اطلاع پھر بھی کرنی چاہئے، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ اور آگے حدیث میں بھی آرہا ہے کہ اپنے گھر میں جاتے ہوئے بھی اگرچہ استیذان کی ضرورت نہیں تاہم اطلاع پھر بھی کرنی چاہئے۔ حضرت ابن مسعود کے ساتھ بھی معاملہ چونکہ گھر والا ہی تھا اس لئے استیذان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے -واللہ اعلم- کہ اطلاع کی ضرورت پھر بھی ہوگی اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ فرمارہے ہیں کہ اِلا یہ کہ میں تمہیں آگے آنے سے منع کر دوں۔ منع کرنا تب ہی ہوگا جبکہ کم از کم اطلاع تو اپنے آنے کی کریں۔ اگر بغیر اطلاع کے ہی چپکے سے آکر بیٹھ جانا ہے تو پھر منع کرنے کی صورت ہی نہیں بنتی۔ اس کی تائید آگے آنے والی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کے ہاں جاتے تھے تو آپ کھانستے تھے، کھانسنے کو علامت مقرر کیا ہوا تھا۔ اب یہاں بھی ظاہر ہے کہ کھانسنا تبھی ہوگا جبکہ رسول اللہ ﷺ کو کم از کم اطلاع تو ہو۔

بات صاف کرنی چاہئے

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دَيْنٍ كَانَ عَلَى أَبِي فَدَقَقْتُ الْبَابَ فَقَالَ: «مَنْ ذَا؟» فَقُلْتُ: أَنَا. فَقَالَ: «أَنَا أَنا» . كَأَنَّهُ كَرِهَهَا. متفق عليه.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قرضے کے سلسلے سے حاضر ہوا جو کہ میرے والد کے ذمہ تھا تو میں نے دروازہ کھٹکایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کون؟ میں نے کہا کہ میں ہوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ میں میں؟ گویا کہ آپ نے اسے ناپسند فرمایا

حضرت جابر ابھی نو عمر ہی تھے کہ ان کے والد غزوہ احد میں شہید ہو گئے۔ان کی یعنی حضرت جابر کی بہنیں بھی تھیں ۷ یا ۹ بہنیں تھیں،ان کے والد کے ذمے قرضے بھی بہت سارے تھے۔لہٰذا بہت ہی تنگ دستی اور مشکل میں تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدد فرمائی خاص طور پر قرض کی ادائیگی میں۔یہاں پر اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے ہیں۔قرضوں کے متعلق بات کرنے کیلئے۔ اس کا تفصیلی واقعہ آگے باب المعجزات میں آئے گا۔جب حضرت جابر اس مقصد کے لئے گئے تو وہاں جا کر دروازہ کھٹکایا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون؟ تو انہوں نے کہا کہ میں ہوں۔جواب میں تو آپ نے اس پر انکار یعنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ میں میں کیا ہوتا ہے۔بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر کی آواز ہی نہیں پہچانی ہو گی۔لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز پہچان لی ہو پھر بھی حضرت جابر کی تربیت اور انہیں ادب سکھانے کے لئے ایسا کیا ہو۔اس لئے کہ ویسے تو ہر آدمی ہی اپنے لئے 'میں' ہوتا ہے۔ایسے موقع پر نام لینے کی بجائے میں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگلے کو چاہئے کہ وہ مجھے صرف میری آواز سے پہچانے۔حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر کوئی ہر کسی کی آواز ہر وقت پہچان لیا کرے۔یہ توقع کرنا کہ دوسرا میری آواز پہچان لے یہ درست نہیں ہے کبھی انسان اپنے قریبی تعلق والے کی بھی آواز نہیں پہچان سکتا۔ لوگوں کی فون پر بھی ایک عادت ہوتی ہے کہ فون کرتے ہیں کہ پہچانا نہیں مجھے؟ کمال ہو گئی! آپ مجھے پہچانتے ہی نہیں! مذاق کی حد تک تو یہ بات درست ہے لیکن یہ توقع رکھنا کہ ہر وقت میری آواز پہچان لیا کرے یہ درست نہیں ہے۔اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز پہچان بھی لی ہو تو حضرت جابر کی اصلاح کے لئے ایسا فرمایا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی سے ایسی بات سرزد ہو جو قابل اصلاح ہو تو اس کی اصلاح تو کرنی چاہئے لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسے اپنے پاس سے دھتکار ہی دو۔آنحضرت ﷺ نے یوں نہیں فرمایا کہ جاؤ دفعہ ہو جاؤ تمہیں تمیز نہیں ہے میں تمہاری مدد نہیں کرتا۔

اصحابِ صفہ کو بلانے کا ایک واقعہ

(٤) وَعَن أبي هريرةَ قَالَ: دَخَلْتُ مَعَ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَجَدَ لَبَنًا فِي قَدَحٍ. فقَالَ: «أَبَا هِرٍّ الْحَقْ بِأَهْلِ الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ إِلَيَّ» فَأَتَيْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ فَأَقْبَلُوا فاسْتَأْذَنُوا فَأَذِنَ لَهُمْ فَدَخلُوا. رواه البخاري.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو آپ نے ایک پیالے میں دودھ پایا۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابوہریرہ! اہل صفہ کے پاس جاؤ ان سب کو میرے پاس بلا کے لاؤ چنانچہ میں ان کے پاس گیا اور ان کو بلالایا وہ آئے اور انہوں نے اجازت طلب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دی تو وہ اندر داخل ہوئے۔

یہ ایک معروف واقعے کا حصہ ہے جس میں آتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کو سخت بھوک لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گئے تو گھر میں دودھ کا ایک پیالہ تھا۔ مجھے تسلی ہوئی کہ چلو کچھ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پی لیں گے اور کچھ مجھے مل جائے گا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ اصحاب صفہ کو بلا کے لاؤ۔ یہ ساٹھ ستر آدمی تھے اب میں نے سوچا کہ اب تو ایک ایک گھونٹ بھی بمشکل آئے گا۔ بہر حال حکم کی تعمیل کے بغیر بھی کوئی چارہ کار نہ تھا اس لئے گیا اور انہیں بلا کے لایا۔ اب حضور اقدس ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ ان کو پلاؤ۔ قاعدہ یہ ہے کہ تقسیم کرنے والے کی باری ہمیشہ آخر میں آتی ہے۔ اب میں نے سوچا کہ پتا نہیں اب میرے لئے بچے گا بھی کہ نہیں۔ لیکن میں نے پلانا شروع کر دیا۔ پیالہ ایک سے لے کر دوسرے کو دیتا دوسرے سے تیسرے کو دیتا رہا، یہاں تک کہ سب نے دودھ پی لیا اور پیالہ ویسے کا ویسا ہی بھرا رہا۔ پھر میں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پلایا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پیا۔

الفصل الثانی

عملی تربیت کا ایک انداز

(٥) عَنْ كَلَدَةَ بْنِ حَنْبَلٍ: أَنَّ صَفْوَانَ بْنَ أُمية بَعَثَ بِلَبَنٍ وَ جِدَايَةٍ وَضَغَابِيسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالنَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَعْلَى الْوَادِي قَالَ: فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ وَلَمْ أُسَلِّمْ وَلَمْ أَسْتَأْذِنْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «ارْجِعْ فَقُلِ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، أَأَدْخُلُ». رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُد.

کلدۃ بن حنبل کہتے ہیں کہ صفوان بن امیہ نے مجھے دودھ، ہرن کا گوشت اور ککڑیاں دے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، رسول اللہ ﷺ اس وقت وادی کے اوپر والے حصے میں تھے۔ میں آپ ﷺ کے ہاں داخل ہوا اور سلام کیا نہ استیذان کیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور کہو: ''السلام علیکم، کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

جدایہ کا معنی ہے ہرن کے بچے۔ ضغابیس جمع ہے ضغبوس کی، اس کا معنی ہے چھوٹی ککڑی۔ صفوان بن امیہ نے کلدہ بن حنبل کو بھیجا۔ حضرت صفوان بن امیہ حضرت کلدہ بن حنبل کے ماں شریک بھائی ہیں۔ تو حضرت صفوان بن امیہ نے اپنے ماں شریک بھائی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کچھ ہدیہ دے کر کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دے آؤ۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں پر موجود تھے یہ وہاں بغیر استیذان اور اجازت کے داخل ہو گئے۔ اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم أأدخل۔ پھر تمہیں اجازت ملے تو اندر آنا۔

ایک دفعہ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا یہ بغیر استیذان کے داخل ہو چکے تھے اور جو قباحت اس میں تھی وہ تو لازم آ ہی چکی تھی لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ باہر جا کر دوبارہ صحیح طریقے سے اندر آؤ۔ یہ طریقہ ان کی تعلیم اور تربیت کے لئے اختیار کیا، اس لئے کہ عملی تربیت سے بات ذہن میں پختہ ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات محض زبان سے کہنے سے بات ذہن میں اچھی طرح بیٹھتی نہیں ہے اور عمل کے موقع پر یاد نہیں آتی۔ جب قولی تعلیم کے ساتھ کوئی عمل بھی شامل ہو جائے، خصوصاً ایسا عمل جو آدمی کو طبعی طور پر ذرا ناگوار بھی ہو تو ایسا عمل ضرور یاد رہتا ہے اور اس کے ساتھ وہ تعلیم بھی یاد آ جاتی ہے۔

(٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ – صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ – قَالَ: «إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَجَاءَ مَعَ الرَّسُولِ، فَإِنَّ ذَلِكَ لَهُ إِذْنٌ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ : قَالَ: «رَسُولُ الرَّجُلِ إِلَى الرَّجُلِ إِذْنُهُ».

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی آدمی کو بلایا جائے اور وہ نمائندے کے ساتھ آئے تو یہی اس کے لئے اجازت ہے۔ اور روایت کے لفظ یہ ہیں: آدمی کا کسی آدمی کی طرف نمائندہ اس کی اجازت ہے۔

دروازے کے سامنے کھڑا نہ ہوا جائے

(٧) وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُسْرٍ – رَضِيَ اللهُ عَنْهُ – قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ – صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ – إِذَا أَتَى بَابَ قَوْمٍ لَمْ يَسْتَقْبِلِ الْبَابَ مِنْ تِلْقَاءِ وَجْهِهِ، وَلَكِنْ مِنْ رُكْنِهِ الْأَيْمَنِ أَوِ الْأَيْسَرِ فَيَقُولُ: «السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، السَّلَامُ عَلَيْكُمْ» وَذَلِكَ

أَنَّ الدُّورَ لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا سُتُورٌ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَذُكِرَ حَدِيثُ أَنَسٍ : قَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ الله " فِي بَابِ الضِّيَافَةِ.

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے دروازے پر آتے تو دروازے کی ایک جانب کھڑے ہوتے۔ سامنے کی جانب کھڑے نہ ہوتے۔ بلکہ اس کے دائیں جانب یا بائیں جانب کھڑے ہوتے تھے اور یہ فرماتے تھے السلام علیکم السلام علیکم، اس وجہ سے کہ اس زمانے میں گھروں میں پردے نہیں ہوتے تھے۔

اس میں اصل حکم تو استیذان کا ہے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کرنی چاہئے۔ لیکن حدیث میں آتا ہے انما جعل الاستیذان من اُجل البصر کہ استیذان کی مشروعیت کی بڑی وجہ نظر کی حفاظت ہے کہ بغیر اجازت کے اندر نظر نہ پڑے۔ اس لئے اگر باہر کھڑا ہو کر اندر جھانک کر دیکھ رہا ہے تو استیذان کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس لئے جب تک اجازت نہیں ملتی اپنی نظر کو گھر میں پڑنے سے بھی بچانا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ طریقہ اختیار کرتے تھے کہ جب استیذان کرنا ہوتا تو دروازے کے دائیں جانب یا بائیں جانب کھڑے ہوتے تاکہ گھر کے اندر نظر نہ پڑے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس زمانے میں گھروں میں پردے نہیں ہوتے تھے شاید دروازے بھی نہ ہوتے ہوں تو گھر میں نظر پڑنے کا واقعی خطرہ ہوتا تھا۔ اگر اسی طرح کی صورت حال ہو کہ گھر میں دروازہ بھی نہ ہو پردہ بھی نہ ہو یا دروازہ کھلا ہوا ہو تو پھر تو بالکل سامنے نہیں کھڑا ہونا چاہئے یہ ضروری ہے کہ دائیں بائیں کھڑا ہو، تاکہ گھر میں نظر نہ جائے۔ لیکن اگر دروازہ ہو یا پردہ ہو تو بھی بہتر طریقہ یہی ہے کہ سامنے کھڑا نہ ہو دائیں بائیں کھڑا ہو۔ اس لئے کہ جب صاحبِ خانہ باہر آئے گا تو اس وقت تو دروازہ کھولے گا تو اس وقت اچانک اس کے گھر میں نظر پڑ سکتی ہے۔

یہ بھی فرمایا کہ اب السلام علیکم السلام علیکم فرماتے تھے یہ مطلب نہیں کہ دو مرتبہ فرماتے تھے مطلب یہ ہے کہ مکرر فرماتے تھے۔

الفصل الثالث

اپنے گھر میں بھی اطلاع کر کے جانا

(۸) عَنْ عَطَاءٍ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: أَسْتَأْذِنُ عَلَى أُمِّي؟ فَقَالَ: «نَعَمْ» فَقَالَ الرَّجُلُ: إِنِّي مَعَهَا فِي الْبَيْتِ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا» فَقَالَ الرَّجُلُ: إِنِّي خَادِمُهَا ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «اسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا ؛ أَتُحِبُّ أَنْ تَرَاهَا عُرْيَانَةً؟» قَالَ: لَا. قَالَ: «فَاسْتَأْذِنْ عَلَيْهَا» . رَوَاهُ مَالِكٌ مُرسلاً.

حضرت عطاء بن یسارؒ نے یہ بیان کیا کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کیا میں اپنی والدہ سے بھی استیذان کروں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں۔ اس آدمی نے کہا کہ میں تو اس کے ساتھ رہتا ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں تب بھی اجازت لو۔ اس آدمی نے کہا کہ میں اس کا خادم بھی ہوں (یعنی کثرت سے مجھے ان کے پاس آنا جانا پڑتا ہے) تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سے اجازت طلب کرو۔ کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تم اسے بغیر لباس کی حالت میں دیکھو تو انہوں نے کہا کہ نہیں تو پھر آپ نے فرمایا کہ پھر تم اجازت طلب کیا کرو۔

مطلب حدیث کا واضح ہے۔ سوال یہ تھا کہ اپنی والدہ کے پاس جاؤں تب بھی استیذان کروں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس نے یہ سمجھا کہ حکم شاید اس صورت میں ہو کہ میں الگ رہ رہا ہوں والدہ الگ رہ رہی ہو اس لئے سوال کیا کہ میں اور وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں کیا پھر بھی مجھے استیذان کرنا چاہئے تو آپ نے فرمایا کہ ہاں پھر بھی استیذان کرنا چاہئے۔ اس سائل نے سمجھا کہ شاید یہ اس صورت کی بات ہے جب گھر میں ایک آدھ دفعہ آنا پڑتا ہو اس

لئے سوال کیا کہ میں اپنی والدہ کا خادم بھی ہوں یعنی بکثرت مجھے آنا جانا پڑتا ہے۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تب بھی استیذان کرو۔ ان سب صورتوں میں استیذان کرنا چاہئے، اس لئے کہ استیذان کی وجہ ان سب میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ والدہ محرم ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ بے تکلفی میں کسی ایسی حالت میں ہو جس میں دیکھنا مناسب نہ ہو اس لئے استیذان کرنا چاہئے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس استیذان میں اور جو غیر کے گھر میں جاتے وقت ہوتا ہے اس میں فرق ہے کہ دوسرے کے گھر میں تو مقصود ہی اجازت طلب کرنا ہوتا ہے، جبکہ یہاں اصل مقصود اطلاع کرنا اور اچانک آدھمکنے سے گریز کرنا ہوتا ہے۔

استیذان میں حضرت علیؓ کی ایک خصوصیت

(۹) وَعَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: كَانَ لِي مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَدْخَلٌ بِاللَّيْلِ وَمَدْخَلٌ بِالنَّهَارِ فَكُنْتُ إِذَا دَخَلْتُ بِاللَّيْلِ تَنَحْنَحَ لِيْ. رَوَاهُ النَّسَائِيّ.

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات کے وقت بھی جانا ہوتا تھا اور دن کے وقت بھی۔ جب میں رات کے وقت داخل ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے کھانستے تھے۔

یعنی کھانسنا علامت ہوتی تھی۔ کھانسنا علامت ہو سکتی ہے اجازت دینے کی بھی کہ میں اگر کھانسوں تو مطلب یہ ہے کہ تم اندر آسکتے ہو اور اگر نہ کھانسوں تو مطلب یہ ہے کہ نہیں آسکتے۔ اور یہ اجازت ہو سکتی ہے عدمِ اذن کی بھی کہ جب کھانسوں تو باہر ہی رک جایا کرو۔ تو بہر حال اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صریح اجازت کے علاوہ بھی کوئی علامت مقرر کی جاسکتی ہے کہ فلاں چیز کو اذن یا عدم اذن کی نشانی سمجھا جائے۔

یہاں بعض شارحین نے اس پر بحث کی ہے کہ یہ تورات کی علامت تھی دن کی علامت کیا ہو گی۔اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم نے حضور ﷺ کے گھر میں جانا نہیں ہے۔ اگر جانا بھی ہوتا تو یہ علامت حضرت علی کے لئے تھی ہمارے لئے نہیں تھی۔دن کی علامت معلوم ہو یا نہ ہو اس سے ہمارے عمل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اصل جو دیکھنے کی بات ہے وہ یہ کہ اس سے مسئلہ کیا معلوم ہوتا ہے اس کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ دن کی علامت کیا ہو گی۔

(۱۰) وَعَنْ جَابِرٌ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَأْذَنُوا لِمَنْ لَمْ يَبْدَأْ بِالسَّلامِ» رواه الْبَيْهَقيّ في شعب الْإِيمَان.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سلام سے ابتدا نہ کرے اسے (اندر آنے کی) اجازت مت دو۔

اس حدیث کی متعدد تشریحات کی گئی ہیں۔ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ حدیث تادیب پر محمول ہو کہ جس کی تادیب اور تربیت تمہارے ذمے ہے اس کے ساتھ یہ برتاؤ کرنا چاہئے۔

باب المصافحۃ والمعانقۃ

الفصل الاول

صحابہ اور مصافحہ

(۱) عَن قتادةَ قَالَ: قُلْتُ لِأَنَسٍ: أَكَانَتِ الْمُصَافَحَةُ فِي أَصْحَابِ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نعم. رَوَاهُ الْبُخَارِيّ.

حضرت قتادہؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مصافحہ کرتے تھے انہوں نے کہا جی ہاں۔

جس کے دل میں رحمت نہ ہو۔۔

(۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَبَّلَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْحَسَنَ بْنَ عَلِيٍّ ، وَعِنْدَهُ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ. فَقَالَ الْأَقْرَعُ: إِنَّ لِي عَشَرَةً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ مِنْهُمْ أَحَدًا. فَنَظَرَ إِلَيْهِ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ: «مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ» مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ. وَسَنَذْكُرُ حَدِيثَ أَبِي هُرَيْرَةَ: «أَثَمَّ لُكَعُ» فِي بَابِ مَنَاقِبِ أَهْلِ بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ إِنْ شَاءَ تَعَالَى

وَذُكِرَ حَدِيثُ أُمِّ هَانِئٍ فِي بَاب الْأمان.

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ کا بوسہ لیا، اس وقت آپ کے پاس اقرع بن حابس بھی موجود تھے۔ تو اقرع نے کہا کہ میرے تو دس بچے ہیں، میں نے تو ان میں سے کسی کو نہیں چوما۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا، پھر فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم کیا بھی نہیں جاتا۔

اقرع بن حابس یہ ان صحابہ میں سے تھے جو مؤلفہ قلوب میں سے تھے تاہم بعد میں ان کا اسلام مکمل طور پر اچھا ہو گیا تھا[1]۔ مزاج میں فطری طور پر کچھ سختی اور بداوت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے حسن بن کو چوما تو اس پر انہوں نے کہا کہ آپ کے نواسے ہیں بالواسطہ اولاد ہیں اور میرے دس بیٹے ہیں بلاواسطہ، میں نے تو کبھی کسی کو نہیں چوما تو رسول اللہ ﷺ نے حیرت کے ساتھ ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ یہ رحم میں کمی کی علامت ہے اور جو دوسروں پر رحم نہ کرے اللہ کی جانب سے اس پر بھی رحم نہیں ہوتا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ کسی کے دل سے رحمت نکال لے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی خشکی کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ایک جگہ پر حضرت عمر کا واقعہ پڑھا کہ ان کے پاس ایک دفعہ ان کے عمال یعنی گورنروں میں کوئی شخص آیا۔ گھر میں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ بچے شرارتیں کر رہے ہوں گے جیسا کہ عام طور پر کیا کرتے ہیں۔ اس گورنر کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رعب پوری دنیا میں چھایا ہوا ہے اور ان بچوں کو کوئی پرواہ ہی نہیں۔ انہوں نے حضرت عمر سے پوچھا کہ آپ کے ہوتے یہ شرارتیں کر رہے ہیں۔ تو حضرت عمر نے فرمایا کہ جب تم گھر میں جاتے ہو گے تو تمہارے بچے بھی کھیلتے ہوں گے۔ اس نے کہا کہ مجال نہیں کہ کھیلیں۔ جب میں گھر میں جاتا ہوں تو ایسے دبک کر بیٹھتے ہیں کہ ان کو ہلنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسا شخص گورنر بننے کے قابل نہیں ہے۔ بعض آدمی اس مزاج کو کمال

[1] - الاصابہ لابن حجر۔

اور خوبی سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا کنڑول ہے لیکن حضرت عمر نے فرمایا کہ ایسا شخص اختیارات ملنے کا اہل نہیں جس کی طبیعت میں سختی ہو خشکی ہو۔

الفصل الثانی

مصافحہ: ذریعۂ مغفرت

(۳) عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ الله عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ إِلَّا غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَتَفَرَّقَا». رَوَاهُ أَحْمَدُ وَالتِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ. وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ قَالَ: «إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ فَتَصَافَحَا وَحَمِدَا اللهَ وَاسْتَغْفَرَاهُ غُفِرَ لَهُمَا».

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو دو مسلمان بھی ایسے ہوں جو آپس میں ملیں تو ایک دوسرے سے ہاتھ ملائیں تو ان کے جدا ہونے سے پہلے ضرور ان کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ یہ تو احمد ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے۔ ابو داود کی روایت میں ہے کہ جب دو مسلمان آپس میں ملیں اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملائیں اور اللہ تعالی کی حمد کریں اور اللہ سے مغفرت طلب کریں تو ان کی ضرور مغفرت کر دی جاتی ہے۔

(٤) وَعَن أنس رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ الله الرَّجُلُ مِنَّا يَلْقَى أَخَاهُ أَوْ صَدِيقَهُ أَيَنْحَنِي لَهُ؟ قَالَ: «لَا» . قَالَ: أَفَيَلْتَزِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ؟ قَالَ: «لَا» . قَالَ: أَفَيَأْخُذُ بِيَدِهِ وَيُصَافِحُهُ؟ قَالَ: «نَعَمْ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ.

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہااے اللہ کے رسول ہم سے کوئی شخص اپنے بھائی یا دوست کو ملتا ہے تو کیا اس کے سامنے جھکے تو آپ نے فرمایا کہ نہیں۔اس نے پوچھا کہ اسے گلے لگائے اور چومے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔اس نے کہا کہ کیا اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں۔

اس باب کی حدیثوں کے متعلق چند مسئلے ہیں۔پہلا مسئلہ مصافحہ کا ہے۔دوسرا معانقہ کا۔تیسرا تقبیل یعنی چومنے کا اور چوتھا کسی کی آمد پر اس کے لئے کھڑا ہونے کا۔پھر تقبیل کے مسئلے میں تقبیل الوجہ کا مسئلہ ہے یعنی منہ چومنا اور دوسرا تقبیل الیدین والرجلین یعنی ہاتھ پاؤں چومنے کا۔اس باب کی احادیث کا بنیادی طور پر ان چار مسئلوں سے تعلق ہے ان میں سے چوتھے مسئلے کے بارے میں آگے ایک باب آرہاہے باب القیام اس کے متعلق گفتگو وہاں پر کریں گے باقی تین مسئلوں کے بارے میں یہاں گفتگو کرتے ہیں۔

مصافحہ کا مسئلہ

پہلا مسئلہ ہے مصافحہ کا اس باب میں کئی احادیث ایسی ہیں جو مصافحہ کے استحباب پر دلالت کر رہی ہیں۔ اکثر فقہا کا مذہب یہی ہے کہ مصافحہ مشروع بلکہ مستحب ہے۔ہاں البتہ امام مالک سے بعض حضرات نے اس کی کراہت نقل کی ہے لیکن امام مالک سے دوسرا قول مصافحہ کی مشروعیت اور جواز کا بھی منقول ہے۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے-واللہ اعلم -کہ امام مالک نے جائزاور صورت کو کہا ہوگا اور مکروہ کسی اور صورت کو۔کوئی قباحت دیکھی ہوگی جس کی وجہ سے اس خاص صورت کو مکروہ کہا ہوگا۔یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلے مشروعیت کے دلائل کا علم نہیں ہوگا جب ان دلائل کا علم ہوا تو اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا۔بہر حال امام مالک کی اس ایک روایت کو چھوڑ کر باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ مصافحہ مشروع ہے۔

البتہ اس میں بھی وہی بات ہے کہ موقع محل کی رعایت ضروری ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ جس سے بکثرت ملاقات ہوتی ہے ایک محلے میں رہتے ہوں یا اکٹھے رہتے ہوں تو وہاں پر مصافحہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر ملاقات میں مصافحہ کرنا حرج کا باعث بن سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کسی آدمی کا ہاتھ مصروف ہو یا مصافحہ کرنے سے اس کے کسی قسم کی الجھن میں پڑنے کا اندیشہ ہو یا تکلیف کا امکان ہو تو مصافحہ نہیں کرنا چاہئے۔ مثلاً ہاتھ مصروف ہے یا ہاتھ میں کوئی چیز پکڑی ہوئی ہے اب مصافحہ کریں گے تو اسے وہ چیز رکھنی پڑے گی، یا سردی کا موسم ہے اس نے ہاتھ بغلوں میں دبائے ہوئے ہیں یا کوٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوئے ہیں ہاتھ گرم کئے ہوئے ہے اور آپ کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں تو اب آپ مصافحہ نہ کریں تو اچھی بات ہے۔ حاصل یہ کہ موقع محل کی بات ہوتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ نے اس کا فائدہ سمجھ کر مصافحہ نہیں کیا اور اس نے برا محسوس کر لیا اگر اس کا امکان ہو تو پھر مصافحہ کر لینا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ مصافحہ کرنے سے اس کو تکلیف اس سے نہیں ہوتی بلکہ خوشی ہوتی ہے تو مصافحہ کرنا مستحسن ہے۔

مصافحہ کا طریقہ:

یہ تو مصافحہ کی مشروعیت کا مسئلہ تھا۔ مصافحہ کس طرح کرنا چاہئے کسی حدیث میں اس کا کوئی طریقہ متعین نہیں ہے کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے کیا جائے یا دونوں ہاتھوں سے کیا جائے۔ آج کل بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ لیکن یہ بات بالکل غلط ہے۔ کئی وجہ سے پہلی وجہ یہ کہ جب کسی نص میں تعیین نہیں ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم عموم ہونا چاہئے۔ چاہے ایک ہاتھ سے ہو چاہے دونوں ہاتھوں سے ہو۔ لہٰذا دونوں ہاتھوں سے مصافحے کو بدعت کہنا درست نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ بھی امت کے تعامل میں چلا آرہا ہے۔ چنانچہ امام بخاری نے اس کے بارے میں مستقل باب قائم کیا ہے باب الاخذ بالیدین۔ اس باب میں انہوں نے نقل کیا ہے کہ حضرت حماد بن زید نے حضرت عبداللہ بن مبارک سے دو ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ یہ دونوں حضرات جلیل القدر محدث ہیں۔ اگر دونوں ہاتھوں سے مصافحہ بدعت ہوتا تو یہ حضرات دو ہاتھوں سے مصافحہ نہ کرتے۔ تیسرا یہ کہ امام بخاری اسی مذکورہ باب کے اندر حدیث نقل کی ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی

جو اصل میں تو تشہد کے بارے میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابن مسعود کو تشہد سکھایا اس حال میں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کا ہاتھ حضور کے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں تھا۔ یہ اگرچہ ملاقات والا مصافحہ نہیں ہے بلکہ مصافحۂ تعلیم ہے لیکن یہ بات تو فی الجملہ معلوم ہوئی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا تصور تھا۔ جب تعلیم کے وقت دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جارہا ہے تو لقا کے وقت دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے میں کیا قباحت ہوسکتی ہے۔ بظاہر یہی ہے کہ لقا کے وقت بھی مصافحہ دونوں ہاتھوں سے کرتے ہوں گے ۔

یہاں بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ یدی میرا ہاتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کے درمیان میں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابن مسعود کا ایک ہاتھ استعمال ہورہا تھا، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب ید کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد عام طور پر جنس ہوتی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ یہ بات انتہائی بعید ہے کہ حضور ﷺ نے تو دو ہاتھ بڑھائیں ہوں اور ابنِ مسعود نے ایک ہاتھ آگے کر دیا ہو۔ صحابہ کرام کی خواہش ہوتی تھی کہ ہمارا جسم زیادہ سے زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے ساتھ لگے تاکہ برکت حاصل ہو۔ چنانچہ اسی باب میں اس طرح کی بعض حدیثیں آگے آرہی ہیں۔ مثلاً حضرت اُسید بن حضیر کا واقعہ آرہا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی کمر کو اچھے طریقے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے ساتھ لگانے لگا۔ ان کی تو کوشش ہوتی تھی کہ ہمارا جسم نبی کے ساتھ لگے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی دو ہاتھ آگے کریں اور یہ ایک ہاتھ آگے کریں اور تیسرا یہ کہ ہمارے لئے حجت نبی کا فعل ہے یا ابنِ مسعود کا۔ چوتھی بات یہ کہ یہاں جو یدی یعنی میرا ہاتھ کہا، اس میں واحد کا صیغہ استعمال کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابن مسعود کے دونوں ہاتھ استعمال ہورہے تھے لیکن آں حضرت ﷺ کے ہاتھوں کے درمیان میں آپ کا ایک ہی ہاتھ تھا۔ بہر حال یہ کہنا کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بدعت ہے یہ درست نہیں۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرنا چاہئے دونوں ہاتھوں سے درست نہیں ان کا استدلال بنیادی طور پر اس بات میں ہے کہ جتنی احادیث مصا فحے کے بارے میں آئی ہیں ان میں ید کا لفظ آتا ہے یدین کا لفظ نہیں آتا اسی طرح اہل لغت نے بھی جہاں پر مصا فحے کی تعریف کی ہے ید کا لفظ بولا ہے یدین کا لفظ نہیں بولا اس کا جواب وہی ہے کہ جسم کے جتنے اعضا دودو ہیں جیسے دو کان دو آنکھیں دو پاؤں وغیرہ ان میں اکثر و بیشتر مفرد کا صیغہ بول کر پوری جنس مراد ہوتی ہے۔ جیسے قرآن مجید میں آتا ہے لا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک۔ کہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف نہ سمیٹو۔ یہاں ید سے مراد پوری جنس ہے۔ اسی طریقے سے حدیث میں آتا ہے من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ۔ مطلب یہ کہ اپنے ہاتھ سے تغییر کرے تو کیا مطلب ہوا۔ کہ ایک ہاتھ سے ہو تو کرے دونوں ہاتھوں کو استعمال نہ کرے۔ ایسے ہی حدیث میں آتا ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ یہاں پر بھی جنس ہی مراد ہے۔ اور یہاں پر مفرد کا صیغہ استعمال کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ مصافحہ دو ہاتھوں سے بھی کیا جائے تو ہاتھ دوسرے کے درمیان میں آتا ہے وہ ایک ہی ہوتا ہے۔

بہر حال یہ بات بالکل بلا دلیل ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ نص کے اندر تو کوئی طریقہ متعین نہیں ہے ہاں زیادہ مروّج طریقہ یہی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے اس لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ اگر کسی جگہ دو ہاتھ سے مصافحہ اتنا عام ہو چکا ہو، یا کسی شخص کے ساتھ دو ہاتھ سے مصافحہ کرنے کے لوگ اتنے عادی ہوں کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا اسے اپنے ساتھ اجنبیت اور بے رخی کا اظہار محسوس ہو تو دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا اور زیادہ اہم ہو جائے گا، اگرچہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا فی نفسہٖ مباح ہے ہاں اگر کسی جگہ پر تشبہ کی وجہ سے اس سے منع کیا جائے تو وہ الگ بات ہوگی۔

الوداع کے وقت مصافحہ:

اسی طرح بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ الوداع کے وقت یعنی رخصت ہونے کے وقت مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں۔ اس لئے کہ مصافحہ دراصل سلام ہی کی تکمیل ہے۔ سلام جیسے لقاء کے وقت ہوتا ہے ایسے ہی وداع کے وقت ہوتا ہے لہٰذا اس کے ساتھ اگر مصافحہ بھی کرلیا جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر ایک صریح حدیث بھی ہے وداع کے مصافحہ کے بارے میں یہ مشکوۃ ہی میں ہے۔ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا ودّع الرجل اخذ بیدہ فلا یدعہا حتی یکون الرجل ہو یدع ید النبی۔ یعنی رسول اللہ ﷺ جب کسی کو رخصت کرتے تو اس کا ہاتھ پکڑتے اور اسے تب تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک دوسرا شخص خود اپنا ہاتھ پیچھے نہیں کرلیتا تھا۔ اس موقع پر آپ یہ دعا پڑھتے أَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِینَکَ وَأَمَانَتَکَ وَخَوَاتِیمَ عَمَلِکَ[1]۔ اس حدیث میں صراحتاً الوداع کے وقت مصافحہ کا بیان ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت مسند احمد اور نسائی کی السنن الکبرے میں ہے اس میں یہ ہے کہ ایک تابعی قزعہ فرماتے ہیں کہ میں ابنِ عمر کے پاس تھا میں وہاں سے جب واپس آنے لگا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ ٹھہرو میں تمہیں اس طریقے سے رخصت کرتا ہوں جس طریقے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں رخصت فرمایا کرتے تھے اور پھر مجھ سے مصافحہ کیا نسائی میں صافحنی کے الفاظ ہیں کہ مجھ سے ابن عمر نے مصافحہ کیا اور وہی دعا پڑھی[2]۔

1۔ مشکوۃ المصابیح: کتاب الدعوات: باب الدعاء فی الاوقات، حدیث نمبر ۲۰، جامع ترمذی: کتاب الدعوات: باب مایقول اذا ودّع انسانا، حدیث نمبر: ۳۴۴۲۔

2۔ مسند احمد: حدیث نمبر: ۴۹۵۷، والسنن الکبری للنسائی حدیث نمبر: ۱۰۲۷۰

معانقہ کا حکم

دوسرا مسئلہ تھا معانقے کا۔اس کا کیا حکم ہے۔اس میں حدیثیں بھی مختلف ہیں اور فقہا کے اقوال بھی۔احادیث کو اگر دیکھیں تو حضرت انس کی زیرِ نظر حدیث سے بظاہر ممانعت معلوم ہوتی ہے کہ معانقہ نہیں کرنا چاہئے اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا افیلتزمہ ویقبلہ کیا اسے گلے لگالے اور چومے آپ نے فرمایا کہ نہیں۔لیکن اس کے برعکس بہت ساری احادیث میں مصافحہ کا جواز بھی معلوم ہوتا ہے مثلاً:

1. حضرت عائشہ کی حدیث اسی فصل یعنی الفصل الثانی میں آرہی ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی سفر سے مدینہ واپس آئے اور ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر باہر حضرت زید بن حارثہؓ کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ کا بدن ننگا تھا یعنی نیچے ازار تو تھی اوپر رداء نہیں تھی۔یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک ننگا تھا۔تو حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ سے معانقہ بھی کیا اور انہیں چوما بھی۔
2. اسی طرح اس سے اگلی حدیث ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے مصافحہ کرتے تھے تو حضرت ابوذر غفاری نے فرمایا کہ میری جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوتی تو آپ میرے ساتھ مصافحہ فرمایا کرتے تھے اور ایک دفعہ مجھے بلانے کے لئے آدمی بھیجا تو اس وقت میں گھر میں نہیں تھا بعد میں مجھے پتا چلا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے تو آپ نے میرے ساتھ معانقہ کیا۔فالتزمنی یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سینے سے لگایا۔حضرت ابوذر فرماتے ہیں فکان تلک اجود واجود اس دفعہ تو مزا ہی آگیا۔پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ ہوتا تھا اب معانقہ بھی کر لیا۔

3. اسی طریقے سے حضرت اسید بن حضیرؓ کی حدیث بھی آرہی ہے جب ترجمہ کریں گے تو وہاں پر تفصیل آجائے گی کہ وہ اپنے جسم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کے ساتھ لگارہتے تھے

4. اسی طرح بہت ساری روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر کو گلے بھی لگایا اور چوما بھی۔ آپ جانتے ہیں کہ حضرت جعفر ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور وہاں جب نجاشی کے پاس جانا پڑا بات چیت کے لئے تو مسلمانوں کے وفد کی ترجمانی بھی حضرت جعفر نے کی تھی اور یہ وہیں ٹھہر گئے تھے۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آگئے لیکن حضرت جعفر ابھی حبشہ میں ہی تھے۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے فارغ ہوئے تو اس موقع پر حضرت جعفر آپ کے پاس پہنچے۔ کافی عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جعفر کے ساتھ محبت بھی زیادہ تھی تو جب حضرت جعفر آئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار فرمایا ہے اٹھ کر کھڑے ہوئے آگے بڑھے ان کو گلے لگالیا اور انہیں چوما ہے۔ اکثر روایات میں آتا ہے قبّل ما بین عینیہ دو آنکھوں کے درمیان یعنی ماتھے پر بوسہ لیا اور بعض روایات میں قبّل شقتیہ کا لفظ بھی آتا ہے بیہقی کی شعب الایمان کی روایت ہے۔ بہر حال تقبیل اور معانقہ دونوں کا ذکر آتا ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا مجھے فتح خیبر کی بھی خوشی ہے اور حضرت جعفر کی آمد بھی خوشی ہے لیکن مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ زیادہ خوشی کس چیز کی ہے فتح خیبر کی یا جعفر کے آنے کی۔

اسی طرح کی اور بھی بہت ساری روایات ہیں جن میں کچھ تو اس باب میں آگے آجائیں گی کچھ اس کے علاوہ بھی ہیں جن سے معانقے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ تو حدیثیں مختلف ہو گئیں۔ دوسری طرف فقہا کے اقوال میں بھی اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد سے معانقے کی کراہت منقول ہے اور یہی مذہب امام مالک کا نقل کیا گیا ہے۔ جبکہ حنفیہ میں سے امام ابو یوسف اور دوسرے بہت سارے فقہا معانقے کے جواز کے قائل ہیں۔ تو ائمہ حنفیہ کا بھی اس بارے میں اختلاف ہو گیا۔ بعض حضرات نے یہاں مختلف اقوال میں ترجیح کا راستہ اختیار کیا ہے اور ترجیح دی ہے امام

ابویوسف کے قول کو۔امام طحاوی نے یہی نقطۂ نظر اختیار کیاہے۔ ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ اکثر احادیث جواز پر دلالت کررہی ہیں جبکہ نہی کی حدیث صرف ایک ہے حضرت انس والی اوراس کی سند پر بھی کلام کی گنجائش موجود ہے اس لئے ان حضرات نے ترجیح دی ہے امام ابویوسف کے قول کو۔

لیکن صحیح یہ معلوم ہوتاہے کہ ترجیح کی بجائے تطبیق کاراستہ اختیار کیاجائے اور تطبیق بھی ایسی ہو جس سے دونوں قول بھی جمع ہوجائیں اور دونوں قسم کی حدیثوں میں تعارض بھی مرتفع ہوجائے۔ تطبیق بہتر ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ امام محمد نے اپنا مذہب جامع صغیر میں بیان کیاہے اوراس میں امام ابویوسف کااختلاف نقل نہیں کیا۔حالانکہ امام محمد کی عادت یہ ہے کہ اگر کسی مسئلے میں ان کاامام ابوحنیفہ یاامام ابویوسف سے کوئی اختلاف ہو تو بیان کردیاکرتے ہیں۔ معلوم ہواکہ اصل مسئلہ میں ان ائمہ کے درمیان اختلاف نہیں ہے اس لئے ان اقوال کو جمع کرنے کی کوئی صورت ہونی چاہئے۔

تطبیق کاایک راستہ وہ ہے جس کو صاحبِ ہدایہ نے اختیار کیاہے وہ یہ ہے کہ نہی اس وقت ہے جب کہ آدمی ننگے بدن ہو یعنی پیٹ اور سینہ ننگا ہو یعنی صرف چادر باندھے ہوئے ہو۔اور جواز اس صورت میں ہے جبکہ بدن ننگا نہ ہو۔ لہٰذا نہی اور صورت میں ہے جواز اور صورت میں۔ جو کہتے ہیں کہ مکروہ ہے وہ پہلی صورت کی بات کررہے ہیں اور جو کہتے ہیں جائز ہے وہ دوسری صورت کی بات کررہے ہیں، لہٰذا اختلاف لفظی ہوا حقیقی نہ ہوا۔اس سے حدیثیں بھی جمع ہوگئیں کہ جن احادیث میں معانقہ کاجواز ہے وہ پہلی صورت میں ہے اور جس میں نہی ہے وہ دوسری صورت میں ہے۔

حضرت مولانا ظفر احمد عثانی نے اس وجہ تطبیق سے اعلاء السنن میں اتفاق نہیں کیا۔وہ فرماتے ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر ننگے سینے کے ساتھ معانقے کی کراہت کی کوئی وجہ ہوسکتی ہے تو وہ مظنۂ شہوت امکانِ شہوت ہوناہے،اور اس معاملے میں دونوں صورتیں برابر ہیں۔اگر کوئی شخص ایساہے کہ جس سے معانقے کی صورت میں شہوت کاخطرہ

ہے پھر سینہ ڈھکا ہوا ہو یا نہ ہو دونوں صورتیں برابر ہیں، جیسے کوئی نعوذ باللہ نامحرم عورت سے معانقہ کرتا ہے یا ایسے امرد سے معانقہ کرتا ہے جس سے شہوت کا خطرہ ہو سینے پر کپڑا ہو یا نہ ہو اس معاملے میں دونوں صورتیں برابر ہیں۔ اور جہاں شہوت کا خطرہ نہیں وہاں انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے فرق کی وجہ کوئی خاص نہیں ہے اور حضرت زید بن حارثہ سے معانقہ کیا تھا حضور ﷺ نے اسی حالت میں کیا تھا کہ بدن ننگا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سینہ ننگا ہونے یا ڈھکا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ کوئی یہ توجیہ کر سکتا ہے کہ نہی اس صورت میں ہے جب دونوں کا سینہ ننگا ہو، اس صورت میں حضرت زید بن حارثہ کے واقعے کی بنیاد پر تو اشکال نہیں ہوگا تاہم محل شہوت ہونے میں دونوں صورتیں برابر ہونے والا اشکال باقی رہے گا۔ اس لئے علامہ ظفر احمد عثمانی نے تطبیق کا دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اور وہ کافی معقول بھی لگتا ہے، اس میں حدیثیں بھی بڑی آسانی سے جمع ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ معانقہ کی کئی صورتیں ہیں۔ ہر صورت کا حکم الگ الگ ہے۔ معانقہ اگر شہوت کی نیت سے کیا جائے تو یہ ناجائز ہی ہے الا یہ کہ وہ بیوی اور باندی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ معانقہ کیا جائے بطورِ تحیہ کے۔ یعنی یہ سمجھ کر کہ یہ ملاقات کا ایک شرعی ادب ہے اور وہی حیثیت ہے جو سلام اور مصافحہ کی ہے کہ جس طرح مصافحہ ملاقات کا ادب ہے اسی طرح معانقہ بھی شرعی تحیہ اور شرعی ادب ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ اس سے ملاقات کر کے خوشی بہت ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ آپ بے ساختہ طور پر اس سے معانقہ کریں گے ایک حیثیت معانقہ کی یہ ہے۔

ممانعت جہاں پر ہے وہ اصل میں تحیہ والی صورت میں ہے کہ اس خیال کے ساتھ معانقہ کیا جائے کہ یہ ملاقات کا شرعی ادب ہے۔ لیکن اگر فرطِ محبت، ہیجان شوق، سرورِ لقاء کی وجہ سے معانقہ کیا جاتا ہے تو یہ جائز ہے۔ جتنی حدیثوں میں بھی معانقہ کرنا آرہا ہے وہ اسی نوعیت کا ہے۔ اس کی تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام جب آپس میں ملتے تھے تو مصافحہ کرتے تھے اور جب سفر سے واپس آتے تھے تو معانقہ کرتے تھے۔ ملاقات پہلی صورت میں بھی ہو رہی ہے لیکن اس میں معانقہ نہیں کرتے تھے تو معلوم ہوا کہ معانقہ محض لقاء کا ادب نہیں ہے، تحیہ نہیں ہے، ہاں البتہ جب عام معمول کی ملاقات ہوتی ہے تو لقاپر اتنی خوشی نہیں ہوتی لیکن جب کوئی آدمی

سفر پر گیا ہوا ہو خاص طور پر اس زمانے کا سفر بہت لمبا ہوتا تھا اور آدمی بہت دیر کے بعد آتا تھا تو جب دیر سے اپنے تعلق والے سے ملاقات ہو تو خوشی زیادہ ہوتی ہے اس کی وجہ سے معانقہ کیا کرتے تھے۔ اگر خوشی کی وجہ سے معانقہ کیا جائے تو سب کے نزدیک اس کی اجازت ہے اور اگر تحیہ سمجھ کر کیا جائے تو ہمارے تینوں ائمہ کے نزدیک مکروہ ہے۔ تو کراہت کا قول اور صورت پر محمول ہے اور جواز کا قول اور صورت پر۔ لہٰذا دونوں قولوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔

عید کے دن معانقہ:

اسی سے ایک مسئلہ اور بھی حل ہو گیا۔ وہ یہ ہے کہ عید کے دن عید کی نماز کے بعد معانقہ کرنے کا کیا حکم ہے۔ اس میں بات یہ ہے کہ اگر اس کو عید کے شرعی آداب میں سے سمجھا جائے تو ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ کسی چیز کا شرعی ادب اس وقت بنتا ہے جب کہ اس کی کوئی شرعی دلیل بھی موجود ہو۔ اور دلیل شرعی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ خاص عید کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہو۔ ہاں البتہ اس ملاقات پر چونکہ خوشی ہوتی ہے اس لئے معانقہ کر لیا جائے تو کوئی حرج کی وجہ بھی نہیں بنتی۔ کس ملاقات پر خوشی زیادہ ہوتی ہے یہ امر عادی ہے امر شرعی نہیں ہے۔ یعنی یہ فیصلہ کرنا شریعت کا کام نہیں ہے کہ کونسی ملاقات پر خوشی زیادہ ہوئی ہے۔ بعض اوقات ملاقات تو اتنی دیر سے نہیں ہوتی البتہ خوشی کے موقع پر ملاقات ہو رہی ہوتی ہے اس لئے معانقہ کر لیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے اگر کر لیا جائے تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے۔ میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں۔ فرض کیجئے آپ کے کسی قریبی اور گہرے دوست کی شادی ہے۔ وہ نکاح کے لئے بارات لے کر گیا۔ آپ کسی وجہ سے ساتھ نہیں گئے۔ آپ کے ذمے انتظامات لگا دیئے ہوں۔ بارات اسی شہر بلکہ اسی محلے میں گئی اور چند گھنٹوں کے بعد وہ دلہن لے کر واپس آ گیا۔ اب اگرچہ اس سے تھوڑی ہی دیر کے بعد ملاقات ہو رہی ہے، اور اتنے عرصے بعد ہونے والی ملاقات میں عام طور پر مصافحہ بھی نہیں کیا جاتا، بلکہ سلام پر اکتفا کیا جاتا ہے، لیکن یہاں آپ ایسا نہیں کریں گے بلکہ اس کے گاڑی سے اترتے ہی آپ اس سے چمٹ جائیں گے اور مبارک باد دیں گے۔ اس لئے ایک خوشی کے موقع پر ملاقات ہو رہی ہے، یہ خوشی کے اظہار کا ایک انداز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔

چومنا:

چومنے میں دو مسئلے ہیں، ایک ہے تقبیل الوجہ یعنی منہ چومنا، اور دوسرا ہے تقبیل الیدین والرجلین، یعنی دست بوسی اور قدم بوسی۔ تو پہلے تقبیل الوجہ پر بات کرلیں۔ اس میں بھی ہمارے ائمہ امام محمد، امام ابو حنیفہ سے اس کی کراہت معلوم ہوتی ہے امام ابو یوسف سے اس کا جواز منقول ہے۔ حدیثیں دونوں طرح کی ہیں، بعض ممانعت پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ حضرت انس کی یہ حدیث۔ اور دوسری طرف بہت ساری احادیث جواز پر بھی دلالت کرتی ہیں جیسا کہ معانقے کی کئی حدیثیں ہم نے بیان کیں ان میں بہت ساری احادیث میں معانقے کے ساتھ تقبیل کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کی حدیث آرہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ چال ڈھال اور سیرت میں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ حضرت فاطمہؓ سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آتیں تو آپ ﷺ اٹھ کر ان کی طرف جاتے اور استقبال کرتے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر جاتے تو حضرت فاطمہ بھی ایسا ہی کرتیں، آپ کا ہاتھ پکڑتیں اور بوسہ دیتیں اور بیٹھاتیں۔ اس طرح کی اور بھی بہت ساری احادیث ہیں جو تقبیل کے جواز پر دلالت کر رہی ہیں۔ تو اس میں بھی وہی بات ہے کہ تقبیل کی کئی صورتیں ہیں، بعض صورتیں ممنوع ہیں اور بعض صورتیں جائز ہیں۔ مثلاً ایک ہے تقبیلِ شہوت، یہ محلّ شہوت میں جائز ہے یعنی بیوی اور باندی میں ویسے جائز نہیں ہے۔ اور ایک ہے تقبیلِ تحیہ کہ اس کو باقاعدہ طور پر تحیہ کا حصہ سمجھ کر کیا جائے تو حضرت انس کی حدیث میں جو نہی ہے وہ اسی صورت میں ہے۔ کیونکہ تحیہ صرف اور صرف سلام ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کی تکمیل مصافحہ سے ہوتی ہے اور کوئی چیز تحیہ کے اندر داخل نہیں ہے۔ اور ایک ہے تقبیلِ شفقت ورحمت یہ بالاتفاق جائز بلکہ مستحسن ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی کو چوما اس پر حضرت اقرع بن حابس نے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کسی کو نہیں چوما، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من لا یرحم لا یُرحم۔ اسی طرح اسی باب میں آرہا ہے کہ جب حضور ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شروع

میں مدینہ آئے تو حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت ابو بکرؓ کے گھر ان کے ہاں گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا لیٹی ہوئیں تھیں ان کو بخار تھا تو حضرت ابو بکرؓ ان کے پاس آئے اور یہ کہا بیٹی کیسی ہو؟ وقبّل خدہا اور ان کے رخسار کو چوما۔ یہ تقبیلِ شفقت یا تقبیل رحمت ہے۔ یہ جائز ہے جہاں پر شہوت کا خطرہ نہ ہو۔

ایک ہے تقبیل سرورِ لقاء کی وجہ سے۔ ملاقات پر خوشی ہوئی ہے اس کی وجہ سے ہیجانِ شوق کی وجہ سے بوسہ دیا تو یہ بھی جائز ہے۔ حضرت زید بن حارثہؓ کو چومنا، حضرت جعفر بن ابی طالب کو چومنا یہ سب اسی کے اندر داخل ہیں۔

ایک قسم ہے تقبیلِ تعظیم۔اسی سے ملتی جلتی ایک ہے تقبیلِ تبرک۔ یعنی برکت حاصل کرنے کے لئے چومنا۔ یہ دونوں صورتیں چونکہ ہاتھ اور پاؤں چومنے کی شکل میں ہوتی ہیں اس لئے ان پر بات اگلے عنوان کے تحت آرہی ہے۔

ہاتھ پاؤں چومنا:

اب آیئے ہاتھ پاؤں چومنے کی طرف۔ اس میں علما کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض اس کو جائز قرار دیتے ہیں اور بعض ناجائز۔ ہاتھ پاؤں چومنا عام طور پر یا تو تعظیم کے لئے ہوتا ہے یا تبرک حاصل کرنے کے لئے۔ اور اگر پہلی قسموں میں سے کسی قسم میں ہوگا تو وہی حکم ہوگا یعنی اگر شہوت کی وجہ سے ہوگا تو اس کا وہی حکم ہوگا اور اگر تحیہ کی وجہ سے ہوگا تو وہی حکم ہوگا اگر ہیجان شوق اور فرط محبت کی وجہ سے ہوگا تو اس کا وہی حکم ہوگا۔ لیکن عام طور پر ہاتھ پاؤں جو چومے جاتے ہیں وہ ان میں سے کسی میں داخل ہوتے نہیں ہیں بلکہ عام طور پر تبرک کے لئے ہوتا ہے یا تعظیم کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے حکم میں علما کے اقوال مختلف ہیں۔ حتی کہ ہمارے قریب کے زمانے کے اکابر کے رجحان مختلف ہیں۔ مثلاً مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی جواہر الفقہ میں اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ہے جس میں ان

کا رجحان جواز کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے اس مسئلہ پر اعلاء السنن میں بحث کی ہے اور ان کا زیادہ تر رجحان عدم جواز کی طرف ہے۔

مولانا عثمانی کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہیجان شوق اور فرط محبت کی وجہ سے ہو تو جائز ہے لیکن اگر تعظیم اور تبرک کے لئے ہو تو جائز نہیں ہے۔ فرق یہ پڑے گا کہ اگر ہیجان شوق یا سرور لقا کی وجہ سے ہو تو یہ اپنے بڑوں کے ساتھ خاص نہیں ہو گا بلکہ اپنے برابر والوں کے ساتھ بھی ہو گا اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی ہو گا اور اگر تبرک اور تعظیم کے لئے ہو تو یہ صرف بڑوں کے ساتھ ہو گا۔

اصل اور راجح بات کیا ہے۔ اس سے پہلے ایک بات یہ ذہن میں رکھ لیں کہ فی نفسہٖ ہاتھ پاؤں چومنا روایاتِ کثیرہ سے ثابت ہے۔ ان میں سے کئی روایات حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کتاب الاستیذان: باب الأخذ بالید میں جمع کر دی ہیں۔ جن میں سے چند روایات ہم پہلے آپ کے سامنے نقل کرتے ہیں۔

1. ان میں سے ایک جو سب سے پہلے ہے وہ ہے جو حضرت زراع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے جو اسی باب میں بھی آگے آ رہی ہے کہ یہ وفد عبدالقیس میں شامل تھے جب یہ وفد مدینے میں پہنچا تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی سواریوں سے اتر کر جلدی جلدی بھاگے تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پاؤں چومیں۔ فنقبل ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورِجلہ۔
2. حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک مرتبہ ان کو کسی لڑائی میں بھیجا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ وہاں سے بھاگ آئے اور مدینہ میں پہنچے۔ لیکن وہاں پہنچ کر خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ ناراض ہوں گے اس لئے سوچا کہ یہیں سے واپس چلے جاتے ہیں۔ پھر یہی رائے ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہر حال حاضر ہونا ہی چاہئے۔ چنانچہ خدمت میں حاضر ہوئے اور جا کر اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہوئے کہا نحن الفرّارون کہ ہم بھاگنے والے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا لا بل انتم العکارون، یعنی تم واپس لوٹ کر جانے والے ہو۔ تو اس موقع پر حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے۔

3. غزوہ تبوک کے موقع پر تین مخلص صحابہؓ ایسے تھے جو بغیر عذر کے پیچھے رہ گئے اور ان کا مقاطعہ کر دیا گیا تھا۔ تقریباً پچاس دن کے بعد ان کی توبہ نازل ہوئی۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں جو ان تینوں میں سے تھے کہ جب ہماری توبہ نازل ہوئی تو ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے۔

4. حضرت صفوان بن عسالؓ کی ایک روایت ہے جن کو امام ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دو یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو نو نشانیاں دی گئی تھیں تسع آیات بینات وہ کیا تھیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نو نشانیاں بتادیں تو ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو چوما۔

5. حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں قبلنا ید النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

6. حضرت عمرؓ کے بارے آتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ اٹھے اور اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے۔

7. حضرت بریدہؓ نے حضور اقدس ﷺ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک اعرابی نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کوئی نشانی دیکھایئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کو بلایا۔ وہ آپ کے پاس آگیا اور آکر آپ کو سلام کیا پھر دوبارہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا۔ اس پر اس اعرابی نے کہا کہ ائذن لی ان اُقبل رأسک ورجلک۔ یعنی اس اعرابی نے آں حضرت ﷺ سے آپ کا سر اور پاؤں چومنے کی اجازت لی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اجازت دی۔

8. صحابہ کرامؓ کے بھی بہت سارے واقعات ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ چومے اسی طرح زید بن ثابتؓ نے اتر کر حضرت ابن عباسؓ کے ہاتھ چومے اور فرمایا ہکذا امرنا ان نفعل باہل بیت نبینا ۔

9. ایک مرتبہ حضرت واثلہؓ نے فرمایا کہ میں نے اس ہاتھ کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی توان کے کسی شاگرد نے فرمایا کہ آپ اجازت دیں کہ میں اس ہاتھ کو چوموں تو حضرت واثلہ نے اس کی اجازت دی۔

10. حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ اسی طرح آتا ہے کہ ان سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ جس ہاتھ سے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ہمیں اجازت دیں کہ ہم اس ہاتھ کو چومیں تو حضرت سلمہ بن اکوع نے اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔

11. ایک موقع پر حضرت علیؓ نے حضرت عباسؓ کے ہاتھ چومے۔

12. حضرت ابو مالک اشجعیؓ نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن اَبی اوفیؓ سے کہا کہ اپنا وہ ہاتھ نکالئے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تاکہ میں اس ہاتھ کو چوموں چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور حضرت ابو مالک اشجعی نے اس کو چوما۔

یہ تو چند مثالیں ہیں۔اس طرح کے بہت سارے واقعات ملتے ہیں احادیثِ مرفوعہ میں بھی اور صحابہؓ کے عمل میں بھی۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ حافظ ابن حجر نے اس موضوع پر یہ روایتیں جمع فرمائیں ہیں اور یہ بھی لکھا ہے مشہور محدث ہیں حافظ ابن المقریٔ نے اس موضوع پر ایک رسالہ جمع کیا ہے۔اسی طریقے سے ایک مشہور محدث گزرے ہیں شیخ محمد عابد سندھی ان کا بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ہے الکرامۃ والتقبل کے نام سے۔ شیخ سندھی کے اس رسالے کی اکثر باتیں حضرت مفتی محمد شفیع کے رسالے میں آگئی ہیں۔اور میں نے جو روایتیں آپ کے سامنے رکھیں وہ انہی دو رسالوں میں سے لی گئی ہیں اکثر روایات انہیں دو رسالوں میں سے ہیں۔البتہ اس میں واثلہ بن اسقع اور سلمہ بن اکوع کی جو روایات آئی ہیں یہ مجمع الزوائد میں ہیں۔

ان روایات سے پتا چلا کہ تقبیل رجلین اور تقبیل الیدین کا ثبوت تو بلاشبہ ہے۔ البتہ علامہ ظفر احمد عثمانی کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ تقبیل رجلین اور تقبیل الیدین تعظیم اور تبرک کے لئے نہیں ہے بلکہ سرور لقا اور ہیجانِ شوق کی وجہ سے ہے، جیسا کہ معانقے میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام روایات پر غور کریں تو ان سب کو اس پر محمول کرنا مشکل ہے۔ ان میں بہت ساری روایات ایسی ہیں جن میں احترام، تبرک اور تعظیم کے علاوہ تقبیل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس لئے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبرک اور تعظیم کے لئے بھی ہاتھ پاؤں چومنا فی نفسہ جائز تو ہے اور روایات کثیرہ سے ثابت ہے ہاں البتہ اگر ان میں کوئی مفسدہ لازم آرہا ہو تو منع کیا جائے گا۔ ایک قباحت بعض اوقات اس میں یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی یہ چاہے کہ لوگ میرے ہاتھ پاؤں چومیں تو ظاہر ہے کہ یہ حب جاہ اور کبر ہے۔ ایسا چاہنا بھی برا ہے اور کسی کی ایسی فرمائش یا خواہش پوری کرنے کے لئے دست بوسی وغیرہ کرنا بھی بغیر مجبوری کے ناپسندیدہ ہوگا۔ یا یہ اندازہ ہے کہ میرے ایسا کرنے سے دوسرے کو تکلیف ہوگی وہ بوجھ محسوس کرے گا اس لئے کہ طبیعتیں ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ بعضوں کو اس طرح کے تکلفات یا تعظیمی مظاہر سے طبعی تنفر ہوتا ہے ایسی صورت میں اگلے کے مزاج کی رعایت رکھنی چاہئے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری پر صحابہ کا کھڑے ہونے کا معمول نہیں تھا، اس لئے کہ وہ جانتے تھے نبی کریم ﷺ پر اس سے گرانی ہوگی۔ اسی طرح کسی جگہ بہت سے لوگ ہیں اگر یہ تمام لوگ ایک ہی شخصیت کے ہاتھ پاؤں چومنے لگ جائیں تو اس کے لئے خاصی تکلیف کا باعث ہوگا۔ تو جہاں پر ایسے مفاسد پائے جائیں وہاں پر ظاہر ہے کہ دست بوسی اور قدم بوسی جائز نہیں ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ یہ تو دست بوسی اور قدم بوسی کا ثبوت اس وقت ہے جب کہ کبھی کبھار فرطِ محبت اور غلبۂ تعظیم میں ہو جائے۔ اس کو باقاعدہ معمول بنالینا کہ جب بھی کسی بزرگ یا عالم سے ملیں تو اس کا ہاتھ ضرور چوم لینا چاہئے یہ مناسب نہیں۔ مذکورہ روایات میں جو ثبوت ہے وہ یہ نہیں کہ ان کا معمول تھا بلکہ جہاں کہیں ہوا ہے احیاناً ہوا ہے۔ مفاسد بھی عموماً اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب اس کو معمول بنالیا جائے۔ جب معمول نہ بنایا جائے تو مفاسد بھی نہیں ہوتے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جب تقبیل بطور تعظیم کے ہو تو یہ بھی ضروری ہے کہ جس شخص کی آپ تعظیم کر رہے ہیں وہ قابل تعظیم ہو بھی سہی۔ لیکن اگر تقبیل ہو رہی ہے بطور سرور لقا کے تو پھر اس میں یہ خرابی نہیں ہو گی۔

بعض دفعہ قدم چومنے کے لئے جھکنا بھی پڑتا ہے اس کا کیا حکم ہے۔ تو قدم بوسی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جھکنا نہ پڑے مثلاً ایک شخص سواری پر بیٹھا ہوا ہے دوسرا اس کی قدم بوسی کرے گا تو اسے جھکنا نہیں پڑے گا، لیکن عام طور پر دست بوسی اور قدم بوسی کے لئے جھکنا بھی پڑتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے۔ کیونکہ اصل یہ ہے کہ دوسرے کے سامنے جھکنا ممنوع ہے جیسا کہ حضرت انسؓ کی اس زیر بحث حدیث میں ہے۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے ایسی دست بوسی یا قدم بوسی جس کے لئے دوسرے کے سامنے جھکنا پڑے وہ ناجائز ہو۔ لیکن حکیم الامت حضرت تھانوی کی رائے یہ ہے کہ یہ اس وقت ناجائز ہے جبکہ انحناء یعنی جھکنا ہی مقصود ہو۔ اگر جھکنا مقصود نہیں ہے اصل تو دست بوسی مقصود ہے اور جھکنا اس میں لازم آرہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ مشہور فقہی قاعدہ ہے الأمور بمقاصدہا۔

ادب ملاقات کی تکمیل مصافحہ سے

(٥) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ - رَضِيَ اللهُ عَنْهُ - أَنَّ رَسُولَ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَ: «تَمَامُ عِيَادَةِ الْمَرِيضِ أَنْ يَضَعَ أَحَدُكُمْ يَدَهُ عَلَى جَبْهَتِهِ، أَوْ عَلَى يَدِهِ، فَيَسْأَلَهُ: كَيْفَ هُوَ؟ وَتَمَامُ تَحِيَّاتِكُمْ بَيْنَكُمُ الْمُصَافَحَةُ». رَوَاهُ أَحْمَدُ، وَالتِّرْمِذِيُّ، وَضَعَّفَهُ.

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مریض کے حال پوچھنے میں کمال کا رجہ یہ ہے کہ تم میں کوئی شخص اپنا ہاتھ مریض کے ماتھے پر یا اس کے ہاتھ پر رکھے اور اس سے پوچھے کہ وہ کیسا ہے، اور آپس میں تمہاری ملاقات کے ادب کی تکمیل مصافحہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا زید بن حارثہ کو چومنا اور معانقہ کرنا

(٦) وَعَنْ عَائِشَةَ - رَضِيَ الله عَنْهَا - قَالَتْ: قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِينَةَ وَرَسُولُ الله - صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي بَيْتِي، فَأَتَاهُ فَقَرَعَ الْبَابَ، فَقَامَ إِلَيْهِ رَسُولُ الله عُرْيَانًا يَجُرُّ ثَوْبَهُ، وَالله مَا رَأَيْتُهُ عُرْيَانًا قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ، فَاعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت زید بن حارثہؓ مدینہ میں آئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تھے حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ننگے بدن اٹھ کر ان کی طرف گئے اس حال میں کہ آپ ﷺ اپنے کپڑے کو زمین پر گھسیٹ رہے تھے۔ اللہ کی قسم میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے پہلے نہ ننگے بدن دیکھا نہ اس کے بعد۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے معانقہ کیا اور ان کو چوما۔

یہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں فقام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عریانا اس کا مطلب یہ ہے کہ نیچے تہہ بند تو تھا اوپر ردا نہیں تھی۔ گویا کہ سینہ اور پیٹ وغیرہ ننگے تھے۔ اور یہ بھی عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس سے پہلے ننگے پیٹ اور ننگے سینہ کی حالت میں نہیں دیکھا۔ اس سے بظاہر ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ یہ مشکل ہے کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور گھر میں تو ایسی حالت ہوتی ہی رہتی ہے

کہ بدن ننگا ہوتا ہے۔ یہاں پر حضرت عائشہؓ یہ نہیں فرمانا چاہتیں کہ میں نے مطلقاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے نہیں دیکھا بلکہ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ کسی کا ایسا استقبال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یعنی کسی کو باہر ملنے گئے ہوں پیٹ اور سینہ کھلا ہوا ہو یہ صرف حضرت زید بن حارثہؓ کے لئے ہی ہوا کسی اور کے لئے میرے سامنے نہیں ہوا۔

نبی کریم ﷺ کا ابوذرؓ کو گلے لگانا

(۷) وَعَنْ أَيُّوبَ بْنِ بُشَيْرٍ، عَنْ رَجُلٍ مِنْ عَنَزَةَ، أَنَّهُ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي ذَرٍّ - رَضِيَ الله عَنْهُ: هَلْ كَانَ رَسُولُ الله - صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يُصَافِحُكُمْ إِذَا لَقِيتُمُوهُ؟ قَالَ: مَا لَقِيتُهُ قَطُّ إِلَّا صَافَحَنِي، وَبَعَثَ إِلَيَّ ذَاتَ يَوْمٍ وَلَمْ أَكُنْ فِي أَهْلِي، فَلَمَّا جِئْتُ أُخْبِرْتُ، فَأَتَيْتُهُ وَهُوَ عَلَى سَرِيرٍ، فَالْتَزَمَنِي، فَكَانَتْ تِلْكَ أَجْوَدَ وَأَجْوَدَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

بنو عنزہ کے ایک شخص کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تم سے مصافحہ کرتے تھے جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تھے تو حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور اقدس ﷺ سے جب بھی ملا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے مصافحہ ضرور کیا۔ اور ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلانے کے لئے میری طرف آدمی بھیجا۔ میں اس وقت اپنے گھر میں نہیں تھا۔ جب میں آیا تو مجھے اس کی خبر ہوئی (کہ مجھے حضور نے بلایا ہے) تو میں حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چارپائی پر تھے۔ تو آنحضرت نے مجھے سینے سے لگایا۔ یہ تو بہت ہی خوب ہوا (اس دفعہ تو مزا ہی آگیا)۔

عکرمۃ بن ابی جہل کی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری

(۸) وَعَن عكرمةَ بن أبي جهلٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ جِئْتُهُ: «مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جس دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ مبارک ہو ایسے سوار کو جو ہجرت کرنے والا ہے۔

اصل میں ہوا یوں تھا جب مکہ فتح ہوا تو حضرت عکرمہ مکہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام معافی کا اعلان کر رکھا تھا مگر حضرت عکرمہ کو یہ خیال ہوا کہ میں تو حضور اقدس ﷺ کے بدترین دشمن کا بیٹا ہوں۔ اس لئے میری جان تو کسی حالت میں بھی نہیں چھوٹ سکتی اس لئے یہ بھاگ گئے تھے۔ ان کی بیوی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام بھی قبول کیا اور یہ کہا کہ عکرمہ تو اس طریقے سے بھاگ گیا ہے۔ حضور اقدس نے فرمایا کہ اگر عکرمہ واپس آجائے ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے معافی دے دیں گے۔ تو انہوں نے کہا کہ اگر میں جاکر عکرمہ کو بتاؤں گی بھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معافی کا وعدہ فرمالیا ہے تب بھی عکرمہ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ حضور اقدس نے بطور نشانی کے اپنی رداء دے دی کہ یہ ساتھ لے جاؤ۔ چنانچہ یہ گئیں اور جاکر عکرمہ کو بتایا کہ حضور اقدس نے فرمایا ہے کہ اگر عکرمہ آجائے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے معاف کردیں گے۔ بڑی مشکل سے عکرمہ کو یقین آیا کہ مجھے بھی معافی مل سکتی ہے۔ اس لئے کہ ابو جہل حضور اقدس ﷺ کے ساتھ جو کچھ کیا اور کرایا اس کے مطابق اگر آں حضرت ﷺ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی معاف نہ کرتا۔ چنانچہ وہ واپس آگئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام بھی قبول کیا۔ اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرحبا بالراکب المہاجر۔ راکب تو اس لئے کہا کہ یہ سوار ہوکر بھاگے تھے سمندر کی طرف اور مہاجر ان کو لغوی معنی کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ مہاجر اصطلاحی تو وہ ہوتا ہے جو اپنا وطن اللہ اور رسول

کے لئے چھوڑے اور جب یہ اپنا وطن چھوڑ کر گئے تھے اللہ اور رسول کے لئے نہیں گئے تھے بلکہ جان چھڑانے کے لئے گئے تھے اور جب واپس آئے ہیں تو اللہ اور رسول کی طرف آئے ہیں لیکن وطن چھوڑ کر نہیں آرہے تھے بلکہ وطن واپس آرہے تھے اس لئے اصطلاحاً یہ ہجرت نہیں ہے لغوی معنی کے اعتبار سے اسے ہجرت کہیں گے۔

اس سے ایک مسئلہ معلوم ہوا وہ یہ کہ کسی کی آمد پر سلام تو اس سے کیا ہی جاتا ہے، اس کی تانیس کے لئے یا اس کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مزید کچھ الفاظ کہہ دیئے جائیں تو کچھ حرج کی بات نہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پر فرمایا مرحبا بالراکب المھاجر۔ یہ اس لئے فرمایا کہ ان کے دل میں رعب تھا کہ پتہ نہیں میرا کیا بنے گا سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے تھے تو ان کا ڈر اتارنے کے لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔

ایک صحابی کا آپ ﷺ کے پہلو کو چومنا

(۹)　وَعَن أُسَيدِ بن حُضَيرٍ - رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ - قَالَ: بَيْنَمَا هُوَ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ - وَكَانَ فِيهِ مُزَاحٌ - بَيْنَا يُضْحِكُهُمْ فَطَعَنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي خَاصِرَتِهِ بِعُودٍ فَقَالَ: أَصْبِرْنِي. قَالَ: «اصْطَبِرْ» . قَالَ: إِنَّ عَلَيْكَ قَمِيصًا وَلَيْسَ عَلَيَّ قَمِيصٌ ، فَرَفَعَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ قَمِيصِهِ فَاحْتَضَنَهُ وَجَعَلَ يُقَبِّلُ كَشْحَهُ قَالَ: إِنَّمَا أَرَدْتُ هَذَا يا رسولَ الله. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت اُسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جو کہ انصار میں سے ایک شخص تھے وہ فرماتے ہیں کہ ایک ایسے وقت جبکہ وہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے - اور ان کی طبیعت میں مزاح کی عادت تھی - یہ لوگوں کو ہنسا رہے تھے اسی اثنا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کوکھ میں لکڑی چھبو دی۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھے بدلہ دلوایئے تو حضور اقدس نے فرمایا کہ بدلہ لے لو۔ تو انہوں نے کہا کہ

آپ کے اوپر قمیص ہے اور میرے اوپر اس وقت قمیص نہیں تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قمیص اوپر کی تو یہ آپ کے ساتھ چمٹ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو کو چومنے لگے اور فرمایا کہ یا رسول اللہ! میرا مقصد تو یہ تھا۔

یہاں اس حدیث کی روایتیں دو طرح کی ہیں۔ بعض نے یہ روایت اس انداز سے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود حضرت اُسید بن حضیر کا ہے۔ جو یہاں مشکوۃ کے متن سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خود ابوداود وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت اسید بن حضیر کا نہیں ہے بلکہ کسی اور صحابی انصاری کا ہے، اسید بن حضیر محض روایت کرنے والے ہیں۔ یہ دوسری بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال جس شخص کا واقعہ ہے اس کو مزاح کی عادت تھی اسی طرح معمول کے مطابق لوگوں میں بیٹھے مزاح کر رہے تھے، لطیفے وغیرہ سنا رہے ہوں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں پہنچ گئے اور بطورِ مذاق کے اس کی کوکھ پر لکڑی ماری۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ نے لکڑی چبھوئی ہے میں بدلہ لوں گا حضور ﷺ نے فرمایا کہ بدلہ لے لو اس نے کہا کہ بدلہ اس طرح تو نہیں ہوتا۔ بدلہ تو اس طرح ہوتا ہے کہ جب کہ مساوات ہو۔ جب آپ نے لکڑی لگائی تھی اس وقت میرا جسم ننگا تھا اور آپ نے قمیص پہنی ہوئی ہے بدلہ اس طرح نہیں ہوتا آپ قمیص اوپر کریں پھر میں بدلہ لوں گا تو آپ نے قمیص اوپر کر لی انہوں نے بدلہ تو کیا لینا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چمٹ گئے برکت حاصل کرنے کے لئے اور مقصود ان کا یہی تھا۔ بدلہ لینا مقصود نہیں تھا۔ اس سے ایک تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع سمجھ میں آ رہی ہے۔ جس کے اندر زیادہ کبر ہوتا ہے وہ کبھی بھی اس طرح کے مزاح میں شریک نہیں ہوا کرتا۔ اسے تو اپنے مصنوعی وقار ہی کی فکر لاحق رہتی ہے۔ دوسرا یہ کہ جب اس نے بدلہ لینے کے لئے کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدلہ دینے کے لئے بھی فوراً تیار ہو گئے یہ آپ کی تواضع بھی ہے اور انصاف بھی۔ اور تیسرا یہ کہ جب اس نے کہا کہ بدلہ تب لوں گا جب آپ قمیص اوپر کریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لئے بھی تیار ہو گئے تو اس طرح حضور کی مزید تواضع اور انصاف سمجھ میں آیا۔

اس واقعے سے مزاح کا جواز بھی سمجھ میں آرہا ہے۔اس پر آگے مستقل باب آئے گا۔ تیسری بات یہ سمجھ میں آئی کہ کسی کو جسمانی تکلیف پہچانا اگرچہ بذاتِ خود ناجائز ہے لیکن اتنی معمولی تکلیف جس کو دوسرا برا نہ منائے اس طرح کی تھوڑی سی ''شرارت'' مذاق کے اندر کر لینے کی گنجائش ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں یہ لکڑی ان کے چبھوئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے کچھ نہ کچھ جسمانی تکلیف ہوئی ہو گی لیکن یہ یقین تھا کہ وہ برا نہیں منائیں گے اور کیا بھی مذاق میں تھا اس لئے یہ جائز تھا۔اس بات کا یقین ہونا ضروری ہے کہ دوسرا اس کو برا محسوس نہیں کرے گا۔ صرف یہ کافی نہیں کہ وہ برا کہے گا نہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ برا محسوس نہیں کرے گا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کہتا تو بیچارا کچھ نہیں اس لئے کہ اس کو پتا ہے کہ اگر میں کچھ کہوں گا تو سارے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ لیکن اتنا پتا ہوتا ہے کہ اس کو اچھا نہیں لگتا۔ اپنی اپنی طبیعتیں ہوتی ہیں۔ بعض اس طرح کے مذاق کو پسند کرتے ہیں بعض پسند نہیں کرتے تو جس کی اس طرح کی طبیعت ہو اس کو مذاق کر لینا چاہئے اور جس کی اس طرح کی طبیعت نہ ہو اس کے ساتھ نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت جعفر کو گلے لگانا اور چومنا

(١٠) وَعَنِ الشَّعْبِيِّ: أَنَّ النَّبِيَّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - تَلَقَّى جَعْفَرَ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، فَالْتَزَمَهُ وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ، وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ "مُرْسَلًا. وَفِي بَعْضِ نُسَخِ " الْمَصَابِيحِ ": وَفِي " شَرْحِ السُّنَّةِ " عَنِ الْبَيَاضِيِّ مُتَّصِلًا.

حضرت شعبی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا استقبال کیا اور انہیں گلے لگایا، انہیں اپنے ساتھ بٹھایا اور ان کو چوما اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ لیا۔

یہ روایت یہاں پر مرسل ہے اس لئے کہ شعبی تابعی ہیں اور براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کررہے ہیں۔ لیکن مصابیح کے بعض نسخوں میں یہ بات ہے کہ شرح السنہ میں یہی روایت شعبی سے مروی ہے لیکن شعبی نے یہ حدیث براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کی بلکہ درمیان میں بیاضی کا واسطہ ہے ۔ بیاضی ایک صحابی ہیں ان سے روایت کررہے ہیں تو اس صورت میں یہ حدیث مرسل نہیں رہے گی بلکہ مسند بن جائے گی۔ مشکوۃ میں ہی جو اگلی روایت آرہی ہے اسے بھی شعبی ہی روایت کررہے ہیں عبداللہ بن جعفرؓ سے اور وہ اپنے والد حضرت جعفرؓ سے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ بات متعدد روایات سے ثابت ہے کہ جب حضرت جعفر بن أبی طالبؓ حبشہ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا استقبال کیا اور بوسہ لیا([1])۔

(١١) وَعَنْ جَعْفَرِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ فِي قِصَّةِ رُجُوعِهِ مِنْ أَرْضِ الْحَبَشَةِ قَالَ: فَخَرَجْنَا حَتَّى أَتَيْنَا الْمَدِينَةَ فَتَلَقَّانِي رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاعْتَنَقَنِي ثُمَّ قَالَ: «مَا أَدْرِي: أَنَا بِفَتْحِ خَيْبَرَ أَفْرَحُ أَمْ بِقُدُومِ جَعْفَرٍ؟». وَوَافَقَ ذَلِكَ فَتْحَ خَيْبَرَ. رَوَاهُ فِي شَرْحِ السّنة.

حضرت جعفر سے روایت ہے کہ ان کے حبشہ کی سرزمین سے واپس لوٹنے کے قصے میں یہ فرماتے ہیں کہ ہم حبشہ سے نکلے یہاں تک کہ ہم مدینہ میں پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا استقبال کیا اور مجھے گلے لگایا۔ پھر فرمایا مجھے معلوم نہیں کہ مجھے فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے آنے کی اور ان کا آنا خیبر کے موقع پر ہوا تھا۔

1۔ مثلاً تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نصب الرایۃ ۴/۲۵۴ کتاب الکراہیۃ، الحدیث الثامن والعشرون، والبدر المنیر لابن الملقن ۹/۵۱ کتاب السیر الحدیث الثانی بعد العشرین، التلخیص الحبیر ۴/۲۵۴۔

اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت جعفر جب رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینے میں پہنچے تو آپ ﷺ نے ان کا استقبال کیا ہے۔ یہ بظاہر کسی روایت کرنے والے کا وہم معلوم ہوتا ہے یا واقعے میں اختصار کی وجہ سے تعبیر میں گنجلک پیدا ہوگئی۔ اصل بات یوں تھی کہ حضرت جعفرؓ حبشہ سے مدینہ منورہ کے ارادے سے چلے تھے، لیکن راستے میں انہیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خیبر میں ہیں تو یہ بھی وہیں آ گئے، ادھر خیبر فتح ہوا اور ادھر یہ حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔

عبدالقیس کے لوگوں کا آپ ﷺ کے ہاتھ پاؤں چومنا

(١٢) وَعَنْ زَارِعٍ وَكَانَ فِي وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ قَالَ: لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ يَدَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرِجْلَه. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت زارع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے اور یہ عبدالقیس کے وفد میں شامل تھے۔ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ میں پہنچے اپنی سواریوں سے جلدی جلدی اترنے لگے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پاؤں کو چومیں۔

حضرت فاطمہؓ اور تقبیل

(١٣) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ أَحَدًا كَانَ أَشْبَهَ سَمْتًا وَهَدْيًا وَدَلًّا - وَفِي رِوَايَةٍ حَدِيثًا وَكَلَامًا- بِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ فَاطِمَةَ. كَانَتْ إِذَا دَخَلَتْ عَلَيْهِ قَامَ إِلَيْهَا فَأَخَذَ بِيَدِهَا فَقَبَّلَهَا وَأَجْلَسَهَا فِي مَجْلِسِهِ

، وَكَانَ إِذَا دَخَلَ عَلَيْهَا قَامَتْ إِلَيْهِ فَأَخَذَتْ بِيَدِهِ فَقَبَّلَتْهُ وَأَجْلَسَتْهُ فِي مجلسِها. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو اپنی چال ڈھال اور طور طریقے میں - اور ایک روایت کے مطابق بات چیت اور کلام کے انداز میں - حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہو۔ جب حضرت فاطمہ حضور کے پاس آتیں تو آپ اٹھ کر ان کی طرف بڑھتے۔ اور ان کے ہاتھ کو پکڑتے، اور انہیں بوسہ دیتے اور انہیں اپنی جگہ میں بٹھاتے اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے پاس آتے تو حضرت فاطمہ بھی اٹھ کر آپ کی طرف بڑھتیں اور آپ کے ہاتھ کو پکڑتیں اور آپ کا بوسہ لیتیں آپ کو اپنی جگہ میں بٹھاتیں۔

یہاں پر دو تین لفظ ہیں۔ سمتا و ہدیا و ولاًّ۔ ان تینوں کا معنی تقریباً ایک ہے۔ عادت، طریقہ، چال ڈھال۔ یعنی حضور ﷺ کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت جس کی تھی وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھیں۔ اس میں یہ آیا کہ فاخذ بیدہا فقبلہا۔ تو قبّلہا کی ضمیر یدہا کی طرف نہیں لوٹ رہی یعنی قبل یدھا، بلکہ یہ ضمیر حضرت فاطمہؓ کی طرف لوٹ رہی ہے تو قبلھا کا معنی ہے قبّل فاطمۃ یعنی حضرت فاطمہ کو چومتے بوسہ لیتے تھے۔ بظاہر یہ ماتھے پر ہوتا تھا اس لئے کہ عربوں کے ہاں مروج یہی تھا۔ اور اسی کے مقابلہ میں دوسری طرف آرہا ہے فأخذت بیدہ فقبلتہ آپ کا ہاتھ پکڑتی اور آپ کو چومتی ہاتھ کو چومتی نہیں بلکہ آپ کو چومتی کیونکہ اگر ہاتھ کو چومتی تو فقبلتہا ہوتا۔

حضرت عائشہؓ اور تقبیل

(١٤) وَعَنِ البراءِ قَالَ: دَخَلْتُ مَعَ أَبِي بَكْرٍ رَضِيَ الله عَنْهُمَا أولَ مَا قدمَ المدينةَ فَإِذا عَائِشَةُ مُضْطَجِعَة قَدْ أصَابَتْهَا حُمَّى ، فَأَتَاهَا أَبُو بَكْرٍ فقَالَ: كَيْفَ أَنْتِ يَا بُنَيَّةُ؟ وَقَبَّلَ خدَّهَا. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شروع شروع میں مدینہ میں آئے تو میں ان کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوا۔ ان کی بیٹی عائشہ لیٹی ہوئیں تھیں۔ انہیں بخار تھا تو حضرت ابو بکر ان کے پاس آئے اور کہا کہ بیٹی کیسی ہو؟ اور ان کے رخسار کو چوما۔

بچے بخل اور بزدلی کا باعث لیکن اللہ کی رحمت

(١٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ الله عَنْهَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أُتِيَ بِصَبِيٍّ فَقَبَّلَهُ فقَالَ: «أَمَا إِنَّهُمْ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ وَإِنَّهُمْ لَمِنْ رَيحَانِ الله» . رَوَاهُ فِي «شرح السّنة».

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ لایا گیا آپ نے اس کو چوما پھر فرمایا کہ بات یہ ہے کہ یہ بچے بخل اور بزدلی کا باعث بھی ہیں اور یہ اللہ کی خصوصی عطا میں سے بھی ہیں۔

اس میں آپ ﷺ نے پہلے تو یہ فرمایا کہ بچے خاص طور پر اپنی اولاد انسان کے اندر بخل بھی پیدا کر دیتی ہے اور بزدلی بھی۔ اگر اولاد نہ ہو تو آدمی خرچ کرنے میں فراخ دل ہوتا ہے اس لئے کہ اس کو اپنی ذات کے علاوہ کسی کی فکر نہیں ہوتی اگر اولاد ہو، بچے ہوں تو آدمی خرچ کرنے میں ہاتھ کو ذرا تنگ رکھتا ہے، کیونکہ اسے اپنی اولاد کے حال اور مستقبل کی فکر ہوتی ہے۔ اس لئے انسان کے اندر بخل پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ اسی طرح اولاد نہ ہونے کی صورت میں انسان کو اپنی جان کی فکر نہیں ہوتی اس کو پتہ ہوتا ہے میں کسی کے لئے سہارا نہیں ہوں کسی کا میری زندگی پر مدار نہیں ہے، باقی رہے والدین تو بعض اوقات انسان کو ان کی اتنی زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ اگر اولاد ہو تو آدمی جان کو داؤ پر لگاتے ہوئے سوچتا ہے کہ اگر میں نہ رہا تو میرے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ حاصل یہ کہ اولاد ایسی چیز ہے جس کے ساتھ انسان کو فطری لگاؤ اور فطری محبت ہوتی ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کو قرآن مجید میں کہا گیا ہے أنما اموالکم واولادکم فتنۃ کہ تمہاری اولاد اور تمہارے اموال تمہارے لئے آزمائش ہیں۔ اس آزمائش میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کے ساتھ انسان کا قلبی تعلق یہ انسان کو زیادہ خرچ کرنے سے بھی اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے بھی روکتا ہے۔

لیکن اگلے جملے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ محض اتنی بات موجبِ مذمت نہیں ہے۔ چونکہ اولاد کو بخل اور بزدلی کا باعث قرار دینے سے کسی کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اولاد کا ہونا ہی مذموم ہوگا اس لئے نبی کریم ﷺ نے اگلے جملے میں فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ مذموم ہے بلکہ انہ من ریحان اللہ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عطا میں سے ہے۔

ریحان کا دوسرا معنی کیا گیا ہے خوشبو، اصل میں ریحان کہتے ہیں ناز بو۔ یہ خوشبودار پودا ہوتا ہے۔ حدیث کا ایک معنی ہوا کہ اولاد اللہ تعالیٰ کی خوشبو میں سے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح خوشبو انسان کے لئے فرحت کا باعث بنتی ہے اسی طرح اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے جو باعثِ فرحت ہوتی۔ کچھ نعمتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے انسان کی ضرورتیں تو پوری ہوتی ہیں لیکن اتنی خوشی انسان کو نہیں ہوتی، ان میں اتنا دل نہیں لگتا۔ کچھ نعمتیں اللہ تعالیٰ کی ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے انسان کو فرحت بھی محسوس ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی نعمتوں کی بھی ضرورت ہوتی

ہے جیسے روز کا کھانا ملتا ہے کیونکہ معمول کے مطابق ملتا ہے جب کھانا سامنے آئے تو خاص خوشی نہیں ہوتی لیکن ایک ضرورت اس سے پوری ہورہی ہوتی ہے۔ دوائی کی ضرورت ہے دوائی مل گئی لیکن دوائی ضرورت تو پوری کررہی ہے فرحت اور نشاط کا باعث نہیں ہے۔ زندگی میں انسان کو صرف اس طرح کی نعمتیں ملتی رہیں تو انسان کی زندگی خشک اور اجیرن ہو جائے۔ اس لئے انسان کو ضرورت ہوتی ہے ایسی نعمتوں کی بھی جو ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تفریحِ طبع کا ذریعہ بھی بنیں۔ لمن ریحان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو انسان کے لئے تفریحِ طبع کا باعث بھی ہے۔ چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانوی فرماتے ہیں کہ اطبا نے مفرحات لکھی ہیں جن سے انسان کی طبیعت میں فرحت پیدا ہوتی ہے اور بعض مریضوں کو دینی پڑتی ہیں فلاں معجون دے دو دواء المسک دے دو۔ حضرت نے فرمایا بچوں کو بھی اس فہرست میں لکھنا چاہیئے تھا۔ من ریحان اللہ کا ایک معنی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عطا ہیں اور دوسرا یہ کہ اللہ کی ایسی نعمت ہے جو باعثِ فرحت ہوتی ہے جس طرح خوشبو انسان کے لئے باعث فرحت ہوتی ہے۔ اولاد میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں ضرورت بھی انسان کی پوری ہوتی ہے اور انسان کو اس سے فرحت بھی حاصل ہوتی ہے۔

سوال پیدا ہوگا کہ بخل بھی مذموم اور جبن بھی مذموم، تو جو چیز بظاہر ان کا سبب بن رہی ہے وہ بھی مذموم ہونی چاہیئے۔ تو بات اصل میں یہ ہے اور سمجھنے کی بات ہے کہ بخل مذموم کون سا ہے یہ جتنے بھی رزائل ذکر کئے جاتے ہیں اصل میں یہ مذموم اس وقت ہوتے ہیں جب کہ ان کے مقتضٰی پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح بزدلی اگر دل میں فطری طور پر پیدا ہوگئی تو وہ مذموم نہیں ہے ہاں البتہ اگر اس کے تقاضا پر خلافِ شریعت عمل کیا تو وہ مذموم ہے۔ وگرنہ تو ظاہر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب سانپ کو دیکھا تو بھاگ پڑے لیکن یہ جبن مذموم نہیں اس لئے کہ یہ طبعی جبن ہے اور اس کے مقتضٰی پر ایسے انداز سے عمل نہیں ہوا کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی ہو۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہئے یہاں بخل سے مراد بخلِ طبعی ہے اسی طرح جبن سے مراد بھی جبن طبعی ہے۔ اور یہ چیزیں پیدا ہورہی ہیں اولاد کے ساتھ طبعی محبت ہونے کی وجہ سے اور اولاد کے ساتھ طبعی محبت یہ مذموم

نہیں ہے لیکن مذموم نہ ہونے کے باوجود امتحان اور آزمائش ضرور ہے۔ شریعت یہ کہتی ہے کہ ہم اس طبعی محبت سے منع تو نہیں کرتے اس لئے کہ یہ تمہارے اختیار سے باہر ہے ہاں البتہ امتحان یہ ہے کہ اگر اس محبت میں اور حکم شریعت میں ٹکراؤ ہو جائے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ کس کو ترجیح دیتے ہو، اگر حکم شریعت کو ترجیح دی تو امتحان میں پاس ہو گئے اور اگر اولاد کے ساتھ طبعی محبت کو ترجیح دی تو فیل ہو گئے۔ اگر امتحان نہ ہو تو فیل ہونے پر سزا نہیں ملتی ہے اور نہ ہی پاس ہونے پر انعام ملتا ہے۔ لیکن اگر امتحان ہو تو انعام ملنے کی بھی توقع ہوتی ہے اب اگر کسی کی اولاد نہیں ہے اس طرح کے تقاضے اس کے ساتھ بھی نہیں اور فراخ دلی سے خرچ کر رہا ہے یہ کوئی اتنا بڑا کمال نہیں ہے اور دوسرا شخص اس کی اولاد ہے اور ان کے مستقبل کی بھی فکر ہے لیکن جہاں شرعی یا اور کسی قسم کی ضرورت پیدا ہوئی خرچ کرنے کی اور حکم شریعت تھا خرچ کرنے کا وہاں خرچ کیا اگرچہ تھوڑا کیا لیکن جتنا حکم تھا اتنا کر دیا اس کا تھوڑا خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نظر میں کمال ہے۔ کیونکہ یہاں رکاوٹ موجود تھی۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بخل اور جبن طبعی پیدا ہونے کا جو سبب ہے یعنی اولاد کے مستقبل کی فکر یہ بھی مذموم نہیں بلکہ ایک درجے میں مطلوب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اولاد کے لئے دعا کی تو ان کے دینی مستقبل کی جہاں دعا کی ﴿وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَعْبُدَ الاَصْنَام﴾ اور یہ بھی فرمایا رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ اسی کے ساتھ ان کی دنیا کے لئے بھی دعا کی۔ یہ بھی دعا کی ﴿فَاجْعَلْ أَفْئِدَۃً مِنَ النَّاسِ تَھْوِيْ إِلَیھِمْ وارْزُقْھُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْن﴾ کہ لوگوں کو ان کی طرف مائل کر دیجئے اور ان کو ثمرات عطا کیجئے۔ اور جس چیز کی دعا نبی کرے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس چیز کی فکر کرنا بھی صحیح ہے۔ ہاں البتہ تھوڑی سی بات اور لگا لیں کہ ان کی دنیا کے لئے دعا کی لیکن دنیا کے ساتھ بھی نتیجہ پھر یہی نکالعلھم یشکرون۔ یہی فرق ہوتا ہے نبی اور غیر نبی میں۔ یا اللہ کے ساتھ تعلق والے میں اور دوسرے شخص میں۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے إنک أن تذرورثتک أغنیاء خیرمن أن عالة یتکففون الناس یعنی اپنے وارثوں کو مال دار چھوڑ کر جانا اس سے بہتر ہے کہ آدمی انہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر جائے کہ وہ لوگوں کے آگے دستِ سوال دراز کریں۔

الفصل الثالث

(١٦) عَنْ يَعْلَى قَالَ: إِنَّ حسنا وحُسيناً رَضِي الله عَنْهُما اسْتَبَقَا إِلَى رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَضَمَّهُمَا إِلَيْهِ وَقَالَ: «إِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مجبنَةٌ» . رَوَاهُ أَحْمد.

حضرت یعلی رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن اور حضرت حسین دوڑتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آئے تو آپ نے ان دونوں کو اپنے ساتھ ملالیا اور فرمایا کہ اولاد بخل اور بزدلی کا باعث ہے۔

کینہ اور عداوت دور کرنے کا طریقہ

(١٧) وَعَنْ عَطَاءٍ الْخُرَاسَانِيِّ أَنَّ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «تَصَافَحُوا يَذْهَبِ الْغِلُّ ، وَتَهَادَوْا تَحَابُّوا وَتَذْهَبِ الشَّحْنَاءُ» رَوَاهُ مَالِكٌ مُرْسَلًا.

حضرت عطا خراسانی رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آپس میں مصافحہ کیا کرو، اس کی وجہ سے کینہ ختم ہوگا اور آپس میں ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو آپس میں محبت کرنے لگ جاؤ گے اور عداوت ختم ہو جائے گی۔

دو چیزوں کا ذکر فرمایا ایک مصافحہ کا اس کا یہ فائدہ یہ بیان کیا کہ اس کی وجہ سے آپس کا کینہ ختم ہو جائے گا۔ اور دوسرے ذکر فرمایا ہدیہ کا اور اس کا فائدہ یہ بیان فرمایا کہ اس سے آپس میں محبت پیدا ہوتی ہے اور آپس کی عداوت ختم ہوتی ہے۔

ہدیہ کی حقیقت:

ہدیہ کسی ایسے ہبہ کو کہا جاتا ہے جو دوسرے کو محبت کی وجہ سے دیا جائے۔ ایک ہے کسی کو آپ نے کوئی چیز دی اس وجہ سے کہ وہ محتاج ہے تو یہ صدقہ ہے اور اگر اس لئے دی ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ محبت ہے گو وہ محتاج بھی ہو اس کو اس کی ضرورت بھی ہو لیکن آپ محض محتاج ہونے کی وجہ سے نہیں دے رہے بلکہ اس کے ساتھ اظہار محبت کے لئے دے رہے ہیں تو یہ ہدیہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صدقہ تو جائز نہیں تھا البتہ ہدیہ آپ کے حلال تھا اور آپ ہدیہ قبول فرمالیا کرتے تھے۔

یہاں تہادوا، بابِ تفاعل سے ہے۔ جس کے معنی ہیں ہدیہ لینا دینا، ہدیہ کا باہمی تبادلہ۔ ہدیہ چونکہ اظہارِ محبت کے لئے ہوتا ہے اور محبت کے اظہار سے محبت بڑھتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ محبت کے بڑھنے میں اس چیز کو بھی دخل ہے کہ اگر کوئی آپ سے محبت کا اظہار کر رہا ہے تو آپ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کریں۔ اس لئے یہاں بابِ تفاعل کا لفظ استعمال کیا۔

مصافحہ کی ایک فضیلت

(۱۸) وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ صَلَّى أَرْبَعًا قَبْلَ الْهَاجِرَةِ فَكَأَنَّمَا صَلَّاهُنَّ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ.

وَالْمُسْلِمَانِ إِذَا تَصَافَحَا لَمْ يَبْقَ بَيْنَهُمَا ذَنْبٌ إِلَّا سَقَطَ» . رَوَاهُ الْبَيْهَقِيُّ فِي «شُعَبِ الْإِيمَانِ».

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دوپہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے تو یہ ایسا ہے جیسا کہ اس نے یہ رکعتیں لیلۃ القدر میں پڑھیں اور دو مسلمان جب آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے درمیان کوئی گناہ نہیں بچتا مگر وہ ساقط ہو جاتا ہے۔

دو چیزوں کی فضیلت اس حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ پہلی چیز تو ہے دوپہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھیں یعنی چاشت کی چار رکعتیں پڑھیں تو ان کی فضیلت بیان فرمائی کہ یہ ایسا ہے جیسا کہ لیلۃ القدر میں نماز پڑھی۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس فضیلت کی غالباً وجہ یہ ہوگی کہ یہ وقت انسان کی مصروفیت میں شباب کا ہوتا ہے یا مصروفیت کے لئے تیار ہو رہا ہوتا ہے تو ایسے وقت میں نماز پڑھنا ذرا مشکل ہوتا ہے لیکن اگر کوئی آدمی ایسے وقت میں بھی نماز کی پابندی کرتا ہے تو اس کے نماز کے ساتھ خاص تعلق کی علامت ہے۔

مصافحہ پر مغفرت صغائر و کبائر:

اس حدیث میں دوسری بات یہ ہے کہ دو مسلمان جب آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے سارے گناہ ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کی حدیثوں میں علما میں یہ بحث چلی ہے کہ اس طرح کی حدیثوں میں صرف صغیرہ گناہ ہی داخل ہیں یا کبیرہ بھی۔ تو ایک قول یہ ہے کہ صغیرہ و کبیرہ دونوں ہی مراد ہوتے ہیں لیکن مشہور اور صحیح یہ ہے کہ صغیرہ گناہ مراد ہیں اس لئے کہ کبیرہ گناہ کے بارے میں اصل قاعدہ یہی ہے کہ وہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بغیر توبہ کے معاف کرنا چاہیں ظاہر ہے کہ یہ بھی ان کے لئے کوئی مشکل نہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کو کسی کا کوئی عمل ایسا پسند آتا ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے بڑے بڑے گناہوں کو بھی معاف کر دیتے

ہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کبیرہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ قاعدہ یہ ہے وعدہ معافی کا اس وقت ہے جبکہ توبہ کرے بغیر توبہ کے اگرچہ معافی کا وعدہ نہیں لیکن وہ اپنے فضل سے معاف کردیں تو ظاہر ہے ان پر کوئی رکاوٹ نہیں۔

باب القیام

الفصل الاول

(۱) عَن أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيّ قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ بَنُو قُرَيْظَةَ عَلَى حُكْمِ سَعْدٍ بَعَثَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ وَكَانَ قَرِيبًا مِنْهُ ، فَجَاءَ عَلَى حِمَارٍ ، فَلَمَّا دَنَا مِنَ الْمَسْجِدِ قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِلْأَنْصَارِ: «قُومُوا إِلَى سيِّدكم» . مُتَّفق عَلَيْهِ. وَمَضَى الْحَدِيثُ بِطُولِهِ فِي بَابِ حِكَمِ الْأَسَرَاءِ.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں جب بنو قریظہ حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلے کو تسلیم کر کے اتر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلانے کے لئے آدمی بھیجا اس وقت حضرت سعد آپ کے قریب ہی تھے تو حضرت سعد ایک گدھے پر سوار ہو کر آئے جب مسجد کے قریب پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا کہ اپنے سردار کی طرف اٹھو۔

کسی کی آمد پر کھڑا ہونے کا حکم

یہ باب قیام کے بارے میں ہے۔ کسی کے لئے کھڑے ہونے کی کئی صورتیں ہیں۔

1. ایک تو ہے قیامِ تعاون۔ یعنی کسی کی آمد پر کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اس کی مدد کی جائے، مثلاً اس کے لئے سواری سے اترنا مشکل ہے آپ اترنے میں اس کی مدد کر رہے ہیں یا اس کے پاس سامان ہے اس کو سنبھالنے میں آپ اس کی مدد کر رہے ہیں اس مقصد کے لئے اس کی آمد پر اٹھتے ہیں تو یہ مستحسن ہے اور اس کے جواز میں کوئی اشکال ہی نہیں ہے۔

2. دوسری صورت ہے قیام کی مثول۔اس سے مراد یہ ہے کہ عجمی بادشاہوں کے ہاں ہوتا تھا کہ ان کے دربار میں بغیر کسی مقصد کے محض تعظیم کی غرض سے ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔اس کو مثول بھی کہتے ہیں اور صمود بھی۔یہ پسندیدہ نہیں۔اس کا مقصد خالص تعظیم اور لوگوں پر رعب اور دھاک بٹھانا ہوتا ہے۔

3. تیسری صورت ہے القیام علیہ۔یعنی کسی کے پاس اس کی حفاظت کے لئے کھڑے ہونا۔جیسا کہ کسی کا کوئی گن مین اس کے پاس اس کی حفاظت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔یہ جائز ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی طریقے سے تلوار لئے کھڑے تھے

۔

4. ایک قیام ہے قیامِ محبت اور قیامِ سرور۔یعنی کسی کی آمد پر خوشی بہت زیادہ ہوئی اس خوشی کا اظہار کرنے کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اٹھ کر اس سے ملا، یہ بھی جائز ہے۔چنانچہ پچھلے باب میں قیام کی کچھ حدیثیں گذری بھی ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے تو حضرت فاطمہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتیں اور حضرت فاطمہ جب حضور اکرم ﷺ کے پاس آتیں تو حضور اکرم ان کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ اسی طریقے سے اور بھی کئی صحابہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے ہیں۔تو یہ اٹھنا ملاقات پر خوشی کا اظہار کرنے کے لئے ہے۔

5. ایک قیام ہوتا ہے قیامِ تحیۃ۔یعنی کسی کی آمد پر کھڑا ہوا جائے یہ سمجھ کر یہ آدابِ ملاقات کا ایک حصہ ہے۔یہ ٹھیک نہیں ہے اس لئے کہ تحیہ صرف السلام علیکم ہے اور اس کی تکمیل مصافحہ سے ہو جاتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز تحیہ میں داخل نہیں ہے۔

6. ایک قیام ہوتا ہے قیامِ احترام اور قیامِ تعظیم۔جو شخص آیا ہے چونکہ وہ آپ کی نظر میں قابلِ احترام و تعظیم ہے تو اپنے دل میں جو احترام آپ محسوس کر رہے ہیں اس کا اظہار کرنے کے لئے اس کی آمد پر کھڑے ہو جاتے

ہیں۔ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ درست ہے یا نہیں بعض حضرات اس کو مکروہ کہتے ہیں لیکن اکثر علما کے نزدیک یہ بھی جائز ہے۔

جو حضرات اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں ان کی دلیل حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو الفصل الثانی کے شروع شروع میں آرہی ہے وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب کوئی اور نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو صحابہ کرام مجلس سے کھڑے نہیں ہوا کرتے تھے اس لئے کہ انہیں معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ناپسند فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تعظیماً کھڑا ہونا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس طرح کی کچھ اور حدیثیں ہیں جو قیام سے نہی پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن جو جواز کے قائل ہیں ان کی طرف سے جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ کراہت شرعی نہیں تھی بلکہ طبعی تھی۔ یعنی آپ ﷺ کو تواضع اور بے تکلفی کی وجہ سے طبعاً یہ پسند نہیں تھا کہ آپ کے لئے صحابہ اٹھ کر کھڑے ہوں۔ اسی طریقے سے دوسری حدیثیں جو نہی پر دلالت کررہی ہیں وہ عموماً اس قیام کی نہی پر دلالت کررہی ہیں جس میں سامنے کھڑا رہا جائے جس کا ذکر اوپر قیام کی صورتوں میں دوسرے نمبر پر ہوا۔ یا وہ صورت ممنوع ہے جبکہ آنے والا شخص حب جاہ کی وجہ سے اپنے لئے پسند کرے اس کو کہ میرے لئے لوگ کھڑے ہوں۔ اس کا اس طریقے سے چاہنا ناپسندیدہ ہے۔ اور اگر اس کے اس طرح کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کے اس مرض میں اضافہ ہوتا ہے تو کھڑا ہونا بھی ناپسندیدہ ہوگا۔ لہٰذا جو عام قیام تعظیم اور احترام ہے اس سے نہی ان حدیثوں میں نہیں ہے۔

دوسری طرف جو حضرات کہتے ہیں کھڑا ہونا جائز ہے انہوں نے بھی کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ مثلاً پچھلے باب میں ہی کئی حدیثیں آئیں کہ فلاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد پر کھڑا ہوگیا اور نبی کریم ﷺ فلاں کی آمد پر اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ لیکن یہ زیادہ تر احادیث قیام تعظیم پر دلالت کرتی نہیں کرتیں بلکہ اور کسی طرح کے قیام پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا۔

البتہ اس مسئلے میں حضرت سعد بن معاذؓ کا واقعہ کافی اہم ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ غزوہ احزاب کے درمیان بنو قریظہ نے بڑی عہد شکنیاں کی ہیں اس لئے ان کے ساتھ بھی ابھی نمٹ لیا جائے۔ چنانچہ بنو قریظہ کا محاصرہ کرلیا گیا اور یہ قلعہ بند ہو گئے۔ کئی دن تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر کاوہ اس شرط پر قلعہ کھولنے کے لئے تیار ہو گئے کہ آپ کے درمیان اور ہمارے درمیان حضرت سعد بن معاذ فیصل ہوں گے جو وہ فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہوگا۔ حضرت سعد بن معاذ کی اکحل رگ پر جو گردن کی ایک رگ ہوتی ہے غزوۂ احزاب میں تیر لگا تھا اور شدید بیمار تھے۔ لیکن انہوں نے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ! مجھے بنو قریظہ کا انجام دکھانا اور یہ بھی دعا کی تھی کہ اے اللہ! اگر قریش کے ساتھ جنگ باقی ہے تو پھر تو مجھے زندہ رکھئے تاکہ میں مزید غزوات میں حصہ لے سکوں اور اگر قریش کے ساتھ کوئی اور معتدبہ جنگ نہیں ہونی تو پھر میں آپ سے دعا نہیں کرتا کہ مجھے زندہ رکھئے بلکہ اسی زخم کے اندر مجھے شہادت مل جائے تو اچھی بات ہے۔ بہرحال حضرت سعد بن معاذ کو انہوں نے حکم اور فیصل تسلیم کرلیا۔ چونکہ یہ بیمار تھے زخمی تھے اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے قریب ان کے لئے خیمہ لگوا دیا تھا تاکہ ان کی دیکھ بھال بھی آسان ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر بار بار ان کی بیمار پرسی کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لئے انہیں بلایا چنانچہ یہ گدھے پر سوار ہو کر آئے۔ اگرچہ ان کا خیمہ مسجد سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن چونکہ بیمار تھے اس لئے انہیں سوار ہو کر آنا پڑا۔ جب یہ مسجد کے پاس پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قوموا الی سید کم کہ اپنے سردار کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ تو یہاں اس میں بحث چلی ہے کہ یہ اٹھ کر کھڑا ہونا کیسا تھا۔ جو حضرات قیامِ تعظیم کو مکروہ قرار دیتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں یہ کھڑا ہونا تعظیم کے لئے نہیں تھا بلکہ ان کی نصرت اور مدد کے لئے تھا اس لئے کہ یہ بیمار تھے ان کے لئے سواری سے اترنا مشکل ہوتا تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو جانے کا حکم اس لئے دیا تاکہ ان کو سواری سے اتار لیں۔ لیکن دوسری طرف کے حضرات کہتے ہیں اور ان کی یہ بات خاصی وزنی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار کے ایک قبیلہ کے سردار تھے اور اہم شخصیت تھے اور بیمار بھی تھے تو یہ بات انتہائی بعید ہے کہ ان کے تیمارداروں اور سنبھالنے والوں نے انہیں اکیلے ہی گدھے پر بیٹھا کے روانہ کر دیا ہو اور ساتھ کوئی بھی نہ آیا ہو۔ اغلب یہی ہے کہ ان

کے خدام ان کو ساتھ لے کر آئیں ہوں گے، اس لئے اتارنے کے لئے تعاون کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دوسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں قوموا الی سید کم ہے الی مریضکم نہیں کہا یہ لفظ بھی بظاہر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ کھڑا ہونا ان کی سیادت اور سرداری کی وجہ سے تھا اور تیسرے یہ کہ واقدی کی المغازی میں ایک روایت ہے — واقدی کی یہ روایت محض تائید و تشریح کے لئے پیش کی جارہی ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی وجہ سے انصار دو لائنیں بنا کر کھڑے ہو گئے اور درمیان سے حضرت سعد بن معاذ گذرے تو یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کھڑا ہونا تعاون کیلئے نہیں تھا بلکہ تعظیم اور احترام کے لئے تھا۔ اس لئے صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تعظیماً کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ تعظیماً اور احتراماً کھڑے ہونے سے نہی تو کسی روایت میں نہی ہے اور حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واقعہ اس کے جواز پر دلالت کررہا ہے لہٰذ صحیح یہی ہے کہ کسی کے احترام میں کھڑے ہونا فی نفسہ یہ مباح ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عربوں کے اندر اس کا زیادہ رواج نہیں تھا اس لئے کہ ان کا مزاج بے تکلفی کا تھا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ میں بھی اس کا زیادہ معمول نہیں تھا۔ جائز تو ہے لیکن اس زمانہ میں اس کا زیادہ معمول نہیں تھا۔ اصل بہتر بات یہی ہے کہ اس طرح کی بے تکلفی کا ماحول ہو کہ ایک دوسرے کے لئے احتراماً کھڑے ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی جائے۔ لیکن اگر کھڑے ہو جائیں تو بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بعض اوقات کھڑے ہونے میں مصلحت بھی ہوتی ہے جیسا کہ بعض اداروں کے اندر یہ معمول ہوتا ہے کہ درسگاہ میں جب استاذ آتے ہیں تو سب طلبہ اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو اس میں یہ فائدہ اور مصلحت ہے کہ طلبہ کو خاص طور پر چھوٹے بچوں کو ادب کی عادت پڑتی ہے دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دفعہ طبیعت میں تھوڑی سی چستی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے لئے کھڑا ہونے کا بہت زیادہ معمول ہوتا ہے اب اگر آپ اس کے لئے کھڑے نہیں ہوں گے تو عرف کی وجہ سے وہ یہ سمجھے گا کہ میرے آنے کو اس نے کوئی اہمیت ہی نہیں دی تو ایسی صورت میں بھی کھڑے ہو جانا بہتر ہے اس لئے کہ آنے والے مسلمان کا یہ حق ہے کہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ

کیا جائے جسے وہ یہ سمجھے کہ میرے ساتھ لاپرواہی برتی گئی ہے اور میرے آنے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ چنانچہ آگے احادیث میں آئے گا کہ اگر کوئی مسلمان آیا ہے اور جگہ کے اندر کشادگی اور وسعت موجود ہے پھر بھی پہلے سے بیٹھے ہوؤں کو چاہیے تھوڑے سے ہلیں اور سرک جائیں تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے آنے کو انہوں نے کوئی اہمیت دی ہے۔

نئے آنے والے کے لئے گنجائش پیدا کرو

(۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ وَلَكِنْ تَفَسَّحُوا وَتَوَسَّعُوا» . مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص دوسرے آدمی کو اس کے بیٹھنے کی جگہ سے نہ اٹھائے کہ پھر وہاں پر خود بیٹھ جائے بلکہ تم جگہ کے اندر کشادگی پیدا کرو اور طرز عمل میں وسعت اختیار کرو۔

اس میں دو ادب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک آنے والے کا اور ایک پہلے سے بیٹھنے والے کا۔ کہ کچھ لوگ اگر پہلے سے کسی جگہ پر بیٹھے ہوئے ہیں بعد میں کوئی شخص آتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ پہلے سے بیٹھے ہوؤں کو اپنی جگہ سے اٹھائے اور ان سے کہے کہ اٹھو میں اس جگہ پر میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ آنے والے کے لئے تو یہ حکم ہے کہ وہ پہلے سے بیٹھے ہوؤں کو نہ ہٹائے لیکن جو پہلے سے بیٹھے ہوئے ہیں ان کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ اس کے لئے جگہ بنادیں۔ اگر پہلے سے کھلے ہو کر بیٹھے ہوئے ہیں تو وہ ذرا مل کر بیٹھ جائیں تاکہ اس کے لئے جگہ کی گنجائش نکل آئے۔ تو دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھیں۔ یہ حکم ایسی جگہ کا ہے جہاں سب لوگوں کا حق برابر ہوتا ہے اور کسی کو دوسرے پر فوقیت اور ترجیح کسی وجہ سے حاصل نہیں ہوتی جیسے مسجد ہے تو وہاں جو شخص جس جگہ آکر پہلے سے بیٹھ گیا ہے تو وہاں یہ بیٹھے نہیں اسی کا حق ہے دوسرا شخص آکر اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اٹھو میں نے یہاں بیٹھنا ہے۔ اسی طرح ہر ایسی جگہ جہاں پر

سب کا حق برابر ہو۔ یہ دو طرح کی جگہیں ہوتی ہیں بعض جگہیں تو ایسی ہوتی ہیں جو مباحات کے قبیل سے ہوتی ہیں جیسے مسجد ہے یا فرض کیجئے کہ کھلا میدان ہے اور وہاں پر کوئی بازار وغیرہ لگاتا ہے جمعہ کو بازار لگتا ہے اتوار کو بازار لگتا ہے اور انتظامیہ کی طرف سے جگہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے کسی نے وہاں پر اپنی سبزی لگائی، کسی نے اپنا فروٹ، کسی نے کپڑے لگالئے ایک جمعہ یا اتوار کو ایک شخص یہاں آکر بیٹھ گیا اگلے جمعہ یا اتوار کو اگلا شخص آکر بیٹھ گیا تو جو دوسرا آکر بیٹھا یہ اب اسی کا حق ہے پہلا آکر اسے اٹھا نہیں سکتا کہ تم یہاں سے اٹھو میں یہاں بیٹھوں گا جو پہلے پہنچ جائے اسی کا حق ہے دوسرا آکر اسے اٹھا نہیں سکتا۔ دوسری جگہیں وہ ہوتی ہیں جن کا اگرچہ معاوضہ دیا گیا ہوتا ہے اس کے باوجود سب کا حق برابر ہوتا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے ایک ریل گاڑی ہے اس کے ایک ڈبے میں ساری سواریوں میں سے کسی نے بھی اپنی سیٹ بک نہیں کروائی البتہ ٹکٹ سب نے لیا ہوا ہے تو اب بھی یہی حکم ہے کہ جو جس سیٹ پر پہلے پہنچ جائے گا وہ اس کی ہو گئی جو بعد میں آیا ہے اس کو یہ حق نہیں ہے کہ پہلے سے بیٹھے ہوئے کو وہاں سے زبردستی ہٹائے، البتہ اتنی بات ضرور ہے ضرورت سے زائد جگہ پر قبضہ کرنا یہ اس کا حق نہیں ہے۔ مسجد میں ایک آدمی جتنی جگہ پر بیٹھتا ہے اتنی ہی جگہ اس کا حق ہے اس کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی اور جگہ پر قبضہ کر لیا اس پر کوئی دوسرا آکر بیٹھ سکتا ہے۔ اسی طریقے سے گاڑی کا ٹکٹ لیا ہوا تھا ایک سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسری سیٹ پر اپنا سامان رکھ لیا تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرا آنے والا اس کو تو نہیں اٹھا سکتا البتہ جس سیٹ پر یہ سامان رکھا ہوا ہے وہ سامان اٹھوا کر ایسی جگہ پر رکھوائے جو سامان کے لئے جگہ بنائی گئی ہے یا سیٹ تھی بیٹھنے کی اور یہ وہاں آکر لیٹ گیا تو بیٹھنا تو اس کا حق ہے اس سے زائد جو جگہ اس نے گھیر لی ہے اس میں اس کا پہلے آنے کی وجہ سے حق نہیں ہو گا بلکہ دوسرے اس کو اٹھا سکتے ہیں کہ اٹھ کے بیٹھئے باقی جگہ پر ہم بیٹھیں گے۔ حاصل یہ کہ یہ قاعدہ صرف مجلس یا مسجد کے اندر ہی نہیں بلکہ تمام ایسی جگہوں میں ہے جہاں پر عام لوگوں کا حق برابر ہو۔

البتہ پہلے سے بیٹھنے والوں نے جگہ ضرورت سے زیادہ گھیری ہوئی ہے اور بعد میں نیا آدمی آیا ہے تو اس کے لئے وسعت پیدا کرنا ان پر واجب ہے کیونکہ ان کا حق تو تھا لیکن ضرورت کی بقدر جگہ پر تھا زائد جو جگہ گھیری ہوئی ہے

اس کو چھوڑنا یہ ان پر واجب ہے۔ اس صورت میں تفسحوا وتوسعوا کا امر وجوبی ہوگا۔ اور اگر انہوں نے جگہ بقدر ضرورت گھیری ہے پھر بھی کوئی بعد میں آگیا اب اگرچہ اس کے لئے جگہ خالی کرنا واجب نہیں لیکن مستحب یہی ہے کہ اپنے آپ کو تنگ کرلیں تنگی برداشت کرلیں اس کے لئے جگہ بنادیں۔ خاص طور پر اگر وہ عمر میں اپنے سے بڑا ہے یا کمزور ہے، بیمار ہے تو اس کے لئے جگہ چھوڑ دینا یہ زیادہ فضیلت کی بات ہے۔

اس حدیث کے تحت ایک اور مسئلہ بعض علما نے چھیڑا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے زمانے میں اس طریقے سے باقاعدہ مدارس بنے ہوئے نہیں ہوتے تھے جیسا کہ آج کل ہوتے ہیں درسگاہیں ہوتی ہیں اور مقرر ہیں۔ مسجد ہی کے اندر درس وغیرہ کے حلقے لگے ہوتے تھے۔ اب ایک شخص روزانہ ایک خاص جگہ پر اپنی مجلس لگاتا ہے درس حدیث دیتا ہے وہاں بیٹھ کر فقہ کا درس دیتا ہے افتاء کے لئے بیٹھتا ہے کسی اور مقصد کے لئے بیٹھتا ہے روزانہ اسی جگہ پر آکر بیٹھتا ہے لیکن کسی دن کوئی اور مولانا صاحب کوئی اور محدث پہنچ گئے اور اس جگہ پر وہ آکر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنا حلقہ لگالیا اور جو روزانہ بیٹھتے ہیں یہ بعد میں پہنچے تو اب ان کے لئے بعد میں پہنچ کر ان کو اٹھانا جائز ہے یا نہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ بعض علما نے یہ کہا ہے کہ چونکہ یہ روزانہ یہاں پر بیٹھا کرتا تھا اس لئے اس کا یہ حق بن گیا ہے لہٰذا یہ دوسرے کو اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ شافعیہ کا زیادہ تر رجحان اسی طرف ہے۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ نہیں جگہ سب کے لئے برابر تھی اس لئے آج جو پہلے پہنچ گیا پہلے یہ پہنچا کرتا تھا یہ بیٹھ جایا کرتا تھا لیکن آج دوسرا پہلے پہنچ گیا اس لئے آج اس کا حق ہے اور یہ بعد میں آیا ہے لہٰذا یہ اسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ حنفیہ کا زیادہ تر رجحان اسی دوسری رائے کی طرف ہے اور اس حدیث کا ظاہر اور عموم بھی اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ البتہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے - واللہ اعلم - کہ اگر منتظم یا متولی جگہ کا تقرر کردے کہ فلاں صاحب اس جگہ بیٹھیں گے فلاں صاحب اس جگہ بیٹھیں گے تو اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

اسی طرح سے اگر عرف ایسا بن چکا ہو کہ عام طور پر ایک جگہ پر جو شخص حلقہ بنانے کا عادی ہو جاتا ہے اس کو وہاں سے ہٹایا نہیں جاتا تو پھر دوسرے شخص کا وہاں آکر بیٹھنا اس وقت میں اگرچہ دوسرے شخص کے لئے اس کو اٹھانے کی اجازت نہ ہو بیٹھنے والے کے لئے بڑی قبیح بات ہے۔

عارضی طور پر اٹھ کر جانے والے کا حق

(۳) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَامَ مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ رَجَعَ إِلَيْهِ فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ» . رَوَاهُ مُسلم.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی اپنی مجلس سے اٹھ کر چلا جائے پھر دوبارہ اس میں لوٹ کر آئے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

اصل اصول یہ ہے کہ اس طرح کی جگہوں میں کہ جو پہلے پہنچ جائے اس کا حق ہے اور جب تک وہ وہاں بیٹھا ہوا ہے اس کا حق ہے اور جب اٹھ کر چلا جائے تو اس کا حق ختم ہو گیا، اگلے دن کوئی اور پہلے پہنچ گیا تو اس کا حق ہو گا۔ لیکن اس حدیث کے اندر اس سے ایک استثنا ہے وہ یہ کہ جو شخص پہلے پہنچا تھا اس لئے وہ جگہ جس کا حق بن گئی وہ تھوڑے سے کسی کام کے لئے اس نیت سے گیا ہے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجاؤں گا۔ مثلاً وضو کرنے کے لئے چلا گیا۔ ناک صاف کرنے کے لئے چلا گیا۔ تو اگر تھوڑی دیر بعد دوبارہ آنے کی نیت سے اٹھ کر گیا ہے تو اس صورت میں اس کا حق برقرار ہے لہٰذا دوسرا شخص اس کی جگہ پر نہیں بیٹھ سکتا اور اگر دوسرا شخص بیٹھے گا تو یہ آنے والا اسے اٹھا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے میں نے بتایا کہ یہ اس صورت میں ہے جب پہلا تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر چلا جائے اور بہتر یہ ہے کہ جانے والا ایسی صورت میں کوئی نشانی وغیرہ رکھ کر جائے تا کہ دوسروں کو پتا چل سکے کہ یہ جگہ فی الحال کسی کے استعمال میں ہے۔

یہ بات اس صورت میں جبکہ طویل وقت کے لئے اٹھ کر جانا نہ ہو۔ مثلاً عشا کی نماز پڑھ کر جاتے ہوئے فجر کے لئے کوئی نشانی رکھ گیا کہ صبح آکر میں نے یہاں بیٹھنا ہے تو اس کا اعتبار نہیں۔

الفصل الثانی

اپنے لئے تعظیماً کھڑا ہونا پسند نہ کیا جائے

(٤) عَن أنس بن مَالك قَالَ: لَمْ يَكُنْ شَخْصٌ أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنْ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانُوا إِذَا رَأَوْهُ لَمْ يَقُومُوا لِمَا يَعْلَمُونَ مِنْ كَرَاهِيَتِهِ لِذَلِكَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيحٌ.

حضرت انس ؓ کہتے ہیں کہ صحابہ کی نظر میں کوئی شخص رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب نہیں تھا ، صحابہ جب حضور ﷺ کو (تشریف لاتے ہوئے) دیکھتے تو کھڑے نہیں ہوتے تھے، اس وجہ سے کہ انہیں حضور ﷺ کا اس کو ناپسند کرنا معلوم تھا۔

(٥) وَعَن مُعَاوِيَة قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُد.

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہو اس کے لئے لوگ تعظیماً کھڑے رہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

یہ بظاہر تو امر کا صیغہ ہے فلیتبوأ مقعدہ من النار، لیکن حقیقت میں یہ اِخبار ہے کہ ایسا شخص دوزخ میں جائے گا۔ اس کا دوزخ میں جانا تو طے شدہ ہے توجب دوزخ میں جانا طے شدہ ہے تو وہاں کس جگہ پر رہنا ہے وہ جگہ سوچ لے خود ہی اپنے لئے مقرر کرلے۔ یہاں پر رسول اللہ ﷺ نے جس چیز پر وعید بیان فرمائی ہے اس کے بارے میں دو باتیں ذہن میں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ وعید مثول پر ہے اور مثول کا معنی کھڑے ہونا نہیں ہے بلکہ کسی کے سامنے کھڑے رہنا ہے جیسا کہ عجمی بادشاہوں کے درباروں میں ہوتا تھا۔ دوسرے یہاں پر یہ وعید اصل میں مثول پر بھی نہیں ہے، کھڑے ہونے پر نہیں ہے بلکہ اس شخص کے لئے وعید ہے جو چاہے کہ لوگ میرے لئے کھڑے ہوں۔ اگرچہ مثول بھی پسندیدہ نہیں ہے، لیکن بہر حال اس کی اتنی مذمت نہیں ہے جتنی مذمت اس بات کی ہے کہ کوئی آدمی یہ چاہے اور لوگوں کو کہے کہ میرے سامنے اس طریقے سے کھڑے رہا کریں۔

(٦) وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلَى عَصًا فَقُمْنَا فَقَالَ: «لَا تَقُومُوا كَمَا يَقُومُ الْأَعَاجِمُ يُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک لاٹھی پر ٹیک لگا کر باہر تشریف لائے۔ تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اٹھ کر کھڑے ہوگئے تو آپ نے فرمایا اس طریقہ سے کھڑے نہ ہوا کرو جیسا کہ عجمی کھڑے ہوتے ہیں کہ ان میں سے بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں۔

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے کھڑا ہونا پسند نہیں فرمایا۔

(۷) وَعَن سعيد بن أبي الحْسن قَالَ: جَاءَنَا أَبُو بكرَة فِي شَهَادَةٍ فَقَامَ لَهُ رَجُلٌ مِنْ مَجْلِسِهِ، فَأَبَى أَنْ يَجْلِسَ فِيهِ وَقَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى عَنْ ذَا ، وَنَهَى النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَمْسَحَ الرَّجُلُ يَدَهُ بِثَوْبِ مَنْ لَمْ يَكْسُهُ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت سعید بن ابی الحسن جو حضرت حسن بصری کے بھائی ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو بکرہؓ ہمارے پاس ایک گواہی کے سلسلے میں آئے تو ایک شخص ان کی خاطر اپنے بیٹھنے کی جگہ سے اٹھ گیا تو حضرت ابو بکرہؓ نے اس جگہ بیٹھنے سے انکار فرمادیا اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے اس بات سے کہ کوئی آدمی اپنا ہاتھ ایسے شخص کے کپڑے سے پونچھے جسے اس نے کپڑا پہنایا نہیں ہے

محض کسی کے بڑا ہونے کی وجہ سے حق سے دست برداری واجب نہیں:

اس میں دو باتیں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائیں۔ ایک یہ ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی عن ذا۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ پہلے سے کوئی شخص بیٹھا ہوا ہو اور دوسرا شخص بعد میں آئے اور اس بیٹھے ہوئے شخص کو اٹھائے اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابو بکرہؓ نے اس شخص کی جگہ پر بیٹھنے سے انکار فرمادیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو اس صورت میں ہے کہ جبکہ آنے والا کسی کو اپنی جگہ سے اٹھا کر خود وہاں پر بیٹھ جائے اگر پہلے سے بیٹھا ہوا شخص اپنی رضامندی سے اپنی جگہ خالی کردے تو کوئی اشکال کی بات نہیں اور یہاں پر بھی بظاہر اس نے اپنی رضامندی سے جگہ فارغ کی تھی پھر بھی حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں پر نہیں بیٹھے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ احتیاطاً اور تورعاً حضرت ابو بکرہؓ اس جگہ پر نہیں بیٹھے۔ اگرچہ بیٹھنا جائز تھا لیکن احتیاط کے

طور پر ورع کے طور پر تقوی کے طور پر وہاں بیٹھنا پسند نہیں کیا۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ نے یہ محسوس کیا ہو گا کہ اس نے جو یہ جگہ خالی کی ہے یہ سوچ کر کی ہے کہ میرے لئے جگہ خالی کرنا اس پر ضروری تھا، کیونکہ بڑے ہیں اور بڑا آدمی آئے تو پہلے سے بیٹھے ہوئے پر لازم ہے کہ اس کے لئے جگہ کو خالی کرے۔ اور ایک غیر لازم کام کو لازم سمجھ کرنے سے رضامندی متحقق نہیں ہوتی۔ رضامندی متحقق اس وقت ہو گی جب اس کو پتا ہو کہ ایسا کرنا مجھ پر واجب نہیں ہے پھر ایسا کرے پھر یہ سمجھیں گے کہ ایسا اس نے اپنی رضامندی سے کیا ہے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ اس نے یہ سوچا ہو کہ چونکہ بڑے آدمی آگئے ہیں اور اگرچہ میں پہلے سے بیٹھا ہوں لیکن میرے لئے لازم ہے کہ میں یہ جگہ خالی کروں اس لئے حضرت ابکرہؓ نے اس لئے اس کی اس اظہار رضامندی کو کافی نہیں سمجھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ پیدل تشریف لے جارہے تھے اتنے میں ایک شخص جو کہ اپنے گدھے پر سوار تھا وہ اگلی سیٹ سے پیچھے ہٹ گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اگلی سیٹ خالی کر دی کہ آپ یہاں بیٹھیں تو حضور ﷺ نے فرمایا: لاانت احق بصدر دابتک الاان تجعلہ لی ۔ کہ میں اس طرح آگے نہیں بیٹھوں گا بلکہ اپنی سواری کی اگلی سیٹ کے تم زیادہ حق دار ہو، ہاں البتہ تم اگر اپنی رضامندی سے یہ حق میرے لئے چھوڑو تو پھر میں بیٹھ جاؤں گا۔ یہاں پر بھی یہی سوال ہے کہ اپنی رضامندی کا اظہار اس نے پہلے ہی کر دیا تھا جب اس نے حضور کو پیش کش کی کہ آپ آگے تشریف رکھیں پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت۔ تو بات وہی ہے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ اس نے یہ سمجھا ہو کہ بڑے ہیں اللہ کے رسول ہیں اس لئے ان کو آگے بٹھانا مجھ پر شاید لازم ہو اور ان کا یہ حق ہو کہ ان کو آگے بٹھایا جائے ہو سکتا ہے کہ وہ پیچھے یہ سوچ کر ہٹا ہو اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ بتایا ہو کہ نہیں حق تمہارا ہی ہے آگے بیٹھنے کا ہاں البتہ اگر تم یہ جان کر کہ آگے بیٹھنے کا میرا حق ہے پھر بھی تم مجھے آگے بیٹھنے کا کہو گے تو پھر بیٹھ جاؤں گا۔ اپنے حق سے آگہی کے بغیر دست برداری معتبر نہیں۔ اسی طرح یہاں اس بات کا امکان تھا کہ وہ یہاں سے اٹھا ہو یہ سوچ کر کہ ایسا کرنا مجھ پر ضروری ہے اور اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو قابل ملامت ٹھہروں گا تو اگر ایسے کیا ہے تو بظاہر یہ رضامندی نظر آتی ہے لیکن حقیقت میں رضامندی نہیں اس لئے حضرت ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جگہ پر نہیں بیٹھے۔

دوسروں کی اشیا میں بلا اجازت تصرف کرنا:

دوسری بات یہ فرمائی کہ آدمی دوسرے کے کپڑے سے اپنا ہاتھ پونچھے اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ وجہ واضح ہے کہ کسی کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے تو جب اپنا ہاتھ دوسرے کے کپڑے کے ساتھ صاف کر رہا ہے تو دوسرے کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف ہے ۔ یہ کپڑا صاف کرنے کا ہی کیوں حکم فرمایا اس کی یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ بات جس موقع پر بیان فرمائی ہو وہاں اس کی ضرورت ہو مثلاً کسی نے کسی کے کپڑے سے ہاتھ صاف کر لیا ہو یا اس وجہ سے یہاں کپڑا صاف کرنے کی بات فرمائی کہ یہ دوسرے کی ملکیت میں معمولی سا تصرف ہے اس لئے بعض اوقات آدمی اس کی پرواہ نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ اتنی سی چیز میں کیا حرج ہو سکتا ہے۔ دوسرے کی ملکیت میں کوئی بڑا تصرف ہو تو آدمی خود ہی اس سے بچتا ہے لیکن دوسرے آدمی کی ملکیت میں تھوڑے سے تصرف کو آدمی معمولی سمجھ لیتا ہے مثلاً کسی کا تولیہ لٹک رہا ہو، گذرتے گذرتے اس سے ہاتھ صاف کر لیا، سمجھتا ہے کہ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا چاہتے ہیں کہ جس تصرف کو تم معمولی سمجھ رہے ہو اس کو بھی بغیر اذن کے نہیں کرنا چاہئے۔

یہیں سے ضمناً ایک بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ آج کل مختلف پروگرام ہوتے ہیں دینی نوعیت کے اور لوگوں کو اطلاع کرنے کے لئے اشتہار چھاپے جاتے لگائے بھی جاتے ہیں دیواروں پر۔ دیواریں اکثر و بیشتر لوگوں کی مملوکہ ہوتی ہیں تو ان میں یہ احتمال کافی حد تک ہوتا ہے کہ دیوار کا مالک اس بات کو پسند نہیں کرے گا کہ وہاں پر اشتہار لگایا جائے۔ ایسی جگہ پر اشتہار لگانا بھی درست نہیں ہے۔ دیکھنے میں یہ معمولی سا تصرف ہے لیکن بہر حال یہ جگہ دوسرے کی ملکیت میں ہے بغیر اذن کے تصرف ہے اس لئے یہ جائز نہیں۔ ہاں البتہ جہاں اذن کا یقین ہو وہاں اور بات ہے۔ جس شخص نے اپنی دیوار خوبصورت بنائی ہے اس پر پلستر کیا اس پر رنگ وروغن کیا یا کچھ اور کیا تو بظاہر وہ یہی چاہتا ہے کہ میری دیوار اسی طرح کی نظر آئے۔ ایک شخص نے دیوار کھڑی کر لی لیکن اس پر کچھ نہیں کیا۔ جیسے پرانے

قصبات میں ہوتا ہے تو اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اس کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ میری دیوار باہر سے کیسی نظر آئے، اشتہار لگانے سے دیوار کو نقصان بھی نہیں پہنچتا وہاں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے کپڑے سے ہاتھ پونچھنے کا ذکر اس لئے فرمایا کہ بظاہر یہ معمولی سا تصرف ہے یہ بھی مالک کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ البتہ ایک صورت آپ نے مستثنیٰ فرمائی کہ اس شخص کو کپڑے اسی نے پہنائیں ہوں تو اس کے کپڑوں سے اس کی اجازت کے بغیر ہاتھ صاف کر سکتا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ تصرف کرنے کے لئے مالک کی اجازت ضروری ہے اور اجازت کبھی صراحتاً ہوتی ہے کبھی دلالتاً۔ دلالتاً اجازت کا مطلب یہ ہے کہ منہ سے تو اس نے یہ نہیں کہا کہ ایسا کر لو لیکن ظنِّ غالب ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو برا محسوس نہیں کرے گا تو یہ دلالتاً اجازت ہے۔ جس شخص کو کپڑے ہی اس نے پہنائے ہیں مثلاً اپنا غلام ہے یا اپنا ایسا بیٹا ہے جو اپنی عیال کے اندر ہے کپڑے اس کو اس نے پہنائیں ہیں تو اگر اس کے کپڑوں سے ہاتھ صاف کرلے گا تو بظاہر وہ اس کا برا نہیں منائے گا۔ اس لئے حضور ﷺ نے اس کو مستثنیٰ کیا۔ لیکن اگر قرائن سے یہ پتا ہو کہ پھر بھی وہ اس کو برا جانے گا تو پھر اس میں تصرف کی اجازت نہیں کیونکہ جب اسے کپڑا دے دیا تو وہ اس کا مالک ہو گیا اس لئے اس میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف جائز نہیں۔ ہاں اگر عاریۃً دیا ہو کپڑا تو اور بات ہے۔

مجلس سے اٹھنے کے بارے میں آپ ﷺ کا ایک معمول

(۸) وَعَن أبي الدرداءِ قَالَ: كَانَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ جَلَسْنَا حَوْلَهُ فَأَرَادَ الرُّجُوعَ نَزَعَ نَعْلَهُ أَوْ بَعْضَ مَا يَكُونُ عَلَيْهِ فَيَعْرِفُ ذَلِكَ أَصْحَابُهُ فَيَثْبُتُونَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تھے اور ہم بھی آپ کے گرد بیٹھتے تھے تو آپ اٹھتے اور واپس آنے کا ارادہ رکھتے تو اپنے جوتے کو یا کسی ایسی چیز کو جو آپ پر ہوتی اتار دیتے تو اس سے آپ کے صحابہ سمجھ جاتے اور وہ اپنی جگہ پر برقرار رہتے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے تھے کبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھنے کے لئے ہی اٹھ کر جاتے تھے اور واپس آنے کا ارادہ نہیں ہوتا تھا اور کبھی ایسا ہوتا کہ آپ اٹھ کر جاتے اور آپ کا واپس آنے کا ارادہ ہوتا تو ایسی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے وقت کوئی نشانی چھوڑ جاتے تھے۔ مثلاً اپنے جوتے مبارک چھوڑ جاتے یا اپنے جسم کے کپڑوں میں سے کوئی چیز رکھ دیتے تو ہم اس سے سمجھ جاتے کہ آپ کے واپس آنے کا ارادہ ہے۔اس سے دو فائدے ہوتے۔ایک فائدہ تو یہ ہوتا کہ اس جگہ پر میں دوبارہ آکر بیٹھوں گا اور دوسرا یہ ہوتا کہ صحابہ سمجھ جاتے کہ ابھی مجلس برخواست نہیں ہوئی بلکہ عارضی طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر چلے گئے ہیں۔

اصل میں آدمی کو اپنی گفتگو اور اپنے طرزِ عمل میں واضح رہنا چاہیئے۔یعنی نہ ہی گفتگو ایسی ہونی چاہیئے کہ دوسرا ابہام کا شکار رہے پتا نہیں کیا چاہتے ہیں اور نہ ہی طرزِ عمل ایسا ہونا چاہیئے کہ دوسرا ابہام کا شکار رہے۔ جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا انداز اختیار کیا کہ پتا چل جاتا تھا کہ آپ کا دوبارہ آنے کا ارادہ ہے یا نہیں تاکہ اگر کوئی جانا چاہتا ہے تو اٹھ کر چلا جائے۔

دو آدمیوں کے درمیان بلا اجازت گھسنا

(۹) وَعَن عبد الله بن عَمْرو عَنْ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ إِلَّا بِإِذْنِهِمَا» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو آدمیوں کے درمیان تفریق کرے مگر ان کی اجازت کے ساتھ۔

(۱۰) وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ جَدِّهِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَجْلِسْ بَيْنَ رَجُلَيْنِ إِلَّا بِإِذْنِهِمَا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھو مگر ان کی اجازت کے ساتھ۔

اس دوسری روایت میں منع فرمایا ہے دو آدمیوں کے درمیان بیٹھنے سے جبکہ پہلی روایت اس کی وضاحت کررہی کیونکہ اس میں دو آدمیوں کے درمیان بیٹھنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان کے درمیان تفریق سے منع فرمایا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ دو آدمی کسی جگہ پر بیٹھے ہوتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ غیر متعلق ہیں اور درمیان میں جگہ خالی ہے وہاں پر کسی تیسرے آدمی کے آکر بیٹھنے سے ان دونوں کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوتی مثلاً مسجد میں بیٹھے ہیں وہ اپنے طور پر کچھ پڑھ رہا ہے اور یہ اپنے طور پر، درمیان میں جگہ خالی ہے تو درمیان میں اگر کوئی تیسرا آدمی آکر بیٹھ جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ ہاں البتہ دو آدمی اس طریقے سے بیٹھے ہیں کہ ان کے درمیان میں گھسنے سے ان کو تکلیف ہوگی یہ ٹھیک نہیں ہے۔ مثلاً وہ دونوں آپس میں کچھ بات کررہے ہیں اب وہاں پر ان کی اجازت لے کر بیٹھنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے وہ ایسی بات کررہے ہوں جو وہ آپ کو سنانا نہ چاہتے ہوں تو خوا مخواہ تم بیٹھو گے تو ان کو اپنا سلسلہ کلام منقطع کرنا پڑے گا۔ اپنی بات بند کرنی پڑے گی۔ تو یہ ٹھیک نہیں ہے، یہ تفریق ہوگئی ان کے درمیان۔ تفریق لازمی نہیں کہ جسمانی ہی ہو بلکہ معنیً بھی تفریق ہوجائے گی کہ وہ آپس میں بات کررہے تھے لیکن تم آکر بیٹھ گئے اس لئے وہ آپس میں بات نہیں کرسکتے تو اس سے حضور ﷺ نے منع فرمایا کہ دو آدمی اگر کہیں بیٹھ کر بات کررہے ہوں تو وہاں

بیٹھنے سے پہلے ان سے پوچھ لینا چاہئے کہ میں بیٹھ سکتا ہوں یا نہیں اگر وہ کہیں کہ بیٹھ جائیں تو ٹھیک ہے اگر وہ کہیں کہ ہم آپس میں کوئی بات کر رہے ہیں تو اس کو بھی برا نہیں منانا چاہئے کہ ایسی کون سی بات ہو گئی ہے جو ہم سے مخفی رکھنے کی ضرورت پڑ گئی۔

الفصل الثالث

صحابہ کا حضور ﷺ کے گھر داخل ہونے تک کھڑے رہنا

(١١) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كَانَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْلِسُ مَعَنَا فِي الْمَسْجِدِ يُحَدِّثُنَا فَإِذَا قَامَ قُمْنَا قِيَامًا حَتَّى نَرَاهُ قد دخل بعض بيُوت أَزوَاجه.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ہمارے ساتھ بیٹھے ہوتے تھے اور باتیں فرما رہے ہوتے تھے تو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر جاتے تو ہم بھی کچھ دیر کھڑے ہو جاتے یہاں تک ہم دیکھتے کہ آپ ازواج مطہرات میں سے کسی کے گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تھے اس وقت صحابہ کا اکثر معمول یہ تھا کہ بیٹھے رہتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے لیکن جب آپ واپس تشریف لے جاتے تو اس وقت جب حضور اکرم اٹھتے تو صحابہ کرام بھی اٹھ جاتے اس لئے کہ اب بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی مجلس برخواست ہو گئی ہے۔ ویسے بھی اب بیٹھے رہنا خلافِ ادب معلوم ہوتا ہے اس لئے صحابہ کرام بھی اٹھ جاتے تھے۔ لیکن اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑیں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اٹھ کر کچھ دیر کے لئے کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر تشریف لے جاتے تو صحابہ کرام اپنی اپنی جگہوں کو جاتے تھے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ بالکل

سامنے ازواج مطہرات کے حجرے ہوتے تھے۔ صحابہ آپ کے گھر داخل ہونے تک منتشر نہیں ہوتے تھے اس کی ایک وجہ تو ادب ہو سکتی ہے اس لئے کہ ابھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سامنے ہیں آپ کے سامنے موجودگی کی حالت میں اِدھر اُدھر بکھر جانے میں تھوڑا سا اعراض کا شائبہ ہے، اعراض تو نہیں اعراض کا شائبہ ضرور ہے اس لئے حضور ﷺ کی زیارت کرتے رہتے تھے کہ ہم آپ کی زیارت کے محتاج ہیں جب آپ اندر تشریف لے جاتے تب اپنی اپنی جگہوں کو جاتے۔ دوسری وجہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ گھر تک پہنچنے تک راستے میں کوئی بات یاد آجائے یا کسی سے کوئی کام پڑ جائے۔

نئے آنے والے کا ایک حق

(١٢) وَعَنْ وَاثِلَةَ بْنِ الخَطّابِ قَالَ: دَخَلَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ قَاعِدٌ فَتَزَحْزَحَ لَهُ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. فَقَالَ الرَّجُلُ: يَا رَسُولَ الله إِنَّ فِي الْمَكَانِ سَعَةً. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ لِلْمُسْلِمِ لَحَقًّا إِذَا رَآهُ أَخُوهُ أَنْ يَتَزَحْزَحَ لَهُ» . رَوَاهُمَا الْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَان.

حضرت واثلۃ بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جب کہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خاطر اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹے تو اس آدمی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جگہ کے اندر تو وسعت ہے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا یہ حق ہے کہ جب اسے اس کا مسلمان بھائی دیکھے تو اس کے لئے اپنی جگہ سے ہٹے۔

تاکہ وہ یہ سمجھے کہ اس نے میرے آنے کو کوئی اہمیت دی ہے، بے اعتنائی کا اظہار نہ ہو۔

باب الجلوس والنوم والمشی

الفصل الاول

گوٹ مار کر بیٹھنا

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِفِنَاءِ الْكَعْبَةِ مُحْتَبِيًا بِيَدَيْهِ. رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے صحن یعنی مسجد حرام میں دیکھا کہ آپ دونوں ہاتھوں کے ساتھ گوٹ مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔

احتباء بیٹھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ دونوں گھٹنے کھڑے کر لئے جائیں اور گھٹنوں کے ارد گرد اپنے بازؤں سے حلقہ بنالیا جائے یا کسی عمامے یا کپڑے وغیرہ کے ذریعے حلقہ بنالیا جائے۔ یہ عربوں کا بیٹھنے کا معروف طریقہ تھا اور اس کو عربوں کی کرسی بھی کہتے ہیں۔ واقعتاً اس میں آدمی کو کافی راحت ہوتی ہے۔ اور ایک قسم کی ٹیک بھی لگ جاتی ہے اور یہ بیٹھنے کے سیدھے سادھے طریقوں میں سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسجد حرام میں احتباء کی حالت میں بیٹھے ہوئے تو اس سے معلوم ہوا کہ احتباءً بیٹھنا مسجد میں بھی جائز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیٹھنا آپ کی سادگی، تواضع اور بے تکلفی پر دلالت کرتا ہے۔

پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹنا

(۲) وَعَن عبَّادِ بن تَمِيم عَنْ عَمِّهِ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ مُسْتَلْقِيًا وَاضِعًا إِحْدَى قدمَيه على الْأُخْرَى. مُتَّفق عَلَيْهِ

عباد بن تمیم اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں سیدھے لیٹے ہوئے دیکھا اس حالت میں کہ آپ نے اپنے دونوں قدموں میں ایک کو دوسرے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔

عباد بن تمیم کے چچا مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری ؓ ہیں جو وضوء کی ایک مشہور حدیث کے راوی ہیں۔

ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر لیٹنا

(۳) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: نَهَى رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَرْفَعَ الرَّجُلُ إِحْدَى رِجْلَيْهِ عَلَى الْأُخْرَى وَهُوَ مُسْتَلْقٍ عَلَى ظَهْرِهِ. رَوَاهُ مُسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی دونوں ٹانگوں میں سے ایک کو دوسری کے اوپر رکھے اس حال میں کہ وہ اپنی کمر کے بل لیٹا ہوا ہو۔

(٤) وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَسْتَلْقِيَنَّ أَحَدُكُمْ ثمَّ يَضَعُ إِحْدَى رِجْلَيْهِ على الْأُخْرَى» . رَوَاهُ مُسلم.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہ کرے کہ کمر کے بل لیٹ جائے پھر اپنی ایک ٹانگ کو دوسری کے اوپر رکھے۔

یہاں دو طرح کی حدیثیں بظاہر متعارض نظر آرہی ہیں۔ ایک طرف تو حضور اقدس ﷺ نے اس طرح لیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ آدمی سیدھا لیٹا ہوا ہو اور ٹانگ پر ٹانگ رکھی ہوئی ہو یا پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے ہوں لیکن دوسری طرف اس باب کی دوسری حدیث میں ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس انداز سے لیٹے ہوئے تھے تو دونوں میں بظاہر تعارض ہے۔ لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منع فرمانا اس صورت میں ہے جبکہ ٹانگ پر ٹانگ رکھنے کی صورت میں کشفِ عورت یعنی ستر کھل جانے کا خطرہ ہو کیونکہ اس زمانے میں زیادہ تر لنگی باندھی جاتی تھی شلوار وغیرہ کم ہوتی تھی۔ اگر ستر کھلنے کا خطرہ نہ ہو تو اس طرح لیٹنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حاصل یہ کہ منع فرمانا اس حالت میں ہے جب ستر کھلنے کا امکان ہو اور خود جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لیٹے ہوئے تھے یہ ایسی حالت میں تھا کہ اس بات کا کھلنے کا امکان نہیں تھا۔ اسی کو بعض حضرات نے یوں بیان فرمایا کہ یہ اس صورت میں تھا جب کہ ایک گھٹنا کھڑا کر کے دوسری ٹانگ کو اس پر رکھ لیا جائے اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو لیٹے ہوئے تھے وہ اس طریقے سے کہ دونوں ٹانگیں سیدھی تھیں اور اس حالت میں ایک پاؤں دوسرے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جس حدیث میں ممانعت ہے وہاں 'رجل' کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے 'ٹانگ' کیا ہے اور جہاں خود آں حضرت ﷺ کا عمل ہے وہاں 'قدم' کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہم نے پاؤں کیا ہے۔

اکڑ کر چلنے کا وبال

(۵) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ الله عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «بَيْنَمَا رَجُلٌ يَتَبَخْتَرُ فِي بُرْدَيْنِ وَقد أعْجَبْته نَفسُه خُسِفَ بِهِ الأرْضَ فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِيهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَة» . مُتَّفق عَلَيْهِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسی حالت میں کہ ایک شخص اپنی دو منقش چادروں میں اکڑتا ہوا چل رہا تھا وہ اپنے آپ پر اترا رہا تھا (اپنا آپ اسے اچھا لگ رہا تھا) کہ اتنے میں زمین میں دھنسا دیا گیا اور وہ قیامت تک زمین میں ہی دھنستا رہے گا۔

بعض نے کہا کہ یہ قارون کا واقعہ ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ قارون ہی مراد ہو بلکہ کوئی بھی اور شخص مراد ہو سکتا ہے۔ اس سے کیا غرض کہ کون ہے اصل جو مقصود ہے حدیث کا وہ تو یہ ہے کہ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور انسان کو کبھی بھی اکڑ اور تکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔

الفصل الثانی

تکیے کا استعمال سنت نبوی ہے

(٦) عَن جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا عَلَى وِسَادَةٍ عَلَى يَسَارِهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

حضرت جابر بن سمرۃ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے تکیے پر ٹیک لگاتے ہوئے دیکھا جو آپ کے بائیں جانب تھا۔

اس حدیث کے پیش نظر بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ تکیہ بائیں جانب رکھنا چاہئے، لیکن یہ بات اس حدیث سے بظاہر ثابت نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ نے بائیں جانب رکھنے کا اہتمام فرمایا تھا یا بالقصد بائیں جانب رکھا تھا یا آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ بائیں جانب رکھا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اتفاقاً بائیں جانب ہو۔ اس وقت آپ کا دل بائیں جانب ٹیک لگانے کو چاہ رہا ہو اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں جانب رکھ لیا۔ آخر کسی جانب تو ہونا تھا تو ایک آدھ مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عمل فرمایا ہو اس سے وہ سنت نہیں بن جاتا۔

(۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: كَانَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَلَسَ فِي الْمَسْجِد احتبى بيدَيْهِ. رَوَاهُ رزين

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تشریف رکھتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے ساتھ احتبا کر لیتے تھے۔

(۸) وَعَنْ قَيْلَة بِنْتِ مَخْرَمَة أَنَّهَا رَأَتْ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُوَ قَاعِدٌ الْقُرْفُصَاءَ. قَالَتْ: فَلَمَّا رَأَيْتُ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَخَشِّعَ أُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت قیلہ بن مخرمہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں اس حالت میں دیکھا کہ آپ گوٹ مار کر سکڑ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب میں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عاجزی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھا تو رعب کی وجہ سے مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔

''القرفصاء'' بیٹھنے کی ایک ہیئت کا نام ہے یہ تقریباً وہی احتباء والی ہی ہیئت ہے کہ آدمی دونوں گھٹنوں کو کھڑا کرلے اور اپنے ہاتھ کے ساتھ حلقہ بنالے۔ اسی میں آدمی تھوڑا سا سکڑ جائے اور خاص طور پر اگر دونوں ہاتھ اپنی بغلوں میں ڈال لے اور اپنا چہرہ اپنے بازؤں کے قریب کرلے۔ بعض دیہاتیوں کو آپ نے اس طرح بیٹھے دیکھا ہوگا۔ امام بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ قرفصاء احتباء ہی کو کہتے ہیں۔ بہر حال قرفصاء احتباء کی ایک قسم ضرور ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بیٹھنے کی سادگی اور مسکنت والی ہیئت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکنت کے ساتھ بے تکلفی کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے، بادشاہوں کا رعب تو ظاہری نوعیت کا ہوتا ہے، اللہ والوں کا رعب مسکنت کے اندر ہوتا ہے او یہ رعب حقیقی ہوتا ہے جو انسان کے دل کی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ تو بظاہر یہاں رعب والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ ﷺ ایک عام سے انسان کی طرح مسکنت کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن قیلہ بنت مخرمہ کہتی ہیں کہ میری پہلی نظر حضور اقدس ﷺ پر پڑی تو مجھ پر ایسا رعب طاری ہوا کہ میں کانپنے لگی۔ دوسری روایت میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ تم ڈرتی کیوں ہو۔ میں تو ایک عام سی عورت کا بیٹا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا أُرعِدتِ المسكينة، بیچاری عورت، مسکین عورت تو کانپنے لگی ہے، حضور ﷺ نے فرمایا یا مسكينة عليكِ السكينة۔[1] رسول اللہ ﷺ کا یہ برجستہ جملہ سن کر اور آپ کے شفقت بھرے انداز کی وجہ سے ان کی کپکپی ختم ہوگئی۔ تو یہ تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رعب۔ لیکن رعب کے ساتھ ساتھ محبت بھی۔ اس لئے 'الفرق' کا ترجمہ میں نے خوف نہیں کیا بلکہ رعب کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آتا ہے ''من رآہ بداہۃ ہابہ و من خالطہ معرفۃ أحبہ'' کہ جو آپ کو

1۔ فتح الباری ۶۵/۱۱۔

اچانک دیکھتا تھا تو وہ آپ سے مرعوب ہو جاتا تھا اس پر آپ کا رعب پڑ جاتا تھا لیکن جو آپ سے معاملات کرتا تھا میل جول کرتا تھا وہ آپ سے محبت کرنے لگ جاتا تھا، رعب اس کے دل میں بھی رہتا تھا لیکن محبت رعب پر غالب آ جاتی تھی۔

آلتی پالتی مار کر بیٹھنا

(۹) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى الْفَجْرَ تَرَبَّعَ فِي مَجْلِسِهِ حَتَّى تطلع الشَّمْس حسناء. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب فجر کی نماز پڑھ چکتے تو اپنی جگہ میں چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ سورج اچھے طریقے سے طلوع ہو جاتا۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تھے اور عموماً سب سے پہلے صحابہ کرام سے یہ پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا اگر کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا اور وہ بیان کرتا تو نبی کریم ﷺ نے جو کچھ فرمانا ہوتا وہ فرما دیتے۔ کبھی یہ فرماتے کہ خواب ہے حقیقت نہیں ہے اور کبھی اس خواب کی تعبیر بیان فرما دیتے۔ اور اگر خود کوئی خواب دیکھا ہوتا یا ویسے رات کے وقت کوئی وحی نازل ہوئی ہوتی تو صحابہ کرام کو اس سے مطلع فرما دیتے۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح کی باتیں اس مجلس میں ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ آگے آئے گا کہ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتی تھیں بعض اوقات شعر و شاعری بھی ہوتی تھی۔ بہر حال یہاں پر جو اصل مقصد ہے وہ یہ لفظ ہے فتربع فی مجلسہ کہ آپ جو اپنی اس مجلس میں بیٹھتے تھے وہ چوکڑی مار کر بیٹھتے تھے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ چوکڑی مار کا بیٹھنا بھی جائز ہے اور اس کی کوئی کراہت نہیں۔ چنانچہ یہی مسئلہ ہے کہ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے چوکڑی مار کر بیٹھنا جائز ہے۔ حتی کہ اس طرح بیٹھ کر

کھانا کھانا بھی جائز ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کو ناجائز یا مکروہ سمجھا جاتا ہے لیکن شرعاً اس کے اندر کوئی کراہت نہیں ہے۔ہاں البتہ یہ ہر مسلمان کا حق ہوتا ہے کہ جب کوئی آدمی اس کے سامنے بیٹھے تو جس مقام کا وہ آدمی ہے اس کے مطابق اس کو احترام دیا جائے اور ایسا انداز اختیار کیا جائے جس کو بے احترامی اور بے ادبی پر محمول نہ کیا جائے۔ احترام اور ادب کے کچھ پہلو شرعی ہیں جو شریعت نے سکھائے ہیں، لیکن زیادہ پہلو اس کے عرفی ہیں یعنی ان کا تعلق عرف کے ساتھ ہے۔ لہٰذا بڑا ہو یا چھوٹا اس کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھنا شرعاً جائز ہے بلکہ بعض فقہانے تو یہ کہا ہے کہ اگر بیٹھ کر نماز پڑھنی ہے تو کس طرح بیٹھنا چاہیے اس میں خود حنفیہ کی کئی روایتیں ہیں ایک روایت تو یہی ہے کہ تشہد کے طریقے پر بیٹھے، ایک یہ ہے کہ احتباء کی حالت میں اور ایک یہ ہے کہ متربعا بیٹھے یعنی آلتی پالتی مار کر بیٹھے۔ حالانکہ نماز تو عاجزی کا موقع ہے اس موقع میں بھی اجازت ہے لہٰذا شرعاً تو اس میں کوئی بے ادبی کی بات نہیں۔ لیکن جہاں عرفاً کسی کے سامنے اس طرح بیٹھنے کو خلافِ ادب سمجھا جائے اور اس کو بے احترامی پر محمول کیا جائے وہاں پر اس طرح نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص جو آپ کے احترام کا مستحق ہو اس کے دل کو خوامخواہ تکلیف پہنچے۔

آخر شب میں آپ ﷺ کا لیٹنے کا انداز

(١٠) وَعَنْ أَبِي قَتَادَةَ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا عَرَّسَ بِلَيْلٍ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ وَإِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهُ وَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلَى كَفِّهِ. رَوَاهُ فِي شَرْحِ السُّنَّةِ.

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کے وقت پڑاؤ ڈالتے تو آپ اپنی دائیں کروٹ پر لیٹتے اور جب آپ صبح سے ذرا پہلے پڑاؤ ڈالتے تو اپنی کلائی کو بچھا لیتے اور اپنے سر کو اپنی ہتھیلی پر رکھتے۔

جب حضور اکرم ﷺ ایسے وقت میں پڑاؤ ڈالتے کہ صبح میں دیر ہوتی تو دائیں کروٹ پر لیٹتے لیکن جب آپ صبح کے بالکل قریب پڑاؤ ڈالتے جبکہ فجر کا وقت قریب ہوتا تو اس وقت آپ کروٹ پر نہیں لیٹتے تھے بلکہ سیدھے لیٹتے تھے اور سیدھے لیٹ کر کلائی بچھا کر اپنا سر مبارک اپنے ہاتھ پر رکھ لیا کرتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ کروٹ پر لیٹنے سے نیند گہری آجاتی ہے اور سیدھا لیٹنے سے نیند عام طور پر گہری نہیں ہوتی۔ لہٰذا آپ تجربہ کرکے دیکھ لیں کہ اگر آپ سیدھے لیٹے ہوں تو جب آپ کی نیند گہری ہونے لگے گی تو آپ کا دل چاہے گا کہ میں کروٹ لے لوں۔ اصل میں آپ کا دل چاہ رہا ہے گہری نیند سونے کو اور اس کا طریقہ خود آپ کے ذہن میں آرہا ہے کہ آپ کروٹ لے لیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب وقت زیادہ ہوتا تھا تو کروٹ لے کر سوتے تھے تاکہ بھرپور نیند ہو جائے اور جب تھوڑا وقت ہوتا تو آپ سیدھا لیٹتے تھے کروٹ نہیں لیتے تھے تاکہ گہری نیند نہ آئے۔

رسول اللہ ﷺ کا بستر کتنا تھا

(۱۱) وَعَنْ بَعْضِ آلِ أُمِّ سَلَمَةَ قَالَ: كَانَ فِرَاشُ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوًا مِمَّا يُوضَعُ فِي قَبْرِهِ وَكَانَ الْمَسْجِدُ عِنْدَ رَأسه. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

ام سلمہؓ کے بعض گھر والے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر اتنا ہی تھا جتنا قبر میں رکھا جاسکتا تھا اور آپ کی نماز پڑھنے کی جگہ سر کی طرف تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچ مچ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک میں کوئی بستر رکھا گیا اور نہ ہی قبر کے اندر رکھنا مسنون ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر لمبا چوڑا نہیں ہوتا تھا بلکہ چھوٹا سا ہوتا تھا بس اتنا سا بستر ہوتا تھا کہ اگر قبر میں رکھنا چاہتے تو قبر میں رکھا جاسکتا تھا۔ اس حدیث کا ایک مطلب اور بھی بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ابوداؤد میں عام نسخوں میں یہ حدیث ان لفظوں کے ساتھ ہے «كان فراش النبي صلى الله عليه

وسلم نحوا مما يوضع الإنسان في قبره»، اور اس پر امام ابوداؤد نے عنوان یہ قائم کیا ہے: "باب کیف یتوجہ عند النوم"، ان لفظوں اور عنوانِ باب کے مطابق مطلب یہ بنتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بستر بچھائے جانے کا انداز وہ ہوتا تھا جو انسان کو قبر میں رکھنے کا، یعنی انسان کو قبر میں قبلے کے رخ لیٹایا جاتا ہے اسی طرح آپ کا بستر بھی قبلہ رخ بچھایا جاتا تھا۔

"وکان المسجد عند راسہ" اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب آپ سوتے تھے تو آپ کا سر مسجد کی طرف ہوتا تھا اور ٹانگیں دوسری طرف ہوتی تھیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مسجد سے مراد معروف مسجد نہیں بلکہ مسجد سے مراد نماز کی جگہ ہے تو ایک طرف آپ کا بستر لگا ہوا ہوتا تھا اور بستر کے ہی سرہانے کی جانب تھوڑی سی جگہ آپ نے نماز پڑھنے کے لئے چھوڑی ہوتی تھی۔

الٹا لیٹنے کا حکم

(١٢) وَعَن أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: رَأَى رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا مُضْطَجِعًا عَلَى بَطْنِهِ فَقَالَ: «إِنَّ هَذِهِ ضِجْعَةٌ لَا يُحِبُّهَا الله» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو اپنے پیٹ کے بل لیٹے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا: یہ لیٹنے کا وہ انداز ہے جسے اللہ تعالی پسند نہیں کرتے۔

الٹا لیٹنے کے ناپسند ہونے کے بارے میں متعدد حدیثیں روایت کی گئی ہیں، ان میں سے بعض کی سندوں میں اختلاف اور اضطراب بھی ہے، تاہم بحیثیت مجموعی یہ بات درجہ حسن تک ضرور پہنچتی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس کی وجہ بعض نے یہ بیان کی ہے کہ اس میں سینہ اور چہرہ جو باعزت اعضا ہیں نیچے آجاتے ہیں جو ان اعضا کی تکریم کے منافی ہے، اگر یہ وجہ ہو تو کراہت تنزیہی ہونی چاہیے۔ ایک اور وجہ اگلی حدیث

سے معلوم ہو رہی ہے کہ یہ اہل النار یعنی کفار کا انداز ہے، یعنی اس میں ان کے ساتھ تشبہ ہے، اور تشبہ کا معاملہ حالات و زمانہ کے اعتبار سے بدلتا رہتا ہے۔ البتہ اسی بات کو پہلی وجہ بھی بنایا جاسکتا ہے کہ یہ اہل النار یعنی دوزخ والوں کا لیٹنا ہے، یعنی دوزخ میں چونکہ دوزخی کی تذلیل اور سزا مقصود ہوگی اس لئے اسے الٹا لٹایا جائے گا، لہذا لیٹنے کا یہ انداز انسانی کرامت کے مطابق نہیں ہے۔

اس حدیث سے اور آنے والی چند حدیثوں سے بحیثیت مجموعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ الٹا لیٹنا مکروہ ہے۔ تاہم عذر کی حالت اس سے مستثنی ہوگی۔ بعض لوگ قدرتی اور پیدائشی طور پر الٹا لیٹنے کے عادی ہوتے ہیں، یہ بھی ایک عذر ہی ہے۔

(۱۳) وَعَنْ يَعِيشَ بْنِ طِخْفَةَ بْنِ قَيْسٍ الْغِفَارِيِّ عَن أبيهِ - وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ الصُّفَّةِ - قَالَ: بَيْنَمَا أَنَا مُضْطَجِعٌ مِنَ السَّحَرِ عَلَى بَطْنِي إِذَا رَجُلٌ يحركني بِرجلِهِ فَقَالَ: «هَذِهِ ضِجْعَةٌ يَبْغَضُهَا الله» فَنَظَرْتُ فَإِذَا هُوَ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وَابْن مَاجَه.

یعیش بن طخفہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں —جو کہ اصحاف صفہ میں سے تھے— وہ کہتے ہیں کہ میں سینے یا پھیپھڑے کی تکلیف کی وجہ سے اپنے پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا، اتنے میں ایک صاحب اپنے پاؤں سے مجھے حرکت دے رہے تھے اور انہوں نے یہ کہا کہ یہ لیٹنے کا وہ انداز ہے جسے اللہ تعالی ناپسند کرتے ہیں، میں نے نظر ڈالی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

بظاہر یہ حدیث پچھلی حدیث سے الگ معلوم ہوتی ہے کہ وہ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی تھی یہ حضرت طخفہ غفاری رضی اللہ عنہ سے۔ لیکن امام ترمذی کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی روایت ہے جس کی سند میں

اضطراب ہے، حدیث کے راوی ابو سلمہ سے ان کے بعض شاگردیوں نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ حدیث حضرت ابوہریرۃؓ کے حوالے سے ذکر کی اور بعض یوں کہ انہوں حضرت طخفہؓ سے۔

حدیث میں لفظ ہیں: ''من السحر'' یہ سین کے زبر کے ساتھ ہے، اس کے معنی ہوتے ہیں سینہ، اسی طرح پھیپڑے کو بھی کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتی ہیں توفی النبی ﷺ بین سَحْری ونحری، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا میرے سینے اور گردن کے درمیان۔ یہ صحابی اپنے سینے یا پھیپھڑے کی تکلیف کی وجہ سے الٹے لیٹے ہوئے تھے، جس پر نبی کریم ﷺ نے انہیں یہ تنبیہ فرمائی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کا یہ عام اصول ہے کہ عذر کی وجہ سے ممنوع کام بھی جائز ہو جاتے ہیں، یہاں رسول اللہ ﷺ نے اس اصول کا اطلاق کیوں نہیں فرمایا؟ تو اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ کو ان کے اس عذر کا علم نہیں ہوگا۔ جب آپ نے انہیں ایسا لیٹنے سے منع فرمادیا تب بھی انہوں نے اپنا عذر بیان نہیں کیا، یا تو شرم وحیا کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ جب کوئی بڑا نصیحت کرے تو آگے سے عذر بیان کرنا بعض اوقات ادب سے ذرا ہٹا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس لئے وفورِ ادب کی وجہ سے انہوں نے عذر بیان نہیں فرمایا۔

بغیر منڈیر کے چھت پر لیٹنا

(١٤) وَعَن عليٍّ بن شَيبَان قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ بَاتَ عَلَى ظَهْرِ بَيْتٍ لَيْسَ عَلَيْهِ حِجَابٌ - وَفِي رِوَايَةٍ: حِجَارٌ - فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَفِي مَعَالِمِ السّنَن للخطابي حجى .

حضرت علی بن شیبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے گھر کی ایسی چھت پر رات گذاری جس پر کوئی رکاوٹ نہیں تھی تو اس کا ذمہ بری باقی نہیں رہا (یعنی وہ اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا)۔

چنانچہ اگلی روایت میں بھی آرہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی آدمی ایسی چھت پر سوئے جس پر کوئی منڈیر وغیرہ کوئی نہیں ہوتی کیونکہ اس میں یہ امکان موجود ہے کہ رات کو نیند کی حالت میں آدمی کوئی پلٹا وغیرہ لے اور پلٹے کھاتے کھاتے نیچے آکر گرے اس کا نقصان ہوگا۔ تو ایسی بے احتیاطی کرنا جس میں کسی نقصان کا خطرہ ہو یہ شریعت کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔

(١٥) وَعَنْ جَابِرٍ قَالَ: نَهَى رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَنَامَ الرَّجُلُ عَلَى سطحٍ لَيْسَ بمحجورٍ عَلَيْهِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ.

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی ایسی چھت پر سوئے جس پر کوئی رکاوٹ بنی ہوئی نہ ہو۔

حلقے کے درمیان میں بیٹھنے کی ممانعت

(١٦) وَعَن حذيفةَ قَالَ: مَلْعُونٌ عَلَى لِسَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَعَدَ وَسْطَ الْحَلْقَةِ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ شخص محمد ﷺ کی زبان پر ملعون ہے جو حلقے کے درمیان میں بیٹھے۔

اس حدیث میں حلقے کے درمیان میں بیٹھنے کی جو مذمت کی گئی ہے اس کے مختلف مطلب بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ آدمی بھری مجلس میں بعد میں آتا ہے،اور لوگوں کی گردنیں پھلاندتا ہوا حلقے کے درمیان میں پہنچ جاتا ہے، حالانکہ اسے چاہیے تھا کہ جہاں جگہ ملے بیٹھ جائے،اس نے ایک تو دوسروں کو ایذا پہنچائی دوسرے اس طرح کے طرزِ عمل کا منشا بعض اوقات تکبر ہوتا ہے۔ہاں البتہ اگر گردنیں پھلاندے بغیر آگے جگہ مل رہی ہو اور آگے بڑھنے کا منشا بھی کبر نہ ہو بلکہ شوقِ علم ہو تو پسندیدہ ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے درمیان میں سر بازار بیٹھ جاتا ہے لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یہ انہیں مختلف قسم کی شعبدہ بازیاں کر کے دکھاتا ہے۔

بہترین مجالس

(۱۷) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «خَيْرُ الْمَجَالِسِ أَوْسَعُهَا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین مجلس وہ ہے جس میں گنجائش زیادہ ہو۔

زیادہ گنجائش ہونے سے مراد یہ ہے کہ مجلس میں بیٹھنے والے بعد میں آنے والوں کے لئے وسعت اور فراخی کا انداز اختیار کریں۔اس حدیث میں یہ بات بھی داخل ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی مجلس قائم کرنی ہے کوئی درس ہونا ہے یا کسی بھی لوگوں کا اجتماع ہونا ہے تو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ جتنے آدمی آنے کا امکان ہے اسے سامنے رکھتے ہوئے انتظامات میں وسعت ہو۔ایسا انتظام کیا جائے جس میں کسی قسم کی تنگی اور کسی کو الجھن یا تکلیف نہ ہو۔

ٹولیوں میں بیٹھنا

(١٨) وَعَنْ جَابِرِ بنِ سَمُرَة قَالَ: جَاءَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابُهُ جُلُوسٌ فَقَالَ: «مَا لِي أَرَاكُمْ عِزِينَ؟» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی حالت میں تشریف لائے کہ آپ کے صحابہ بیٹھے ہوئے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں متفرق ٹولیوں میں دیکھ رہا ہوں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے -واللہ اعلم- کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے انتظار میں صحابہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں ان کے لئے بہتر یہ تھا کہ وہ یکجا ہو کر اکٹھے ہو کر باقاعدہ مجلس کے انداز میں بیٹھتے لیکن وہ متفرق ہو کر الگ ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کو حضور اقدس ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں دلوں کے تفرق کا شائبہ اور اس کا ایک گونا اظہار ہوتا ہے کہ ان کے دل ملے ہوئے نہیں ہیں اور دوسرے اس میں بدنظمی بھی ہے کہ جب حضور کی باتیں سننے کے لئے بیٹھنا ہے تو آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی اس ہیئت میں بیٹھا جائے جیسا کہ آپ کی مجلس میں بیٹھنا ہے، ایسے نہیں کہ جب آپ تشریف لے آئیں تو مجلس کی ہیئت بنانی شروع کی جائے۔ چنانچہ ابن حبان نے اس حدیث پر یہ عنوان قائم کیا ہے: ذكر الزجر عن ترك اجتماع الناس في المسجد في المجلس الواحد إذا أرادوا تعلم العلم أو درسه-

آدھا دھوپ اور آدھا سائے میں بیٹھنا

(۱۹) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِذَا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الْفَيْء فقلص الظِّلُّ فَصَارَ بَعْضُهُ فِي الشَّمْسِ وَبَعْضُهُ فِي الظل فليقمْ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وَفِي شرح السّنة عَنهُ. قَالَ: «وَإِذا كَانَ أَحَدُكُمْ فِي الْفَيْءِ فَقَلَصَ عَنْهُ فَلْيَقُمْ فَإِنَّهُ مَجْلِسُ الشَّيْطَانِ» . هَكَذَا رَوَاهُ مَعْمَرٌ مَوْقُوفًا.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص سائے میں ہو اور سایہ اس سے سمٹ جائے اور اس کا کچھ جس دھوپ میں ہو اور کچھ سائے میں تو اسے چاہیے کہ وہ اٹھ جائے (تاکہ سارا دھوپ میں ہو جائے یا سارا سائے میں)۔ اور شرح السنۃ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی سائے کے اندر ہو اور وہ سایہ اس سے سمٹ جائے تو اسے چاہئے کہ وہاں سے اٹھ جائے اس لئے کہ یہ شیطان کا بیٹھنا ہے۔

حاصل یہ کہ آدمی کو اس انداز سے نہیں بیٹھنا چاہئے کہ اس کے جسم کا کچھ حصہ دھوپ میں ہو اور کچھ سائے میں۔ اگر پہلے سائے میں بیٹھا ہوا تھا اب جسم کے کچھ حصہ پر دھوپ آگئی تو وہاں سے اٹھ جائے یا تو سارا کا سارا دھوپ میں ہو جائے یا سارا کا سارا سائے میں ہو جائے اسی طرح دھوپ میں بیٹھا ہوا تھا جسم کے کچھ حصہ پر سایہ آگیا تو بھی اٹھ جائے یا تو سارا کا سارا دھوپ میں ہو جائے یا سارا کا سارا سائے میں ہو جائے۔ کچھ حصہ دھوپ میں ہو اور کچھ سایہ میں ہو اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شیطان کی مجلس قرار دیا۔ یا معمر کی روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو شیطان کی مجلس قرار دیا ہے یہ بات قابل غور ہے کہ اس کو شیطان کی مجلس کیوں قرار دیا، ہو سکتا ہے کہ شیطان واقعتاً اسی طریقے سے بیٹھتا ہو۔ لیکن اصل بات یہاں پر یہ کہنا ہے کہ اس طرح بیٹھنے سے شیطان خوش ہوتا ہے اس لئے کہ اس میں ایک تو انسان کے بدن کو اور بدنی صحت کو نقصان پہنچتا ہے اور انسان کے جسمانی نقصان پر بھی خاص

طور پر مؤمن کے نقصان پر شیطان کو خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ جس طرح انسان کی روح کا دشمن ہے اسی طرح انسان کے جسم کا بھی دشمن ہے انہ لکم عدو مبین کہ کھلا ہوا دشمن ہے پکا دشمن ہے۔ اس کی دشمنی کسی خاص دائرے میں محدود نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کو پتا ہے کہ مؤمن جب جسمانی اعتبار سے بیمار ہو گا تو بہت سارے اعمال بھی اس کے ڈھیلے پڑ جائیں گے لہٰذا اس کی روحانیت کو بھی نقصان پہنچے گا۔ تو حاصل یہ کہ شیطان اس طرح کے بیٹھنے پر خوش ہوتا ہے اور جس کام پر شیطان خوش ہو اس سے بچنا چاہئے۔ اس کے علاوہ دوسری وجہ اور بھی ہے کہ صحت کو نقصان نہ بھی پہنچے تو یہ بدذوقی اور مزاج میں بے اعتدالی کی علامت ہے اگر طبیعت کے اندر اعتدال ہو اور ذوق کے اندر سلامتی ہو تو آدمی اس کیفیت کو برداشت نہیں کرتا الجھن سی ہوتی ہے۔ اگر پھر بھی یہاں بیٹھا ہوا ہے کہ اس کو اس طرح کی کیفیت کی وجہ سے کوئی الجھن نہیں ہو رہی اور یا یہ ہے کہ یہ انتہائی سست ہے کہ الجھن تو ہو رہی ہے لیکن اٹھنے کی ہمت نہیں ہو رہی اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں شیطان کو پسند ہیں کہ مؤمن بدذوق ہو یا مؤمن سستی کا مارا ہوا ہو۔ ہاں البتہ کسی مجبوری کی وجہ سے بیٹھنا پڑ جائے کہ کسی کے ساتھ باتیں کر رہا ہے اگر اٹھے گا تو ہو سکتا ہے کہ یہ اسے نامناسب سمجھے یا کوئی اور مجبوری ہو تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے بعض اوقات اس طرح کی صورت حال ہوتی ہے کہ آدمی کو مجبوراً بیٹھا رہنا پڑتا ہے۔

مرد و زن میں اختلاط سے ممانعت

(۲۰) وَعَن أبي أُسيد الأنصاريِّ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ وَهُوَ خَارِجٌ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاخْتَلَطَ الرجالُ مَعَ النِّسَاء فِي الطَّرِيق فَقَالَ للنِّساء: «اسْتَأْخِرْنَ فَإِنَّهُ لَيْسَ لَكُنَّ أَنْ تَحْقُقْنَ الطَّرِيقَ عَلَيْكُنَّ بِحَافَاتِ الطَّرِيقِ» . فَكَانَتِ الْمَرْأَةُ تَلْصَقُ بِالْجِدَارِ حَتَّى إِنَّ ثَوْبَهَا لَيَتَعَلَّقُ بِالْجِدَارِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالْبَيْهَقِيُّ فِي شُعَبِ الْإِيمَانِ.

حضرت ابو اسید انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد سے باہر نکل رہے تھے، راستے میں مردوں کا عورتوں کے ساتھ اختلاط ہونے لگا، اس وقت میں نے آپ ﷺ کو عورتوں سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم پیچھے رہو، تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کہ تم راستے کے درمیان میں چلو، تم راستے کے اطراف کو اختیار کرو۔ چنانچہ (اس کے بعد) عورت دیوار سے جُڑ کر چلتی تھی، یہاں تک (بسا اوقات) اس کا کپڑا دیوار سے چپک جاتا تھا۔

نماز پڑھ یا کسی اور موقع پر لوگ مسجد سے نکل رہے تھے، نکلنے والوں میں عورتیں اور مرد دونوں ہی تھے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں بھی مسجد میں آیا کرتی تھیں، اس لئے مردوں اور عورتوں کا راستے میں اختلاط ہو رہا تھا تو آپ ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا، ایک تو ویسے ہی حیا کا تقاضا ہے کہ مردوں اور عورتوں میں اختلاط نہ ہو، دوسرے ممکن ہے بعض منافق اور دلوں کے مریض قسم کے لوگوں کی کارستانیوں کا بھی ڈر ہو جن کا ذکر سورہ احزاب کی اس آیت میں ہے ﴿لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِيْنَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ﴾ اس لئے اختلاط سے بچنے کے لئے عورتوں کو یہ فرمایا کہ تم ایک طرف کو ہو کر چلو اور راستے کے درمیان میں نہ چلو۔

آں حضرت ﷺ نے یہ بات فرمائی تھی محض اس لئے تاکہ مردوں کے ساتھ اختلاط نہ ہو لیکن صحابہ کرامؓ کے اندر اطاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ایک دفعہ حکم مل جاتا تھا تو اس حکم کو پورا کرنے میں آخری حد تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتے تھے لہٰذا اب عورتوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ اب راستے کے کنارے پر چلتی تھیں اور کنارے میں بھی اس انداز سے کہ کنارے کے ساتھ مل کر۔ بعض دیواروں کی لپائی کی ہوتی ہے اور اس میں بھوسہ بھی ڈالا ہوا ہے تو اس میں کپڑا چپک جاتا ہے تو اس طرح بعض عورتوں کا کپڑا دوپٹا وغیرہ بھی دیوار کے ساتھ چپک جاتا تھا۔ انہیں سنبھالنا پڑتا تھا لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ ایک طرف ہو کر چلو تو ایک طرف ہونے میں جتنی انتہا ہو سکتی تھی اتنی انہوں نے حکم کو پورا کرنے کے لئے کی۔

عورتوں کو جو ایک طرف ہو کر چلنے کا حکم ہوا اس کی اصل وجہ مردوں کے ساتھ اختلاط سے بچنا ہے۔ اور چونکہ اس زمانے میں باہر آنے والوں کی زیادہ تعداد مردوں کی ہوتی تھی، اس لئے مردوں کو یہ کہنا کہ تم کنارے پر ہو کر چلو تنگی کا باعث بن سکتا تھا، اس لئے آپ نے عورتوں کو ایک طرف ہونے کا فرمایا، اس لئے کہ جو تھوڑے ہوں ان کے لئے کنارے پر ہونا آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی ایسا وقت ہو جس میں راستے میں کوئی مرد نہ ہو اس میں کوئی عورت راستے کے درمیان میں چلتی ہے تو یہ اس حکم کے منافی نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی جگہ ایسی ہے جو بنیادی طور پر عورتوں کے لئے ہے، مرد بالتبع وہاں چلے جاتے ہیں، جیسے خواتین کا ہی کوئی ادارہ ہے، خواتین کا پارک ہے، یا کسی ایسے اجتماع سے لوگ فارغ ہو کر نکل رہے ہیں جس میں اصل یا زیادہ تعداد میں عورتیں ہیں تو وہاں اسی مقصد کے کے لئے یعنی اختلاط سے بچنے کے لئے مردوں کو بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کنارے پر ہو کر چلیں۔

(۲۱) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسلم نهى أَنْ يمشيَ - يَعْنِي الرجلُ - بَين المرأتينِ. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی مرد دو (اجنبی) عورتوں کے درمیان میں چلے۔

جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ

(۲۲) وَعَن جابرِ بن سمرةَ قَالَ: كُنَّا إِذَا أَتَيْنَا النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَسَ أَحَدُنَا حَيْثُ يَنْتَهِي. رَوَاهُ أَبُو دَاوُد. وَذُكِر حَدِيثا عبد الله بن عَمْرٍو فِي «بَابِ الْقِيَامِ» وَسَنَذْكُرُ حَدِيثَ عَلِيٍّ وَأَبِي هُرَيْرَةَ فِي «بَابِ أَسْمَاءِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَصِفَاتِهِ» إِنْ شَاءَ الله تَعَالَ

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے تو ہم میں سے کوئی شخص وہیں پر بیٹھ جاتا تھا جہاں پر مجلس ختم ہوتی تھی۔

مطلب یہ کہ جو بعد میں آتا تو پیچھے جہاں اسے جگہ ملتی وہیں پر بیٹھ جاتا تھا۔ آگے آنے کی کوشش نہیں کرتا تھا، اس لئے کہ آگے آنے کی کوشش اگر کی جائے تو امکان ہے کہ کندھے پھلانگ کر آگے آنا پڑے اور پہلے بیٹھے ہوئے لوگوں کو تکلیف اور تشویش ہو اس لئے ادب یہی ہے کہ بعد میں آنے والا پیچھے ہی بیٹھ جائے۔ ہاں البتہ دوسروں کو تکلیف کا امکان نہ ہو اور جگہ بھی موجود ہو تو آگے آنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی تین آدمی آئے۔ ان میں سے ایک تو پیچھے ہی جہاں اس کو جگہ ملی بیٹھ گیا۔ دوسرے نے دیکھا کہ آگے جگہ خالی ہے تو وہ کندھوں کو پھلانگنے سے بچتا ہوا آگے پہنچ گیا۔ اور تیسرے شخص نے جب دیکھا کہ آگے جگہ نہیں ہے تو وہ واپس چلا گیا ہو سکتا ہے کہ یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ میری شان کے لائق جگہ نہیں ہے یا کوئی اور وجہ ہو۔ بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے پہلے شخص کے بارے میں فرمایا کہ اس نے حیا کی تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے حیا کریں گے۔ اور دوسرے شخص کے بارے میں فرمایا کہ اوی الی اللہ فآواہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی آغوش میں جگہ چاہی، اس لئے کہ اس کا یہ انداز علم کے لئے طلب اور ذوق وشوق کا اظہار تھا تو اللہ تعالی نے اسے اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے دی۔ تیسرے کے بارے میں فرمایا کہ اس نے بے رخی برتی اس لئے اللہ تعالی نے بھی اس کے ساتھ بے رخی والا معاملہ فرمایا۔

الفصل الثالث

بیٹھنے کا ایک نامناسب انداز

(٢٣) عَن عمْرِو بن الشَّرِيدِ عَن أبيهِ قَالَ: مَرَّ بِي رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا جَالِسٌ هَكَذَا وَقَدْ وَضَعْتُ يَدِي الْيُسْرَى خَلْفَ ظَهْرِي وَاتَّكَأْتُ عَلَى أَلْيَةِ يَدِي. قَالَ: «أَتَقْعُدُ قِعْدَةَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد

عمرو بن الشرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا میرے پاس سے گذر ہوا جبکہ میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اپنی پشت کے پیچھے رکھا ہوا تھا اور میں نے ہاتھ کے پچھلے گداز حصے پر ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم ان لوگوں کی طرح بیٹھتے ہو جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔

ألية يدي ہمزہ کے زبر کے ساتھ۔ ہاتھ کی پشت، ہاتھ وہ نرم اور گداز حصہ جو انگوٹھے کی جڑ کے پاس ہوتا ہے۔ بود و باش وغیرہ کے بارے میں جو اوامر و نواہی ہوتے ہیں وہ عام طور پر امر تعبدی نہیں ہوتے بلکہ ان کی کوئی علت ہوتی ہے۔ یہاں بیٹھنے کی اس ہیئت کو ناپسند کرنے کی کیا علت ہے، کسی روایت میں اس کی واضح تصریح نہیں ہے تاہم یہ جو آپ ﷺ نے فرمایا المغضوب علیہم، جن پر اللہ کا غضب ہے اس سے کیا مراد ہے، اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ اس سے یہود مراد ہیں، جیسا کہ سورہ فاتحہ کے اس لفظ کی یہی تفسیر کی گئی ہے، اس صورت میں بیٹھنے کے اس انداز کے ناپسندیدہ ہونے کی علت یہود کے ساتھ تشبہ ہوگی، لہذا جہاں تشبہ پایا جائے وہاں یہ انداز ناجائز ہوگا۔ دوسرے یہ کہ یہاں المغضوب علیہم سے کوئی خاص طبقہ مراد نہیں ہے، بلکہ عمومی طور پر یہ کہنا مقصود ہے کہ اس طرح بیٹھنے والوں پر اللہ تعالی کا غضب ہوتا ہے۔ اس صورت میں بظاہر اللہ کے غضب کی وجہ کبر ہوگی، اس زمانے میں اس طرح بیٹھنا تکبر کی علامت ہوتا ہوگا۔ تاہم اگر کسی علاقے یا زمانے میں یہ تکبر کی علامت نہ رہے اور نہ ہی اس طرح بیٹھنا تکبر کی وجہ سے ہو تو یہ وعید متوجہ نہیں ہوگی۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عادات میں اباحت اصل ہوتی ہے، امام بخاریؒ نے کتاب الاستیذان میں باب قائم کیا جائے باب الجلوس کیفما تیسر، اس باب میں امام بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آدمی جیسے سہولت ہو بیٹھ سکتا ہے۔ یعنی بیٹھنے کی ہیئت میں اصل جواز ہے، لہذا جب تک کسی خاص ہیئت کے عدمِ جواز کی وجہ سامنے نہ آجائے تب بھی تک اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ امام بخاری نے اس میں وہ حدیث پیش کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے احتباء (گوٹ مار کر بیٹھنے) سے منع فرماتے ہوئے اس کی علت یہ بیان فرمائی ہے: لیس علی فرج الانسان منہ شیء، یعنی یہ طریقہ اس لئے ناپسندیدہ ہے کہ ستر کھلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ باب کے مذکورہ عنوان کے تحت یہ حدیث لا کر غالباً امام بخاریؒ اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ بیٹھنے وغیرہ وغیرہ عادات کے امور میں جہاں کسی خاص ہیئت سے ممانعت ہوتی ہے تو وہ کسی علت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لہذا جہاں وہ علت پائی جائے وہاں ممانعت ہوگی ورنہ نہیں۔

الٹا لیٹنے کا حکم

(٢٤) وَعَن أبي ذرٍّ قَالَ: مرَّ بِي النبيُّ صلى الله عليه وسلم وَأَنَا مُضْطَجِعٌ عَلَى بَطْنِي فَرَكَضَنِي بِرِجْلِهِ وَقَالَ: «يَا جُنْدُبُ إِنَّمَا هِيَ ضِجْعَةُ أَهْلِ النَّارِ» . رَوَاهُ ابنُ مَاجَه.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ میرے پاس سے گذرے جبکہ میں اپنے پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا تو آپ نے اپنا پاؤں مجھے مارا اور فرمایا: اے جندب (حضرت ابوذر کا نام ہے) یہ تو دوزخ والوں کا لیٹنے کا انداز ہے۔

باب العطاس والتثاؤب

چھینک اور جمائی کا باب

الفصل الاول

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْعُطَاسَ وَيَكْرَهُ التَّثَاؤُبَ فَإِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ وَحَمِدَ اللهَ كَانَ حَقًّا عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ سَمِعَهُ أَنْ يَقُولَ: يَرْحَمُكَ اللهُ. فَأَمَّا التَّثَاؤُبُ فَإِنَّمَا هُوَ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَرُدَّهُ مَااسْتَطَاعَ فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا تَثَاءَبَ ضَحِكَ مِنْهُ الشَّيْطَانُ ». رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: «فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذا قَالَ: هَا ضحك الشَّيْطَان مِنْهُ».

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالی کو چھینک پسند ہے اور جمائی ناپسند ہے۔ لہذا جب تم میں سے کوئی شخص چھینکے اور وہ اللہ کی حمد کرے تو ہر ایسے مسلمان پر جو اسے سنے لازم ہے کہ وہ یرحمک اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) کہے۔ اور جہاں تک جمائی کا تعلق ہے تو یہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، لہذا جب تم میں سے کسی کو جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ جہاں تک ہو سکے اسے روکے، اس لئے کہ تم میں سے کوئی شخص جب جمائی لیتا ہے تو شیطان اس پر ہنستا ہے، اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص کہتا ہے "ہا" تو شیطان اس پر ہنستا ہے۔

اس باب میں دو چیزوں کے آداب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک عطاس یعنی چھینک اور دوسرے تثاؤب یعنی جمائی لینا۔ ان دونوں کے بارے میں بنیادی بات یہ بتائی گئی ہے کہ چھینک اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت اور پسندیدہ چیز ہے بشرطیکہ عام معمول کے مطابق ہو زکام وغیرہ کسی بیماری مثلاً الرجی کی وجہ سے نہ ہو۔ جبکہ جمائی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ چھینک کیوں پسندیدہ ہے اس کی وضاحت تو حدیث کے اندر نہیں ہے لیکن ہمارے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بتلادیا کہ یہ اللہ کو پسند ہے چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور ان کی نعمت ہے اس لئے شکر ادا کرنا چاہئے۔ البتہ ایک وجہ بہت سے علمانے یہ لکھی ہے کہ چھینک آنے کی وجہ سے اندر کے بہت سارے فضلات، رطوبات اور بخارات وغیرہ باہر نکل جاتے ہیں اور آدمی کی طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے اور اس میں نشاط اور چستی پیدا ہو جاتی ہے۔ نشاط اور چستی اچھی چیز ہے اس لئے کہ طبیعت میں نشاط اور چستی ہو تو آدمی بہت سارے اچھے اچھے کام کر سکتا ہے اس کے برعکس جمائی سستی کی علامت اور سستی کا باعث ہوتی ہے اور سستی اور کاہلی یہ ساری نحوستوں اور ساری خرابیوں کی جڑ ہے اس لئے تثاؤب کو یعنی ابکائی کو پسند نہیں کیا گیا۔

حدیث میں یہ فرمایا کہ تثاؤب یعنی ابکائی شیطان کی جانب سے ہے۔ شیطان کی طرف سے ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ حدیث کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے کہ شیطان انسان میں کوئی ایسا تصرف کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو جمائی آتی ہے لیکن ہر موقع پر ایسا ہونا ضروری نہیں ہے اس لئے بظاہر یہاں پر مراد یہ ہے کہ شیطان کی طرف سے ہے یعنی شیطان اس پر خوش ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ مؤمن پر سستی کا ذریعہ ہے اور شیطان جب دیکھتا ہے کہ اس وقت مؤمن پر سستی کاہلی چھائی ہوئی ہے وہ نحوست کا مارا ہوا ہے تو اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اب یہ میرے شکنجے میں پھنس گیا کہ اگر اس سے برائی نہ کرا سکا تو کم از کم اسے بہت ساری نیکیوں سے روک دوں گا۔ اور دوسرا یہ کہ جب جمائی آتی ہے تو شیطان چونکہ ہمارا دشمن ہے اور دشمن بھی بڑا کینہ پرور قسم کا اس طرح کا جو دشمن ہوتا ہے وہ اپنے دشمن کی کوئی معمولی سی بھی خرابی دیکھتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے تو شیطان جب تھوڑی سی

عارضی طور پر بھی انسان کی شکل بگڑی ہوئی دیکھتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اسی کو حدیث میں فرمایا کہ ضحک الشیطان کہ شیطان اس پر ہنستا ہے۔

بہر حال پہلی بنیادی بات یہ ہوئی کہ چھینک ایک پسندیدہ چیز ہے اور جمائی ناپسندیدہ ہے۔ اب آگے جتنے بھی آداب ہیں اس کے وہ اسی پر متفرع ہیں۔

چھینک کے آداب

چھینک کا پہلا ادب:

چھینک کا سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے اس لئے چھینکنے والے کو الحمد للہ کہنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس ادب کے ذریعے سے اصل میں شریعت ہمارا یہ مزاج بنانا چاہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی چھوٹی چھوٹی نعمتوں پر بھی شکر ادا کرو اور اس کی عادت اپناؤ کہ جو بھی اللہ کی نعمت سامنے آئے اللہ تعالیٰ کی جس نعمت کی طرف بھی توجہ ہو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ ویسے تو انسان پر اللہ تعالیٰ کی ہر وقت جتنی نعمتیں ہوتی ہیں یہ انسان ان کا شمار ہی نہیں کر سکتا لیکن بہر حال بعض چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں کہ جن کی وجہ سے کسی خاص نعمت کی طرف انسان کا ذہن متوجہ ہو جاتا ہے تو ایسے موقع پر ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو سوچنا چاہئے کہ یہ اللہ کی نعمت ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ کھانا ملتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن اس کی طرف ذہن نہیں جاتا لیکن جس وقت کھانا سامنے آتا ہے تو اس وقت کم از کم انسان کا ذہن اس طرف جانا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ انسان کو پینے کا پانی ہر وقت دستیاب ہے یہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لیکن ذہن نہیں جاتا اس کو مکلف نہیں بنایا گیا لیکن جب پانی کا گلاس تمہارے ہاتھوں میں ہے اور تم نے پی بھی لیا ہے تو کم از کم اس وقت تو ذہن جانا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس وقت تو الحمد للہ کہہ دینا چاہئے۔ صحت ٹھیک ہے کسی بیماری اور تکلیف میں

مبتلا نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے لیکن ویسے اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا جب سو کر اٹھے ہیں تو کم از کم اس وقت تو ادھر ذہن جانا چاہیئے اس وقت تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے نیند بھی دے دی اور نیند کے بعد دوبارہ اٹھا بھی دیا ایسے نہیں ہوا کہ نیند میں پڑے ہیں تو اسی میں بیہوش ہو گئے یا موت آگئی یا اور کوئی اس طرح کا معاملہ ہو گیا تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو انسان کے سامنے آتی ہیں تو یہ در حقیقت انسان کو متوجہ کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمہارے اوپر یہ نعمت ہے اور اس پر بندے کو چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ یہ چیز اگر واقعتاً انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو زیادہ عبادتیں اور زیادہ ریاضتیں کئے بغیر نا معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ لوگوں نے تو قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے خاص طور پر دوسرے مذاہب نے تو پتا نہیں کیا کچھ کرنے کا کہا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے ہمیں قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے اتنے آسان ذریعے بتائے کہ انسان اگر تھوڑی سی توجہ کرے تو باطنی طور پر پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ دیکھنے میں کھا رہا ہے، پی رہا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ ہنس کھیل رہا ہے، چھینک رہا ہے کچھ اور کام کر رہا ہے دیکھنے سے لگ رہا ہے کہ دنیا داری ہے لیکن اندر ہی اندر پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ ہر لمحہ سوچ رہا ہے کہ یہ بھی اللہ کی نعمت ہے یہ بھی اللہ کی نعمت ہے۔

انسان کی طبیعت میں نشاط ہے سستی اور کاہلی نہیں ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ ویسے تو اس کی طرف توجہ نہیں ہوتی لیکن جب چھینک آتی ہے تو اس کی طرف توجہ ہونی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میری طبیعت اور صحت ٹھیک ہے یہ مقصد ہے الحمد للہ کہنے کا۔

الحمد للہ کہنا واجب یا مستحب:

یہ بات تو بکثرت احادیث میں آتی ہے کہ چھینکنے والے کو اللہ کی حمد کرنی چاہیئے، یہ حکم وجوبی ہے یا استحبابی، تو امام نووی نے اس بات پر اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ حکم وجوبی نہیں استحبابی ہے۔ اس لئے کہ یہ مسئلہ آداب سے تعلق رکھتا

ہے، اور اس طرح کے موضوعات پر اکثر اوامر وجوب کے لئے نہیں ہوتے، باقی یرحمک اللہ کہنے کا معاملہ تو وہ محض ادب نہیں ہے بلکہ اسے مسلمان کا حق بھی قرار دیا گیا ہے۔

اللہ کی حمد کے الفاظ:

اللہ کی حمد کن لفظوں سے کی جائے، زیادہ تر احادیث میں تو الحمد للہ کے لفظ آتے ہیں، تاہم بعض احادیث میں اور لفظ بھی آئے ہیں، مثلاً: الحمد لله ربِ العالمين ، الحمد لله على كلِّ حال، الحمد لله رب العالمين على كل حال، الحمد لله رب العالمين حمدا طيبا كثيرا مباركا فيه[1].

دوسرا ادب: رحمت کی دعا دینا:

جس نے چھینک سنی اور الحمد للہ بھی سنا اس کو چاہئے کہ وہ تشمیت کرے۔ تشمیت کا لفظ میں نے اس لئے بولا کہ بہت سی احادیث میں یہی لفظ آرہا ہے۔ تشمیت کا معنی کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ اصل میں یہ لفظ ہے تسمیت یعنی سین کے ساتھ۔ سمت سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں دوسرے کے لئے سَمت یعنی سیدھے راستے اور ہدایت کی دعا کرنا۔ زیادہ معروف تشمیت یعنی شین کے ساتھ ہے۔ تشمیت مشتق ہے شماتت سے اور باب تفعیل سلب ماخذ کے لئے ہے۔ تشمیت کے معنی ہوئے ازالۃ الشماتۃ شماتت کو زائل کرنا۔ شماتت ہوتی ہے کسی کی تکلیف یا بری حالت دیکھ کر خوش ہونا۔ جیسا کہ شیطان انسان کو جمائی لیتا ہوا دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ تو اس کے برعکس یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر خوش ہونا اور اس کے لئے مزید نعمت اور اللہ کی رحمت کا طالب رہنا۔ خلاصہ یہ کہ تشمیت کا مطلب ہے کہ دعائے رحمت کرنا۔ لہٰذا سننے والے کو چاہئے کہ وہ یرحمک اللہ کہے۔

1- فتح الباري 600/10.

تشمیت العاطس (دعائے رحمت) کا حکم:

اس میں معروف قول تین ہیں۔

1. پہلا قول یہ ہے کہ یہ سنت عن الکفایہ ہے۔یعنی یرحمک اللہ کہنا سنت ہے لیکن ایک کے کہنے سے باقیوں سے بھی سنت ادا ہو جائے گی دوسرے سنت کے تارک نہیں سمجھے جائیں گے۔
2. دوسرا قول یہ ہے کہ یہ واجب علی العین ہے۔یعنی واجب ہے اور ہر سننے والے پر واجب ہے ایک کے کہنے سے دوسرے کا وجوب ساقط نہیں ہو گا۔
3. اکثر حنفیہ اور اکثر حنابلہ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ واجب علی الکفایہ ہے۔یعنی ہے تو واجب لیکن ایک آدھ نے ادا کر دیا تو باقیوں کی طرف سے بھی وجوب ادا ہو جائے گا۔ ثواب تو اسی کو ملے گا جس نے یرحمک اللہ کہا ہے لیکن بہر حال باقی بھی واجب کو چھوڑنے والے نہیں سمجھے جائیں گے۔

واجب ہونے کی دلیل تو یہ ہے کہ بہت ساری احادیث میں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور امر کے اندر اصل وجوب ہے نیز کئی حدیثوں میں اسے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ذمے حق قرار دیا گیا ہے، لہٰذا یہ کہا گیا کہ تشمیت العاطس واجب ہے۔ علی الکفایہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ تشمیت العاطس ردالسلام کے قبیل سے ہے اور ردالسلام میں اگر ایک سلام کا جواب دے دے تو دوسروں کی طرف سے بھی ادا ہو جاتا ہے اس لئے ہم نے کہا کہ یہ علی الکفایہ ہے۔البتہ ہمارے سامنے جو حدیث ہے اس میں یہ آیا کہ ان حقا علی کل مسلم سمعہ أن یقول لہ یرحمک اللہ۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر سننے والے پر یرحمک اللہ کہنا واجب ہے۔اس سے بظاہر کفایہ والے قول کی تردید ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدا میں وجوب تو سب کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے یہ تو ہم بھی مانتے ہیں کفایہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ متوجہ تو وجوب سب کی طرف ہوا لیکن ایک کے کرنے سے باقیوں کی طرف سے بھی کفایت ہو گئی ان کی طرف سے بھی ساقط ہو گیا یوں سمجھا جائے گا کہ انہوں نے بھی واجب ادا کر دیا۔مثلاً نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے تو فرض کفایہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ جنہوں نے ابتدا میں پڑھا ہے انہیں پر واجب ہوا تھا بلکہ ابتدا میں تو جن جن کو

معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا یہاں انتقال ہوا ہے ان سب پر واجب ہوا تھا۔ان میں سے چند ایک نے پڑھ لی تو سب کا وجوب ساقط ہو گیا ان میں سے کوئی بھی نہ پڑھتا تو چند ایک سے مواخذہ نہ ہوتا بلکہ سب سے ہوتا۔پتا چلا کہ فرض کفایہ میں یا واجب علی الکفایہ میں بھی ابتداءً وجوب سب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔کفایہ اور عین کا فرق اصل وجوب کے اعتبار سے نہیں، ادائیگی کے طریقے اور وجوب کے سقوط کے اعتبار سے ہے۔لہٰذا اس حدیث سے اگر یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ یہاں یرحمک اللہ کہنا سب کی طرف متوجہ ہو رہا ہے تو یہ واجب علی الکفایہ ہونے کے خلاف نہیں ہے۔

حاصل یہ کہ اکثر حنفیہ کے نزدیک یرحمک اللہ کہنا واجب علی الکفایہ ہے۔جو حضرات کہتے ہیں کہ سنت ہے وہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ صیغہ امر کا ہے لیکن چونکہ یہ حکم آداب کے قبیل سے ہے اور جو احکام آداب کے قبیل سے ہوتے ہیں ان میں اکثر بیشتر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا بلکہ استحباب کے لئے ہوتا ہے اور یہاں پر ایسے ہی ہے۔

یرحمک اللہ واجب ہونے کی شرطیں:

اس وجوب کے لئے کچھ شرطیں ہیں یا دوسرے قول کے مطابق سنت ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہیں۔

1. سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ چھینکنے والا مسلمان ہو۔اگر چھینکنے والا کافر ہے تو اس نے الحمدللہ کہہ بھی لیا تو بھی یرحمک اللہ کہنا واجب نہیں ہے اگر یھدیکم اللہ کہہ دیا جائے تو اچھی بات ہے۔اسی باب میں حدیث نمبر ۹ میں آرہا ہے (جس کی تشریح آگے آرہی ہے) کہ یہودی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے اور جان بوجھ کر چھینکتے اور الحمدللہ بھی کہتے تھے تاکہ حضور اقدس ﷺ ہمیں یرحمک اللہ کہہ دیں۔تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یرحمک اللہ کی بجائے یھدیکم اللہ کہتے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ کوئی غیر مسلم چھینک مار کر الحمدللہ کہتا ہے تو اس کو یرحمک اللہ کہنا ضروری نہیں۔تاہم یہودیوں کے بارے میں آپ ﷺ کے طرزِ عمل کی دوسری وجہ بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ آگے حدیث کی تشریح میں ذکر کیا جائے گا، اس لئے یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ غیر مسلموں کو یرحمک اللہ کہنا، یا انہیں تشمیت کرنا جائز ہے یا نہیں، امام

احمد سے اس بارے میں لایُستحب کے لفظ منقول ہیں، جس سے بظاہر فی نفسہ جواز معلوم ہوتا ہے، نیز غیر مسلموں بالخصوص یہودیوں سے اس زمانے میں بکثرت واسطہ پڑتا تھا، اس کے باوجود آپ نے تشمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہیں غیر مسلموں کو تشمیت سے قولاً منع نہیں فرمایا۔ تشمیت چونکہ تحیہ کے کافی مشابہ ہے، اس لئے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حکم بھی سلام والا ہونا چاہئے، جو باب السلام میں بیان ہو چکا ہے۔ تاہم یہ ساری بات اس ماحول میں ہے جہاں تشمیت نہ کرنے کو بے اعتنائی سمجھا جاتا ہو، ورنہ اس کی خاص ضرورت نہیں۔ حافظ ابن حجر نے تعبیر اختیار فرمائی ہے کہ غیر مسلموں کے لئے بھی تشمیت کا حکم ہے، لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں۔ واللہ اعلم۔

2. دوسرا یہ ہے کہ چھینکنے والے نے الحمدللہ کہا ہو۔ اگر اس نے چھینک تو ماری لیکن الحمدللہ نہیں کہا تو یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔
3. تیسری بات یہ کہ اس کی یہ چھینکیں زکام یا کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے نہ ہوں، اگر زکام یا الرجی کی وجہ سے چھینک رہا ہے تو پھر ایک آدھ دفعہ یرحمک اللہ کہہ دینا چاہئے۔ اس کے بعد یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے شخص کو کتنی بار یرحمک اللہ کہنا چاہئے اس میں آگے حدیثیں آئیں گی۔ وہ تھوڑی سی مختلف ہیں۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو تین مرتبہ تو یرحمک اللہ کہنا چاہئے اس نے پہلی چھینک ماری اور الحمدللہ کہا تو یرحمک اللہ کہہ دو دوسری مرتبہ پھر چھینک آئی اس نے الحمدللہ کہا تو پھر بھی یرحمک اللہ کہہ دو اور تیسری مرتبہ بھی کہہ دو لیکن چوتھی مرتبہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوسری مرتبہ چھینک ماری۔ پہلی مرتبہ چھینک ماری تو آپ ﷺ نے یرحمک اللہ کہا لیکن دوسری چھینک پر آپ نے فرمایا الرجل مزکوم کہ اسے زکام ہے۔ اور بعض روایتوں میں آتا کہ دو مرتبہ آپ نے یرحمک اللہ کہا اور تیسری مرتبہ فرمایا کہ اسے زکام ہے۔ تو بعض میں آیا دوسری مرتبہ میں اور بعض میں آیا تیسری مرتبہ میں اور بعض میں آیا چوتھی مرتبہ میں۔ لیکن ان روایات میں حقیقت میں کوئی تعارض نہیں اس لئے کہ اصل بات تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ کم از کم کہنا چاہئے۔ بعد میں

جب ظن غالب ہو جائے کہ اسے زکام ہے اور یہ لگے کہ یہ چھینکتا ہی رہے گا تو اس کے بعد سے یرحمک اللہ کہنا چھوڑ دے۔ اس وجہ سے کہ اگر اب بھی یرحمک اللہ کہنے کو ضروری قرار دیں گے تو اس میں حرج اور تنگی لازم آئے گی۔ یہیں ایک معروف سوال کا جواب بھی ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ جب یہ پتا چلا کہ یہ بیمار ہے یہ تو ہماری دعا کا اور زیادہ مستحق ہو گیا لیکن آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اب اس کے لئے دعائے رحمت نہ کرو اس کو یرحمک اللہ نہ کہو۔ جواب یہ ہے کہ بحیثیت مریض ہونے کے دعا کرنا اور بات ہے وہ آپ جتنی چاہیں اس کے لئے کرتے رہیں لیکن یہاں بات ہو رہی ہے چھینک کے جواب کی کہ بحیثیت عاطس اس کو یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چھینک کا تیسرا ادب:

تیسرا ادب یہ ہے کہ چھینکنے والے کو چاہئے کہ وہ یرحمک اللہ کے جواب میں کہے يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ۔ بعض روایتوں میں آتا ہے يَغْفِرُ اللهُ لِي وَلَكُم، حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے: يرحمنا الله وإياكم ويغفر الله لنا ولكم۔ بعض نے بعض حنفیہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہدیکم اللہ ویصلح بالکم کہنا مناسب نہیں ہے، اس کی وجہ ابراہیم نخعی کے حوالے سے یہ نقل کی گئی ہے کہ یہ الفاظ خوارج کہا کرتے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ خوارج عام مسلمانوں کو کافر سمجھا کرتے تھے، اور یہ الفاظ آں حضرت ﷺ نے یہودیوں کو بھی ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بعض حنفیہ نے اس سے منع کیا ہے کہ تو وہ اس صورت میں ہے جبکہ خوارج کے ساتھ تشبہ ہو رہا ہو یا انداز ایسا ہو جس سے مخاطب کو کافر سمجھنے کا شائبہ ہوتا ہو۔

امام ابو داؤد کا ایک عجیب واقعہ:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابن عبد البر نے سند جید کے ساتھ امام ابو داؤد کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ پانی کے جہاز میں سفر کر رہے ہیں، کنارے پر ایک شخص کی آواز سنی جس نے چھینک کر الحمد للہ کہا، امام ابو داود نے فوراً ایک چھوٹی کشتی ایک درہم کرائے پر لی، اور اس شخص کو جاکر یرحمک اللہ کہا اور واپس اپنی جگہ پر آگئے، کسی نے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو امام ابو داؤد نے کہا ہو سکتا ہے کہ وہ شخص مستجاب الدعاء ہو، یعنی میرے یرحمک اللہ کہنے کے جواب میں جو دعا دے وہ دعا میرے حق میں قبول ہو جائے۔ جب وہ سوئے تو انہوں نے خواب میں کسی کو کہتے ہوئے سنا کہ اے جہاز والو! ابو داؤد نے ایک درہم کے عوض جنت خرید لی ہے۔

چوتھا ادب:

چوتھا ادب یہ ہے کہ چھینکنے والا کوشش یہ کرے کہ آواز آہستہ سے آہستہ ہو۔ اس لئے کہ زیادہ اونچی آواز سے چھینکنا، زیادہ آواز نکالنا بدسلیقہ ہونے کی علامت ہے اور مؤمن کو چاہئے کہ وہ سلیقے اور تہذیب کے ساتھ رہے۔ ایسا کام نہ کرے جو دوسروں کو برا لگے اور جس کی وجہ دوسروں کی طبیعت پر گرانی ہو۔

پانچواں ادب:

پانچواں ادب یہ ہے کہ چھینکنے والا اپنے منہ پر کپڑا رکھے۔ کپڑا نہ ہو تو ہاتھ رکھ لے۔ اس میں کئی فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے آواز کچھ پست ہو جاتی ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آدمی چھینکتا ہے تو ہوا زور کے ساتھ باہر نکلتی ہے اور اس میں انسان کے اندر کی رطوبات اور باریک اجزا جن میں کئی بیماری پر مشتمل بھی ہو سکتے ہیں جن کو آج کل جراثیم کہہ دیا جاتا ہے دوسرے تک پہنچیں گے۔ تو اول تو دوسرے کے بیمار پڑنے کا خطرہ ہے اور اگر ایسی بات نہ بھی ہو تب بھی تکلیف تو اس کو اس کی وجہ سے ضرور ہو گی۔ اس لئے فرمایا کہ منہ پر ہاتھ رکھ لو یا کپڑا وغیرہ رکھ لو۔ اس

سے معلوم ہوا کہ یہ ادب تو بیان کیا گیا ہے چھینکنے میں، لیکن کھانسنے وغیرہ میں بھی اسی ادب کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ منہ پر ہاتھ یا کپڑا وغیرہ نہ رکھنے کی وجہ سے چھینکنے میں دوسرے کو جو نقصان اور تکلیف پہنچ سکتی ہے اس کا امکان کھانسی کے اندر بھی ہے۔

جمائی کے آداب

دوسری چیز اس باب میں جمائی کے آداب ہیں

1. پہلا ادب یہ ہے کہ جب جمائی آئے تو حتی الامکان اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ نماز کے اندر اگر ہو تو روکنے کی کوشش کرنا زیادہ موکد ہے۔ لیکن نماز کے باہر بھی کوشش یہی کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ جب جمائی آئے گی تو شیطان خوش ہوگا، تو بلاضرورت شیطان کو خوشی کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ بعض حضرات نے بطورِ تجربے کے جمائی روکنے کا یہ طریقہ بھی ذکر کیا ہے کہ آدمی یہ تصور کرے کہ انبیا علیہم السلام کو جمائی نہیں آتی تھی۔ اس تصور سے یہ رک جاتی ہے۔ لیکن یہ ایک تجربے کی بات ہے مسئلے کی بات نہیں ہے۔
2. اگر نہ رکے تو پھر آدمی کو چاہئے کہ منہ جتنا کم کھولا جا سکے کم کھولے تاکہ شکل بگڑے نہیں۔
3. اس میں بھی اگر لاچاری ہو تو تیسری بات یہ ہے کہ منہ پر ہاتھ وغیرہ رکھ لینا چاہئے تاکہ منہ کے جو اندرونی اجزا ہیں ان کی دوسرے مسلمان کو "زیارت" نہ ہو۔ اس لئے کہ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو گرانی ہو۔ اور تاکہ شیطان کو بھی خوشی نہ ہو اس لئے کہ جیسا کہ آپ نے پڑھا حدیث کے ترجمے میں کہ جب مسلمان آآ کرتا ہے تو شیطان خوش ہوتا ہے کہ اچھا ہے اس کی شکل بگڑ گئی۔ اس لئے حتی الامکان یہ ہے کہ اگر باقی مراحل سے اتنی لاچاری ہو تو ہاتھ وغیرہ منہ پر رکھ لے۔

(۲) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسلم: «إِذا عطسَ أحدُكم فلْيقلِ: الحمدُ للهِ وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ - أَوْ صَاحِبُهُ - يَرْحَمُكَ الله. فإِذا قَالَ لَهُ يَرْحَمكَ اللهُ فَلْيَقُلْ: يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ» رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی تم میں سے کوئی چھینک مارے تو اسے چاہئے کہ الحمدللہ کہے اور اس کے بھائی کو یا فرمایا کہ اس کے ساتھی کو چاہئے کہ وہ اسے یرحمک اللہ کہے اور جب وہ اسے یرحمک اللہ کہے تو یہ چھینکنے والا اسے یہدیکم اللہ ویصلح بالکم کہے (اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری حالت کو درست کرے)۔

جو الحمدللہ کہے اسے دعائے رحمت دو

(۳) وَعَن أنسٍ قَالَ: عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَمَّتَ أَحَدَهُمَا وَلَمْ يُشَمِّتِ الْآخَرَ. فَقَالَ الرَّجُلُ: يَا رَسُولَ الله شَمَّتَّ هَذَا وَلَمْ تُشَمِّتْنِي قَالَ: «إِنَّ هَذَا حَمِدَ اللهَ وَلم تحمَدِ الله» . مُتَّفق عَلَيْهِ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس دو آدمیوں کو چھینک آئی تو ان میں ایک کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یرحمک اللہ کہا اور دوسرے کو آپ نے یرحمک اللہ نہیں کہا۔ تو اس آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے اس آدمی کو تو یرحمک اللہ کہا اور میرے لئے نہیں کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے اللہ کی حمد کی ہے اور تم نے اللہ کی حمد نہیں کی۔

(٤) وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَحَمِدَ اللهَ فَشَمِّتُوهُ وَإِنْ لَمْ يَحْمَدِ اللهَ فَلَا تُشَمِّتُوهُ» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی آدمی کو چھینک آئے اور وہ اللہ کی حمد بھی کرے اسے یرحمک اللہ کہو اور وہ اگر اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کرے تو اسے یرحمک اللہ نہ کہو۔

بار بار چھینک آئے تو

(٥) وَعَن سلمةَ بن الْأَكْوَع أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَطَسَ رَجُلٌ عِنْدَهُ فَقَالَ لَهُ: «يَرْحَمُكَ اللهُ» ثُمَّ عَطَسَ أُخْرَى فَقَالَ: «الرَّجُلُ مَزْكُومٌ» . رَوَاهُ مُسلم وَفِي رِوَايَة التِّرْمِذِيّ أَنَّهُ قَالَ لَهُ فِي الثَّالِثَةِ: «إِنَّهُ مَزْكُومٌ»

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ کے ہاں ایک آدمی کو چھینک آئی تو آپ نے اسے یرحمک اللہ کہا پھر اسے دوسری مرتبہ چھینک آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس آدمی کو زکام ہے۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے تیسری مرتبہ میں فرمایا کہ اسے زکام ہے۔

جمائی میں منہ پر ہاتھ رکھنا

(٦) وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِذَا تَثَاءَبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَمْسِكْ بِيَدِهِ عَلَى فَمِهِ ؛ فَإِنَّ الشيطانَ يدخلُ» . رَوَاهُ مُسْلِم.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی آدمی کو جمائی آئے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھے لے، اس لئے کہ شیطان اندر داخل ہو جاتا ہے۔

الفصل الثانی

چھینک میں منہ ڈھانپنا اور آواز آہستہ رکھنا

(٧) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا عَطَسَ غَطَّى وَجْهَهُ بِيَدِهِ أَوْ ثَوْبِهِ وَغَضَّ بِهَا صَوْتَهُ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ. وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيثٌ حَسَنٌ صَحِيح

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب چھینکتے تھے تو اپنے چہرے کو اپنے ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانپ لیا کرتے تھے اور چھینکتے وقت آواز کو پست رکھتے تھے۔

(۸) وَعَن أبي أَيُّوبَ أَنَّ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إذا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الحَمْدُ لله عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَلْيَقُلِ الَّذِي يَرُدُّ عَلَيْهِ: يَرْحَمُكَ اللهُ ، وَلْيَقُلْ هُوَ: يَهْدِيْكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ»رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ والدارميّ.

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی چھینکے تو اسے چاہئے کہ وہ کہے: الحمد للہ علی کل حال اور جو اسے جواب دینے والا ہے وہ کہے: یرحمک اللہ (اللہ تم پر رحم کرے) اور یہ شخص یعنی چھینکنے والا کہے: یہدیکم اللہ ویصلح بالکم (اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے)۔

(۹) وَعَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ: كَانَ الْيَهُودُ يَتَعَاطَسُونَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْجُونَ أَنْ يَقُولَ لَهُمْ: يَرْحَمُكُمُ الله فَيَقُولُ: «يَهْدِيكُمُ الله وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَأَبُو دَاوُدَ.

حضرت ابو موسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس جان بوجھ کر چھینکا کرتے تھے، وہ یہ امید کرتے تھے کہ آپ ان کے لئے یَرْحَمُکُم اللہُ کہیں گے (یعنی اللہ تم پر رحم کرے)، تو آپ (اس کی بجائے ان کے جواب میں) کہتے: یَہْدِیکُم اللہُ ویُصلِحُ بالکم (اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری حالت کو درست کرے)

یتعاطسون میں بابِ تفاعل تکلف کے معنی میں ہے۔ یعنی چھینک نہ آنے کے باوجود بتکلف چھینکا کرتے تھے، ہو سکتا ہے الحمد للہ بھی کہتے ہوں۔

چھینک کے جواب میں عام طور پر یرحمک اللہ کہا جاتا ہے، لیکن یہاں حضور اقدس ﷺ نے یہودیوں کو دعائے رحمت نہیں دی۔ اس کی ایک وجہ تو عام شارحین یہ بیان کی ہے کہ غیر مسلم دعائے رحمت کا اہل نہیں ہے، جس طرح کہ ان کے لئے دعائے مغفرت سے منع کیا گیا ہے۔ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے، لیکن ایک بقید حیات غیر مسلم کے لئے دعائے رحمت کی توجیہ بھی ہوسکتی ہے۔ سیاقِ حدیث سے بظاہر ایک اور بات معلوم ہورہی ہے۔ وہ یہ کہ ان یہودیوں کا چھینکنا سچ مچ نہیں ہوتا، بلکہ شرارت کے طور پر ہوتا تھا۔ اصل میں حضور ﷺ سے اپنے لئے یرحمکم اللہ کہلوانا چاہتے تھے، اس کی وجہ بھی یہ نہیں کہ وہ واقعی آپ سے دعائے رحمت کے طالب تھے، بلکہ یہ بھی شرارت ہی تھی۔ ایسے موقع ایسا انداز اختیار کرنا مناسب نہیں ہوتا جس سے شرارتی کو اپنی شرارت میں کامیابی کا احساس ہو اور وہ یہ سمجھے کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

(۱۰) وَعَن هلالِ بن يسَاف قَالَ: كُنَّا مَعَ سَالِمِ بْنِ عُبَيْدٍ فَعَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ. فَقَالَ لَهُ سَالِمٌ: وَعَلَيْكَ وَعَلَى أُمِّكَ. فَكَأَنَّ الرَّجُلَ وَجَدَ فِي نَفْسِهِ فَقَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أَقُلْ إِلَّا مَا قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذْ عَطَسَ رَجُلٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «عَلَيْكَ وَعَلَى أُمِّكَ، إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الْحَمْدُ لله رَبِّ الْعَالِمِينَ وَلْيَقُلْ لَهُ مَنْ يَرُدُّ عَلَيْهِ: يرحمكَ الله وَلْيَقُلْ: يَغْفِرُ اللهُ لِيْ وَلَكُمْ» رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ وَأَبُو دَاوُد.

ہلال بن یساف فرماتے ہیں کہ ہم حضرت سالم بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے کہ لوگوں میں سے ایک آدمی نے چھینک ماری اور السلام علیکم کہا۔ تو (اس کے جواب میں) حضرت سالم بن عبید نے کہا وعلیک وعلی امک (تجھے بھی سلام اور تیری ماں کو بھی)۔ تو ایسا لگا کہ اس آدمی نے اس بات کو

اپنے دل میں محسوس کیا، اس پر حضرت سالمؓ نے کہا کہ میں نے تو وہی بات کہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے کہی جبکہ آپ کے سامنے ایک آدمی کو چھینک آئی اور اس نے کہا: السلام علیکم، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: علیک و علی أمک (تجھے اور تیری ماں کو سلام) جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو وہ کہے الحمد للہ رب العالمین، اور جواب دینے والا کہے: یرحمک اللہ اور یہ چھینکنے والا کہے: یغفر اللہ لی ولکم۔

سالم نے یہ کیوں کہا اس کی وجہ تو واضح ہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کے موقع پر یہی جواب دیا تھا کہ آپ ﷺ کے سامنے بھی ایک شخص نے چھینک مار کر السلام علیکم کہا تو آپ نے جواب میں علیک و علی امک کہا اس لئے حضرت سالم بن عبیدؓ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح جواب کیوں دیا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ بہتر ہوتا کہ آپ میری ماں کا تذکرہ نہ شر کے ساتھ کرتے نہ خیر کے ساتھ کرتے۔ لیکن بہر حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی جواب دیا کہ علیک و علی امک تو اس میں کیا حکمت تھی۔ تو اس میں در حقیقت اسے تنبیہ کرنا مقصود تھی کہ السلام علیکم کا کلمہ بہت اچھا ہے بہت مبارک کلمہ ہے لیکن ہر چیز کا ایک موقع محل ہوتا ہے بغیر موقع محل کے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تو جب تم نے چھینک ماری ہے تو موقع السلام علیکم کہنے کا نہیں ہے بلکہ الحمد للہ یا الحمد للہ رب العالمین کہنے کا ہے۔ تو تم نے بات اچھی کہی لیکن بے موقع کہی ہے جیسا کہ تمہاری ماں اچھی ہوگی لیکن بے موقع اس کا تذکرہ یہاں کیا گیا تو تمہیں اچھا نہیں لگا، حالانکہ اس کی سلامتی ہی کی بات کی گئی، اسے کوئی گالی تو نہیں دی گئی، معلوم ہوا کہ محض کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ موقع محل بھی دیکھا جاتا ہے۔

دوسرے شارحین نے لکھا ہے کہ اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تمہاری ماں نے تمہیں کوئی ادب اور تمیز نہیں سکھلائی۔ کیونکہ یہ باتیں عام طور پر انسان ماں کی گود سے سیکھتا ہے اس وقت جو تربیت اور جو سلیقہ انسان کو مل جاتا ہے وہ ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ تو علی امک کا لفظ کہہ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمہاری تربیت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تمہیں تربیت کی ابھی ضرورت ہے۔

(۱۱) وَعَن عبيد بن رِفَاعَة عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «شَمِّتِ الْعَاطِسَ ثَلَاثًا فَإِنْ زَادَ فَشَمِّتْهُ وَإِنْ شِئْتَ فَلَا» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيب

عبید بن رفاعہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چھینکنے والے کو تین دفعہ یرحمک اللہ کہو اگر اس سے زیادہ چھینکے تو چاہو تو یرحمک اللہ اور چاہو تو نہیں۔

حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ تو مشہور بدری صحابی ہیں،ان کے بیٹے عبید بن رفاعہ صحابی نہیں ہیں،اس لئے یہ حدیث مرسل ہے

(۱۲) وَعَن أبي هريرةَ قَالَ: «شَمِّتْ أَخَاكَ ثَلَاثًا فَإِنْ زَادَ فَهُوَ زُكَامٌ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَقَالَ: لَا أَعْلَمُهُ إِلَّا أَنَّهُ رَفَعَ الْحَدِيث إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اپنے بھائی کو تین دفعہ یرحمک اللہ کہو اگر اس سے زیادہ چھینکے تو وہ زکام ہے۔

یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے لیکن حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والے راوی کہتے ہیں کہ مجھے اغلب یاد یہی پڑتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

الفصل الثالث

ہر چیز کا موقع محل ہوتا ہے

(١٣) عَنْ نَافِعٍ: أَنَّ رَجُلًا عَطَسَ إِلَى جَنْبِ ابْن عمَرَ فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ابْنُ عُمَرَ: وَأَنَا أَقُولُ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِ اللهِ وَلَيْسَ هَكَذَا. عَلَّمَنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَقُولَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ.

حضرت نافع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب چھینک ماری اور کہا الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں بھی کہتا ہوں الحمد للہ والسلام علی رسول اللہ (میں نہ الحمد للہ کا منکر ہوں نہ صلوۃ وسلام کا) لیکن ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یوں نہیں سکھایا، ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہ سکھایا کہ ہم (چھینکنے کے بعد) یوں کہیں الحمد للہ علی کل حال۔

اس شخص نے چھینک مار کر دو جملے کہے، ایک الحمد للہ دوسرا السلام علی رسول اللہ۔ حضرت ابن عمرؓ نے دوسرے جملے پر انکار فرمایا ہے کہ یہ تم نے ٹھیک نہیں کہا اور اس کی وجہ یہ بتلائی کہ السلام علی رسول اللہ میں بھی پڑھتا ہوں لیکن جب پڑھنے کا موقع ہوتا ہے۔ یہ اس کا موقع نہیں ہے۔ اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھلایا نہیں ہے بلکہ صرف حمد سکھائی ہے۔ اس لئے چھینک مار کر الحمد للہ علی کل حال کہنا چاہئے السلام علی رسول اللہ کہنا ٹھیک نہیں۔ ویسے تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ وسلام بھیجنا یہ کسی بھی موقع پر ہو سکتا ہے۔ لیکن اس نے چھینکنے کے ساتھ ہی السلام علی رسول اللہ کہا تو اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ اس موقع کے شرعی اداب میں سے ہے۔ حالانکہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔

بدعت میں یہی ہوتا ہے کہ بدعتی جو کام کررہا ہوتا ہے وہ کام اپنی ذات میں برا نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر وہ کام اپنی ذات میں اچھا ہی ہوتا ہے۔اس لئے کہ اگر وہ کام اپنی ذات میں ویسے ہی برا ہو تو وہ معصیت ہے بدعت میں داخل نہیں ہے۔اس میں خرابی یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر لازم کو لازم سمجھ لیا جاتا ہے یا کسی خاص چیز کا کوئی موقع شریعت میں متعین نہیں ہوتا لیکن اپنی طرف سے تعیین کرلی جاتی ہے کہ یہ کام فلاں وقت میں ہونا چاہئے۔بے موقع وہ کام ہوتا ہے جس کو شریعت نے مطلقاً کہا ہوتا ہے کہ یہ کام کرو اس نے بطورِ مسئلہ شرعیہ یہ طے کرلیا ہوتا کہ اس کام کا موقع یہ ہے۔ تو انکار اصل میں اس کام پر نہیں ہوتا بلکہ اس کام کے بے موقع ہونے پر ہوتا ہے۔

باب الضحک

ہنسی کے بارے میں باب

یہ باب ہنسنے کے بارے میں ہے۔ یہاں تین لفظ ملتے جلتے ہیں تبسم، ضحک اور قہقہہ۔ ان میں سے تبسم سب سے ہلکا درجہ ہے اور ضحک اس سے اگلا اور قہقہہ اس سے بھی اگلا۔ تبسم تو ہوتا ہے کہ آدمی کے صرف دانت ظاہر ہوں دانت کھل جائیں چہرے پر بھی خوشی کے آثار ظاہر ہوں لیکن کوئی آواز نہ ہو جس کو اردو میں مسکرانا کہتے ہیں۔ اور ضحک اس سے اگلا درجہ ہے کہ کسی قدر آواز بھی ہو لیکن اتنی نہ ہو کہ دوسرے کو سنائی دے۔ اور تیسرا درجہ قہقہہ کا کہ اتنی آواز میں ہو کہ وہ دوسروں کو بھی سنائی دے۔ یہ تو عام طور پر ان تینوں لفظوں میں فرق کیا جاتا ہے۔ لیکن عام حالات میں ضحک کا اطلاق تینوں حالتوں میں بکثرت ہوتا رہتا ہے۔ تبسم پر بھی ضحک کا اطلاق ہوتا ہے اور قہقہہ پر بھی۔ تو مطلقاً ہنسنا چاہے وہ تبسم ہو یا قہقہہ اس کو ضحک کہہ دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی مسکراہٹ:

یہاں پر اس باب میں ضحک پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا طریقہ اور ضحک کے آداب کو بیان کرنا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک نبی کریم ﷺ کا تعلق ہے، آپ بہت زیادہ کھل کر نہیں ہنستے تھے۔ آپ کا اکثر و بیشتر معمول تبسم کا تھا مسکراتے تھے۔ البتہ تبسم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بہت کثرت سے فرماتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر دو چیزیں ہوتی تھیں ایک صحابہ کے ساتھ حق صحبت اور دوسرے وقار کی رعایت۔ آپ دونوں باتوں کو جمع فرماتے تھے۔ وقار کی رعایت کرتے ہوئے آپ زیادہ کھل کر ہنستے نہیں تھے۔ کیونکہ زیادہ کھل کر ہنسنا یہ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے لیکن صحابہ کے ساتھ حق صحبت کی رعایت کرتے ہوئے تبسم ضرور فرماتے تھے اور بکثرت تبسم فرماتے تھے۔ جہاں پر ہنسنے کا موقع ہوتا وہاں پر بھی تبسم

فرماتے۔ جہاں پر کسی سے ملاقات ہوتی تو دیکھ کر بھی تبسم فرماتے جیسا کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان آئے گا کہ جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا تو مجھے دیکھ کر تبسم فرمایا۔ اور ایسا بھی ہوا کہ کسی نے کوئی کام ایسا کیا جو بظاہر بڑا عجیب سا تھا تو اور لوگوں نے تو منع کرنے کی کوشش کی لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں کیا بلکہ اس کے اس طرزِ عمل پر ہنستے رہتے۔

امام بخاری نے اس طرح کی کافی حدیثیں جمع فرمادیں ہیں۔ مثلاً آپ نے پڑھی ہے ایک حدیث العسیلہ کہ حضرت رفاعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں ان کی بیوی نے دوسری جگہ نکاح کر لیا تھا لیکن یہ وہاں رہنا نہیں چاہتی تھیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ مامعہ الا مثل ہدبۃ ثوبی ہذا کہ اس کے پاس تو میرے اس کپڑے کے پھندے کی مثل ایک چیز ہے۔ تو اس پر بخاری کی روایت میں یہ آتا ہے کہ وہ عورت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آکر یہ بات کر رہی تھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی گھر میں تھے اور حضرت خالد بن ولید گھر سے باہر کھڑے تھے اور وہ اونچی اونچی باتیں کر رہی تھی اور اس کی آواز باہر جارہی تھی۔ تو حضرت خالد بن ولیدؓ نے باہر سے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو آواز دی کہ اس کو چپ کراؤ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی طرح کی باتیں کر رہی ہے۔ لیکن حدیث میں ہے کہ مایزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی التبسم [1]۔

اسی طرح ایک دفعہ راستے میں ایک بدو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ لیا اور آپ کے گریبان سے چادر پکڑ کر ایسا کھینچا کہ آپ کی گردن مبارک پر چادر کا نشان پڑ گیا اور یہ کہا کہ مجھے کچھ دو۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کو تو اس پر غصہ آیا ہو گا لیکن حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے صرف تبسم فرمایا اور اس کے بارے میں حکم دیا کہ اس کو فلاں فلاں چیز دے دی جائے۔

---

[1]- صحیح البخاری، کتاب اللباس: باب الإزار المهدب

حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم حق صحبت ادا کرنے کے لئے تبسم بکثرت فرماتے تھے حتی کی بعض ایسے موقعوں پر بھی تبسم فرماتے کہ جہاں پر بعض دوسرے صحابہ کی رائے ہوتی تھی کہ بات کرنے والے کو اس طرح کی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔

اسی طرح وہ واقعہ ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا فرمایا تھا اور ازواج مطہرات سے الگ ہو گئے تھے ایک بالا خانہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمالیا تھا لیکن مشہور یہ ہو گیا تھا کہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ بات سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔لمبا واقعہ ہے۔اس میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اصل بات کرنے سے پہلے حضوراقدس ﷺ کو ہنسانا چاہئے۔ پھر اصل بات کرنی چاہئے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذرا خاموش چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے تو حضرت عمرؓ نے دو تین باتیں کہیں ان میں ایک بات یہ بھی کہی کہ یارسول اللہ ! یہ آپ کی بیویاں آپ کی نرمی اور آپ کے اخلاق کی وجہ سے آپ سے نفقہ مانگ رہی ہیں آپ اگر دیکھیں خارجہ کی بیٹی (اپنی بیوی کے بارے میں کہا) ے کہ وہ مجھ سے نفقہ کیسے مانگتی ہے ذرا مانگ کر تو دیکھے۔تو اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اس طرح کے اور بھی کئی واقعات آتے ہیں۔بہر حال حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم تبسم بہت کثرت سے فرماتے تھے۔تو دونوں چیزوں کی رعایت تھی ایک طرف وقار کی رعایت تھی اور دوسری طرف حق صحبت کی۔

حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تبسم آپ کے حوصلے اور آپ کے بہت بڑے ظرف کی علامت ہے۔اس لئے کہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ذمہ داری تھی وہ اتنی بڑی تھی کہ دنیا بھر کی ذمہ داریاں اکٹھی کر لی جائیں تو وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتیں۔اس کے علاوہ آپ کے اوپر ہموم واحزان اور پریشانیاں بھی تھیں۔ کہیں یہودیوں کی طرف سے مسئلے کھڑے ہو رہے ہیں، کہیں قریش کی طرف سے کہیں کسی اور کی طرف سے۔تو کسی شخص پر اتنی بڑی ذمہ داری ہو اور اس کو اتنی ایذائیں پہنچائیں گئیں ہوں اور پہنچائی جارہی ہوں اور اتنی پریشانیاں ہوں تو بڑے سے بڑے

عالی ظرف اور بلند حوصلہ شخص کے چہرے پر بھی اتنی سنجیدگی ہوگی، ماتھے پر اتنی تیوڑیاں ہوں گی، چہرہ اتنا بگڑا ہوا ہوگا کہ اس کی شکل کو دیکھنا مشکل ہوگا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ آپ پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھیں تو آپ کے سر میں درد شروع ہو جائے گا۔ لیکن یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود صحابہ کے ساتھ خوش رہتے۔ اسی کے ساتھ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کی بھی بہت بڑی دلیل ہے کہ اپنے سے انتہائی چھوٹوں کے ساتھ بھی ہنستے تھے، مسکراتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ میں ان سے بڑا ہوں اور یہ میری شان کے خلاف ہے کہ میں ان کے ساتھ ہنس کر یا مسکرا کر بات کروں۔

بات ہو رہی تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھل کر تو نہیں ہنستے تھے لیکن تبسم بکثرت فرماتے تھے۔ آپ کا تبسم فرمانا کئی طرح کا ہوتا تھا۔ کبھی تو تبسم ہوتا تھا تعجب کی وجہ سے۔ اور اکثر و بیشتر انسان جو ہنستا ہے وہ تعجب ہی کی وجہ سے ہنستا ہے کہ کوئی بات یا کوئی واقعہ اس کے سامنے ایسا ہوتا ہے جو حیرت کا باعث ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی ہنس پڑتا ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے اور ہم کو اس کے اندر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ انسان ہنستا کیوں ہے کہ جس پر فلاسفہ نے بھی لکھا ہے اور سائنس دانوں نے بھی لکھا ہے ہمارے موضوع سے براہِ راست متعلق نہیں ہے لیکن سادہ سی بات یہ ہے کہ اکثر و بیشتر انسان تعجب کی وجہ سے ہنستا اور مسکراتا ہے ۔ دوسرا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تبسم ہوتا تھا اعجاب کی وجہ سے۔ کوئی چیز آپ کو اچھی لگی پسند آئی کسی کی کوئی بات اچھی لگی کسی کی کوئی حالت اچھی لگی تب بھی آپ مسکراتے تھے۔ اور تیسرا آپ کا تبسم ہوتا تھا ملاطفت یعنی دل جوئی کے لئے۔ چنانچہ حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھتے تو مسکراتے ضرور تھے۔ تو یہ مسکرانا دلجوئی اور ملاطفت کے لئے تھا۔

ہنسنے کے بارے میں صحابہ کا عمل:

اب آیئے صحابہ کے معمول کی طرف۔ صحابہ کرام بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اور آپ کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے اور ہنسا بھی کرتے تھے۔ لیکن یہاں بات صرف تبسم کی نہیں تھی بلکہ اس سے بھی اگلا درجہ ہوتا تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض دفعہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگتے تھے۔ لوٹ پوٹ ہونے لگتے تھے۔ ہنسی مذاق کی باتیں آپس میں بھی کرتے تھے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ہوتی تھیں۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول پہلے گزر چکا ہے کہ آپ فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر وہیں بیٹھ جاتے تھے ایک تو خواب وغیرہ پوچھتے تھے کچھ اور باتیں کیا کرتے تھے اور اس پر ہنسا بھی کرتے تھے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف دیکھ کر اور سن کر مسکراتے رہتے تھے۔ یہ آپ کی خاصی بے تکلف مجلس ہوتی تھی، مجموعہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں مختلف قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کھانے پینے کی باتیں شروع ہو گئیں فلاں کھانا ایسا ہوتا ہے، فلاں ملک کے کھانے ایسے ہوتے ہیں، فلاں ملک میں ایسے کھایا جاتا ہے تو اگر کھانے کی باتیں ہوتیں تو حضور اقدس ﷺ بھی اس میں شریک ہو جاتے۔ کبھی کسی لباس کی بات چل پڑتی کہ فلاں جگہ کا لباس ایسا ہے، فلاں لباس ایسا ہے جب ایسی بات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ کبھی عمارات کی بات چل پڑتی کہ ہم فلاں شہر میں گئے تھے فلاں ملک میں گئے تھے وہاں فلاں بلڈنگ ایسی تھی، فلاں عمارت ایسی تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس میں بھی ساتھ شامل ہو جاتے۔ تو جس طرح کی بات ہوتی موضوع چھڑتا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی شان کے مطابق جتنا آپ کے لئے مناسب ہوتا حصہ لیتے یا اس کو سنتے رہتے۔ ہاں البتہ جہاں کوئی بات خلافِ شریعت آتی وہاں فوراً ٹوک دیتے۔ اسی طریقے سے اسی مجلس کے اندر شعر شاعری بھی ہوتی تھی۔ یہ شعر کیسے ہوتے تھے اس کے بارے میں آگے باب البیان والشعر مستقل آرہا ہے وہاں کچھ عرض کریں گے۔ لیکن اجمالاً اتنا سمجھ لیجئے کہ بعض شارحین نے لکھا ہے کہ یہ شعر ایسے ہوتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ترغیب وترہیب پر مشتمل ہوتے تھے۔ لیکن یہ بات ٹھیک

نہیں معلوم ہو رہی بلکہ مطلقاً شاعری کی بات ہو رہی ہے۔ یہ تو ہے کہ ایسے شعر نہیں ہوتے تھے کہ جس میں کوئی بات خلافِ شریعت ہو۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ اس میں سارا تصوف ہی بھرا ہوا ہو۔ یہ جو اس طرح خاص کر لیا جاتا ہے کہ اس میں ترغیب و ترہیب ہو، توحید کا بیان ہو اور اس طرح کی چیزیں ہوں تو وہی شعر ہوتے تھے۔ یہ بات ٹھیک نہیں اس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے باب البیان والشعر میں آجائے گی۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ کے انتقال کے بعد بھی صحابہ کرام کی شعروں کی مجلسیں قائم ہوا کرتی تھیں اور آج کل کی بولی میں کہہ لیجئے کہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان میں کہیں نہیں ملتا کہ بات اس طرح کی ترغیب و ترہیب اور توحید اور چند اس طرح کے مضامین کے شعروں تک محدود ہوتی تھی۔ ہر طرح کے شعر ہوتے تھے۔ ہاں البتہ شرعی حدود کے اندر ہوتا تھا۔ اسی طریقے سے اس مجلس کے بارے میں یہ بھی آیا یأخذون فی امر الجاھلیۃ کہ زمانہ جاہلیت کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کی باتیں کس لئے کرتے تھے تو کوئی وجہ سے کرتے تھے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے نکال دیا ہے اور دوسرے عبرت حاصل کرنے کے لئے۔ چنانچہ ایک دفعہ صحابی نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ بتوں کی تو پوجا ہم کرتے ہی تھے لیکن جتنا فائدہ میرے بت نے میرے خدا نے مجھے پہنچایا کسی اور نے نہیں پہنچایا۔ وہ اس طریقے سے کہ میں نے ایک بت بنا رکھا تھا حیس کا۔ حیس ایک حلوہ سا ہوتا تھا جیسا کہ ہمارے ہاں یہ چوری ہوتی ہے۔ تو اس کا میں نے بت بنا کر رکھا ہوا تھا تو قحط سالی آگئی تو اب برے وقت میں ظاہر ہے خدا ہی کام آیا کرتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کو کھانا شروع کر دیا اور تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے خدا کو ہڑپ کر گیا۔ تو واقعی میرا خدا میرے کام آیا۔ دوسرے نے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے اپنا بت بنا کر رکھا ہوا تھا تو میں کہیں سے آیا تو دیکھا کہ جنگل کی لومڑیاں اس پر پیشاب کر رہی ہیں تو میں کہا کہ یہ عجیب خدا ہے کہ جو اپنے آپ کو لومڑیوں کے پیشاب سے بھی نہیں بچا سکتا تو مجھے بات سمجھ میں آگئی اور میں آپ کی خدمت میں مسلمان ہونے کے لئے حاضر ہوا۔ ایک صحابی نے بتایا کہ ہم ایسا کرتے تھے کہ اگر کوئی بت نہیں ملتا تھا بت ذرا مہنگے ہوتے تھے اور یہ غریب لوگ تھے تو کوئی خوبصورت پتھر ملتا سفید قسم کا تو اس کو اٹھا لیتے اس کو اپنا خدا بنا لیتے سفر میں بھی اسے ساتھ رکھ لیتے۔ اور اگر کہیں اس سے زیادہ خوبصورت پتھر نظر آجاتا تو پہلا پھینک دیتے اور کہتے کہ ہمیں اچھا خدا مل گیا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا کہ اگر کوئی پتھر نہ ملتا تو تھوڑی سی مٹی جمع کرتے اس کے اوپر بکری کا دودھ

نکالتے اور اس کا گار اسا بن جاتا تو خشک ہو کے دودھ کی وجہ سے اس کی شکل ذرا اچھی ہو جاتی تو وہ ہمارا خدا ہوتا تھا۔ تو اس طرح سے اسی طریقے کی باتیں ہوتی تھیں جو بطورِ شکر کے بھی ہوتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے ہمیں نجات عطا فرمادی، بطورِ عبرت کے بھی اور بطورِ تفریح کے بھی۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی مجالس پر خشکی کا غلبہ نہیں ہوتا تھا:

میں نے آپ کے سامنے پورے باپ کا خلاصہ ذکر کیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ جو مجلس ہوتی تھی یہ کوئی خشک قسم کی مجلس نہیں ہوتی تھی کہ اس میں ترغیب و ترہیب کے علاوہ فکر آخرت کے علاوہ کوئی چیز ہی نہ ہو۔

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی اور خاص طور پر آپ کا صحابہ کے ساتھ تعلق کس نوعیت کا ہوتا تھا۔ یہ صورتِ حال نہیں تھی کہ وہاں خالص بزرگی اور انتہائی سنجیدگی کے علاوہ کچھ نہ ہو، اور آدمی صرف نصیحت کے لئے ہی تیار ہوں کسی مسئلے کے علاوہ قبر و آخرت کے علاوہ اور کسی قسم کی بات ہی نہ کرے کہ ہم تو دین دار لوگ ہیں دنیا کی بات تو ہماری زبان سے نکلنی ہی نہیں چاہئے، اس طرح کی بزرگی کا وہاں پر تصور نہیں تھا۔ بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کے لئے بہترین نمونہ بنا کر بھیجا گیا چونکہ آپ فرشتوں کے لئے نمونہ نہیں بلکہ انسانوں کے لئے نمونہ ہیں اس لئے انسانی زندگی کے تمام لوازم کے اور اس کے تقاضے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حیاتِ مبارکہ میں بڑے اعتدال اور بہت ہی خوبصورت توازن کے ساتھ اپنی اپنی جگہ میں موجود ہیں۔ انسان بہر حال انسان ہے جس طرح اس کو آخرت کی فکر کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح اس دنیا کے اندر اس کے تقاضے ہیں کھانا بھی ہے، پینا بھی ہے اسی طرح ہنسی مذاق بھی ہے، تفریح بھی، ادھر ادھر کی باتیں بھی ہیں، ملاطفت بھی ہے، خوشگوار تعلقات بھی ہیں کسی قدر گپ شپ بھی ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں انسانی زندگی کے لوازم اور تقاضے ہیں۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری انسانیت کے لئے نمونہ بنا کر بھیجا گیا ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے۔ وہاں بزرگی

اور نیکی کا اس طرح کا تصور نہیں تھا کہ اپنے متعلقین کے سامنے آئیں تو ہاتھ میں تسبیح ہو دانے پر دانا گر رہا ہو۔ صرف حلال و حرام کی باتیں اور نصیحتیں ہو رہی ہوں اس کے علاوہ باقی کچھ بھی نہ ہو جہاں کہیں کسی نے دنیا کی کسی چیز کا نام لے دیا ایک ہی سانس میں استغفار کی پوری تسبیح پڑھ جائیں۔ آں حضرت ﷺ کی جو مجالس وعظ و نصیحت کی ہوتی تھیں ان میں خالص وعظ و نصیحت ہی ہوتا تھا۔ بعض مجالس ایسی بھی ہوتی تھیں جو انتہائی سنجیدہ ہوتی تھیں۔ بعض اوقات جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وعظ فرمارہے ہوتے تھے خطبہ دے رہے ہوتے تھے تو صحابہ فرماتے ہیں کہ ایسا نظر آرہا ہوتا تھا کہ بہت بڑا خطرہ ہے جو آپ کو اپنی آنکھوں سے نظر آرہا ہے اور اس کو دیکھ کر باتیں کر رہے ہیں اور یہ خطرہ صبح آیا شام آیا۔ آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو جاتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کا اور آپ کی مجالس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو پہلے ذکر کیا گیا جس کا مقصد طبیعتوں کو ہلکا پھلکا کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کا ارشاد ہے کہ رَوِّحوا القلوب ساعۃ فساعۃ کہ کبھی کبھار اپنے دلوں کو اور اپنے دماغ کو ہلکا پھلکا کر لیا کرو۔ چاہے شعر و شاعری کے ذریعے سے ہو، چاہے اور قسم کی باتوں کے ذریعے سے یا کسی جائز تفریح کے ذریعے سے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اور مجالس میں یہ سارے کے سارے پہلو جمع تھے اور اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی بزرگی اور سنجیدگی کے خلاف نہیں سمجھا۔ اس لئے کہ آپ دنیا کو زندگی سکھلانے کے لئے آئے ہیں وہی نمونہ آپ نے پیش کیا ہے جسے اپنایا جاسکے، و گرنہ آپ انسانوں کے لئے نمونہ نہ رہتے بلکہ فرشتوں کے لئے نمونہ بن جاتے پھر انسانوں کی طرف انسان ہی کو بھیجنے کا مقصد پورا نہ ہوتا۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ ساری باتیں آپ کو ملیں گے۔ جہاں ذکر ملے عبادت ملے گی وعظ و نصیحت ملے گی وہاں آپ کو ہنسی مذاق بھی ملے گا ادھر ادھر کی دوسری باتیں بھی ملیں گی لوگوں کے اطوار اور عادات کی باتیں بھی ملیں گی مختلف اقوال پر تبصرے بھی ملیں گے شعر و شاعری بھی آپ کو ملے گی۔ ان حدیثوں کی تشریح کرتے ہوئے آپ انہیں بھی کسی سنجیدہ دائرے میں بند کرنے کی کوشش کریں کہ یہ جو شعر ہوتے تھے ان میں نماز کی ترغیب ہوتی تھی اور یہ زمانہ جاہلیت کی باتیں صرف عبرت و شکر کے لئے ہوتی تھیں،۔ جیسا کہ بعض شارحین کے ہاں یہ رجحان نظر آتا ہے — تو

اس اندازِ تشریح کی اور ان باتوں پر مکمل سنجیدگی کا لیبل لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد کے خلاف ہے۔ اس سے تو بعض اوقات ان احادیث کی روح ہی نکل جاتی ہے۔ اصل مقصد تو یہی ہے کہ طبیعت ہلکی پھلکی ہو جائے ایک خوش گوار سی مجلس ہوتی تھی جس میں ہر قسم کی باتیں آپ کے سامنے آتی تھیں اور صحابہ کرام ذرا زیادہ کھلتے تھے اور آپ ﷺ اپنے مرتبے اور مقام کے لحاظ سے اتنا زیادہ نہیں کھلتے تھے، لیکن دیکھتے رہتے تھے اور انکار بھی نہیں فرماتے تھے۔

اس کے ساتھ ایک چیز اور ہے جو اس باب کی آخری حدیث میں آرہی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپس میں ہنسا بھی کرتے تھے۔ پوچھنے والے نے سوچا ہو گا کہ بزرگی کے تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی ہنستا ہوا نظر نہ آئے۔ ہر وقت انتہائی سنجیدہ اور عبوسا قمطریرا بنا ہوا ہو، اس لئے اس نے یہ سوال کیا تو حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ ہاں ہنستے تھے۔ حالانکہ ان کے دل میں ایمان پہاڑ سے بھی بڑا ہوتا تھا۔ یہ ہنسنا، مذاق کرنا خوش گپی کرنا جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے ایمان کے منافی نہیں ہے۔ ایک دوسری روایت میں آیا کہ ہنستے تھے لیکن جب رات ہوتی تو "کانوا رھبانا" یہ رات کو ایسے لگتے تھے جیسا کہ انہیں دنیا کا کوئی پتا ہی نہیں ہے اور بالکل تارک الدنیا ہیں۔

ابو سلمۃ بن عبد الرحمن حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کے صاحبزادے اور مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: «لم يكن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم متحزقين ، ولا متماوتين ، وكانوا يتناشدون الشعر في مجالسهم ويذكرون أمر جاهليتهم فإذا أريد أحد منهم على شيء من أمر الله دارت حماليق عينيه كأنه مجنون» [1] یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نہ تو انقباض والے تھے

1- الأدب المفرد للبخاری حدیث نمبر ۵۵۵۔

(بلکہ کھلے ڈُلےاور بشاشت والے تھے)اور نہ زندگی اور نشاط سے عاری تھے کہ انداز ایسا ہو کہ لگے کہ زہد وطاعت کی وجہ سے مریل ہو چکے ہیں،وہ ایک دوسرے کو شعر بھی سنایا کرتے تھے اور اپنی جاہلیت کی باتیں بھی ذکر کیا کرتے تھے ،البتہ جب ان سے کوئی ایسی بات کرتا جس سے دین پر حرف آتا تو گھور کر خشمگیں نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔

حاصل یہ کہ ہر وقت اور موقع کا حق ادا ہوتا تھا۔ جو موقع رہبانیت کا ہے،اس میں راہب ہیں اور جو موقع تعلقات نبھانے کا ہے اس میں تعلقات نبھائے جارہے ہیں۔ جو موقع وعظ و نصیحت کا ہے اس میں وعظ و نصیحت اور جو موقع سنجیدگی کا ہے اس میں سنجیدگی اور جو موقع ہنسی مذاق کا ہے اور دلچسپی کی باتیں کرنے کا ہے اس میں وہ باتیں ۔ہر چیز اپنے موقع پر ہو یہی اصل دین ہے۔ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ عارفی فرمایا کرتے تھے کہ دین نام ہے تقاضائے وقت پورا کرنے کا۔ ہر وقت تم سے تقاضا کررہا ہوتا ہے کہ اس وقت یہ کرو،بس اس وقت یہی کرنا دین ہے۔

چند دن پہلے کی بات ہے کہ ہمارے گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ تو ان کے ہاں ایک بڑی عمر کی خاتون ہیں۔ جب ملنے کے لئے کوئی آتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اپنا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اب اس کے حال احوال پوچھیں اس کے بچوں کے بارے میں پوچھیں اور باہمی دلچسپی کی باتیں پوچھیں۔ تو وہ بڑی بی سلام کا جواب دیتے ہی کہنے لگیں چوتھا کلمہ اتنی دفعہ پڑھا کرو اور فلاں کلمہ اتنی دفعہ پڑھا کرو اور میں کلمہ طیبہ چھ لاکھ دفعہ پڑھ چکی ہوں۔ اچھا ذرا بتاؤ کہ میں نے تم کو کیا پڑھنے کو بتایا، اچھا اب یہ سب یاد ہو گیا تو اب وعدہ کرو کہ پڑھا کرو گی۔ تو دیکھنے والیاں تو اس کو بہت بڑی بزرگی سمجھ رہی ہیں، اور ہو سکتا ہے وہ سب کچھ نیک نیتی اور اخلاص سے یا غلبۂ حال کی وجہ سے کر رہی ہوں، لیکن یہ سنت نہیں ہے کہ ہر وقت آدمی اسی طرح کا بنا رہے۔ آپ کو اگر کوئی نصیحت کے لئے بلائے یا آپ کے پاس نصیحت کا طالب بن کر ہی آئے تو آپ نصیحت کریں یا وہ ایسا کام کر رہا ہے جس میں وہ آپ کی نصیحت کا محتاج ہے تو اس کو نصیحت کریں کہ وہ یہ کام نہ کرے لیکن جہاں صرف آپ سے اظہار محبت کے لئے آیا ہے تو وہاں آپ اسی کے مناسب باتیں کریں وہاں خشک ناصح بن کر بیٹھ جانا یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے طریقے نہیں ہے۔ تو صحابہ کا یہی طریقہ تھا جب لوگوں کے سامنے ہوتے اور ہنسی مذاق کا موقع ہوتا تو ہنس رہے ہوتے تھے اور جب رات ہوتی تھی تو وہی جن

کے بارے میں لگتا تھا کہ ان کوئی فکر ہی نہیں ہے راہب ہوتے، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں، رو رہے ہیں ، گڑ گڑا رہے ہیں یہی چیز دین ہے۔

یہیں سے ایک اور بات سمجھنے کی ہے۔وہ یہ کہ جنید بغدادی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ''ماالنہایہ'' کہ انتہا کیاہے، یعنی آدمی کمال کے درجہ تک پہنچ جائے اس کی نشانی کیاہے۔ انہوں نے جواب دیا ''العود الی البدایۃ'' ابتدا کی طرف لوٹ آنا۔ یعنی جو کامل اور منتہی ہوتا ہے وہ دیکھنے میں مبتدی کی طرح لگا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جو دین میں بالکل مبتدی ہے کبھی ہنسی کر رہا ہے کبھی مذاق کر رہا ہے کبھی کچھ کر رہا ہے کبھی کچھ کر رہا ہے۔اور یہی کام بظاہر یہ کامل بھی کر رہا ہے لیکن حقیقت میں دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔وہ یہ ہے کہ یہ اس لئے کر رہا ہے کہ اس کا دل ایمان سے اور ایمان کے تقاضوں سے خالی ہے اور وہ کر رہا ہے اس حالت میں کہ ایمان اس کے دل میں پہاڑ سے بھی بڑا ہے۔ یہ دوسرا ایمانی تقاضوں سے خالی ہونے کی وجہ سے نہیں کر رہا بلکہ ایمان ہی کے تقاضے کی وجہ سے کر رہا ہے۔ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تعلق والوں کے تعلق کا حق ادا کیا جائے۔اس کو حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ تین آدمی ہیں کہ ان کی منزل دریا کی دوسری طرف ہے۔ایک آدمی دریا میں داخل ہوا اور دریا کے اندر سے گزر رہا ہے۔اور ایک آدمی وہ ہے جو ابھی بالکل شروع میں کھڑا ہے، سوچ رہا ہے کہ دریا میں داخل ہوں یا نہ ہوں تو اس میں جو دریا کے درمیان میں ہے اس کا انداز مختلف ہے۔ وہ کبھی غوطے کھا رہا ہے کبھی کچھ کر رہا ہے کبھی کچھ۔اور ایک وہ ہے جو دریا کی دوسری طرف پہنچ چکا ہے اور دوسرے کنارے پر کھڑا ہے۔ان میں سے پہلا اور تیسرا شخص دیکھنے میں ایک جیسے لگ رہے ہیں، لیکن حقیقت میں ان میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ تو یہ ہے ''العود الی البدایۃ'' کہ ابتدا کی طرف لوٹنا۔ یعنی کامل کی بظاہر زندگی عام اور نیک مسلمان جیسی ہوتی ہے۔اس میں بظاہر کوئی کمال اور رنگ نظر نہیں آتا اس میں کوئی جوش وخروش نہیں ہوتا بظاہر انفرادیت سے خالی بے رنگ سی ہوتی ہے۔ لیکن اندر اس کے رنگ بھرا ہوا ہوتا ہے۔اور جو متوسط ہوتا ہے یعنی درمیان میں راستہ طے کر رہا ہوتا ہے اسی میں رنگ ہوتا ہے، جوش وخروش ہوتا ہے اسی میں بزرگی کے آثار نظر آرہے ہوتے ہیں، اس وجہ سے کہ وہ ابھی منزل تک

پہنچا نہیں ہے۔ ہمارے عرف میں ہمارے ماحول میں بزرگی اسی کو سمجھا جاتا ہے جو اس شخص کی کیفیت ہے جو ابھی دریا میں داخل ہو رہا ہے اور وہ چیز بسا اوقات صحابہ کی زندگی میں نظر نہیں آتی اس کی وجہ سے حیرت ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ حدیثوں کی تشریح کرتے ہوئے صحابہ کی اسی حالت کو دریا کے اندر پہنچے ہوئے آدمی کی حالت پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقت میں اس طرح کی تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا اپنا ہی معیار ہے اس میں صحابہ کو اتارنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

الفصل الاول

ہنسنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا معمول

(۱) عَنْ عَائشةَرَضِيَ الله عَنْهَا قَالَتْ: مَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَجْمِعًا ضَاحِكًا حَتَّى أَرَى مِنْهُ لَهَوَاتِهِ إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ. رَوَاهُ البُخَارِيّ.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی بھی اس طرح کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ میں آپ کے حلق کے کوے کو دیکھ لوں۔ آپ تو صرف تبسم فرماتے تھے۔

’’مستجمعا ضاحکا‘‘، استجمع یستجمع کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کے تمام اطراف کو جمع کر لینا۔ کوئی چیز پورے طور پر پائی جائے۔ مثلاً کہا جاتا ہے فلان استجمعت فیہ شروط الإمامۃ اس کا معنی یہ ہے کہ امامت کے لئے جتنی شرطیں ہیں وہ ساری کی ساری اس میں جمع ہیں۔ تو مستجمعا ضاحکا کا معنی ہو گا کہ ایسا ہنسنا کہ انسان ہنسنے کی انتہا کو پہنچ جائے، کوئی کسر نہ چھوڑے۔ اس کا حاصل ترجمہ کیا کھل کر ہنسنا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقے سے نہیں ہنستے تھے کیونکہ یہ وقار کے بھی خلاف ہے اور انسان کے بے فکر ہونے کی بھی دلیل ہے۔

”حتی أری منہ لہواتہ“ لہوات جمع ہے لہاۃ کی۔ حلق کے اندر گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا لٹکا ہوتا ہے اس کو عربی میں لہاۃ کہتے ہیں ۔جس کو اردو میں کوا کہہ دیا جاتا ہے۔یہاں مراد ہے بہت منہ کھول کر ہنسنا۔اس طریقے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہنسا کرتے تھے۔ہاں البتہ آپ تبسم کثرت سے فرمایا کرتے تھے۔

یہاں پر یہ سوال بعض حضرات نے اٹھایا ہے کہ دوسری احادیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض موقعوں پر ہنسنا ثابت ہے۔جبکہ یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ آپ ضحک نہیں فرماتے تھے بلکہ تبسم فرماتے تھے۔تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہاں پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کے اکثری معمول کی بات کر رہی ہیں کہ اکثر و بیشتر آپ کا معمول یہ تھا۔دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ مطلقاً ضحک کی نفی نہیں کر رہی ہیں بلکہ بہت زیادہ کھل کر ہنسنے کی نفی کر رہی ہیں۔اس طرح کا ہنسنا کسی موقع پر بھی بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ تیسرا یہ کہ جہاں رسول اللہ ﷺ کی طرف ضحک کی نسبت کی گئی ہے وہاں ضحک سے مراد بھی تبسم ہو سکتا ہے۔

آپ ﷺ مجھے دیکھ کر مسکرا دیتے تھے

(۲) وَعَنْ جَرِيرٍ قَالَ: مَا حَجَبَنِي النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُنْذُ أَسْلَمْتُ وَلَا رَآنِي إِلَّا تَبَسَّمَ. مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ.

حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب سے میں مسلمان ہوا ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پاس آنے سے نہیں روکا۔اور آپ نے مجھے جب بھی دیکھا تبسم ضرور فرمایا۔

یہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ صحابہ میں سے ہیں۔ تقریباً ۱۰ ہجری میں مسلمان ہوئے۔ یہ خوبصورت بہت تھے،اس لئے انہیں یوسف ہذہ الامۃ بھی کہا گیا ہے۔بعض معرکے سر کرنے کے لئے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کو بھیجا ہے اور ان کے لئے دعا بھی فرمائی۔ کتاب المناقب میں ان کے بارے میں کچھ احادیث آجائیں گی۔ یہاں یہ دو باتیں فرما رہے ہیں۔ دونوں کا خلاصہ یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ میرا خیال بہت کرتے تھے۔ پہلا یہ کہ جب بھی میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کی اجازت طلب کی استیذان کیا تو آپ نے مجھے اندر بلالیا کبھی ایسا نہیں کہا کہ نہ آؤ میرے پاس وقت نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ جب بھی کسی جگہ پر یا کسی راستے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوتی تو آپ کی نظر مجھ پر پڑتی تو آپ مجھ کو دیکھ کر مسکراتے ضرور تھے۔ ان دونوں باتوں سے حضرت جریرؓ یہ سمجھ رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ پر خاص شفقت تھی۔

کئی بزرگوں کے حالات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے جو حدیث کے اندر آئی ہے۔ ان کا متعلقین کے ساتھ برتاؤ اس انداز کا ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے طور پر یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ حضرت کو سب سے زیادہ شفقت مجھ پر ہے۔ یہ بھی برتاؤ کا ایک طریقہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب معاملہ ہو اور اس کے جذبات کی رعایت رکھی جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ طریقہ سنت ہے۔

بعض شارحین نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ان کے لئے مسکرانا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک بے تکلف مجلس

(۳) وَعَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَقُومُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِي يُصَلِّي فِيهِ الصُّبْحَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ وَكَانُوا يَتَحَدَّثُونَ فَيَأْخُذُونَ فِي أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ فَيَضْحَكُوْنَ وَيَبْتَسِمُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَفِي رِوَايَةٍ لِلتِّرْمِذِي: يَتَنَاشَدُوْنَ الشِّعْرَ.

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کی جگہ سے اس وقت تک نہیں اٹھتے تھے جس میں آپ فجر کی نماز پڑھتے تھے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا تھا ،جب سورج طلوع ہو جاتا تھا تو آپ اٹھتے تھے۔ صحابہ کرام اس وقت باتیں کرتے تھے اور زمانہ جاہلیت کی باتوں میں بھی مصروف ہو جاتے تھے اور ہنسا کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکراتے رہتے تھے ۔اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو شعر سناتے تھے۔

بعض شارحین نے یہاں کہا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی باتیں کرنا ان کی مذمت کے لئے ہوتا تھا، اسی طرح شعر سے مراد یہاں وہ شعر ہیں جو توحید اور ترغیب وترہیب پر مشتمل ہوں۔

الفصل الثانی

آپ ﷺ کا کثرت سے مسکرانا

(٤) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ قَالَ: مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ.

حضرت عبد اللہ بن حارث بن جزر ضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مسکرانے والا کوئی نہیں دیکھا۔

الفصل الثالث

ہنسنا کمالِ ایمان کے منافی نہیں

(٥) عَن قتادةَ قَالَ: سُئِلَ ابْنُ عُمَرَ: هَلْ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُونَ؟ قَالَ: نَعَمْ وَالْإِيمَانُ فِي قُلُوبِهِمْ أَعْظَمُ مِنَ الْجَبَلِ. وَقَالَ بِلَالُ بْنُ سَعْدٍ: أَدْرَكْتُهُمْ يَشْتَدُّونَ بَيْنَ الْأَغْرَاضِ وَيَضْحَكُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ فَإِذَا كَانَ اللَّيْلُ كَانُوا رُهْبَانًا. رَوَاهُ فِي «شَرْحِ السّنة»

حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا گیا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہنسا بھی کرتے تھے، توانہوں نے فرمایا کہ ہاں! حالانکہ ان کے دلوں میں ایمان پہاڑ سے بھی بڑا تھا لیکن جب رات ہوتی تھی تو یہ راہب ہوتے تھے

"یشتدّون بین الاغراض" اغراض غرض کی جمع ہے غرض کہتے ہیں نشانی کو اوراسی طرح غرض کہتے ہیں ہدف کو۔ ہدف کا مطلب ہے کہ کوئی جگہ مقرر کرلی جائے کہ دوڑ کر وہاں پہنچنا ہے کہ دیکھیں کون پہلے وہاں پہنچتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صحابہ آپس میں کھیلا کرتے تھے۔

باب الاسامی

نام رکھنے کے بارے میں باب

اسامی کو یا کی تشدید کے ساتھ بھی پڑھ سکتے ہیں اور اس کی تخفیف کے ساتھ بھی۔ اگر یا کو تشدید کے ساتھ پڑھیں تو یہ افاعیل کا وزن ہو گا اگر بالتخیف ہو تو یہ افاعل کا وزن ہو گا۔ اس باب کے اندر مقصود تو ہے نام رکھنے کے بارے میں شرعی احکام و آداب بیان کرنا لیکن اس کے ضمن میں دوسرے الفاظ کے بارے میں بھی کچھ بتلائیں گے کہ کون سالفظ استعمال کرنا مناسب ہے کون سا مناسب نہیں ہے۔

نام رکھنے کے بارے میں اسلام کے تعلیم فرمودہ بنیادی اصول کیا ہیں، اس پر بات چند حدیثوں کا ترجمہ کرنے کے بعد کی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ والا نام اور کنیت رکھنے کا حکم

(۱) عَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي السُّوقِ فَقَالَ رَجُلٌ: يَا أَبَا الْقَاسِمِ فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّمَا دَعَوْتُ هَذَا. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسلم: «سَمُّوا بِاسْمِي وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ» . مُتَّفق عَلَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ بازار میں تھے کہ ایک آدمی نے کہا: ارے ابوالقاسم! اس پر نبی کریم ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا: میں نے اس کو (کسی اور

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس کی کنیت بھی ابوالقاسم تھی) بلایا تھا۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے والا نام تو رکھ لیا کرو، میری کنیت اختیار نہ کیا کرو۔

(۲) وَعَنْ جَابِرٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «سَمُّوْا بِاسْمِيْ وَلَا تَكْتَنُوْا بِكُنْيَتِيْ؛ فَإِنِّي إِنَّمَا جُعِلْتُ قَاسِمًا أَقْسِمُ بَيْنَكُمْ» مُتَّفَق عَلَيْهِ.

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے والا نام رکھ لیا کرو، میرے والی کنیت اختیار نہ کیا کرو اس لئے کہ مجھے تو بس ایسا قاسم بنایا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔

اس آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ میری کنیت ابوالقاسم ہونے کی محض یہ وجہ نہیں کہ میرے بیٹے کا نام قاسم تھا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ کنیت کسی بیٹے یا بیٹی کے نام پر ہوتی ہے۔ بلکہ یہاں اس کنیت میں خود یہ وصف بھی ملحوظ ہے جس کی طرف نسبت کر کے یہ کنیت اختیار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قاسم بنایا تھا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو علم دیا جاتا تھا پھر وہ علم آگے لوگوں کو تقسیم فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو فیض ملتا تھا اور آپ نے وہ فیض پوری دنیا میں پھیلا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو مال ملتا تھا مال غنیمت مال فیٔ وغیرہ آپ وہ مال لوگوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ تو تقسیم کرنا اور سخاوت کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خاص وصف تھا۔ آپ کو کیا کچھ ملا، اور آپ کیا کچھ تقسیم کرنے والے ہیں اس کی تعیین نہیں کی گئی، اس لئے لفظوں سے اس کی تعیین ممکن نہیں ہے۔

یہ دونوں حدیثیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپ والی کنیت کے بارے میں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے محمد اور احمد یہاں جو بات ہو رہی ہے وہ محمد کی ہو رہی ہے اور آپ معروف کنیت ابوالقاسم تھی۔ سوال یہاں پر یہ ہے کہ کسی بچے کا نام محمد رکھنا کیسا ہے اور اسی طریقے سے ابوالقاسم کنیت اختیار کرنا کیسا ہے۔ اس کے بارے میں حدیثیں کافی مختلف نظر آ رہی ہیں۔ جن دو حدیثوں کا ترجمہ کیا گیا ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمد نام

رکھنا تو درست ہے البتہ ابوالقاسم کنیت نہیں ہونی چاہئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دونوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے یعنی نام محمد ہو اور کنیت ابوالقاسم ہو۔ اگر کسی کی کنیت ابوالقاسم نہیں ہے تو اس کا نام محمد ہو سکتا ہے اگر کسی کا نام محمد نہیں بلکہ کچھ اور ہے تو اس کی کنیت ابوالقاسم ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اسی باب حدیث نمبر ۲۰، ۲۱ میں آرہا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ابوالقاسم کنیت منع ہے لیکن اس شخص کے لئے جس کا نام محمد ہو۔ یہاں اس باب کی ابتدائی دو حدیثوں سے جن کا ترجمہ کیا گیا ہے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم کنیت سے مطلقاً ممانعت ہے چاہے نام محمد ہو یا کچھ اور۔ بعض حدیثوں سے آپ والی کنیت اور نام دونوں کا جواز معلوم ہوتا ہے، مثلاً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا کہ آپ کے انتقال کے بعد اگر کوئی میرا بیٹا پیدا ہو تو میں اس کا نام آپ کے نام پر اور اس کی کنیت آپ کی کنیت پر رکھ لوں یعنی اس کا نام محمد ہو اور اس کی کنیت ابوالقاسم ہو تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں رکھ لینا۔ چنانچہ بعد میں جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے پیدا ہوئے اس کا نام محمد رکھا گیا جنہیں محمد بن الحنفیہ کہا جاتا ہے۔ ان کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ اسی طرح ایک عورت نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے میں نے اس کا نام محمد رکھا ہے اور اس کی کنیت ابوالقاسم رکھی ہے۔ لیکن مجھے پتا یہ چلا کہ آپ اسے ناپسند فرماتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ما الذی اُحل اسمی و حرم کنیتی" کہ وہ کون سی چیز ہے جس نے میرے نام کو تو حلال قرار دیا ہو اور میری کنیت کو حرام قرار دیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد نام اور ابوالقاسم کنیت کو جمع بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ احادیث ایک دوسرے کے معارض نظر آرہی ہیں لیکن حقیقت میں ان میں تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ محمد نام اور ابوالقاسم کنیت اپنی ذات کے اعتبار سے جائز ہے، اسی حقیقت کی نشان دہی حضرت عائشہؓ والی حدیث میں کی گئی ہے جو اس باب کے نمبر ۲۲ پر آرہی ہے، جس میں آپ نے فرمایا ما الذی اُحل اسمی و حرّم کنیتی۔ اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جس نے تم سے یہ کہا کہ میرے والا نام اور کنیت بذاتِ خود شرعی مسئلے کے لحاظ سے حرام ہے اس نے درست نہیں کہا، اس لئے کہ جہاں حضور اقدس ﷺ نے نہی فرمائی ہے وہ در حقیقت انتظامی ہے، تشریعی نہیں۔ اصل وجہ خود اس باب کی پہلی حدیث سے سمجھ میں آرہی ہے کہ آں حضرت ﷺ کے زمانے میں آپ والی کنیت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہونے کا خطرہ تھا، سب سے زیادہ اشتباہ کا خطرہ اس صورت

میں تھا جبکہ نام بھی آپ والا ہو اور کنیت بھی آپ والی، اس لئے بعض مواقع پر آپ نے اس سے منع فرمایا، اس سے کم اشتباہ اس صورت میں تھا جبکہ کنیت آپ والی ہو، اکیلے آپ والے نام میں اشتباہ اس لئے کم تھا کہ عربوں میں قابل احترام شخصیات کا نام لینے کی بجائے انہیں کنیت سے ذکر کیا جاتا تھا۔ اس لئے زیادہ تر احادیث میں آپ نے ابو القاسم کنیت سے منع فرمایا۔ یہ اشتباہ چونکہ آپ کے زمانے تک محدود تھا اس لئے یہ نہی بھی آپ کی حیاتِ مبارکہ تک تھی۔ جہاں رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی ہے وہ یا تو آپ کے بعد کے زمانے سے متعلق ہے، جیسا کہ حضرت علیؓ کی مذکورہ حدیث، یا پھر وہ ان بچوں کے بارے میں ہے جو آپ کی حیاتِ مبارکہ کے آخری حصے میں پیدا ہوئے، اور اس بات کا امکان نہیں تھا کہ وہ آپ ﷺ کی حیات میں اتنے بڑے ہوں کہ ان کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو۔

اس کے آپ کو ابو القاسم کہنے کی وجہ محض یہ نہیں تھی آپ کے ایک صاحبزادے کا نام قاسم تھا، بلکہ اللہ تعالی نے آپ کو تقسیم کرنے والا بنایا تھا، اس وصف کی بنا پر بھی آپ کو ابو القاسم کہا جاتا تھا۔ اور یہ وصف آپ ہی کا ہے اگر آپ کی زندگی میں کوئی اور ابو القاسم کہلاتا ہے اگرچہ بے ادبی مقصود نہ ہو آپ کی ہم سری، برابری کا دعویٰ مقصود نہ ہو تب بھی بے ادبی کا شائبہ ضرور ہے اس لئے آپ کے زمانہ میں منع کر دیا گیا کہ کوئی اور اپنے آپ کو ابو القاسم نہ کہلائے۔

سب سے پسندیدہ نام

(۳) وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ أَحَبَّ أَسْمَائِكُمْ إِلَى اللهِ: عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ» رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے ناموں میں سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔

ان دو ناموں میں اللہ تعالی کی عبدیت کا اظہار ہے، اور اللہ تعالی کو عبدیت بہت زیادہ پسند ہے، پھر عبدیت والے نام بہت سے ہو سکتے ہیں، جیسے عبد الشکور، عبد الغفور وغیرہ۔ عبدیت والے ان ناموں میں سے ان دو ناموں کی ایک خاص خصوصیت ہے جو اور ناموں میں نہیں پائی جاتی۔ وہ یہ کہ اللہ کا اسم ذات ہے اور رحمن اللہ تعالی کی صفات میں سے اہم صفت ہے بلکہ ایسی صفت ہے ایسا نام ہے جو کہ ذاتی نام ہی کی طرح ہے۔ اس لئے جو بات ان دو کے اندر پائی جاتی ہے باقیوں کے اندر نہیں پائی جاتی۔ بعض نے ایک یہ بھی نکتہ بیان کیا ہے کہ لفظ عبد کی نسبت قرآن کریم میں ان دو اسماء ہی کی طرف ہوئی ہے۔ اللہ کی طرف یا رحمن کی طرف۔ مثلاً ﴿وَأَنَّه لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللهِ يَدْ عُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْه لِبَداً﴾ یہاں عبداللہ کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح سورۃ الفرقان میں ہے ﴿وَعِبَادُالرَّحْمنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْناً﴾ یہاں عباد کی اضافت عباد کی طرف ہو رہی ہے۔ تو قرآن کریم میں عبد یا عباد کی اضافت جہاں کہیں بھی ہوئی ہے لفظ اللہ کی طرف ہوئی ہے یا لفظ رحمن کی طرف۔ ویسے تو تمام نام جن میں عبدیت پائی جاتی ہے وہ پسندیدہ ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔ البتہ بعض علما نے یہ وضاحت کی ہے کہ عبداللہ اور عبدالرحمن کا محبوب ترین نام ہونا انبیا علیہم السلام کے ناموں کے بعد ہے۔ یعنی سب سے اچھے نام تو انبیا کے ہیں، بالخصوص رسول اللہ ﷺ کا اسمِ گرامی، ان کے بعد جو نام ہیں ان میں سے عبداللہ اور عبدالرحمن سب سے محبوب ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دو ناموں کا سب سے زیادہ محبوب ہونا ان ناموں کے اعتبار سے ہو جن کے شروع میں عبد آتا ہے۔ یعنی عبدیت والے ناموں میں سے یہ دو نام اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں، اس لئے کہ یہ اللہ کے سب سے بڑوں ناموں کی طرف منسوب ہیں۔

رباح، یسار جیسے چند ناموں سے ممانعت

(٤) وَعَن سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسلم: «لَا تُسَمِّيَنَّ غُلَامَكَ يَسَاراً وَلَا رِبَاحًا وَلَانَجِيْحاً وَلَا أَفْلَحَ فَإِنَّكَ تَقُولُ: أَثَمَّ هُوَ؟

فَلَا يَكُونُ فَيَقُولُ لَا» رَوَاهُ مُسْلِمٌ. وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ قَالَ: «لَا تسم غُلَامًا رَبَاحًا وَلَا يَسَارًا وَلَا أَفْلَحَ وَلَا نَافِعًا»

حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اپنے غلام کا نام یسار (آسانی والا)، رباح (نفع والا)، نجیح (کامیاب) اور افلح (کامیاب) نہ رکھو، اس لئے کہ تم کہو گے کہ کیا وہ یہاں ہے اور وہ نہیں ہوگا تو اگلا کہے گا کہ نہیں ہے (یعنی یہاں آسانی، نفع والا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ)۔

(۵) وَعَن جَابر قَالَ أَرَادَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَنْهَى عَنْ أَنْ يُسَمَّى بِيَعْلَى وَبِبَرَكَةَ وَبِأَفْلَحَ وَبِيَسَارٍ وَبِنَافِعٍ وَبِنَحْوِ ذَلِكَ. ثُمَّ رَأَيْتُه سَكَتَ بَعْدُ عَنْهَا ثُمَّ قُبِضَ وَلَمْ يَنْهَ عَنْ ذَلِك. رَوَاهُ مُسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارادہ فرمایا کہ اس بات سے منع کر دیں کہ کسی کا نام یعلی، برکت، افلح یسار یا نافع اس طرح کا کوئی نام رکھا جائے پھر میں نے آپ کو اس کے بعد دیکھا کہ آپ اس کے بارے میں خاموش رہے یعنی کوئی حکم نہیں فرمایا پھر آپ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا۔

یہ چند نام ہیں جن کے بارے میں پہلی حدیث میں یہ فرمایا گیا کہ یہ چند نام نہیں رکھنے چاہئیں۔ اس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی کہ یہ نام ہیں تو بہت اچھے لیکن یہ ایسے معانی پر مشتمل ہیں کہ جن کی نفی کرنا اچھا نہیں ہے۔ لہٰذا کسی کا نام مثلاً رکھو گے نافع اور تم نے پوچھا یہاں نافع ہے اور اگر نہ ہوئے تو جواب آئے گا کہ نافع نہیں ہیں، جس میں بد فالی اور بد شگونی کا شائبہ ہے یعنی یہاں کوئی نفع والا نہیں ہے۔ کسی کا نام رکھ لیا برکت، آپ پوچھتے ہیں یہاں برکت ہے، آپ کی مراد ہے برکت بی بی، لیکن وہ یہ کہے کہ یہاں برکت نہیں ہے تو یہ اچھا معنی نہیں بنتا۔ اس لئے حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے نام رکھنے سے منع فرمایا۔ابن حبان نے ان ناموں سے ممانعت کی وجہ کو اور انداز سے بیان کیا ہے، وہ یہ کہ اصل میں اس زمانے میں لوگ نئے نئے شرک سے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اور زمانۂ میں ان کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ نفع نافع نام سے آئے گا، یا یسار یعنی خوش حالی اور سہولت یسار نام سے آئے گی، چنانچہ ابن حبان کے لفظ ہیں: « يشبه أن تكون العلة في الزجر عن تسمية الغلمان بالأسامي الأربع التي ذكرت في الخبر: هي أن القوم كان عهدهم بالشرك قريبا، وكانوا يسمون الرقيق بهذه الأسامي، ويرون الربح من رباح، والنجح من نجاح، واليسر من يسار، وفلاحا من أفلح لا من الله تعالى جل وعلا، فمن أجل هذا نهى عما نهى عنه»۔تاہم بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان کی ذکر کردہ وجہ الفاظِ حدیث سے خاص مطابقت نہیں رکھتی، اس لئے حدیث کے ظاہری الفاظ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس ممانعت کی وجہ بد شگونی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی سے بچنا ہے۔لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابن حبان کا مقصد بھی شاید یہی ہے۔شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ بد شگونی اور مایوسی پیدا ہونے کا امکان وہیں ہوگا جہاں ناموں اور الفاظ کی تاثیر کا اعتقاد پایا جاتا ہوگا، وہاں یہ کہنے سے کہ نافع نہیں ہے بدفالی اور بد شگونی کا خیال پیدا ہوگا، جہاں الفاظ کے اثرات کو زیادہ اہمیت سے دیکھا ہی نہ جاتا ہو وہاں اس طرح کی بدِ شگونی بھی پیدا نہیں ہوگی۔

یہاں مشکوۃ میں ذکر شدہ ان دونوں روایتوں میں بظاہر تعارض نظر آرہا ہے۔پہلی روایت یعنی حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس طرح کے نام رکھنے سے منع فرمادیا تھا۔اور دوسری حدیث یعنی حضرت جابرؓ کی حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے منع کرنے کا ارادہ کیا تھا منع نہیں کیا تھا۔تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت جابرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تو دیکھا کہ آپ نے منع کرنے کا ارادہ کیا لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا تو ان کو پتہ نہیں چلا ان کے علم میں یہ بات نہیں آئی اس لئے انہوں نے اپنے علم کے اعتبار سے کہہ دیا کہ آپ نے منع نہیں کیا۔اور حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ ہیں نے حضور اقدس ﷺ کو منع فرماتے ہوئے سنا، اس لئے انہوں نے یہ نقل کردیا کہ آپ نے منع فرمایا تھا۔ایسا ہوتا رہتا ہے

کہ ایک کام ہوا، ایک کو پتا چلا دوسرے کو پتا نہیں چلا، جس کو پتا چلا اس نے کہہ دیا کہ ہوا ہے اور جس کو پتا نہیں چلا اس نے کہہ دیا کہ نہیں ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ تو فرمایا کہ میں منع کردوں اس ارادے کا حضرت جابر کو بھی پتا چلا، لیکن جب آپ نے عملاً منع فرمایا تو حضرت جابرؓ کے سامنے نہیں فرمایا اس لئے ان کو اس کا علم نہیں ہوا اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ ارادہ کیا تھا، لیکن عمل نہیں کیا۔ لیکن حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالی عنہ کو پتا بھی چل گیا اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا ہے اس لئے کوئی تعارض کی بات نہیں ہے۔

دوسرا یہ کہ جہاں آتا ہے کہ آپ نے منع نہیں فرمایا اس سے مراد ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہی تحریمی نہیں فرمائی اور جہاں آتا ہے کہ آپ نے منع فرمایا ہے۔ اس سے مراد یہ کہ آپ نے نہی تنزیہی فرمائی، یا شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں آں حضرت ﷺ نے یہ بات صرف بطور مشورہ فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نام رکھنا جائز تو ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ نہ رکھا جائے، یہ نہی تنزیہی بھی ایک خاص علت کی وجہ سے ہے، یعنی بد شگونی پیدا ہونے کا ڈر۔ اگر کسی جگہ یہ علت نہ ہو تو شاید کہا جا سکتا ہے کہ نہی تنزیہی بھی نہیں ہوگی، واللہ أعلم۔ شاہ ولی اللہ نے ایک احتمال یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صراحتاً تو نہی نہیں فرمائی البتہ راوی کو نہی کے آثار نظر آئے تو انہوں نے اپنے اندازے کے مطابق کہہ دیا کہ آپ نے نہی فرمائی[1]۔

لیکن یہ جو اصول ہے کہ اس طرح کے نام رکھنا پسندیدہ نہیں ہے۔ یہ اصول انہی ناموں تک محدود ہے جن کا تذکرہ احادیث میں آگیا مثلاً یسار، رباح، نجیح، افلح برکہ، یعلی اور نافع۔ ان کے علاوہ محض علت کے اشتراک کی وجہ سے کسی اور نام کی طرف اس کا تعدیہ نہیں کیا جائے کہ علت وہاں پر پائی جا رہی ہے لہذا حکم بھی وہاں پر جاری کریں۔ کیونکہ

1- ووجه الجمع بين الحديثين أنه لم يعزم في النهي ولم يؤكد ولكنه نهى نهي إرشاد بمنزلة المشورة، أو ظهرت مخايل النهي، فقال الراوي نهى اجتهادا منه (حجة الله البالغة ٢/ ٣١٠)

اگر ایسا قیاس شروع کر دیا تو پھر کوئی نام بھی رکھنے کے لئے نہیں ملے گا۔ کسی کا نام آپ نے رکھا سعد اور کسی کا نام رکھا سعید تو یہاں پر کوئی آپ سے پوچھے گا کہ سعید ہے آپ کہیں گے کہ یہاں پر کوئی سعید نہیں ہے نعوذ باللہ سارے شقی ہیں۔

حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی حدیث میں ابو داود وغیرہ میں یہ لفظ آتے ہیں «إنما هن أربع فلا تزيدن عليّ» اس کا مطلب عام طور پر تو یہی سمجھا گیا ہے حضرت سمرۃ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کل چار نام ہی ہیں، حدیث کے روایت کرنے میں اپنی طرف سے کسی نام کا اضافہ نہ کرنا۔ لیکن ابن حبان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات بھی رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا حصہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ میری یہ ممانعت ان چار ناموں تک ہی محدود ہے، ان میں اپنی طرف سے قیاس کر کے اضافہ نہ کرنا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: « ذكر البيان بأن قوله صلى الله عليه وسلم: وانظروا أن لا تزيدوا عليه أراد به أن لا تزيدوا على هذا العدد الذي هو الأربع»۔

کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک غلام کا نام بھی رباح تھا۔ اگر یہ روایت ثابت ہے[1] تو ہو سکتا ہے کہ اس غلام کا یہ نام آپ نے نہ رکھا ہو بلکہ پہلے سے ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے نہی فرمانے سے پہلے کی بات ہو۔

حضرت سمرۃ کی حدیث کے لفظ ہیں لا تسمین غلامک یسارا الخ یہاں غلام ہی کا کیوں ذکر فرمایا، تو ہو سکتا ہے کہ یہاں غلام سے مراد مطلقاً لڑکا اور بچہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غلام سے مراد مملوک ہو۔ دوسرے احتمال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعض روایتوں میں عبدک کا لفظ آتا ہے، اسی طرح مسلم وغیرہ کی بعض روایتوں میں رقیق کا لفظ

---

[1] -اس کی سند میں ایک راوی عکرمہ بن عمار ہیں، جن پر محدثین نے کسی قدر کلام کی ہے۔

بھی آتا ہے۔اس لئے مجموعی طور پر روایات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے یہ نہی مملوکہ غلاموں کے بارے میں فرمائی ہے۔اپنے بچوں کے بارے میں نہیں۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ غلاموں سے چونکہ بکثرت کام لینا ہوتا تھا اس لئے انہیں بکثرت بلانا بھی پڑتا تھا اور پوچھنا بھی پڑتا تھا کہ فلاں ہے یا نہیں اس لئے بدشگونی والی مذکورہ صورتِ حال پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا تھا۔جبکہ اپنے بچوں کو کام کاج کے لئے اس طرح بلایا نہیں جاتا تھا، نیز آزاد انسانوں کو عموماً کنیت یا لقب وغیرہ سے یاد کیا جاتا تھا۔

نیز یہ بات بھی ہے عربوں کے اس طرح کے خوبصورت، اچھے اور نرم ونازک معانی والے نام عموماً اپنے غلاموں ہی کے رکھے جاتے تھے، نافع، رباح، یسار۔اس طرح کے ہلکے پھلکے اچھے نام اپنے بچوں کے رکھنے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔اس لئے کہ غلاموں کو خدمت لینے کے لئے بکثرت پکارنا پڑتا تھا۔تو ایسا نام رکھتے تھے جو بولنے میں بھی اچھا ہو۔لیکن اپنی اولاد کا مقصد ان کے ذہن میں لڑنا بھڑنا، میدان کے اندر جرأت اور بہادری کے جوہر دکھانا ہوتا تھا۔اس لئے ان کے نام بھی کھردرے قسم کے رکھتے تھے تاکہ واقعتاً یہ بہادر بنیں۔آپ اگر قبل از اسلام عربوں کے رکھے ہوئے نام دیکھیں جیسے بعض صحابہ کے نام یا بعض صحابہ کے والدین کے نام تو کسی کا نام جبل ہے کسی کا نام حجر (پتھر) ہے کوئی حرب (لڑائی) ہے کوئی مرہ ہے یعنی کڑوا، کوئی حنظلہ ہے۔کیونکہ اپنی اولاد کے بارے میں وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ نرم مزاج نازک مزاج قسم کا ہو بلکہ یہ چاہتے تھے کہ مضبوط اور سخت قسم کا ہو ایسا ہو کہ اس کو دیکھ کر یا اس کا نام سن کر ہی دشمن ڈر جائے۔اس لئے آپ ﷺ نے غلام کا ذکر فرمایا کہ اپنے غلاموں کا نام یہ نہ رکھو اولاد کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ اولاد کا اس طرح کا نام رکھا ہی نہیں کرتے تھے۔اپنے بچے کا نام نافع رکھیں ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

شہنشاہ کہلانا بری بات ہے

(٦) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَخْنَى الْأَسْمَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ اللهِ رَجُلٌ يُسَمَّى مَلِكَ الْأَمْلَاكِ» . رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ. وَفِي

رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ: «أَغْيَظُ رَجُلٍ عَلَى اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَخْبَثُهُ رَجُلٌ كَانَ يُسَمَّى مَلِكَ الْأَمْلَاكِ لَا مَلِكَ إِلَّا لِلهِ»

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے ناپسندیدہ نام اس آدمی کا ہوگا جو شہنشاہ کہلاتا ہوگا (یعنی بادشاہوں کا بھی بادشاہ کہلاتا تھا)۔اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے غصے کے قابل شخص وہ ہوگا جو ملک الاملاک یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔حالانکہ اللہ کے علاوہ کوئی (حقیقی) بادشاہ نہیں ہے۔

بَرَّہ نام رکھنا کیسا ہے

(۷) وَعَن زينبَ بنتِ أبي سلمةَ قَالَتْ: سُمِّيتُ بَرَّةَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ «لَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ اللهُ أَعْلَمُ بِأَهْلِ الْبِرِّ مِنْكُمْ سَمُّوهَا زَيْنَبَ» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت زینب بنت ابوسلمہ فرماتی ہیں کہ میرا نام بَرّہ رکھا گیا تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ خود اپنی پاکی بیان نہ کیا کرو ہو۔اللہ زیادہ جانتے ہیں کہ تم میں سے بر یعنی نیکی والا کون ہے۔اس کا نام زینب رکھو۔

یہ حضرت زینب بنت ابی سلمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ربیبہ ہیں۔ربیبہ کہتے ہیں بیوی کی اس بیٹی کو جو پہلے خاوند سے ہو۔یہ حضرت زینب بن ابی سلمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بیٹی ہیں ان کے پہلے خاوند حضرت ابوسلمہ سے۔حضرت ابوسلمہ کا انتقال ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کر لیا تو یہ بھی

رسول اللہ ﷺ کی پرورش میں آگئیں۔ یہاں یہ بتارہی ہیں کہ ان کا نام ابتدامیں برہ رکھا گیا تھا جس کے معنی ہیں نیکی والی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نام مناسب نہیں ہے اس کی بجائے تو اس کا نام زینب رکھو۔ برہ نام اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ برہ کا معنی ہے نیک تو اس سے اگر کوئی پوچھے گا کہ تم کون ہو تو کہے گی کہ میں بڑی نیک ہوں تو اس میں شائبہ ہے تزکیہ نفس کا۔ تزکیہ نفس کا معنی ہے خود اپنی اچھائی خود اپنی بڑائی بیان کرنا اور یہ پسندیدہ بات نہیں ہے۔ برہ نام نہ رکھنے کی ایک وجہ تو یہ ہے۔ اور ایک وجہ اگلی حدیث میں دوسری آرہی ہے۔ ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لئے کہ ایک ہی جیسے کام کی مختلف وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔

آپ ﷺ نے جویریہ نام رکھا

(۸) وَعَن ابنِ عبَّاسٍ قَالَ: كَانَتْ جُوَيْرِيَةُ اسْمُهَا بَرَّةُ فَحَوَّلَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اسْمَهَا جُوَيْرِيَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ أَنْ يُقَالَ: خَرَجَ مِنْ عِنْدِ برة. رَوَاهُ مُسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت جویریہ کا نام برہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر جویریہ رکھ دیا۔ آپ اس بات کو ناپسند سمجھتے تھے کہ کہا جائے کہ آپ برہ کے ہاں سے نکلے ہیں۔

حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ اور ام المؤمنین ہیں۔ قبیلہ بنو مصطلق کے سردار تھے حضرت حارث بن ابی ضرار یہ ان کی بیٹی ہیں۔ غزوہ بنی مصطلق میں جن عورتوں کو باندی بنایا گیا تھا ان میں یہ بھی شامل تھیں۔ جب مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو یہ ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔ انہوں نے ان کے عقدِ کتابت کرلیا، یعنی یہ طے ہوگیا کہ یہ اتنی قیمت ادا کردیں تو آزاد ہوجائیں گی۔ بدلِ کتابت میں معاونت کے لئے

یہ رسول ﷺ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئیں اور اپنی مصیبت زدگی کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی کہ میں بنوالمصطلق کے سردار کی بیٹی ہوں، حضور اقدس ﷺ نے ان کا سارا بدلِ کتابت ادا کر کے ان کو ازاد کروایا اور آزاد کرا کے ان سے نکاح کر لیا۔ بعد میں ان کے والد حضرت حارث بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ صحابہ کرام کی ملکیت میں اس قبیلے کی اور بھی بہت ساری باندیاں تھیں، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہؓ سے نکاح کیا تو جس جس کو پتہ چلتا گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ سے نکاح کیا ہے تو وہ اپنی اپنی باندی کو آزاد کرتا گیا کیونکہ یہ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال کا خاندان بن گیا تھا انہوں نے ادب کے خلاف سمجھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان میں سے کسی کو اپنا مملوک بنا کر رکھا جائے۔ اس لئے حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ کوئی عورت اپنے خاندان کے لئے اتنی بابرکت ثابت نہیں ہوئی جتنی حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثابت ہوئیں۔

ان کا اصل نام برہ تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ نام تبدیل فرمادیا اور اس کی جگہ ان کا نام جویریہ رکھ دیا۔ جویریہ کے لفظی معنی ہیں چھوٹی سی لڑکی۔ اور وجہ اس کی یہ بیان فرمائی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر سے نکل کر کہیں جائیں گے تو پوچھا جائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہاں سے گئے تو جواب میں کہا جائے گا "خرج من عندی برۃ" کہ برہ کے ہاں سے نیک کے ہاں نکل گئے تو اس میں بر اور نیکی سے دوری کا معنی پایا جاتا ہے تو یہ اچھا نہیں لگتا، یہ بات کسی ذوقِ لطیف پر گراں ہو سکتی ہے۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نام بدل دیا اور اس کی جگہ جویریہ رکھ دیا۔

عاصیہ نہیں جمیلہ

(۹) وَعَن ابْن عمر أَنَّ بِنْتًا كَانَتْ لِعُمَرَ يُقَالُ لَهَا: عَاصِيَةُ فَسَمَّاهَا رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جميلَة. رَوَاهُ مُسلم

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک بیٹی تھیں جنہیں عاصیہ (نافرماں) کہا جاتا تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام جمیلہ رکھا۔

جو بات میں نے پہلے بتائی کہ عرب نام کس طرح رکھا کرتے تھے اس کے مطابق عاصیہ نام پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ وہ اپنی اولاد کے نام اس طرح کے رکھا کرتے تھے۔ عاصیہ کا ایک معنی تو یہ ہے کہ جو بڑی سخت مزاج ہو پکے مزاج کی ہے جلدی کسی کی بات ماننے اور پیچھے لگنے والی نہیں ہے۔ اور یہ کمال اور خوبی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اور عاصیہ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کرنے والی ہے اور یہ معنی بڑا غلط اور برا ہے۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نام کو تبدیل فرمادیا اور یہ فرمایا کہ اس کا نام جمیلہ ہے۔

حافظ نے الِاصابہ میں وضاحت فرمائی ہے کہ اس میں روایات مختلف ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جس کا نام عاصیہ سے تبدیل کر کے جمیلہ رکھا تھا وہ حضرت عمر کی بیٹی تھی یا بیوی۔ زیرِ نظر روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ حضرت عمر کی بیٹی تھی، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عمر کی بیوی جمیلہ بنت ثابت ہیں۔ جب یہ مسلمان ہوئیں تو آں حضرت ﷺ نے ان کا نام عاصیہ سے تبدیل کر کے جمیلہ رکھ دیا۔ بہر حال جو بھی خاتون ہوں مسئلے پر اس سے فرق نہیں پڑتا۔

نام رکھنے کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات

اب تک جو حدیثیں آئیں ان میں نام رکھنے کے آداب بیان کئے گئے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ اپنے بچوں کے نام اچھے رکھے جائیں۔ چنانچہ آگے مشکوۃ ہی میں حدیث آئے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن اپنے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا لہٰذ تم اپنی اولاد کے نام اچھے رکھا کرو۔ اچھے نام کون سے ہوتے ہیں یا نام رکھنے میں کن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے تو احادیث میں غور کرنے سے اس حوالے سے چند اصول سمجھ میں آتے ہیں۔

شائبہ شرک اور تعظیم مبالغے سے اجتناب:

(۱) نام ایسا نہیں ہونا چاہئے جس میں شرک کا شائبہ ہو یا حد سے زیادہ تعظیم ہو۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے برا نام وہ ہے کہ کسی کو شہنشاہ یا ملک الاملاک کہا جائے،اس لئے کہ اگر یہ صریح شرک نہ بھی ہو تو اس میں شرک کا شائبہ اور تعظیم کے اندر مبالغہ ضرور ہے لہٰذا اس طرح کا نام ٹھیک نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف ملک الاملاک نام ہی برا ہے بلکہ جس نام میں بھی یہ علت پائی جائے گی وہ برا ہوگا۔ کسی کا نام نعوذ باللہ احکم الحاکمین رکھ دیں کسی کا نام سلطان الصلاحین رکھ لیں کسی کا نام افضل الخلق رکھ دیں اس طرح کے جتنے بھی نام ہیں وہ سارے کے سارے اسی میں آجاتے ہیں۔

اسی طرح بعض نام ایسے ہیں جن میں عبدیت پائی جاتی ہے جیسے عبداللہ ،عبدالرحمن ،عبدالرزاق وغیرہ تو بعض دفعہ یہ نام لیتے وقت عبد کا لفظ حذف کر دیا جاتا ہے۔رزاق کہہ دیا جاتا ہے،رحمن کہہ دیا جاتا ہے یا شروع ہی سے کسی کا نام اللہ تعالی کے ناموں میں سے کسی پر رکھ دیا جاتا ہے اور اس میں عبد کا لفظ نہیں لگایا جاتا، مثلاً کسی کا نام محمد رحیم رکھ دیا تو اس طرح کے ناموں کا کیا حکم ہے۔تو بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام دو طرح کے ہیں۔ بعض نام اللہ تعالیٰ کے ایسے ہیں کہ جن کا اطلاق صرف اللہ تعالی پر ہی جائز ہے کسی اور پر جائز نہیں جیسا کہ لفظ رحمن۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو رحمن کہنا جائز نہیں۔ یا رزاق ہے رازق تو کسی اور کو شاید مجازاً کہا جاسکے لیکن رزاق نہیں کہا جاسکتا۔دوسری قسم کے اللہ تعالیٰ کے نام وہ ہیں جن کا اطلاق اللہ کے علاوہ اوروں پر بھی کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے شکور۔ لیکن غیر اللہ کو بھی شکور کہا جاسکتا ہے۔قرآن کریم میں حضرت نوح علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے انہ کان عبدا شکورا۔ اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارہ میں فرمایا ''افلا اکون عبدا شکورا''۔اللہ تعالی کا ایک نام ہے صبور لیکن غیر اللہ کو صبور کہا جاسکتا ہے۔اللہ تعالی کا ایک نام ہے رحیم لیکن غیر اللہ پر بھی رحیم کا اطلاق کیا جاسکتا ہے ''لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ماعنتم حریص علیکم بالمومنین رؤوف رحیم'' رؤف بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے لیکن اس کا اطلاق بھی غیر اللہ پر کیا جاسکتا ہے۔تو پہلی قسم کے ناموں کے ساتھ لفظ عبد ضرور استعمال کرنا چاہئے اور بغیر عبد کے ایسے نام

نہیں رکھنے چاہئیں۔ کسی کا نام محض رحمن لکھ لیں محض رزاق رکھ لیں یہ ٹھیک نہیں ہے۔ البتہ جو دوسری قسم کے اللہ تعالیٰ کے نام ہیں ان میں اچھی بات تو یہ ہے کہ لفظ عبد شامل کیا جائے عبدالرحیم، عبدالرؤف، عبدالشکور، لیکن بغیر عبد کے یہ اگر نام رکھ لئے جائیں یا نام رکھا تو عبد کے ساتھ تھا لیکن استعمال میں آسانی کے لئے بغیر عبد کے بول دیتے ہیں کہ عبدالرحیم کو رحیم کہہ دیتے ہیں عبدالشکور کو شکور کہہ دیتے ہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

اسی اصول میں یہ بات بھی ہے کہ ایسا نام رکھنا کہ جس میں غیر اللہ کی طرف سے ایسے فعل کی نسبت پائی جائے جس کی نسبت غیر اللہ کی طرف نہیں کی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جیسے کسی کا نام رکھ لیں نبی بخش، محمد بخش اس طرح کے نام بھی ٹھیک نہیں ہیں ان سے بھی بچنا چاہئے۔

نام کا معنی مناسب ہو:

﴿۲﴾ دوسرا اصول یہ ہے کہ نام ایسا ہونا چاہئے کہ جس کا معنی بھی مناسب ہو۔ لفظ اور اس کے معنی میں بشاعت نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو جو سننے میں برا لگے اور سننے میں ذوقِ لطیف پر گراں گزرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا معنی بھی برا نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت عمر کی بیٹی کا نام عاصیہ تھا جس کا ایک معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمان اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بدل دیا۔ اسی طرح اگلی فصل میں کئی نام آرہے ہیں جو محض حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وجہ سے بدلے ہیں۔ مثلاً کسی کا نام تھا غراب کسی کا نام تھا شیطان۔

بدشگونی سے بچنا:

﴿۳﴾ تیسرا اصول یہ ہے کہ نام ایسا نہیں ہونا چاہئے جس میں بدفالی کا امکان ہو۔ فال کا حکم باب الفال والطیرہ گذر چکا، ایسا نام نہ رکھا جائے جس سے بدفالی کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کا امکان ہو۔ اگر کسی جگہ پر عرف اور ماحول کے

اعتبار سے یہ یقین ہو کہ کسی کے ذہن میں اس طرح کا خیال پیدا نہیں ہو گا وہاں اس طرح کا نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ حدیث نمبر ۴،۵ کے تحت یہ بات گذر چکی ہے۔

خودستائشی پر مبنی نام نہ ہو:

﴿۴﴾ چوتھا اصول یہ ہے کہ ایسا نام نہیں رکھنا چاہیے جس میں تزکیۂ نفس پایا جائے یعنی اپنی بڑائی بیان کرنے کا شائبہ ہو جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بَرّہ نام پسند فرمایا اس لئے کہ اس میں یہ شائبہ ہے کہ وہ کہتی ہے کہ میں برہ ہوں یعنی بڑی نیک ہوں۔ البتہ کوئی نام اپنی ذات کے اعتبار سے اچھا ہو اور اس میں اعلیٰ صفت کا تذکرہ ہو لیکن عرف اور ماحول ایسا ہو کہ جس کی وجہ سے تزکیہ نفس کی طرف ذہن کے منتقل ہونے کا امکان نہ ہو تو وہاں اس طرح کے نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے مثلاً ہمارے ماحول میں اگر کسی کا نام بَرّہ رکھ دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ یہ بہت نیک ہے۔ کوئی اپنا نام متقی رکھ لے ہو سکتا ہے کہ اس کا ذہن ادھر منتقل نہ ہو تو جہاں پر اس طرح کا احتمال ہو کہ یہ مفہوم پیدا ہو گا وہاں پر بچنے کی ضرورت ہے۔ ہر جگہ پر بچنے کی ضرورت نہیں ورنہ بہت سارے اچھے نام ایسے ہیں جو آپ رکھ نہیں سکیں گے۔ کیونکہ ہر اچھے نام میں اچھی صفت پائی جاتی ہے۔ کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں راشد ہوں، کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں کمال ہوں، کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں حسن ہوں، کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں اکبر ہوں، کوئی آدمی کہتا ہے کہ میں اعظم ہوں تو چونکہ عام طور پر ان ناموں کے استعمال کے وقت یہ بات ذہن میں نہیں آتی کہ یہ اپنی خوبی بیان کر رہا ہے اس لئے اس طرح کے ماحول میں اس طرح کے نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یہاں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے برہ نام تبدیل فرمایا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں واقعتاً یہ بات پیدا ہوتی ہو گی۔ یا کم از کم آں حضرت ﷺ کے سامنے خود کو بَرّہ کہنا مناسب نہیں ہو گا۔ اسی طرح کا واقعہ حضرت زینب بنت جحش کا بھی ہے کہ ان کا نام بھی پہلے برہ تھا۔ جب وہ اپنے آپ کو برہ کہتی تو لوگ کہتے کہ تزکی نفسہا کہ یہ

خود اپنے آپ کو نیک کہہ رہی ہے[1] تو یہاں خود ستائشی کا تاثر لوگوں کے ذہنوں میں عملاً پیدا ہو رہا تھا اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نام تبدیل کرنے کا حکم دیا اگر اس طرح کا تاثر ذہنوں میں پیدا نہ ہوتا تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ نام تبدیل نہ فرماتے۔ چنانچہ اسی سے ملتا جلتا ایک نام اور ہے وہ حضور اقدس ﷺ نے تبدیل نہیں فرمایا۔ اور وہ ہے بریرہ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مولاۃ یعنی آزاد کردہ باندی ہیں یہ نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل نہیں فرمایا حالانکہ معنی اس کا بھی تقریباً وہی ہے۔ لیکن چونکہ اس کی وجہ سے اس طرح کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہو رہا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تبدیل نہیں فرمایا۔

انبیاء اور صلحاء والے نام رکھنا:

﴿۵﴾ بہتر یہ ہے کہ نام ایسا رکھا جائے جو پہلے کسی نبی کسی صحابی یا کسی نیک آدمی کا نام گزرا ہو۔ کیونکہ اس میں تفاؤل یعنی نیک فال ہے کہ یہ بھی اس طرح کا بنے گا۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں بھی آتا ہے—جیسا کہ اس باب کے آخر میں بھی آرہا ہے- تم انبیا کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھا کرو، اسی طرح حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے انبیا اور صلحا کے ناموں پر نام رکھا کرتے تھے[2]۔ اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بعض حضرات نے نقل کیا ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا حضرت طلحہ اپنے بیٹوں کے نام انبیا کے نام پر رکھا کرتے تھے لیکن میں نے سوچا کہ اپنے بیٹوں کا نام کسی نبی کے نام پر رکھوں گا تو ظاہر ہے وہ نبی تو بن نہیں جائے گا اس لئے انبیا کی بجائے میں نے اپنے بیٹوں کے نام شہدا کے ناموں پر رکھنا شروع کر دیئے۔

1۔ صحیح البخاری، کتاب الأدب: باب تحویل الاسم إلی أحسن منہ۔ یہ ذہن میں رہے کہ زینب بنت ابی سلمہ اور زینب بنت جحش دونوں کا نام پہلے بَرّہ تھا جو آپ ﷺ نے تبدیل فرما دیا۔

2۔ فتح الباری ۱۰/۵۷۸

بعض سلف سے انبیا والے نام رکھنے سے ممانعت بھی منقول ہے، مثلاً حضرت عمر سے بھی اس طرح کی بات منقول ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کے کسی غلط کام کی وجہ سے اسے برا بھلا کہا جائے گا تو اس سے اس نام کی توہین ہوگی۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضرت عمرؓ سے محمد نام رکھنے سے بھی منع فرمایا، لیکن بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب کسی نے حضرت عمر کو یہ بتایا کہ میرا یہ نام خود رسول اللہ ﷺ کا رکھا ہوا ہے تو انہوں نے اپنی بات پر اصرار نہیں فرمایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا([1])۔

بہر حال نام کے اندر یہ بھی اچھی بات ہے کہ پہلے جو نیک لوگ گزرے ہیں ان میں سے کسی کا نام کسی نبی کا نام ہو کسی صحابی کا نام ہو یا نیک لوگوں میں سے کسی شخص کا نام ہو اسی سے اس سے برعکس بات بھی سمجھ میں آئی کہ جو لوگ برے گزرے اور اس حوالے سے ان کا نام بہت معروف ہے ان کے نام رکھنے سے بچنا چاہئے۔ مثلاً کوئی شخص کسی کا نام فرعون رکھ لے نعوذ باللہ قارون رکھ لے تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کا نام شیطان تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدل دیا تو معلوم ہوا کہ برے لوگوں کے نام پر نام نہیں رکھنا چاہئے۔

حضور ﷺ کا ناموں کو تبدیل کرنا بطور مشورہ بھی تھا:

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں یہ جو فرمایا کہ فلاں نام نہ رکھو فلاں نام بدل دو ضروری نہیں کہ ہر جگہ آپ کا یہ فرمانا بطور حکمِ شرعی ہو، بلکہ بہت سی جگہوں پر آپ کا یہ فرمانا بطور مشورہ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض جگہوں پر بعض حضرات نے نام تبدیل نہیں بھی کیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا۔ چنانچہ حضرت سعید بن المسیّب کے دادا تھے حزن۔ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ آپ کا نام کیا ہے تو انہوں نے

[1] ۔فتح الباری ۱۰/۵۷۳

فرمایا کہ میرا نام حزن ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنا نام سہل رکھ لو۔ اس لئے کہ حزن سخت زمین کو کہتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ جو نام میرے باپ نے رکھا ہے میں اسے تبدیل نہیں کروں گا۔ حضرت سعید بن المسیب فرماتے ہیں کہ اس کا اثر اب تک ہم میں موجود ہے اور ہمارے اندر سختی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے باوجود نام تبدیل نہیں کیا اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بطورِ مشورہ کے فرمائی تھی۔

آپ ﷺ نے اس کا نام منذر رکھا

(۱۰) وَعَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ أُتِيَ بِالْمُنْذِرِ بْنِ أَبِي أُسَيْدٍ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِينَ وُلِدَ فَوَضعه على فَخذه فَقَالَ: «وَمَا اسْمه؟» قَالَ: فلَان: «لا ولكن اسْمه الْمُنْذر» . مُتَّفق عَلَيْهِ

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ منذر بن ابی اسید جس وقت کہ یہ پیدا ہوئے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی ران پر رکھا اور فرمایا کہ اس کا نام کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ ان کا نام فلاں ہے تو آپ نے فرمایا کہ نہیں بلکہ اس کا نام منذر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ منذر بن اسید جب پیدا ہوئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام پوچھا کہ ان کا نام کیا ہے ان کے والد نے جو نام ہوگا وہ بتایا ہوگا وہ کیا نام تھا اس کا حدیث میں ذکر نہیں ہے بہر حال کوئی بھی نام تھا جو اچھا اور مناسب نہیں تھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی بجائے اس کا نام منذر رکھ لو۔

(۱۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ عَبدِي وَأَمتِي كلكُمْ عباد الله وَكُلُّ نِسَائِكُمْ إِمَاءُ الله. وَلَكِنْ لِيَقُلْ: غُلَامِي وَجَارِيَتِي وَفَتَايَ وَفَتَاتِي. وَلَا يَقُلِ الْعَبْدُ: رَبِّي ولكنْ ليقلْ: سَيِّدِي» وَفِي رِوَايَةٍ: «لِيَقُلْ: سَيِّدِي وَمَوْلَايَ». وَفِي رِوَايَةٍ: «لَا يَقُلِ الْعَبْدُ لِسَيِّدِهِ: مَوْلَايَ؛ فَإِنَّ مولاكم الله». رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص (اپنے غلام اور باندی کے بارے میں) یہ نہ کہے میرا بندہ یا میری بندی۔ تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری ساری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ بلکہ یوں کہے میرا غلام اور میری باندی، میرا جوان یا میری لڑکی۔ اور غلام بھی (اپنے مالک کے بارے میں) یہ نہ کہے میرا رب، بلکہ کہے میرا سید۔ اور ایک روایت میں ہے اسے چاہئے کہ یہ کہے میرا سید اور میرا مولا، اور ایک روایت میں ہے غلام اپنے آقا کو یہ نہ کہے میرا مولا، اس لئے کہ تمہارے مولی اللہ ہیں۔

اپنے غلام کو عبدی (میرا بندہ) کہنے کا حکم:

یہاں کچھ الفاظ کے استعمال کرنے سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ ان میں سے سب سے پہلا لفظ ہے عبدی اور امتی کہ کوئی شخص اپنے مملوک یا مملوکہ کو پکارنا چاہے تو اس کو یا عبدی (اے میرے بندے) یا امتی (اے میری بندی) کہہ کر نہ پکارے۔ اس کی وجہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ اصل میں تم اللہ تعالیٰ کے عبد ہو، اس لئے تم یہ کہو کہ یہ میرا عبد ہے یہ ٹھیک نہیں ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ گویا ہمسری کا دعوی ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امہ اور عبد کا لفظ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر غیر اللہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں آتا ہے ''وأنکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم'' کہ تمہارے عبدوں میں سے جو نیک ہیں یا تمہاری اماؤں میں سے جو نیک ہیں ان کا نکاح کرادو تو یہاں کہا کہ یہ تمہارے عبد اور تمہاری امہ ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی کو غیر اللہ کا عبد یا أمة کہنا درست اور جائز ہے۔ اسی طرح احادیث تو بہت کثرت سے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''من اعتق عبداله'' جو آدمی اپنے غلام کو آزاد کرے یا ''من اعتق شقصا فی عبد'' کسی غلام میں اپنے حصے کو آزاد کرے۔ فقہا کی کلام میں بھی آپ کو بکثرت ملے گا ''باع عبدہ'' ''کاتب عبدہ''۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہاں اس حدیث میں منع کرنے کا مقصد کیا ہے۔ تو اس حدیث کی تشریح میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ سب سے اہم بات وہ ہے جس کی طرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے۔ امام بخاریؒ نے اس حدیث میں جو باب قائم کیا ہے وہ باب ہے باب کراھیۃ التطاول علی العبد کہ آدمی اپنے غلام پر اپنی برتری دکھائے یعنی اس کی تحقیر کرے ایسے لفظوں سے پکارے جس سے اس کی توہین ہوتی ہو یہ ناپسندیدہ ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ تمہارا مملوک ہے اس لئے تم حدود شریعت کے اندر رہتے ہوئے اس کی استطاعت کا خیال رکھتے ہوئے اس سے اپنا کام ضرور لے سکتے ہو اس کو کام کہہ بھی سکتے ہو اور کام کے لئے اسے بلا بھی سکتے ہو، پکار بھی سکتے ہو، لیکن بہر حال وہ انسان ہے، جانور نہیں ہے اور انسان ہونے میں وہ تمہارے برابر کا ہے۔ اس لئے بحیثیت انسان جو کسی کام کا احترام ہوتا ہے اس کا مستحق وہ بھی ہے۔ چونکہ وہ تمہاری ملکیت میں آگیا ہے اس لئے تم اسے حقیر سمجھ کر پکارنے لگ جاؤ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ امام بخاری کے نقطہ نظر کا حاصل یہ ہے کہ اپنے غلام کو عبدی کہہ کر پکارنا تب ممنوع ہے جبکہ اس کا منشا اس کی تحقیر ہو۔ اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ خود حدیث میں جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ تو امام بخاری کی ذکر کردہ وجہ سے بظاہر مختلف نظر آتی ہے۔ اس لئے حدیث میں آں حضرت ﷺ نے عبدی کہنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سب اللہ کے عبد ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل وجہ یہ ہے کہ یہ نسبت اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہی بات امام بخاری

سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس نسبت کو علی الاطلاق اللہ تعالی کے ساتھ خاص قرار دینا درست نہیں ہے، یہ بات خود نص قرآنی کے خلاف ہے۔ یہ نسبت ممنوع تب ہے جبکہ آقا کی غلام پر برتری مقصود ہو، اور برتری کے طور پر کسی کو اپنا عبد کہنا صرف اللہ کو جچتا ہے۔ تاہم اگر اس لفظ کے اطلاق کا مقصد محض ملکیت بیان کرنا ہو تو کوئی حرج نہیں۔

ربی (میرا رب) کہنے کا حکم:

دوسرا لفظ ہے جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ غلام اپنے آقا کے لئے ربی کا لفظ استعمال نہ کرے۔ کسی کے بارے میں لفظِ رب دو طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ بغیر اضافت کے استعمال ہو تو ایسی صورت میں یہ لفظ صرف اللہ تعالی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے اس کا استعمال ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ لفظِ رب اضافت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو اس کا استعمال جائز ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی بہت ساری جگہوں پر یہ لفظ آیا ہے۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہا ہونے والے کو کہا تھا "اذکرنی عند ربک" کہ اپنے رب کے ہاں میرا تذکرہ کر دینا۔ اسی طریقے سے حدیثوں میں بھی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ رب اضافت کے ساتھ غیر اللہ کیلئے استعمال کیا جائے تو وہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ غلام اپنے آقا کو خطاب کرتے ہوئے ربی نہ کہے تو اس نہی کا کیا مطلب ہے۔ تو اس کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہاں نہی تنزیہی ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو رب کہے یہ جائز تو ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس طرح کا لفظ استعمال نہ کرے اس لئے کہ بہر حال اس میں شرک کا ایہام ضرور ہے۔ اگرچہ بہت دور کا ہو لیکن ہے سہی۔ تو یہ کراہت تنزیہی ہے۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ منع کرنا اس صورت میں ہے جبکہ یہاں پر آقا کی حد سے زیادہ تعظیم مقصود ہو۔ ایک ہے ادب احترام وہ تو ہونا ہی چاہئے وہ اپنے ماتحتوں کو سکھانا بھی چاہئے لیکن عجمیوں کی طرح کوئی بھی بات کرنی ہو تو پہلے تعظیم کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کئے جائیں جیسا کہ بادشاہوں کے ہاں ہوتا تھا کہ بڑے بڑے القاب

مثلاً سلطان معظم فلاں اور فلاں اور اسی طرح کے الفاظ یہاں انگریزوں کے ہاں بھی بادشاہ کے لئے استعمال ہوتے ہیں، ہز میجسٹی وغیرہ۔ تو پہلے وہ لفظ بولو پھر اس کے بعد وہ بات کرو یہ طریقہ اسلامی تعلیمات میں نہیں ہے۔ تو یہاں پر ربی کہنے سے اس صورت میں منع کیا گیا ہے جبکہ اپنے غلام سے یہ کہنے کا تقاضا اس طرح کی عادت کی بنیاد پر کیا جائے۔ تو عبدی کہنے سے منع کر کے آقا کو کہا کہ تم اپنے غلام کی تحقیر نہ کرو اور یہاں زیادہ تعظیم کرانے سے منع کیا جا رہا کہ عظمت کے اندر اس طرح کی پابندیاں نہیں ہونی چاہئیں کہ مخصوص الفاظ ہوں وہ پہلے بولے جائیں پھر کوئی بات کہی جائے۔

چنانچہ یہی محمل ایک اور حدیث کا ہے وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ آدمی آئے اور انہوں نے آکر کہا انت سیدنا آپ ہمارے سید ہیں، تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سید تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ تو انہوں نے کہا انت أفضلنا فضلا و أعظمنا طولا، کہ آپ ہم سے افضل ہیں اور بہت بڑے ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قولوا بعض قولکم ولا یستجرینکم الشیطان[1] جو بات کہنی ہو وہ کہو شیطان کہیں تمہیں اس طرح کی باتوں میں چلاتا نہ رہے۔ جہاں پر یہ حدیث آئے گی وہاں پر اس کی تفصیلی تشریح عرض کریں گے۔ لیکن یہاں پر جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے سید کہا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی انکار فرمایا حالانکہ سید کا لفظ دوسرے کے لئے استعمال کرنا جائز ہے کوئی قباحت کی بات نہیں۔ قرآن کریم میں بھی آتا ہے احادیث میں بھی بکثرت آتا ہے۔ اور واقعتاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سید ہیں آپ نے اپنے بارے میں فرمایا میں انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر۔ خود کہہ رہے کہ میں سب کا سید ہوں تو انہوں نے کہہ دیا کہ آپ ہمارے سید ہیں تو کیا فرق پڑ گیا، یہاں پر آپ نے کیوں انکار فرمایا کہ نہیں سید تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ تو بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے -واللہ اعلم- کہ ان کہنے والوں نے یہ

---

[1]۔ سنن ابی داود، کتاب الأدب: باب فی کراہیۃ التمادح

سمجھا ہو گا کہ جس طرح کے شاہی آداب ہوتے ہیں کہ پہلے جاکر سید کی تعریف کی جائے تعریفی کلمات کہے جائیں کہ سر آپ تو بہت اونچے ہیں اور سر آپ تو یہ ہیں پھر اس کے بعد جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ بات کی جائے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمانا یہ چاہتے ہیں کہ اس طرح کی تمہیدات کی یہاں پر ضرورت نہیں ہے۔ جہاں پر واقعتاً کسی کی مدح کرنے کی ضرورت ہو اور دائرہ شریعت میں رہتے ہوئے کسی کی مدح کر لی جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں واقعتاً میں سید ہوں لیکن جو بات تم کہنے کے لئے آئے ہو اس سے پہلے تمہید کے طور پر کسی قسم کا مکھن لگانے کی اور جگہوں پر ضرورت ہوتی ہو گی یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اسی طرح یہاں پر ربی کا معاملہ ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں پر اس طرح کا معمول بن جائے ایک پروٹوکول کا حصہ ہو کہ پہلے یوں کہو پھر بولو جیسا کہ عدالتوں میں ہوتا ہے جج کو خطاب کرنا ہو تو پہلے کہتے مائی لارڈ پھر اگلی بات کرتے ہیں تو اس طرح کے جو الفاظ متعین کر لئے جائیں تو یہ شریعت کا مزاج نہیں ہے۔

کسی کو مولیٰ کہنا:

تیسرا لفظ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آقا کے بارہ میں یہ نہ کہے کہ یا مولای، اے میرے مولا اس لئے کہ تمہارے مولا تو حق تعالیٰ ہیں۔ تو یہاں پر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کو اپنا مولا کہنا جائز ہے یا نہیں تو صحیح یہی ہے کہ یہ جائز ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ مولا کا لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مولا کا ایک معنی تو ہے سب کچھ دینے والا، عطا کرنے والا رب۔ ظاہر ہے کہ اس معنی میں تو مولا صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔ لیکن مولی کے اور بھی بہت سارے معنی آتے ہیں۔ مجازی مالک کو بھی مولا کہہ دیا جاتا ہے، آزاد کردہ غلام کو بھی مولی کہہ دیا جاتا ہے، چاچازاد بھائی کو بھی مولا کہہ دیا جاتا ہے تو ان معانی میں مولا کا لفظ اگر غیر اللہ کے لئے استعمال کر لیا جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے فان اللہ ھو مولاہ وجبرئیل وصالح المؤمنین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کے مولی اللہ بھی ہیں جبرئیل علیہ السلام اور نیک مؤمنین بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مولی ہیں تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ بھی کسی کا مولا ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے عرف میں عالمِ دین کو جو مولانا کہہ دیا جاتا ہے اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مولا تو اللہ تعالیٰ ہیں یہ شرک ہے۔ یہ بات نہیں ہے ورنہ نعوذ باللہ یہ کہنا پڑے گا یہ شرک قرآن میں بھی موجود ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اور صالح المؤمنین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مولا ہیں۔ حالانکہ جبرئیل علیہ السلام کا مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے۔ اور صالح المومنین کا مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہے پھر بھی اس کو مولا کہا گیا ہے جب ان سے کم درجہ کے ان کے مولا ہو سکتے ہیں تو کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہے تو وہ بطریق اولیٰ اس کا مولیٰ بن سکتا ہے۔

اب آیئے اس حدیث کی طرف کہ یہاں پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ کوئی عبد اپنے آقا کو مولانا نہ کہے۔ لیکن یہاں جیسا کہ آپ کے سامنے آیا کہ روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ وہ مولای کہے، ربی کی بجائے سیدی کہے یا مولای کہے اس میں مولا کہنے کا حکم ہے۔ اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ مولای نہ کہے۔ بعض حضرات نے یہاں پر ترجیح پہلی روایات کو دی ہے جس میں آتا ہے کہ وہ مولای کہے اور جن میں آتا ہے کہ مولای نہ کہے اس کو مرجوح قرار دیا ہے[1]۔ اس کے مطابق تو بات ہی ختم ہو گئی۔ اگر دونوں روایتوں کو درست مان لیا جائے تو وہی بات کہیں گے جو پہلے کہی ہے۔ کہ فرق پڑ جاتا ہے موقع محل سے کہ اس کو مولای کہا جارہا ہے کس معنی میں۔ اگر کسی ایسے معنی میں اس کو مولای کہا جارہا ہے جو معنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو ظاہری بات ہے کہ یہ ناجائز

1۔ فتح الباری ۵/۱۸۰ کتاب العتق: باب کراہیۃ التطاول علی الرقیق۔

ہے لیکن اگر اس کو مولای عام عرفی معنی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اگر اس کو ویسے عام خطاب کے لئے مولای کہا جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تعظیم میں مبالغہ کے لئے کہا جاتا ہے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ تو کس موقع پر کہا جارہا ہے کس مقصد کیلئے کہا جارہا ہے اور کس معنی میں کہا جارہا ہے اس سے فرق پڑ جاتا ہے۔

کسی کو سید کہنا:

ان حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو سید کہنا بھی ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں بھی آتا ہے ''والفیاسیدھالدی الباب''یعنی یوسف اور زلیخا نے اس کے سید کو دروازے پر پایا۔ اسی طرح آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو غلام اللہ کا بھی حق ادا کرے اور اپنے آقا کے ساتھ بھی خیر خواہی کرے تو اس کے لئے دوہرا اجر ہوتا ہے۔ ایک لفظ آپ نے ایک روایت میں استعمال فرمایا ہے نصح لسیدہ۔ اس طرح کی بے شمار حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو سیدنا یا سیدی کہنا ٹھیک ہے۔

اب ذرا دوبارہ پیچھے کی طرف چلئے کہ آپ نے عبدی اور امتی کہنے سے منع فرمایا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ کلکم عبید اللہ وکلّ نسائکم اماء اللہ تم سب اللہ کے عبد ہو اور تم عورتیں اللہ کی بندیاں اور امہ ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا ''فان مولاکم اللہ'' کہ تمہارے مولا اللہ تعالیٰ ہیں، اسی طرح کی بات اگلی روایت میں آئے گی کہ آپ نے فرمایا کہ کرم مؤمن کا دل ہے ان سب کے بارہ میں امام بخاری نے بہت اچھے انداز سے بحث فرمائی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس طرح کی تعبیرات کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان الفاظ کا اطلاق انہی جگہوں پر ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور جگہ پر نہیں ہو سکتا۔ تم اللہ کے عبد ہو یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کسی اور کے عبد نہیں کہلا سکتے۔ تمہارے مولا اللہ تعالیٰ ہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کسی اور کو مولا نہیں کہہ سکتے۔ کرم مؤمن کا دل ہے اس کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ کرم کا اطلاق کسی اور چیز پر ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ عام عرف میں ان لفظوں کا اطلاق جن معانی پر ہوتا ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن اس لفظ کے اطلاق کا سب سے بڑا محل یہ ہے۔ اوروں کے بھی عبد ہوں گے لیکن اصل عبدیت اللہ کے لئے ہے۔ کوئی باندی کسی کی امہ ہو گی لیکن سب سے زیادہ وہ امہ ہے اللہ تعالیٰ کی۔ اور بھی کرم کے معانی ہوں گے لیکن لفظ کرم کا سب سے زیادہ مستحق مؤمن کا دل ہے۔ تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ لفظ کے اطلاق کا سب سے بڑا محل یہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ کسی اور جگہ پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کو امام بخاری نے کئی مثالوں سے سمجھایا ہے۔ مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا ملک الا اللہ۔ کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ملک یعنی بادشاہ نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ملک کا اطلاق اللہ کے علاوہ کسی اور پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کامل اور حقیقی بادشاہت اللہ کے لئے ہے۔ لیکن کسی اور کو ملک کہا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ﴾ اسی طرح آتا ہے ﴿إِنَّ الْمُلُوْكَ إِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً أَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾۔ خود قرآن کریم میں ملک (بادشاہ) کا اطلاق اللہ کے علاوہ اوروں پر کیا گیا ہے۔ تو حدیث لا ملک الا اللہ کے یہ معنی نہیں کہ کسی اور کو ملک کہہ نہیں سکتے اس کا مطلب یہ ہے کامل ملک سب سے زیادہ ملک کہلانے کے مستحق اللہ تعالیٰ ہیں۔ اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ کو قابو میں کر لے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو اپنے غصے کو قابو کرنے والا ہے، مجاہدے اور ریاضتیں کرنے والا صوفی ہے، اسی کو پہلوان کہہ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ تو بیچارہ مجاہدے کر کر کے سوکھا ہوا ہو اور اس کو پہلوان کہا ہی نہ جا سکتا ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ بھی ایک پہلوانی ہے اور تم لوگ اسی کو پہلوان کہتے ہیں۔ اس سے بڑی ایک پہلوانی یہ ہے کہ آدمی دوسروں کو قابو کرنے کی بجائے اپنے آپ کو قابو کرے۔ یہ مطلب نہیں کہ کسی کو صریع (پہلوان) کہہ نہیں سکتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کامل درجے کا صریع یہ ہے سب سے زیادہ صرعۃ اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ تو یہی معاملہ یہاں پر ہے

کہ جب یہ کہا کلکم عبیداللہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کو کسی کا عبد کہا نہیں جاسکتا، جب یہ کہا کل نسائکم اماء اللہ یہ مطلب نہیں کسی کو کسی کی باندی نہیں کہاجاسکتا، جب یہ کہا مولاکم اللہ تو یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی اور کو کسی اور کا مولا نہیں کہاجاسکتا۔

انگور کو کرم نہ کہو

(١٢) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَقُولُوا: الْكَرْمُ فَإِنَّ الْكَرْمَ قَلْبُ الْمُؤمن ». رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم انگور کو کرم نہ کہواس لئے کہ کرم مؤمن کا دل ہے۔

(١٣) وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ وَائِلِ بْنِ حُجْرٍ قَالَ: «لَا تَقُولُوا: الْكَرْمُ وَلَكِنْ قُولُوا: الْعِنَبُ والحَبَلَة»

اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ نے فرمایا کہ انگور کو کرم نہ کہو بلکہ عنب اور حبلہ کہو۔

عربوں کے ہاں انگور اور اس کی بیل کو کرم کہہ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات شراب کو بھی کرم کہہ دیتے تھے۔ کبھی کرم کہتے تھے کبھی ابنۃ الکرم کہتے تھے، کرم یعنی انگور کی بیٹی یعنی اس سے بنی ہوئی۔ چنانچہ ایک شاعر ابونواس کا قول ہے

صفة التلول بلاغة الفدم فاجعل صفاتك لابنة الكرم

آپ کو معلوم ہوگا کہ قدیم عرب شعرا اپنے قصائد کے شروع میں محبوبہ کے کھنڈرات کا ذکر کیا کرتے تھے ۔ تو شاعر کہتا ہے کہ یہ پرانے سیدھے سادھے لوگوں کی بلاغت ہے اور ان کا طریقہ ہے اور چونکہ ہم ترقی یافتہ ہو گئے ہیں ان کو چھوڑ دیہ تو بدؤوں کے زمانے میں ہوتا تھا کہ ایک جگہ پر رہ رہے ہیں وہاں پر ڈیڑا ڈالا ہوا ہے، جب وہاں کا چشمہ خشک ہوا تو اٹھ کر کہیں اور چلے گئے۔ پھر دوبارہ وہاں پر آئے تو اپنی محبوبہ یاد آگئی اب ہم شہری بن گئے ہیں۔ اب یوں قصائد وغیرہ کے شروع میں کھنڈرات کا ذکر کرنے کی بجائے جن سے ہم کو واسطہ ہی نہیں پڑتا اس چیز کا ذکر کرو جس سے واسطہ پڑتا ہے وہ ابنۃ الکرم ہے، یعنی شراب کا تذکرہ کرو۔ تو عرب انگور کو بھی اور اس کی بیل کو بھی کرم کہتے تھے شراب کو کرم اور ابنۃ الکرم کہتے تھے۔ ویسے تو یہ ایک نام ہے کسی چیز کا کسی چیز کا کوئی بھی نام رکھ لیا جائے کوئی حرج کی بات نہیں۔ یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انگور کو کرم کہنے سے منع فرمایا ایک خاص وجہ سے۔ وہ یہ کہ اصل میں زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کا یہ تصور تھا کہ شراب پینا اور جوا کھیلنا عزت، شرافت اور حوصلہ مندی کی علامتیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیوان حماسہ میں پڑھا ہوگا کہ بہت سارے شعرا اپنی تعریف وغیرہ کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ ہم اپنے اونٹ وغیرہ بیچ کر کچھ پیسے شراب پینے پر لگا دیتے اور کچھ پیسے جوے پر لگا دیتے ہیں یہ ان کے حوصلہ مندی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ شراب کو کرم کہتے تھے اس وجہ سے کہ شراب پینا شرافت کی علامت ہے اور اس وجہ سے بھی کہتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ جب آدمی شراب پی لیتا ہے نشے میں ہوتا ہے تو وہ سخاوت زیادہ کرتا ہے مال لوٹاتا ہے اس کو کوئی پروا نہیں

ہوتی مہمان آگئے اتنے اونٹ ذبح کردو یہ کردو تو یہ شراب آدمی کو آمادہ کرتی ہے کرم پراس لئے شراب کو بھی کرم کہہ دیتے تھے اور جس چیز سے شراب بنتی تھی یعنی انگوراس کو بھی کرم کہہ دیتے تھے۔اس میں گویا شراب کی تعریف کا پہلو نکلتا تھا، جبکہ ابتدا میں حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کوشش یہ فرمائی ہے کہ شراب کی نفرت دلوں میں بٹھائی جائے۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے آپ نے مخصوص برتنوں کے استعمال سے بھی منع فرمادیا ہے اور بھی کئی عارضی احکامات آپ نے اسی مقصد کیلئے دیئے تاکہ شراب کی نفرت اچھی طرح دلوں میں بیٹھ جائے اور عرصہ دراز سے جو اس کا شوق دلوں کے اندر رچا ہوا ہے وہ پوری طرح نکل جائے۔اسی لئے حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انگور کو کرم نہ کہو بلکہ اس کی بجائے اس کو عنب کہو اور انگور کی بیل کو حبلہ کہو۔اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرم کا ایک متبادل استعمال بیان فرمایا تھا جو اس اطلاق کا سب سے زیادہ حق رکھتا ہے تم کرم کہتے ہو انگوروں کو اس وجہ سے کہ وہ کرم کا باعث ہیں۔سخاوت کا ذریعہ ہے تو سخاوت اصل میں شراب کی وجہ سے نشے کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ سخاوت اصل میں مؤمن کے دل میں ہوتی ہے۔اگر دل کے اندر سخاوت موجود ہو تو شراب نہ بھی پی ہوئی ہو تو وہ سخاوت کرے گا اس لئے جس معنی میں تم انگور کو کرم کہتے ہو اس معنی میں کرم کہلانے کا صحیح مستحق مؤمن کا دل ہے۔

لیکن یہ یاد رکھیں کہ اس طرح کے اطلاقات کے سلسلے میں جتنی بھی نہی آرہی ہے یہ سب تنزیہی ہے۔پچھلی حدیث میں جو آیا وہ بھی اس حدیث میں بھی جو آیا وہ بھی ان میں نہی تنزیہی ہے تحریمی نہیں ہے اور آگے بھی جو آرہا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں نہ کہو یہ سب نہی تنزیہی ہیں اور یہ نہی بھی اس صورت میں جب کرم کا لفظ بولنے سے ذہن اس خاص معنی کی طرف منتقل ہوتا ہو۔لیکن اگر اس کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

زمانے کو برامت کہو

(١٤) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " لَا تُسَمُّوا الْعِنَبَ الْكَرْمَ وَلَا تَقُولُوا: يَا خَيْبَةَ الدَّهْرِ فَإِنَّ اللهَ هُوَ الدهرُ ". رَوَاهُ الْبُخَارِيّ

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انگور کو کرم مت کہو اور یہ مت کہو ہائے زمانہ کی بربادی، اس لئے کہ اللہ تعالی ہی زمانہ ہیں۔

(١٥) وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا يَسُبَّ أَحَدُكُمُ الدَّهْرَ فَإِنَّ اللهَ هوَ الدَّهْر» . رَوَاهُ مُسلم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص زمانے کو گالی نہ دے اس لئے کہ اللہ تعالی ہی زمانہ ہیں۔

مطلب اس کا یہ ہے جب کوئی کام غلط ہو جاتا ہے، کوئی نقصان ہو جاتا ہے تو عموماً زمانے کو گالی دی جاتی اور اسے برا بھلا کہا جاتا ہے، کہ زمانہ بڑا خراب ہے، یہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو کچھ کیا ہے زمانے نے کیا ہے۔ حالانکہ کرنے والا زمانہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی ہیں۔ جو کچھ سمجھ کر زمانے کو گالی دی ہے وہ حقیقتاً اللہ تعالی ہیں۔ زمانے کو فاعل حقیقی سمجھ کر گالی دی حالانکہ فاعل اللہ تعالی ہیں اس لئے یہ گالی زمانے کو نہیں پڑی بلکہ حقیقت میں اللہ تعالی کو پڑی۔ ایک کام عمرو نے کیا لیکن آپ نے یہ فرض کر لیا کہ یہ زید نے کیا اور یہ کہتے ہیں کہ اس نے بہت برا کیا، دیکھنے میں آپ زید کو برا کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ عمرو کی برائی بن رہی ہے۔ اسی طرح یہاں زمانے کو تم برا کہتے وہ

در حقیقت اللہ تعالیٰ کی برائی ہوتی ہے۔اور اس لئے فرمایا کہ زمانے کو برا نہ کہو۔تو گویا اس کی دو وجہیں ہو گئیں ایک یہ کہ زمانے کو برا کہتے ہو اس میں یہ سوچ پوشیدہ ہے کہ زمانہ سب کچھ کرتا ہے یہ غلط ہے۔اور دوسرا یہ کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی ہے اگرچہ بے ادبی کا ارادہ نہ ہو لیکن بے ادبی ہو تو گئی اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔

الفاظ اور تعبیرات کے چناؤ میں شائستگی

(١٦) وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ: خَبُثَتْ نَفْسِي وَلَكِنْ لِيَقُلْ: لَقِسَتْ نَفْسِي». مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ

وَذُكِرَ حديثُ أبي هريرةَ: «يُؤذيني ابنُ آدمَ» فِي «بَابِ الْإِيمَانِ».

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میری طبیعت بگڑ گئی، بلکہ یوں کہے میری طبیعت بوجھل ہو گئی۔

جب آدمی بیمار ہوتا ہے یا طبیعت میں کسی قسم کی گرانی ہوتی ہے تو اس کے لئے دو لفظ بولے جا سکتے ہیں۔ایک لفظ یہ کہ یہ کہا جائے ''خبثت نفسی''۔یہاں خبث یخبث کا معنی بھی یہی ہے کہ طبیعت بگڑی ہوئی ہے ٹھیک نہیں ہے۔اور دوسرا لفظ ہے ''لَقِستُ نفسی'' اس کا حاصل بھی یہی ہے۔کیونکہ لقس یلقس کا معنی ہوتا ہے متلی آنا، دل برا ہونا وغیرہ۔تو مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔خبث نفسی کہہ کر بھی مقصود یہ ہوتا تھا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں اور لقست نفسی کہہ کر بھی یہی مقصد ہوتا تھا۔لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسری تعبیر اختیار کرو پہلی تعبیر اختیار نہ کرو۔وجہ اس کی یہ ہے کہ جب ایسے موقع پر خبثت نفسی کہیں گے تو جو معنی مراد ہے وہ تو ٹھیک ہے لیکن لفظ

غیر سائشتہ ہے، اچھا لفظ نہیں ہے۔ کیونکہ خبیث کا معنی اس سے وسیع ہے۔ اس کے اندر باطنی خباثت اخلاق اور عادات کی خباثت سب کچھ آجاتا ہے تو اس طرح کا لفظ جو ایسے معنی کو موہم ہو وہ بھی بولنا نہیں چاہئے۔

اس سے یہ اصول سمجھ میں آیا کہ الفاظ استعمال کرتے وقت ایک تو یہ دیکھنا چاہئے کہ جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں جو آپ کا مراد و مقصود ہے وہ ٹھیک ہو اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جو لفظ آپ استعمال کر رہے ہیں وہ بھی سائستہ اور مہذب ہوں۔ محض یہ کافی نہیں ہے کہ میرا مقصد ٹھیک ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ ایسے ہوں جو بدذوقی کی علامت نہ ہوں۔ اس کی ایک مثال یہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبثت نفسی نہ کہو بلکہ لقست نفسی کہو۔ اسی طریقے سے ایک موقع پر ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آکر یوں اجازت طلب کی کہ السلام علیکم أألج۔ ولج یلج کے معنی ہوتے ہیں داخل ہونا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں نہ کہو أألج بلکہ کہو أأدخل۔ اس لئے کہ اصل میں ولج یلج کا معنی ہوتا ہے گھسنا تو أألج کہہ رہے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ جس جگہ میں آرہا ہوں وہ جگہ تنگ ہے یا آپ پر میں بوجھ بننا چاہتا ہوں زبردستی گھسنا چاہتا ہوں اگرچہ مقصود یہ نہ ہو لیکن لفظ تو ایسے ہی ہیں اس لئے اس سے بچنا چاہئے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمہ اللہ کے پاس ایک صاحب تھے انہوں نے کہیں جانا تھا لیکن گاڑی وغیرہ ان کے پاس نہیں تھی، دوسرے ایک صاحب کے پاس گاڑی تھی انہوں نے کہا کہ حضرت میں انہیں چھوڑ آتا ہوں تو حضرت نے فرمایا کہ چھوڑ آؤگے یا پہنچا آؤگے؟ یعنی مقصد تو آپ کا ٹھیک ہے لیکن اس معنی کو اگر یوں تعبیر کرو کہ میں پہنچا آتا ہوں یہ بہتر ہے بنسبت اس کے یوں کہو کہ میں چھوڑ آتا ہوں۔ کیونکہ اس میں ایک قسم کا متارکہ کا معنی پایا جاتا ہے۔

الفصل الثانی

ابو الحکم کنیت پسندیدہ نہیں

(١٧) عَن شُرَيْح بن هَانِئٍ عَن أبيهِ أَنَّهُ لَمَّا وَفَدَ إِلَى رَسُولِ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَ قَوْمِهِ سَمِعَهُمْ يُكَنُّونَهُ بِأَبِي الْحَكَمِ فَدَعَاهُ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: «إِنَّ اللهَ هُوَ الْحَكَمُ فَلِمَ تُكَنَّى أَبَا الْحَكَمِ؟» قَالَ: إِنَّ قَوْمِي إِذَا اخْتَلَفُوا فِي شَيْءٍ أَتَوْنِي فَحَكَمْتُ بَيْنَهُمْ فَرَضِيَ كِلَا الْفَرِيقَيْنِ بِحُكْمِي. فَقَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا أَحْسَنَ هَذَا فَمَا لَكَ مِنَ الْوَلَدِ؟» قَالَ: لِي شُرَيْحٌ وَمُسْلِمٌ وَعَبْدُ الله قَالَ: «فَمَنْ أَكْبَرُهُمْ؟» قَالَ: قُلْتُ: شُرَيْحٌ. قَالَ فَأَنْتَ أَبُو شُرَيْحٍ». رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وَالنَّسَائِيّ

حضرت شریح بن ہانی اپنے والد ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی قوم کے وفد میں شامل ہو کر آئے تو آپ نے ان کی قوم کے لوگوں کو سنا کہ وہ انہیں اُبوالحکم کی کنیت سے پکارتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلایا اور کہا کہ اللہ حکم (فیصلہ کرنے والے) تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، انہی کی طرف حکم لوٹتا ہے، پھر تمہاری کنیت ابوالحکم کیوں ہے۔ ہانی نے کہا کہ میری قوم میں جب کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے درمیان فیصلہ کر دیتا ہوں تو وہ میرے فیصلے پر راضی ہو جاتے ہیں (اس لئے مجھے ابوالحکم کہا جانے لگا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو بہت اچھی بات ہے، تمہارے بچے کون کون سے ہیں۔ انہوں نے کہا میرا شریح

ہے، مسلم ہے اور عبد اللہ ہے۔ آپ نے فرمایا ان میں بڑا کون ہے۔ میں نے کہا شریح، تو آپ نے فرمایا تم ابو شریح ہو۔

یہ ابو شریح یاہانی والد ہیں معروف قاضی شریح کے۔ جو کہ خلافت راشدہ کے معروف قاضی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں منصب قضا پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں تک قاضی رہے قرون اولیٰ کے چند معروف قاضیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ تو شریح تابعی ہیں مگر ان کے والد صحابی ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ابو حکم کنیت سے منع فرمادیا۔ اس لئے کہ فیصلہ کرنا اصل میں اللہ تعالیٰ کا کام ہے حاکم حقیقی اللہ تعالیٰ ہیں۔ ابوالحکم کنیت اگرچہ صریح شرک نہیں ہے لیکن آپ نے اس کو نامناسب ضرور سمجھا۔ انہوں نے اس کنیت کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو فریقوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی خاص صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ جب بھی لوگوں کا اختلاف ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں تو میں فیصلہ کر دیتا ہوں تو دونوں فریق مطمئن ہو جاتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وصف تو بہت اچھا ہے یہ کام بھی بہت اچھا ہے کہ تم لوگوں کے درمیان مصالحتیں کراتے ہو لیکن اس کی وجہ سے ابوالحکم کنیت نہ رکھو۔ کنیت بدل دو، اور اس کے لئے آپ نے مناسب یہ سمجھا کہ اولاد کے نام پر کنیت رکھ دی جائے اس لئے آپ نے اولاد کے نام پوچھے، اور ان میں سے سب بڑے بیٹے شریح کے نام پر ان کی کنیت ابو شریح مقرر فرمادی۔

اجدع شیطان کا نام ہے

(۱۸) وَعَن مسروقٍ قَالَ: لَقِيتُ عُمَرَ فَقَالَ: مَنْ أَنْتَ؟ قُلْتُ: مَسْرُوقُ بْنُ الْأَجْدَعِ. قَالَ عُمَرُ: سَمِعْتُ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «الْأَجْدَعُ شيطانٌ» رَوَاهُ أَبُو دَاوُد وابنُ مَاجَه

مسروق کہتے ہیں کہ میں حضرت عمرؓ سے ملا تو انہوں نے کہا تم کون ہو؟، میں نے کہا مسروق بن الاجدع۔ حضرت عمر نے (میرے والد کا نام سن کر) کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اجدع (ناک کان کٹا ہوا) شیطان ہے۔

مسروق جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، یمن کے قبیلے ہمدان سے تعلق رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن آپ کی زیارت سے مشرف نہیں ہو سکے اس لئے صحابی نہیں ہیں۔ ان کا شمار ان کبار تابعین میں ہوتا ہے جو عہدِ صحابہ میں ہی فتویٰ دیا کرتے تھے۔ علم، زہد، عبادت وغیرہ میں ان کا مقام بہت اونچا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ انہیں مسروق کہنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے بچپن ایک دفعہ انہیں کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا، بعد میں بازیاب ہو گئے، لیکن نام مسروق ہی پڑ گیا، یعنی چوری شدہ۔

ان کے والد کا نام اجدع تھا۔ یہ بھی مسلمان ہو چکے تھے۔ حضرت عمر نے یہ نام سن کر حدیث نقل فرمائی کہ اجدع شیطان ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ شیطان کے ناموں میں سے ایک نام اجدع ہے، اس لئے یہ نام رکھنا درست نہیں۔ اکثر شارحین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ تاہم یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اجدع ہونا

شیطان کا وصف ہے۔ اجدع کے لفظی معنی ہیں کان، ناک کٹا ہو۔ اس سے مراد لیا جاتا ہے برکت اور بے تکا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کا مقصد یہ تھا کہ یہ نام تبدیل کر لیا جائے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں تصریح ہے کہ حضرت عمر نے خود ہی متبادل نام بھی تجویز فرما دیا۔ حضرت عمر نے فرمایا "ولکنک مسروق بن عبد الرحمن"، تم مسروق بن عبد الرحمن ہو، یعنی تمہارے والد کا نام عبد الرحمن ہو گا۔ اس حدیث کے راوی امام شعبی کہتے ہیں کہ میں نے دیوان (سرکاری رجسٹر) میں یہی نام لکھا ہوا دیکھا ہے[1]۔ ابن سعد نے الطبقات الکبری میں لکھا ہے کہ نام تبدیل کرنے والی یہ بات حضرت عمرؓ نے براہِ راست بھی مسروق کے والد سے کہی تھی[2]۔ بہر حال اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ مسروق نام رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔

اچھے نام کا قیامت میں فائدہ

(۱۹) وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَسْمَائِكُمْ وَأَسْمَاءِ آبَائِكُمْ فَأَحْسِنُوا أَسْمَاءَكُمْ» رَوَاهُ أَحْمد وَأَبُو دَاوُد.

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں قیامت کے دن تمہارے ناموں اور تمہارے آبا کے ناموں سے پکارا جائے گا، اس لئے تم اپنے نام اچھے رکھا کرو۔

---

[1]۔ مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۱۱

[2]۔ الطبقات الکبری ۱۳۸/۶۔

یہاں یہ حدیث لانے کا مقصد تو یہ بتانا ہے کہ نام اچھے رکھنے چاہئیں، اس لئے کہ دنیا میں تو یہ نام چند لوگوں کے سامنے ہی آتے ہیں، قیامت کے دن سب کے سامنے یہ نام لئے جائیں گے۔

قیامت کے دن باپ کے نام سے پکارا جائے گا یا ماں کے ؟:

یہاں ایک سوال یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے حوالے سے پکارا جائے گا یا باپ کے نام سے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے ناموں سے پکارا جائے گا، اس لئے کہ ہر ایک متعین ہوتی ہے، جس نے اسے جنا ہوتا ہے، باپ میں کبھی اشتباہ بھی ہو جاتا ہے۔ قیامت کے دن جو سچ مچ کسی کا باپ ہے اس کا نام لینا بعض کے لئے رسوائی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ ان حضرات نے حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جس میں یہی بات آتی ہے، جسے طبرانی روایت کیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے[1]۔ جبکہ زیرِ نظر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن آباء کے ناموں سے پکارا جائے گا۔ اگرچہ اس حدیث کی سند پر بھی کلام ہے، مثلاً یہ کہ حضرت ابوالدرداء سے یہ حدیث جو روایت کر رہے ہیں یعنی عبداللہ بن ابی زکریا ان کی حضرت ابوالدرداء سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی اس حدیث کی سند طبرانی کی مذکورہ روایت سے بہت بہتر ہے۔ نیز امام بخاری نے اسی بات کو ایک اور صحیح حدیث سے ثابت کیا ہے، جس میں آتا ہے کہ ہر غدر کرنے والے کے لئے اس کے غدر کی بقدر جھنڈا ہوگا جس سے سب کو پتا چلے گا کہ یہ شخص دنیا میں غدر کرتا تھا۔ اس حدیث میں لفظ آتے ہیں: ہذہ غدرۃ فلان بن فلان۔ اگر ماں کے حوالے سے پکارا جانا ہوتا تو یوں کہا جاتا "ہذہ غدرۃ فلان بن فلانۃ"۔ تاہم مستثنیات ہر جگہ ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا میں صرف والدہ کی نسبت

1۔ فتح الباری ۱۰/۵۶۳ کتاب الأدب: باب مایُدعی الناس بأسماء آبائہم۔

سے یاد کیا جاتا ہے، آخرت میں بھی ایسا ہوگا۔ نیز حافظ نے ذکر کیا ہے کہ اگر باپ سے پکارا جائے گا تو اس باپ کا نام لیا جائے جس کی طرف نسبت کے حوالے سے وہ دنیا میں معروف تھا۔ واللہ أعلم بالصواب۔

(٢٠) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ نَهَى أَنْ يَجْمَعَ أَحَدٌ بَيْنَ اسْمه وكُنيتِه وَيُسمى مُحَمّداً أَبَا الْقَاسِم. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ.

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ آپ کے نام اور کنیت کو جمع کیا جائے اور محمد ابوالقاسم نام رکھا جائے۔

(٢١) وَعَنْ جَابِر: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: «إِذَا سَمَّيْتُمْ بِاسْمِي فَلَا تَكْتَنُوا بِكُنْيَتِي» . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَهْ. وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ. وَفِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ قَالَ: «مَن تسمَّى باسمي فَلَا يَكْتَنِ بِكُنْيَتِي وَمَنْ تَكَنَّى بِكُنْيَتِي فَلَا يَتَسَمَّ باسمي».

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میرے والا نام رکھو تو میرے والی کنیت اختیار نہ کرو، ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے جس نے میرا نام رکھا وہ میری کنیت اختیار نہ کرے اور جس نے میرے والی کنیت رکھی وہ میرا نام اختیار نہ کرے۔

(٢٢) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ الله عَنْهَا أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ: يَا رَسُولَ الله إِنِّي وَلَدْتُ غُلَامًا فَسَمَّيْتُهُ مُحَمَّدًا وَكَنَّيْتُهُ أَبَا الْقَاسِمِ فَذُكِرَ لِي أَنَّكَ تَكْرَهُ ذَلِكَ. فَقَالَ: «مَا

الَّذِي أَحَلَّ اسْمِي وَحرم كنيتي؟ أَو ماالذي حَرَّمَ كُنْيَتِي وَأَحَلَّ اسْمِي؟» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ. وَقَالَ محيي السّنة: غَرِيب.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یارسول اللہ میرے ایک لڑکا پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام محمد رکھا اور کنیت ابوالقاسم مقرر کی تو مجھے بتایا گیا کہ آپ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ کونسی چیز ہے جس نے میرے نام کو حلال بنایا اور میری کنیت کو حرام کیا، یایوں فرمایا کہ کونسی چیز ہے جس نے میری کنیت کو حرام کیا اور میرے نام کو حلال کیا (یعنی جب ایک جائز ہے تو دوسرا بھی جائز ہے)۔

مطلب یہ کہ بذاتِ خود شرعی حرمت دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں ہے۔ جو عارضی ممانعت تھی وہ انتظامی تھی اور مخصوص حالات کے پیشِ نظر تھی، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

(٢٣) وَعَن مُحَمَّد بن الحنفيَّةِ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ الله أَرَأَيْتَ إِنْ وُلِدَ لِي بَعْدَكَ وَلَدٌ أُسَمِّيهِ بِاسْمِكَ وَأُكَنِّيهِ بِكُنْيَتِكَ؟ قَالَ: «نَعَمْ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

محمد بن الحنفیہ اپنے والد حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ بتلائیے کہ اگر آپ کے بعد میرے کوئی اولاد ہو تو میں اس کا نام آپ والا اور اس کی کنیت آپ والی رکھ لوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں!

بنو حنیفہ یمامہ کے علاقے کا بڑا مشہور قبیلہ تھا، مسیلمۃ کذاب کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ اس قبیلے کی ایک باندی حضرت علیؓ کے حصے میں آئی تھی، جس سے حضرت علی کے صاحبزادے پیدا ہوئے جن کا نام محمد رکھا گیا، یہ چونکہ حضرت فاطمہؓ سے نہیں تھے، بلکہ بنو حنیفہ کی باندی سے تھے اس لئے انہیں محمد بن الحنفیہ کہہ دیا جاتا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے یہ باندی نسبی اعتبار سے بھی بنو حنیفہ میں سے نہیں تھی، بلکہ ان کی مملوکہ باندی تھیں، اصل میں یہ سند سے تعلق رکھتی تھیں۔

(٢٤) وَعَن أنس قَالَ: كَنَّانِي رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِبَقْلَةٍ كُنْتُ أَجْتَنِيهَا. رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ: هَذَا حَدِيثٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هَذَا الْوَجْه. وَفِي المصابيح صَححهُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میری کنیت ایک ایسی بوٹی سے رکھی جو میں چنا کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک بوٹی اکھاڑا کرتے تھے، جسے عربی میں حمزۃ کہتے ہیں، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے ان کی کنیت ابو حمزہ رکھ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کنیت کے لئے نہ تو یہ ضروری ہے کہ وہ اولاد میں سے کسی کے نام پر ہو اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ جس کی کنیت ہے وہ صاحبِ اولاد ہو۔ اس لئے کہ بظاہر اس وقت حضرت انسؓ چھوٹے تھے۔

یہاں یہ حدیث ترمذی کے حوالے سے نقل کی گئی ہے، اور امام ترمذی کا اس پر یہ تبصرہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ حدیث صرف اسی طریق سے مروی ہے۔ اس کے بعد صاحب مشکوۃ نے کہا ہے: ''وفی المصابیح صححہ''۔ اس سے بظاہر یہ

معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مصابیح یعنی امام بغوی نے امام ترمذی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ امام بغوی نے مصابیح میں اس پر ''صح'' کی رمز لگائی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امام بغوی کی اپنی رائے ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، یہ بات انہوں نے امام ترمذی کے حوالے سے نقل نہیں کی۔ نہ ہی جامع ترمذی کے کسی نسخے میں یہ بات ہے کہ انہوں نے اسے صحیح قرار دیا ہو۔ امام بغوی کی اس رائے سے اتفاق مشکل ہے، اس لئے کہ اس حدیث کی سند کا مدار جابر بن یزید جعفی پر ہے جن پر محدثین کے ہاں خاصی کلام ہے۔

(٢٥) وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ الله عَنْهَا قَالَتْ: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ كَانَ يُغَيِّرُ الِاسْم الْقَبِيح. رَوَاهُ التِّرْمِذِيّ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ برے نام کو تبدیل کر دیا کرتے تھے۔

چند برے نام

(٢٦) وَعَنْ بَشِيرِ بْنِ مَيْمُونٍ، عَنْ عَمِّهِ أُسَامَةَ بْنِ أَخْدَرِيٍّ، «أَنَّ رَجُلًا يُقَالُ لَهُ أَصْرَمُ كَانَ فِي النَّفَرِ الَّذِينَ أُوتُوا رَسُولَ الله - صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فَقَالَ رَسُولُ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " مَا اسْمُكَ؟ " قَالَ: أَصْرَمُ قَالَ: " بَلْ أَنْتَ زُرْعَةُ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَوَقَالَ: وَغَيَّرَ النَّبِيُّ - صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - اسْمَ

الْعَاصِ، وَعَزِيزٍ، وَعَتَلَةَ، وَشَيْطَانٍ، وَالْحَكَمِ، وَغُرَابٍ، وَحُبَابٍ، وَشِهَابٍ، وَقَالَ: تَرَكْتُ أَسَانِيدَهَا لِلاخْتِصَارِ.

اسامہ بن اخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی جسے اصرم کہا جاتا تھا ان لوگوں میں شامل تھا جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا نام کیا ہے، اس نے کہا اصرم، آپ نے فرمایا بلکہ تم زرعہ ہو۔ یہ حدیث امام ابو داود نے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے العاص، عزیز، عَتَلہ، شیطان، الحکم، غراب (کوّا)، حباب اور شہاب ناموں کو تبدیل فرمایا، امام ابو داود فرماتے ہیں کہ میں نے اختصار کی خاطر ان کی سندیں ذکر نہیں کیں۔

اصرم، صرم یصرم سے مشتق ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں کھیتی وغیرہ کا کٹنا، بھسم ہو جانا جل جانا وغیرہ، جبکہ زُرْعہ، زراعت سے ہے جس کے معنی اگنے کے ہیں۔ تو آں حضرت ﷺ نے اصرم نام تبدیل کر کے زُرْعہ رکھ دیا۔ امام ابوداؤد نے چند اور مثالیں بھی ذکر کی ہیں جہاں رسول اللہ ﷺ نے کسی نامناسب نام کو تبدیل فرمادیا۔ ان میں ایک نام العاص ہے، اس لئے کہ یہ عصیان اور معصیت سے بنا ہے۔ ایک نام عزیز ہے۔ اس کو تبدیل کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عزیز کی بجائے عبد العزیز کہنا زیادہ مناسب ہے، یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں اپنی بڑائی بیان کرنے کا شائبہ ہے۔ عَتَلہ نام بھی آپ نے تبدیل فرمایا، اس لئے اس میں سرکشی اور سختی کے معنی پائے جاتے ہیں۔ الحکم نام بھی آپ نے تبدیل فرمایا، اس کی وجہ پہلے قاضی شریح کے والد کے واقعہ میں گذر چکی ہے۔ شیطان نام تبدیل کرنے کی وجہ واضح ہے۔ غراب کوّے کو کہتے ہیں جو کہ پسندیدہ جانور نہیں سمجھا جاتا، نیز اس میں دوری کے معنی پائے جاتے ہیں۔ حُباب کے بارے میں بعض نے کہا کہ یہ شیطان کا نام ہے، بعض نے کہا یہ سانپ کی ایک قسم ہے۔ شہاب شعلے کو کہتے

ہیں، اس میں آگ کی طرف نسبت ہے۔ بعض نے کہا کہ شہاب نام اکیلا ہو تو مناسب نہیں، اس کی نسبت دین کی طرف ہو، یعنی شہاب الدین میں کوئی حرج نہیں۔

(۲۷) وَعَن أبي مسعودٍ الأنصاريِّ قَالَ لِأَبِي عَبْدِ الله أَوْ قَالَ أَبُو عَبْدِ الله لِأَبِي مَسْعُودٍ: مَا سَمِعْتُ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ فِي "زَعَمُوا"

قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ الله صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «بِئْسَ مَطِيَّةُ الرَّجُلِ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ وَقَالَ: إِنَّ أَبَا عَبْدِ الله حُذَيْفَة.

حضرت ابو مسعود انصاری نے ابو عبد اللہ (یعنی حضرت حذیفہ) سے کہا یا ابو عبد اللہ نے ابو مسعود سے کہا آپ نے رسول اللہ ﷺ کو "زَعَمُوا" (لوگ کہتے ہیں) کے بارے میں کیا فرماتے ہوئے سنا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ یہ آدمی کا برا تکیہ کلام (یا برا سہارا) ہے۔

زعموا کا مطلب ہے لوگ یوں کہتے ہیں، لوگوں کا گمان یہ ہے۔ یہ تعبیر کے استعمال میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ آدمی اپنی ذمہ داری پر بات کرنے کی بجائے دوسروں کے کھاتے میں ڈال کر کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طرح کی تعبیر کے ساتھ بات نقل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص سنی سنائی بات بغیر تحقیق کے آگے نقل کر رہا ہے۔ جو آدمی ہر بات سے پہلے یہی کہتا ہے کہ لوگ یوں کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنی سنائی باتیں نقل کرنے کا عادی ہے۔

یہاں زعموا کے بارے میں فرمایا بئس مطیۃ الرجل، مطیۃ کے لفظی معنی ہیں سواری، یہاں اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح سواری کو کسی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے اسی طرح اس شخص کا اصل مقصود تو

اس بات کو مخاطب کے ذہن میں ڈالنا، مثلاً مخاطب کو کسی کے بارے میں بدگمان کرنا، لیکن یہ مقصد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود کو اس بات کا ذمہ دار بھی نہیں بنانا چاہتا، اس لئے اسے وہ دوسروں کے کھاتے میں ڈالنے کے لئے کہہ دیتا ہے "لوگ کہتے ہیں"، "سنا ہے کہ" وغیرہ وغیرہ۔ گویا اس طرح کی تعبیر کو ایک طرح سے وہ سہارا بنا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ سواری آدمی کے استعمال میں رہتی ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جنہیں آدمی اپنی گفتگو بہت کثرت سے استعمال کرتا ہے، جسے ہم تکیہ کلام کہہ دیتے ہیں۔ "سنا ہے کہ" "کہتے ہیں کہ" وغیرہ تکیہ کلام ہونا اچھی بات نہیں ہے۔

سنی سنائی بات پکے انداز سے آگے نقل کر دینا تو بذاتِ خود جھوٹ کا ایک شعبہ ہے، لیکن اگر سنی سنائی بات کو اس وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ مجھے اس کی تحقیق نہیں ہے تو اس کی اگرچہ گنجائش ہے، لیکن اس کی کثرت اور عادت ہونا جس سے یہ لفظ تکیہ کلام ہی بن جائے اچھی عادت نہیں ہے۔

علماء نے اس پر بحث کی ہے کہ زعموا کا لفظ استعمال کرنا کیسا ہے۔ اس لئے کہ اس حدیث میں اس سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، لیکن بہت سی نصوص اور صحابہ کے اقوال میں اس کا استعال بھی ملتا ہے، جس سے جواز معلوم ہوتا ہے۔ تو اصل بات یہ ہے کہ جہاں مذکورہ بالا قباحتوں میں سے کوئی پائی جائے وہاں ناجائز ہے، وگرنہ جائز ہے۔

مشیت میں غیر اللہ کو اللہ کے برابر نہ کیا جائے

(۲۸) وَعَنْ حُذَيْفَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى الله عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَقُولُوْا: مَا شَاءَ الله وَشَاءَ فُلَانٌ وَلَكِنْ قُولُوا: مَا شَاءَ الله ثُمَّ شَاءَ فلَان». رَوَاهُ أَحْمد وَأَبُو دَاوُد

.وفِي رِوَايَةٍ مُنْقَطِعًا قَالَ: « لَا تَقُولُوا: مَا شَاءَ الله وَشَاءَ مُحَمَّدٌ وَقُولُوا مَا شَاءَ الله وحْدَه» . رَوَاهُ فِي شرح السّنة

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم یوں نہ کہا کرو جو اللہ نے اور فلاں نے چاہا، بلکہ یوں کہا کرو جو اللہ نے چاہا پھر فلاں نے چاہا۔ اور ایک منقطع روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یوں نہ کہا کرو جو اللہ نے چاہا پھر محمد نے چاہا، بلکہ صرف اتنا کہا کرو جو اللہ نے چاہا۔

دونوں حدیثوں کا قدرِ مشترک یہ ہے کہ اللہ اور غیر اللہ کی طرف اگر مشیت کی نسبت کرنی ہو یعنی یہ بتانا ہو کہ یہ کام کس کے چاہنے سے ہوا ہے تو ایسی تعبیر اختیار نہیں کرنی چاہئے جس سے مشیت کی نسبت اللہ اور غیر اللہ کی طرف برابر درجے میں ہو رہی ہو۔ اس کا ایک صحیح طریقہ تو وہ ہے جو دوسری روایت میں بیان ہوا کہ اس کام کو صرف اللہ کی مشیت کی طرف منسوب کرو، کسی اور کے چاہنے یا نہ چاہنے کا نام ہی نہ لو۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو پہلی روایت میں بیان ہوا کہ اگر کسی اور کی مشیت کا حوالہ دینا ہی ہو تو اس انداز سے نہ ہو کہ دونوں کی مشیت میں برابری کا تاثر ابھرے، لہذا یوں نہ کہا جائے "ماشاء اللہ وشاء فلان" بلکہ اس کی بجائے یوں کہا جائے "ماشاء اللہ ثم شاء فلان" جو اللہ نے چاہا پھر فلاں نے چاہا۔ تاکہ یہ واضح ہو کہ فلاں کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وما تشاؤون إلا أن یشاء اللہ رب العالمین"۔

منافق کو سردار نہ کہو

(۲۹) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا تَقُولُوا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ فَإِنَّهُ إِنْ يَكُ سَيِّدًا فَقَدْ أَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کے بارے میں یہ نہ کہو کہ وہ سید ہے،اس لئے کہ اگر وہ واقعی (تمہارا) سردار ہے تو تم نے اپنے رب کو ناراض کر لیا ہے۔

بعض حدیثوں میں منافق کی جگہ فاسق کا لفظ آتا ہے۔زیادہ تر روایات میں منافق کا لفظ آتا ہے۔لیکن یہاں منافق سے مراد عملی منافق ہے۔اس لئے قلبی نفاق تو پوشیدہ چیز ہوتی ہے اس کا پتا چلانا بہت دشوار ہوتا ہے،اس لئے حکم لگانا بھی مشکل ہے۔البتہ نفاق عملی کا پتا چلانا آسان ہے۔مثلاً جھوٹ بولنا،خیانت کرنا،وعدہ خلافی کرنا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں ہر ایک کو آسانی سے نظر آسکتی ہیں۔

حدیث میں منافق کو سید یعنی سردار کہنے سے منع کیا گیا ہے۔یہ بظاہر اس صورت میں جبکہ یہ بطور تملق اور خوشامد کے ہو۔کسی سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے خوامخواہ کسی کو اس طرح کے القاب سے نوازرہے ہو۔اس لئے کہ منافق کو اپنے اختیار اور ارادے سے عملاً سچ مچ اپنا سردار بنانا گناہ اور اللہ کی ناراضگی کا موجب ہے تو زبانی کلامی کسی کو اس طرح کا لقب دینا بھی ناپسندیدہ ہوگا۔تاہم اگر کوئی اس طرح کا شخص ہمارے قصد واختیار کے بغیر کسی بڑے منصب پر

فائز ہو اور اسے اس منصب کے حوالے سے یاد کرنا پڑے تو وہ اس حدیث کے خلاف نہیں ہے۔ جیسے صدر فلاں، وزیر اعظم فلاں وغیرہ۔

الفصل الثالث

(۳۰) عَنْ عَبْدِ الْحَمِيدِ بْنِ جُبَيْرِ بْنِ شَيْبَةَ قَالَ: جَلَسْتُ إِلَى سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ فَحَدَّثَنِي أَنَّ جَدَّهُ حَزْنًا قَدِمَ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: «مَا اسْمُكَ؟» قَالَ: اسْمِي حَزْنٌ قَالَ: «بَلْ أَنْتَ سَهْلٌ» قَالَ: مَا أَنَا بِمُغَيِّرٍ اسْمًا سَمَّانِيهِ أَبِي. قَالَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ: فَمَا زَالَتْ فِينَا الْحُزُونَةُ بَعْدُ. رَوَاهُ البُخَارِيّ.

عبدالحمید بن جبیر کہتے ہیں کہ میں سعید بن المسیب کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دادا حَزَن نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا تمہارا کیا نام ہے، انہوں نے کہا میرا نام حَزن (سخت اور پتھریلی زمین) ہے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تم سَہل (نرم زمین) ہو۔ انہوں نے کہا میں اس نام کو بدلنے والا نہیں جو میرے والد نے رکھا ہے۔ سعید بن المسیب کہتے ہیں کہ ہم میں (ہمارے خاندان میں) اس وقت سے ہمیشہ حزونت (سختی) موجود رہی۔

آں حضرت ﷺ نے نام تبدیل کرنے کی یہ بات بطور مشورے کے فرمائی تھی، جسے نہ ماننا اگرچہ معصیت نہیں تھا، آپ کا مشورہ نہ ماننے کا نقصان تو بہر حال ہونا تھا، چنانچہ سعید بن المسیب کہتے ہیں اس نام کے اثرات اب تک ہمارے خاندان میں چلے آرہے ہیں۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں عرض کیا ''السہل توطا'' یعنی نرم زمین کو ہر کوئی روندتا ہے اور اس پر چڑتا ہے، جبکہ پتھریلی زمین پر چڑھنے کے لئے کوئی جلدی تیار نہیں ہوتا۔ مطلب ان کے کہنے

کا یہ تھا کہ بندے کو نرم بن کر نہیں رہنا چاہئے وگرنہ لوگ اس کو دبا لیتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مشورہ زیادہ دور اندیشی پر مبنی تھا۔

اچھے اور برے نام

(٣١) وَعَنْ أَبِي وَهَبٍ الْجُشَمِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تَسَمُّوا أَسْمَاءَ الْأَنْبِيَاءِ وَأَحَبُّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللهِ عَبْدُ اللهِ وَعَبْدُ الرَّحْمَنِ وَأَصْدَقُهَا حَارِثٌ وهمامٌ أقبحها حربٌ ومُرَّة» . رَوَاهُ أَبُو دَاوُد.

حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم انبیا والے نام رکھا کرو، اور اللہ کو سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں اور سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں اور سب سے برے نام حرب (لڑائی) اور مرّۃ (کڑوا) ہیں۔

اس حدیث کے پہلے حصے میں کہا گیا ہے کہ انبیاء والے نام رکھا کرو، اس حدیث کی سند پر اگرچہ کچھ کلام ہے، لیکن امام بخاری نے یہ مضمون بعض صحیح احادیث سے بھی ثابت کیا ہے، مثلاً آں حضرت ﷺ نے اپنے صاحبزادے کا نام ابراہیم رکھا تھا۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابتدا میں انبیا والے نام رکھنے سے منع کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں رجوع کر لیا تھا۔ اسی طرح بعض سلف سے ملائکہ والے نام رکھنے سے منع کرنا بھی منقول ہے، تاہم کسی صحیح حدیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

سب سے سچے نام حارث اور ہمام ہیں۔ سچا ہونے سے مراد امرِ واقعہ پر منطبق ہونا ہے۔اس لئے کہ حارث کے معنی ہیں کرنے والا، کمانے والا، تو ہر آدمی کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہوتا ہے۔ ہمام کے معنی ہیں فکر مند، ہر آدمی کسی نہ کسی معاملے میں فکر مند ضرور ہوتا ہے۔